اپریل تا ستمبر 2026

فیضانِ ادب (سہ ماہی)

جلد نمبر: 11
شمارہ: 2-3

بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

مولانا ارشاد حسین نمبر



مدیر
ڈاکٹر فیضان حیدر

Rs:500

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یوپی 275305

Digitized by Mohd Wasi Akhtar

فیضانِ ادب (سہ ماہی)
اپریل تا ستمبر 2026
ڈاکٹر فیضان حیدر

RNI: UP/URD/2018/74924
Date of Publication: 15/04/2026 &
Date of Dispatch: 20/04/2026

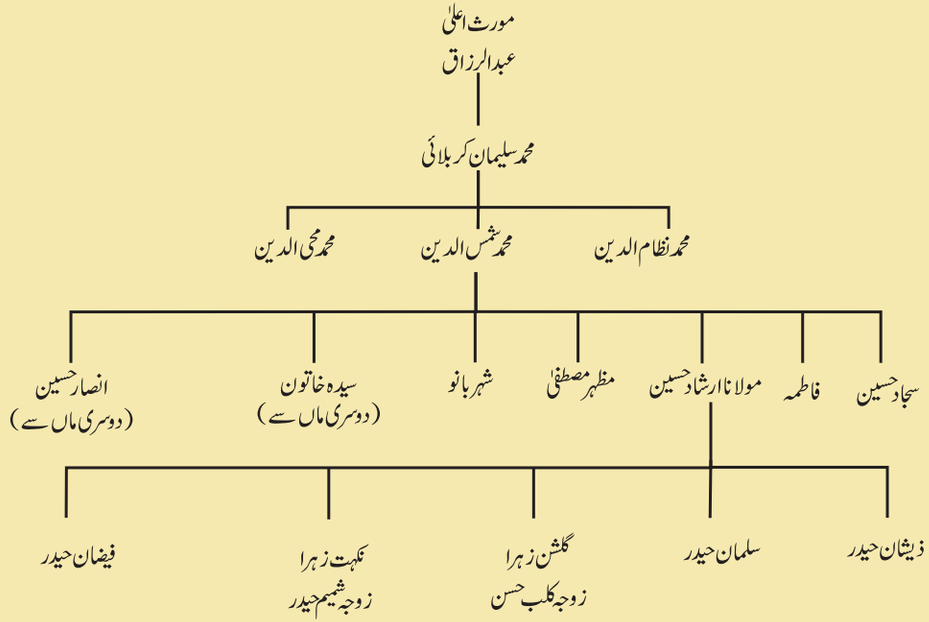
ISSN: 2456-4001

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Peer Reviewed Refereed Research Journal with Impact Factor: 7.0 (IIFS)

Vol. XI, Issue: II & III, April to September 2026



Editor
Dr.FAIZAN HAIDER

For latest issues of FAIZAN-E-ADAB
visit at www.faizaneadab.in

Printed and published by Dr. Faizan Haider on behalf of Urdu And Persian Research Organization, and printed at Scrino Printers, Farooqui Katra, Sadar Bazar, Maunath Bhanjan, and published at Urdu And Persian Research Organization, Purana Pura, Kurthi Jafarpur, Mau, U.P. 275305, Editor: Dr. Faizan Haider, E-Mail: faizanhaider40@gmail.com

سہ ماہی
فیضانِ ادب
بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ
جلد نمبر 11 شمارہ 3-2
اپریل تا ستمبر 2026ء

مدیر
ڈاکٹر فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یوپی 275305

Quarterly FAIZAN-E-ADAB
An International Peer Reviewed Refereed Research Journal with
Impact Factor: 7.0 (IIFS)
Vol. XI, Issue: II & III, April to September 2026
RNI: UPURD/2018/74924 —— ISSN: 2456-4001
Website: www.faizaneadab.in & faizaneadab.blogspot.com

بیادگار: استاذ الاساتذہ **مولانا ارشاد حسین** (طاب ثراہ)

مدیر: (ڈاکٹر) فیضان حیدر (+917388886628)

مجلس مشاورت	مجلس ادارت
پروفیسر نسیم احمد (وارانسی)	پروفیسر عابد حسین حیدری (سنبھل)
پروفیسر سید حسن عباس (وارانسی)	ڈاکٹر شکیل احمد (مئوناتھ بھنجن)
پروفیسر سید محمد اصغر (علی گڑھ)	ڈاکٹر سید نقی عباس (مظفر پور)
پروفیسر سید وزیر حسن (وارانسی)	ڈاکٹر ظہیر حسن ظہیرؔ (مئوناتھ بھنجن)
پروفیسر عمر کمال الدین (لکھنؤ)	ڈاکٹر سید الفت حسین (پٹنہ)
پروفیسر سید جاوید حیات (پٹنہ)	ڈاکٹر فیضان جعفر علی (لکھنؤ)
ڈاکٹر محمود احمد کاوش (نارووال)	ڈاکٹر مہناز انجم (اسلام آباد)
ڈاکٹر محسن رضا رضوی (پٹنہ)	ڈاکٹر محمد خالد انجم عثمانی (دربھنگہ)
ڈاکٹر ذیشان حیدر (لکھنؤ)	ڈاکٹر شمیم احمد (مئوناتھ بھنجن)

اس شمارے کی قیمت: **500** روپے ☆ سالانہ: **1000** روپے (صرف رجسٹرڈ ڈاک سے)

مضامین اور تخلیقات **faizaneadab@gmail.com** اور **info@faizaneadab.in** پر ارسال فرمائیں۔

ممبر شپ کے لیے بار کوڈ کے ذریعہ یا بینک اکاؤنٹ میں آن لائن رقم ٹرانسفر کی جاسکتی ہے۔

Account No.: 735801010050190, Name: FAIZAN E ADAB, Union Bank of India, Kurthi Jafarpur Branch, Ifsc : UBIN0573582, UPI ID: 8707337737@uboi

- مقالہ نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
- مقالوں کی ایڈیٹنگ میں ادارہ آزاد ہے۔
- فیضان ادب کے مکمل حوالے کے ساتھ مضامین یا اقتباسات نقل کیے جاسکتے ہیں۔
- تمام تر قانونی چارہ جوئی صرف مئو کی عدالت میں ہی ممکن ہے۔

فہرست

اداریہ	: مدیر	07
مولانا ارشاد حسین: ایک نظر میں	: ابن ارشاد	10
قطعۂ تاریخ وفات	: رؤف خیر	13
قطعاتِ تاریخ وفاتِ مولانا ارشاد حسین معروفی	: تنویر پھولؔ	14
خراج عقیدت بخدمت مولانا ارشاد حسین (توشیحی نظم)	: حلیم صابر	15
توشیحی نظم بنام مولانا ارشاد حسین	: فرحت حسین خوشدلؔ	16
آئینۂ حیات و جہانِ خدمات		
مولانا ارشاد حسین: حیات، شخصیت اور علمی و ادبی خدمات	: فیضان حیدر	18
مولانا ارشاد حسین معروفی: ایک عہد ساز شخصیت	: شبانہ امان اللہ	39
مولانا ارشاد حسین: حیات، خدمات اور علمی وراثت	: کرار حسین اظہری	50
مولانا ارشاد حسین کی فارسی خدمات	: عبدالسلام جیلانی	56
مولانا ارشاد حسین معروفی کی ادبی خدمات	: عتیق الرحمٰن	64
مولانا ارشاد حسین معروفی: حیات اور تخلیقی سفر	: رفیق احمد	75
مولانا ارشاد حسین: ایک اجمالی تعارف	: زُہرہ خاتون	82
نغمۂ حمدِ باری و عطرِ نعتِ مصطفیٰؐ		
مولانا ارشاد حسین معروفی اور اُن کا سرمایۂ حمد و نعت	: محمود احمد کاوش	87

ارشادِ نبیؐ کا نکتہ داں: ارشاد حسین معروفی	: محسن رضا رضوی	100
عطرِ مدحتِ اہل بیت رسولؐ		
مولانا ارشاد حسین معروفی کی منقبت گوئی	: فیضان جعفر علی	107
مولانا ارشاد حسین: ذکرِ اہل بیت کا نغمہ گو	: سید الفت حسین	114
جہانِ سخن		
مولانا ارشاد حسین کی شعری کائنات	: فیضان حیدر	137
مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری	: محمد شاہنواز عالم	162
علم و ادب کا نیّرِ تاباں: ارشاد حسین معروفی	: سلطان آزاد	169
مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری	: مہناز انجم	176
مولانا ارشاد حسین معروفی کا اسلوبِ تدریس اور شاعری	: مرغوب عالم	181
نکہتِ غزل		
مولانا ارشاد حسین کی غزلیں	: مجاہد الاسلام	188
مولانا ارشادؔ کی غزلیہ شاعری	: سحر افروز	196
مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی	: شکیل احمد	204
حضرت مولانا ارشادؔ: تغزل کے صید اور شعریت کے صیاد	: ہادی سرمدی	211
جرأت اظہار کا شاعر: ارشاد حسین	: عشرت ناہید	226
نکہتِ رباعی		
رباعیات کے آئینے میں مولانا ارشاد حسین کی حق گوئی	: اکبر علی	231
مولانا ارشاد حسین: بحیثیت رباعی گو	: زیبا پروین	238
نکہتِ تصوف		
آفاقِ تصوف کا نغمہ سرا: ارشادؔ معروفی	: محمد خالد انجم عثمانی	244

بازگشت معانی

مولانا ارشاد معروفی کی ترجمہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ..... : علی اصغر الحیدری 251

آئینۂ نقد و نظر

مشرقی شعریات کا تنقیدی محاسبہ اور مولانا ارشاد حسین : عابد حسین حیدری 263

'علوم القرآن': ایک تعارفی تجزیہ : ذیشان حیدر 288

فیضانِ ارشاد:

شاگردانِ مولانا ارشاد حسین : فیضان حیدر 319

خراجِ عقیدت

گل سرسبد چمنستان تدریس : ناظم علی خیرآبادی 365

ایک مثالی استاد : صادق حسین سمندپوری 370

مولانا ارشاد حسین: علم، اخلاق اور انکسار کا پیکر : دلبر حسنین معروفی 374

مقبول و معتبر استاد : محمد مہدی حسینی 377

آئینۂ تجلیات : کاظم علی واعظ 380

آہ! فخر المدرسین : محمد حجّت 383

معلّم اسوہ : مظاہر حسین 385

عمر بھر جس نے جلائے علم و حکمت کے چراغ : احتشام الحسن زنگی پوری 390

جید الاستعداد محقق، عالم دین، اور ادیب و شاعر : انصار احمد معروفی 393

اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی : علی اصغر الحیدری 397

وقارِ باطن کا مجسم پیکر : ابن ارشاد 401

حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ..... : نفیس الحسن 408

منظوم خراج عقیدت

وا استاذاہ! : اصغر اعجاز قائمی 411

رباعیات بیادِ مولانا ارشاد حسین : مقبول احمد مقبولؔ 413
تعزیتی نظم بیاد مولانا ارشاد حسین معروفی (مرحوم) : کلیم حیدر کلیمؔ معروفی 414
چراغِ داغ! : علی اصغر الحید ری 415
تعزیتی نظم..... : عزادار حسین ساجدؔ جلال پوری 416
فی رثاء والدی/ ای فروغِ صبح ایمانی/تعزیتی نظم : فیضان حیدر 417
تعزیتی قطعات : اظہر قائمی/محمد حیدر/ طاہر مبارک پوری 421

تعارف وتبصرہ

نام کتاب	مولف/مرتب	تبصرہ نگار	
نگارشات (مجموعہ مضامین)	ڈاکٹر سفیان احمد انصاری	: فیضان حیدر (معروفی)	422
پریم چند کی مضمون نگاری	ڈاکٹر خالد انجم	: فیضان حیدر (معروفی)	427

انتخابِ کلام مولانا ارشاد حسین 431
تعزیت نامے 552
نمونہ تحریر مولانا ارشاد حسین معروفی (مرحوم) 553
مولانا ارشاد حسین تصویروں کی زبانی 557

اداریہ

تاریخ شاہد ہے کہ علم وہ بنیادی عنصر ہے جس نے انسان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر شعور، فہم و ادراک اور دانائی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچایا۔ دراصل علم وہ سرچشمۂ بصیرت ہے جس کے فیض سے فکر میں وسعت، ادراک میں گہرائی و گیرائی اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور سنوارنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ جب بھی انسان نے علم کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نصب العین بنایا، اس کے سامنے ترقی کے نئے امکانات روشن ہوئے اور تہذیبی و فکری پیش رفت کی راہیں ہموار ہوئیں۔ اس کے برعکس جب معاشروں نے علم و آگہی سے بے اعتنائی برتی تو جمود، پسماندگی اور زوال ان کا مقدر بن گئے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی ہر باشعور اور مہذب قوم نے علم کو اپنی فکری شناخت، تہذیبی بنیاد اور تمدنی استحکام کا مرکزی حوالہ قرار دیا ہے۔

علم کی اصل عظمت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اس کے ساتھ تحقیق کا شعور بھی موجود ہو۔ تحقیق دراصل علم کی تہ در تہ پرت اور وسعت دونوں کو ارتقائی منزلوں تک لے جاتی ہے۔ تحقیق کے ذریعہ ہی نئے سوالات پیدا ہوتے، نئے زاویے سامنے آتے اور نئے دریچے وا ہوتے ہیں۔ اگر علم صرف روایت کی سطح پر باقی رہ جائے اور اس میں تحقیق کی روح شامل نہ ہو تو وہ اپنی تاثیر کھو دیتا ہے۔

برصغیر میں تحقیق و تنقید کی تابناک روایت رہی ہے۔ یہاں کے علما و فضلا نے نہ صرف مذہبی علوم میں گراں قدر خدمات انجام دیں بلکہ زبان، ادب اور تہذیب و تمدن کے میدان میں بھی اپنے فکر و قلم کے چراغ روشن کیے۔ ان علما کی محنتوں نے اس خطے کی علمی فضا کو روشن کیا اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک مضبوط علمی بنیاد فراہم کی۔

ایسی ہی باوقار شخصیات میں مولانا ارشاد حسین کا نام نامی بھی ہے۔ وہ ان علما میں سے تھے جنھوں نے پوری زندگی درس و تدریس، تنقید و تحقیق، ترجمہ و تخلیق میں گزار دی۔ ان کی شخصیت میں وقار، سنجیدگی، سادگی اور علمی متانت کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ وہ تعلیم و تدریس کو ایک مقدس ذمہ داری سمجھتے تھے اور طلبہ کو فیضانِ علم پہنچانے کے لیے دامے درمے سخنے ہر طرح کوشاں تھے۔

مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ تدریس کے میدان میں صرف ہوا، جہاں انھوں نے فقط ایک مدرس کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مربی اور رہنما کے طور پر اپنی خدمات انجام دیں۔ ان کا اندازِ تدریس اس روایت سے مختلف تھا جو صرف نصاب تک محدود رہتی ہے۔ وہ درس وتدریس کو معلومات کی ترسیل کا ذریعہ ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے فکری بیداری اور علمی ذوق کی آبیاری کا وسیلہ بھی قرار دیتے تھے۔

ان کی درس گاہ کا ماحول علمی سنجیدگی اور فکری بالیدگی سے معمور ہوتا تھا، جہاں نصابی مباحث کی توضیح وتشریح کے ساتھ فکر ونظر کے نئے دریچے بھی وا ہوتے تھے اور علمی مسائل پر فاضلانہ مکالمے کی فضا قائم رہتی تھی۔ طلبہ ان کے پاس صرف حصولِ علم کی غرض سے نہیں آتے تھے بلکہ ان کی شخصیت سے علمی وقار، فکری استقامت اور اخلاقی تربیت کے وہ نقوش بھی حاصل کرتے تھے جو ایک سچے معلم کی پہچان ہوتے ہیں۔

ان کی تدریسی زندگی کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے شاگردوں میں سوال کرنے کی جرأت پیدا کرتے اور علمی تجسس کو فروغ دیتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ فکر وشعور کی بیداری تھا۔ اسی لیے وہ طلبہ کو اس بات کی ترغیب دیتے کہ وہ صرف سامع بن کر نہ رہیں بلکہ غور وفکر کریں، مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں اور علمی نکات پر سوال اٹھانے کا حوصلہ پیدا کریں۔

یہی طرزِ تربیت درحقیقت تحقیق وجستجو کی بنیاد فراہم کرتا ہے، کیوں کہ سوال ہی وہ ابتدائی زینہ ہے جس سے تحقیق کا سفر شروع ہوتا ہے۔ مولانا کے اس علمی وتربیتی رویے کا نتیجہ تھا کہ ان کے شاگردوں میں مطالعے کا ذوق اور علمی سنجیدگی پروان چڑھتی تھی۔ چنانچہ ان کے زیرِ تربیت بہت سے طلبہ نے مذہبی خدمات کے ساتھ علمی، ادبی اور تحقیقی میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا اور اپنے استاد کی علمی روایت کو آگے بڑھانے میں قابلِ قدر کردار ادا کیا۔

ایسی بلند پایہ شخصیات درحقیقت کسی بھی معاشرے کے لیے قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی ذات ایک فرد تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ اپنے علم، کردار اور اخلاق سے ایک وسیع معاشرتی دائرے کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ شخصیات اپنے علمی فیضان سے معاشرے کے فکری افق کو روشن کرتی اور اپنی عملی زندگی کے ذریعے اقدار وروایات کی ایسی مثال قائم کرتی ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ ان کے وجود سے علم کی وہ روشنی پھوٹتی ہے جو ذہنی آگہی کے ساتھ کردار کی تعمیر، اخلاق کی تطہیر اور اجتماعی شعور کی بیداری کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علم اگر صرف معلومات کے ذخیرے تک محدود رہ جائے تو اس کی افادیت محدود ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن جب یہی علم کردار، اخلاقی بصیرت اور سماجی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ہم آہنگ

ہو جائے تو وہ ایسی قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کی اصلاح و ترقی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں وہی اہلِ علم قدر و منزلت کے حامل قرار پائے جن کی زندگی علم و عمل کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ ایسی شخصیات کی حیات ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ علم کا حقیقی مقصد صرف ذہن کو معلومات سے بھر دینا نہیں، بلکہ انسان کے باطن کو سنوارنا، اس کے کردار کو نکھارنا اور اسے معاشرے کے لیے ایک مفید اور بامقصد فرد بنانا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے اہلِ علم کی زندگی دراصل ایک زندہ درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہے جہاں سے نہ صرف علمی بصیرت حاصل ہوتی ہے بلکہ انسانی قدروں اور سماجی ذمہ داریوں کا شعور بھی پروان چڑھتا ہے، اور یہی وہ پہلو ہے جو کسی بھی مہذب معاشرے کی فکری و اخلاقی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

مولانا کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع اور متنوع تھا۔ انھوں نے مذہبی خدمات کے ساتھ علمی، ادبی اور تحقیقی میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے اور بالخصوص شاعری کی مختلف اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ ان کی شاعری میں حمد، مناجات، نعت، منقبت، غزل، رباعی، سلام، قطعہ اور مرثیہ جیسی اصناف شامل ہیں، جن میں عقیدت و فن اور سنجیدگی و شائستگی کا حسین امتزاج صاف طور پر نظر آتا ہے۔

فیضانِ ادب کا یہ خصوصی شمارہ مولانا ارشاد حسین کی یاد میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس اشاعت کا مقصد فقط ایک عظیم شخصیت کی یاد کو تازہ کرنا نہیں بلکہ ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنا بھی ہے۔ دراصل اہلِ علم کی زندگی اور خدمات کو محفوظ کرنا علمی روایت کے تسلسل کے لیے نہایت اہم ہے، کیوں کہ یہی عمل ماضی کی علمی، ادبی، تہذیبی اور مذہبی میراث کو زندہ رکھنے اور اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر اس شمارے میں مختلف اہلِ قلم نے اپنی تحریروں کے ذریعے مولانا ارشاد حسین کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کے گوناگوں پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ ان مضامین میں کہیں ان کی علمی بصیرت اور تدریسی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، تو کہیں ان کے اخلاقی و روحانی اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے اور کہیں ان کی فکری و ادبی کاوشوں کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے، تاکہ قارئین کے سامنے ان کی شخصیت کا ایک جامع اور متوازن نقش ابھر سکے۔ امید ہے کہ یہ شمارہ نہ صرف مرحوم کی یاد کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوگا بلکہ نئی نسل کو بھی علم و ادب اور تحقیق و تنقید کی اہمیت سے روشناس کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

یہاں ان تمام قلم کاروں کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا اخلاقی فریضہ ہے جنھوں نے قلمی تعاون کیا۔ امید ہے کہ گزشتہ خصوصی شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی قارئین کو پسند آئے گا۔

فیضان حیدر معروفی (مدیر)

ابن ارشاد
پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو 275305

مولانا ارشاد حسین: ایک نظر میں

نام:	(مولانا) ارشاد حسین
پیدائش:	۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء بروز سہ شنبہ (پورہ شیخ معروف، ضلع اعظم گڑھ [موجودہ مئو])
وفات:	۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء بمطابق ۱۵/شوال المکرم ۱۴۴۶ھ بروز دوشنبہ (ایراز لکھنؤ میڈیکل کالج، لکھنؤ)
والد:	محمد شمس الدین ابن محمد سلیمان کربلائی ابن عبدالرزاق
والدہ:	نرجس خاتون بنت صادق علی کربلائی ابن حاجی غلام حسین
برادران وخواہران:	سجاد حسین، مولانا ارشاد حسین، مظہر مصطفیٰ، فاطمہ، شہر بانو زوجہ محمد اعجاز کربلائی، (نرجس خاتون کے بطن سے)؛ انصار حسین اور سیدہ خاتون زوجہ علی اکبر (دوسری ماں سے)
شریک حیات:	شمیم زہرا بنت ابوالحسن ابن غلام رسول ابن قدرت علی
اولاد:	ڈاکٹر ذیشان حیدر، استاد شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس ماسٹر سلمان حیدر، گورنمنٹ اسکول ٹیچر، کھرہٹ، مئو فیضان حیدر، استاد شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ایم کالج، دربھنگہ گلشن زہرا زوجہ جناب کلب حسن (مقیم حال بنگلور) نکہت زہرا زوجہ ماسٹر شمیم حیدر، استاد مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ
خاندانی پس منظر:	دینی وعلمی خانوادہ، کربلائی نسبت
مادرِ علمی:	۱۔ مدرسہ اشاعت العلوم، محلّہ پارہ، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو ۲۔ مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ

۳۔جامعہ ناظمیہ لکھنؤ (ممتاز الافاضل، ۱۹۷۲ء)
۴۔لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

تعلیمی اسناد: مولوی، منشی، عالم، کامل، فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضل معقولات، فاضل طب (عربی و فارسی بورڈ الہ آباد، موجودہ اتر پردیش مدرسہ ایجوکیشن بورڈ لکھنؤ)
فاضل ادب (۱۹۷۰ء)، دبیر ماہر (۱۹۷۱ء)، دبیر کامل (۱۹۷۲ء) [لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ]

اساتذۂ کرام: حجۃ الاسلام مولانا علی ارشاد نجفی، حجۃ الاسلام مولانا فیاض حسین واعظ، مفتی اعظم آیۃ اللہ سید احمد علی، مولانا سید مرتضیٰ نقوی، مولانا محمد حسین نجفی، مولانا روشن علی، حجۃ الاسلام مولانا سید حمید الحسن، مولانا سید محمد شاکر، مولانا محمد ایوب، فیلسوف عصر مولانا حکیم محمد اطہر، مولانا محمد ہاشم، مولانا سید ابن حیدر وغیرہ۔

عملی زندگی کا آغاز: ۱۹۷۲ء

تدریسی خدمات: مکتب صابرہ نقی، دہیاور، فیض آباد، (موجودہ امبیڈکر نگر)
مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ (وائس پرنسپل)
جامعہ ایمانیہ ناصریہ، جون پور
جامعہ حیدریہ مدینۃ العلوم، خیر آباد، ضلع مئو
مدرسہ باب العلم، مبارک پور (یہیں سے جون ۲۰۱۲ء میں وظیفہ یاب)

امامت وتبلیغ: محلہ نیا بازار، بھاگل پور (بہار)
محرم ورمضان میں وعظ وارشاد (مومن پارہ، رائے پور)
مسجد حجرہ شاہ محمد پور، مبارک پور، اعظم گڑھ
جمعہ کی امامت (پورہ معروف، تا ۲۰۰۸ء)

علمی وادبی خدمات: موسس ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف (قیام: ۲۰۱۶ء)
مجلہ 'فیضانِ ادب' کی سرپرستی

تصنیفات وتالیفات: ۱۔فلسفۂ توحید
۲۔افادیتِ نماز
۳۔افادیتِ روزہ

۴۔تفسیر قرآن (چند منتخب سورتیں)
۵۔علوم القرآن (زیر طبع)
۶۔غرائب القرآن (زیر طبع)

تراجم: ۱۔ترجمۂ کریما (۲۰۱۹ء)
۲۔ترجمہ دوازدہ بند محتشم کاشانی (۲۰۱۹ء)
۳۔ترجمہ صد پند لقمان (۲۰۲۰ء)
۴۔ترجمہ قصیدۂ ایوان مدائن (۲۰۲۵ء)
۵۔جلاء الصدور ترجمہ معراج العقول (نامکمل)

ادبی پہلو: شاعری (حمد، مناجات، نعت، منقبت، غزل، رباعی، نظم، قطعہ، مسدس وغیرہ)

شعری مجموعہ ارمغانِ ارشاد (زیر ترتیب)

مضامین ومقالات: بیس سے زائد مضامین (مذہبی، علمی، ادبی، تحقیقی وتنقیدی)

تقریظیں: بیس سے زائد کتابوں پر

خصوصیات: سادگی، قناعت، سنجیدگی، علم دوستی، مدلل اور عام فہم اندازِ تدریس، اخلاقی تربیت پر خصوصی توجہ

سبک دوشی: ۳۰/جون ۲۰۱۲ء

مدفن: پورہ معروف (مٹھیا[آبائی قبرستان])، ضلع مئو

☆☆☆

ڈاکٹر رؤف خیر
موتی محل، حیدرآباد، رابطہ نمبر:9440945645

قطعۂ تاریخ وفات

سہ ماہی 'فیضانِ ادب' کے سرپرست شیخ ارشاد حسین معروفی ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو مئو میں پیدا ہوئے اور ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو انتقال کر گئے۔ قطعہ تاریخ وفات پیش ہے جس کے آخری مصرعے سے ۲۰۲۳ء اعداد میں دو کے تعمیے سے تاریخ وفات ۲۰۲۵ء برآمد ہوتی۔

قطعہ

آپ جب خاک مئو سے لکھنؤ تک آ گئے
بالیقیں علم و ادب سے باندھا پیمان ادب
آپ نے جب راہ، تعلیم و تعلّم کی چنی
آخرش ٹھیرے یکے از خاصِ خاصانِ ادب
ایسے پا بستہ تھے باب العلم کی دہلیز سے
ہو کے وابستہ کیے کچھ کام شایانِ ادب
شیخ معروفی تھے ایسے شیخ ارشاد حسین
ہیں کئی شاگرد جن کے تھامے دامانِ ادب
مسند ارشاد پر تھے خیرؔ وہ دو رنگ میں
''سرپرست و جان بزمِ جام 'فیضان ادب''
۲۰۲۳+۲=۲۰۲۵ء

☆☆☆

تنویر پھولؔ
نیویارک، امریکہ

قطعاتِ تاریخ وفاتِ مولانا ارشاد حسین معروفی

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ صاحب کے ذریعے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ معروف دینی شخصیت حجۃ الاسلام مولانا شیخ ارشاد حسین معروفی جو دربھنگہ میں مقیم لکچرر فیضان حیدر، مدیر سہ ماہی 'فیضان ادب' کے والد گرامی تھے، ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء بروز دوشنبہ لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی، تمام مرحومین اور ہم سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

قطعۂ تاریخ ہجری

راہیٔ ملکِ عدم ارشاد معروفی ہوئے
ان کی رحلت پر ہوئے مغموم ان کے ہم جلیس
تجھ کو معروفی کی گر کہنی ہے تاریخِ وفات
پھول کہہ ''ارشاد معروفی، مکرّم دل نفیس''
[۱۴۴۶ھ]

قطعۂ تاریخ عیسوی

پھول! عالم بے بدل دنیا سے رخصت ہوگئے
رحلتِ ارشاد معروفی کو اک دھچکا کہو
معرفت کا نور ان کے رخ سے تھا ہر دم عیاں
''محترم ارشاد معروفی پری چہرہ'' کہو
[۲۰۲۵ء]

☆☆☆

حلیم صابر
کولکاتا (مغربی بنگال)، رابطہ نمبر: 9748772983

خراجِ عقیدت بخدمت مولانا ارشاد حسین

(توشیحی نظم)

م- مرد مومن حضرت ارشاد استاد سخن
و- واقف ان سے ہے سبھی علم و ادب کی انجمن
ل- لہجہ شائستہ تھا ان کا تھے وہ مرد نیک خو
ا- اس طرح کرتے تھے وہ شیریں زباں میں گفتگو
ن- نور چہرے پر، شرافت کی جھلک تھی شکل پر
ا- آپ کی تھی ذات علمی حیثیت سے معتبر
ا- ان کی علمی خوبی کے تھے معترف اہل وطن
ر- رحم کا جذبہ بھی دل میں آپ کے تھا موجزن
ش- شکل تھی صوفی منش سی بے ضرر انسان تھے
ا- افتخار قوم و ملت فخر ہندوستان تھے
د- درس و تدریس آپ کا تھا مشغلہ عمدہ صفات
ح- حاصل ان سے علم کر کے سارے طلبا طالبات
س- سربراہی میں جو ان کی جہل سے پائی نجات
ی- یاد کرتے ہیں وہ سب استاد کے احسان کو
ن- نیک طینت اپنے محسن صاحب ذیشان کو

☆☆☆

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ
ہزاری باغ، جھارکھنڈ، رابطہ نمبر: 9113750958

توشیحی نظم بنام مولانا ارشاد حسین

م- مولوی منشی، عالم کامل تھے ارشاد حسین
ماہ اپریل میں پائی رحلت بھیگے سب کے نین

و- ورطۂ حیرت میں ہے دنیا اُن کا دیکھ کے کام
رب کی عنایت خاص تھی اُن پر زندہ ہے ان کا نام

ل- لائق تحسیں اُن کی امامت، اور ریاضت خوب
اُن کی کتابیں پڑھ کے دنیا اب بھی ہے مرعوب

ا- ایسا افادی پہلو اُن میں، جس میں کئی ہیں راز
اُن کا ہے اُسلوب نرالا، دین کے ہیں شہباز

ن- ناصح بھی تھے، ناطق بھی تھے حامل ہر اسرار
دین کی خاطر مر مٹنے کو رہتے تھے تیار

ا- ارضِ مدینہ، ارض معلّٰی ذہن میں تھا ہر دم
دل کے نہاں خانے میں بسایا شاہِ زمنؐ کا غم

ا- ایک ہی مرکز، ایک ہی محور، ایک صفت درویش
سب پہ نظر رکھتے تھے یکساں، غیر ہوں یا پھر خویش

ر- راہِ حق پر خوب چلے اور دیں کا دیا پیغام
اپنی وسعت سے بھی زیادہ اس نے کیا سب کام

ش- شمس تھے والد، دادا سلیماں، بھائی تھے سجاد

آج ہے اُن کے گھر والوں کو دنیا کرتی یاد

ا- اہلِ دانش اہلِ تقویٰ کی ہے یہ پہچان
جس نے اپنے نفس کو جانا وہ سب ہیں ذیشان

د- درس کے تقدیسی پیشے نے اُن کی بڑھائی شان
حبِّ نبیؐ کے داعی تھے وہ اُن پر ہم قربان

ح- حق کا بیاں تحریر میں یکساں اور تقریر میں خوب
دل کی بات زباں پر لاتے، شعر کا خوب اسلوب

س- سن اُنچاس کے اکتوبر میں اُن کی ہوئی پیدائش
اہلِ بیت سے نسبتِ عالی نے کی تھی زیبائش

ی- یادِ الٰہی اُن کا وظیفہ، ماں نے ان کو سکھایا
تین پسر، دو دختر کو محنت سے نیک بنایا

ن- نامِ علیؑ اور کامِ علیؑ سا اب ملنا مشکل
ذکرِ صحابہؓ بھی کرنا ہے تم بھی کرو خوشدل

☆☆☆

ڈاکٹر فیضان حیدر
شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ایم کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 7388886628

آئینۂ حیات و جہانِ خدمات

مولانا ارشاد حسین: حیات، شخصیت اور علمی و ادبی خدمات

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین کی شخصیت علم، تقویٰ، قناعت اور سنجیدگی کا روشن نمونہ تھی۔ وہ ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ضلع مئو کی مردم خیز بستی پورہ معروف کے ایک دینی و علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی پس منظر مذہبی روایات اور علمی ذوق و شوق سے مالا مال تھا، جس نے ان کی فکری و اخلاقی تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ اشاعت العلوم، محلّہ پارہ، پورہ معروف سے حاصل کی۔ یہاں انھوں نے دینی علوم کے ساتھ عربی و فارسی کی بنیادی استعداد پیدا کی۔ بعد ازاں ۱۹۶۲ء میں مدرسہ باب العلم مبارک پور میں داخلہ لیا جہاں ممتاز اساتذہ کی رہنمائی نے ان کی علمی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

۱۹۶۶ء میں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ اس دوران انھوں نے عربی و فارسی بورڈ الہ آباد سے عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضل معقولات اور فاضل طب جیسے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ جامعہ ناظمیہ کے جلیل القدر اساتذہ کی تربیت نے ان کے علمی مزاج کو وسعت اور استدلالی قوت عطا کی۔

تعلیم کے دوران ہی انھوں نے معاشی ضرورت کے تحت امامت کی ذمہ داری سنبھالی اور ۱۹۷۲ء میں ممتاز الافاضل کی سند حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ انھوں نے مکتب صابرہ نقی، مدرسہ باب العلم مبارک پور، جامعہ ایمانیہ ناصریہ جون پور اور جامعہ حیدریہ خیر آباد جیسے اداروں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ان کا اندازِ تدریس نہایت واضح، مدلل اور عام فہم تھا جس کے ذریعے وہ مشکل علمی مباحث کو بھی آسان بنا دیتے تھے۔

وہ طلبہ کی علمی تربیت کے ساتھ ان کی اخلاقی اور فکری تعمیر پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ دینی تبلیغ،

امامت، وعظ وارشاد اور علمی وادبی سرگرمیوں میں بھی وہ فعال رہے۔ 'ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی' کا قیام اور بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی مجلّہ 'فیضانِ ادب' کی سرپرستی ان کی علمی خدمات کا نمایاں حصہ ہے۔ انھوں نے تصنیف وتالیف اور تحقیق کے میدان میں بھی اہم خدمات انجام دیں۔ فلسفۂ توحید، افادیتِ نماز، افادیتِ روزہ اور علوم القرآن جیسی تصانیف ان کی علمی بصیرت کا ثبوت ہیں۔ ۱۴/ اپریل ۲۰۲۵ء بروز سوموار کو ایرا لکھنؤ میڈیکل کالج میں ان کا انتقال ہوا، اور سوموار کو ہی رات دس بجے آبائی وطن پورہ معروف میں تدفین عمل میں آئی۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، ابتدائی نشو ونما، تعلیم وتربیت، درس وتدریس، مدرسہ باب العلم، جامعہ ایمانیہ ناصریہ، جامعہ حیدریہ، علمی واخلاقی تربیت، شاعری، فیضان ادب، تصنیفات وتالیفات، تراجم۔

علم دوستی کی فضا میں آنکھ کھولنے والا چراغ: علمی و دینی شخصیات کی حیات وخدمات کا مطالعہ دراصل ان فکری وتہذیبی سرچشموں کی تلاش بھی ہے جن سے ان کی شخصیت نے نشوونما پائی۔ کسی فرد کی علمی وروحانی تشکیل اس کی انفرادی محنت کا حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے پس منظر میں پورا خاندانی اور تہذیبی ورثہ کارفرما ہوتا ہے جو نسل در نسل منتقل ہو کر شخصیت کی فکری جہتوں کو متعین کرتا ہے۔ اسی لیے سوانح میں یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رکھی جاتی ہے کہ کسی شخصیت کے علمی کمالات وخدمات کو سمجھنے کے لیے اس کے خاندانی پس منظر، ابتدائی ماحول اور معاشرتی فضا کا جائزہ ناگزیر ہے۔ یہ عوامل اس کے مزاج، رجحانات اور طرزِ فکر کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور اسی کے بطن سے اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔

مولانا ارشاد حسین کی شخصیت بھی اسی تسلسل کی ایک درخشاں کڑی ہے جس کے پیچھے ایک قدیم دینی وعلمی روایت کی تابناک تاریخ کارفرما ہے۔ ان کی حیات کا مطالعہ ہمیں نہ صرف ایک مخلص عالم دین، مربی اور معلم کی شخصیت سے آشنا کرتا ہے بلکہ اس خانوادے کی جھلک بھی پیش کرتا ہے جس نے ان کی ذہنی و روحانی تربیت کی بنیاد فراہم کی۔ مولانا کی ولادت ایک دینی و مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ پورا نام (مولانا) ارشاد حسین ابن محمد شمس الدین ابن محمد سلیمان کربلائی ابن عبد الرزّاق اور ماں کا نام نرجس خاتون بنت صادق علی کربلائی ابن حاجی غلام حسین ہے۔ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ضلع مئو کی مردم خیز بستی پورہ معروف، کرتھی جعفر پور میں نسبتاً مفلوک الحال گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ تاہم یہ ایسی فضا تھی جہاں بزرگوں کے ہاتھ میں محنت اور دل میں قناعت تھی۔ اس ماحول نے مولانا کی شخصیت میں ابتدا ہی سے سنجیدگی، قناعت اور علم

دوستی کے وہ نقوش ثبت کر دیئے جو عمر بھر ان کی شخصیت اور مزاج کا حصہ رہے۔

مولانا اپنی بے نیازی اور دنیاوی علائق سے عدمِ دلچسپی کے واقعات خود بڑے سادہ مگر دل کش انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جب وہ دَھوَرِیا ساتھ (پورہ معروف سے تقریباً دو کلومیٹر شمال میں واقع ایک موضع) سے اکثر پیدل گزرا کرتے تو وہاں کے پردھان کیدار ناتھ محبت اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت انھیں متوجہ کرتے ہوئے کہتے کہ یہ زمین اور باغ جوان کے دادا کے نام درج ہے، مناسب ہے کہ اسے اپنے والد کے نام منتقل کرالیں۔ مگر مولانا اس پیش کش کے جواب میں نہایت سادگی اور دردمندی کے ساتھ کہتے کہ جس مکان میں خود رہ رہا ہوں، وہ تو حالات کے جبر میں بیچنا پڑا، اور آپ مجھے اس بات پر آمادہ کر رہے ہیں کہ اس زمین اور باغ کو والد صاحب کے نام کروالوں! پھر وہ مسکرا کر صاف لفظوں میں یہ بھی کہہ دیتے کہ ان سب میں میری کوئی دلچسپی نہیں، اور بہتر یہی ہے کہ یہ جائداد جیسی ہے ویسی ہی رہنے دی جائے۔ اس واقعے میں مولانا کی شخصیت کے وہ نمایاں اوصاف پوری طرح جھلکتے ہیں جو انھیں ایک عالم ہی نہیں بلکہ صاحبِ کردار بناتے ہیں۔ دنیا سے بے رغبتی، حالات کی تلخیوں پر شکوہ کے بجائے صبر اور مال و منال کے مقابلے علم و وقار کو ترجیح دینا، وہ فکری و اخلاقی رویہ تھا جو ان کی پوری زندگی پر محیط رہا اور جس نے ان کے کردار کو معنویت عطا کی۔

والد کی حیات ہی میں جب چچازاد بھائیوں کے ساتھ اختلافات شدت اختیار کرنے لگے اور ایک ناگہانی واقعے نے حالات کی نزاکت کو اور نمایاں کر دیا تو خاندان کے سنجیدہ اور صاحبِ بصیرت افراد نے معاملے کو دور اندیشی کے ساتھ دیکھا۔ مولانا کے والد محمد شمس الدین نے حالات کے پیشِ نظر انھیں نہایت اخلاص کے ساتھ یہ مشورہ دیا کہ ترکے میں ملنے والے آبائی مکان کو فروخت کر دینا ہی بہتر ہے، کیوں کہ ایسے ماحول میں کبھی بھی کسی بڑے سانحے کا اندیشہ لاحق ہو سکتا ہے۔ ان کے بڑے ابّا محمد نظام الدین مرحوم، جن سے مولانا کو خاص قلبی وابستگی تھی اور جو انھیں جی جان سے مانتے تھے، اس رائے کی تائید کرتے ہوئے اسے نہایت صائب قرار دیا۔ بزرگوں کی اس متفقہ رائے میں وقتی مصلحت ہی نہیں بلکہ مستقبل کی سلامتی اور ذہنی سکون بھی شامل تھا، جسے مولانا نے پوری سنجیدگی اور فراست کے ساتھ قبول کیا۔

چنانچہ مولانا نے بغیر کسی تردد کے وہ آبائی مکان فروخت کر دیا اور پورہ معروف کے محلہ بانسہ میں، بازار سے متصل ایک مکان خرید لیا، جو نہ صرف رہائش کے اعتبار سے موزوں تھا بلکہ معاشرتی و سماجی سہولتوں کے قریب بھی واقع تھا۔ اس کے علاوہ ان کے نانا صادق علی کربلائی ابن حاجی غلام حسین کی طرف سے بھی انھیں ایک مکان بطور ترکہ ملا، جو بعد ازاں مولانا کی پوری زندگی کا مرکز و محور بن گیا۔ اسی مکان میں انھوں

نے پوری زندگی گزار دی، اور آج بھی ان کی اولاد اسی گھر میں سکونت پذیر ہے۔

مکتب کی دہلیز اور شعور کی پہلی کرن: گاؤں کے ایک معروف اور قدیم دینی ادارے مدرسہ اشاعت العلوم (محلہ پارہ) میں مولانا ارشاد نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کی۔ یہ مدرسہ نہ صرف علمی وقار کے اعتبار سے ممتاز تھا بلکہ یہاں دینی و اخلاقی تربیت کا بھی خاص اہتمام تھا۔ اس علمی و روحانی فضا نے مولانا کی شخصیت کی ابتدائی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ بچپن سے ہی ان کے اندر علم کے حصول کا شوق نمایاں تھا، جسے مدرسے کے تعلیمی نظام اور اساتذہ کی رہنمائی نے مزید جلا بخشی۔ اس دور میں انھوں نے بنیادی دینی علوم کے ساتھ عربی و فارسی زبان کی بھی تعلیم حاصل کی، جو بعد کے علمی سفر میں ان کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوئی۔

مولانا کی تعلیم و تربیت میں ان کے والدِ محترم کا کردار نہایت اہم اور فیصلہ کن رہا۔ چوں کہ والد خود سولہ پارے کے حافظِ قرآن تھے، اس لیے انھیں علم دین سے فطری وابستگی اور تعلیمی شعور حاصل تھا۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کو رسمی فریضہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ایک مقدس ذمہ داری تصور کرتے تھے۔ مولانا ارشاد حسین چوں کہ تین بھائیوں (سجاد حسین مرحوم، مولانا ارشاد حسین مرحوم اور مظہر مصطفیٰ مرحوم) اور دو بہنوں (فاطمہ مرحومہ اور شہر بانو زوجہ محمد اعجاز کربلائی مرحوم) پر مشتمل ایک دینی گھرانے میں پرورش پا رہے تھے، اس لیے والد نے خصوصیت کے ساتھ بیٹوں کی علمی و اخلاقی تربیت پر بھرپور توجہ دی۔ زوجہ کی وفات کے بعد والد نے دوسری شادی کی جن سے دو اولاد سیدہ خاتون زوجہ اکبر علی (گھوسی) اور انصار حسین پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول دینی اقدار، مطالعے اور نظم و ضبط سے آراستہ تھا، جس نے مولانا کی شخصیت میں سنجیدگی، وقار اور علم دوستی کو راسخ کیا۔

مدرسہ اشاعت العلوم میں مولانا کو ایسے قابل اور مخلص اساتذہ میسر آئے جنھوں نے ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو صحیح سمت عطا کی۔ ان اساتذہ میں بالخصوص منشی زین العابدین کی علمی و تربیتی خدمات قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے نہایت شفقت اور توجہ کے ساتھ مولانا کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نبھائی۔ انھوں نے نہ صرف نصابی علوم کی تفہیم پر زور دیا بلکہ ان کے اندر علمی ذوق اور اخلاقی پختگی پیدا کرنے کی بھی سعی کی۔

وطن عزیز کے ممتاز دینی و تعلیمی ادارے اشاعت العلوم میں انھوں نے درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی۔ اس مرحلے میں ان کی فطری ذہانت، مطالعے کا شوق اور دینی علوم سے والہانہ لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اشاعت العلوم کے اساتذہ نے نہایت توجہ اور محنت سے ان کی علمی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور ان کے اندر ایسا علمی

ذوق پیدا کیا جو آگے چل کر پوری علمی زندگی کا محرک بن گیا۔

ثانوی تعلیم سے آگہی کی طرف پہلا قدم: ۱۹۶۲ء میں مدرسہ باب العلم، مبارک پور کے درجہ ششم میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں یہ ادارہ مشرقی اتر پردیش کے علمی مراکز میں اہم مقام رکھتا تھا اور اپنے باوقار تعلیمی معیار، مضبوط تدریسی نظام اور جید اساتذۂ فن کی وجہ سے علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کا حامل تھا۔ یہاں کا علمی ماحول نہایت سنجیدہ اور منظم تھا، جہاں طلبہ کو صرف نصابی تعلیم ہی نہیں، بلکہ علمی و فکری پختگی اور اخلاقی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ یہی وہ فضا تھی جس نے ان کے علمی ذوق کو مزید جلا بخشی اور ان کی شخصیت کی علمی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

مدرسہ باب العلم میں ان کو جن ممتاز اساتذۂ کرام سے کسبِ فیض کا موقع ملا، ان میں مولانا عبدالحمید شاہ ناظرؔ مبارک پوری، مولانا فیاض حسین واعظ اور حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا علی ارشاد نجفی مبارک پوری کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات اپنے اپنے فن میں مہارت، تدریسی بصیرت اور بلند اخلاقی اوصاف کے باعث علمی حلقوں میں نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے شفقت، محبت اور علمی سخت گیری کے امتزاج کے ساتھ تعلیم و تربیت فرمائی۔ ان اساتذہ کی رہنمائی اور تربیت نے مولانا کی شخصیت کو علمی اعتبار سے مستحکم کیا۔

مدرسہ بابُ العلم سے انھوں نے ۱۹۶۵ء میں عربی و فارسی بورڈ، الہ آباد (اب اتر پردیش مدرسہ تعلیمی بورڈ، لکھنؤ) کے تحت مولوی کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ اس امتحان کا مرکز الہ آباد مقرر تھا، چنانچہ وہ اس مقصد کے لیے شاعرِ اہلِ بیت جناب ایوبؔ مبارک پوری کی معیت اور ان کی نگرانی میں الہ آباد تشریف لے گئے تھے۔

مولانا کی ذہانت ابتدا ہی سے غیر معمولی تھی اور یہ بات ان کے اساتذہ اور ہم جماعتوں پر بہت جلد واضح ہو گئی۔ وہ سبق کو نہ صرف جلدی سمجھ لیتے تھے بلکہ اس کی باریکیوں تک پہنچنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ درس کے دوران ان کی یکسوئی، سوال کرنے کا سلیقہ اور معقول اندازِ استفسار اس امر کا ثبوت تھا کہ ان کا ذہن حافظے پر نہیں، بلکہ فہم و تدبر پر زیادہ انحصار کرتا تھا۔ مشکل سے مشکل مضمون ہو یا عربی و فارسی کے دقیق قواعد، وہ انھیں غیر معمولی سرعت کے ساتھ سمجھ لیتے اور پھر انھیں اپنی زبان میں سادہ مگر بامعنی انداز میں بیان کر دیتے تھے۔

وہ خود کو نصاب تک محدود نہیں رکھتے تھے، بلکہ زندگی اور کردار سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ مطالعہ کے دوران متن کے پس منظر، مصنف کے منشا اور اسلوب کی نزاکتوں پر غور کرتے، جس سے ان کے اندر تنقیدی

شعور پیدا ہوا۔ نت نئے خیالات کو کھلے دل سے قبول کرتے اور قدیم علمی روایت سے رشتہ بھی مضبوطی سے قائم رکھتے تھے، جس سے ان کی قوت فہم و ادراک میں توازن اور پختگی پیدا ہوئی۔ ان کی یہی ذہانت اور فکری بلوغت آگے چل کر علمی شناخت کا بنیادی حوالہ بنی اور انھیں ایک سنجیدہ، صاحبِ نظر اور نکتہ رس عالم کی صورت میں متعارف کرانے میں معاون ثابت ہوئی۔

تخصص کی سمت رواں قدم اور تخیل کی بے کراں وسعت: ۱۹۶۶ء کے اوائل میں مولانا نے اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے مدرسہ مبارکہ مشارع الشرائع المعروف بہ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ کا رخ کیا اور یہاں درجۂ 'عالم الف' میں داخلہ حاصل کیا۔ اس دور میں جامعہ ناظمیہ برصغیر کے ممتاز دینی و علمی مراکز میں شمار ہوتا تھا جہاں فقہ و اصول، فلسفہ و منطق اور ادبی علوم کی تدریس نہایت اعلیٰ معیار پر ہوتی تھی۔ مولانا نے اسی علمی ماحول میں اپنی استعداد کو پروان چڑھایا اور مسلسل محنت، شغف اور اساتذہ کی رہنمائی کے زیرِ اثر تعلیمی منازل طے کرتے ہوئے ۱۹۷۲ء میں ممتاز الافاضل کی آخری سند حاصل کی۔

جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں مولانا نے اپنے تعلیمی سفر کو امتیازی شان کے ساتھ جاری رکھا اور نصابی تعلیم کے ساتھ متعدد تخصصی امتحانات میں بھی کامیابیاں حاصل کیں۔ چنانچہ انھوں نے عربی و فارسی بورڈ الہ آباد سے عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضل معقولات اور فاضل طب جیسے امتحانات میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا، جو ان کی علمی ہمہ گیری اور وسیع المطالعہ طبیعت کا واضح ثبوت ہے۔

اس علمی سفر میں جن اساتذۂ کرام کی صحبت اور رہنمائی مولانا کو میسر آئی، وہ اپنے زمانے کے جلیل القدر علما اور اساتذۂ فن میں شمار ہوتے تھے۔ ان میں مفتی اعظم آیت اللہ سید احمد علی، مولانا سید مرتضیٰ نقوی، ماہرِ اصولِ فقہ مولانا محمد حسین نجفی، مولانا روشن علی، مولانا محمد شاکر، مولانا محمد ایوب، فیلسوف عصر مولانا حکیم محمد اطہر، مولانا محمد ہاشم اور ادیبِ زمانہ مولانا ابن حیدر کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف اپنے علمی مرتبے کے اعتبار سے ممتاز تھے بلکہ طلبہ کی تربیت میں بھی نہایت اخلاص اور شفقت سے کام لیتے تھے۔ انہی بزرگ اساتذہ کی علمی رہنمائی اور محبت آمیز تربیت نے مولانا ارشاد کی علمی شخصیت کو جِلا بخشی، یہاں تک کہ ان اساتذہ کی نظروں میں بھی وہ ایک باصلاحیت طالب علم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

ان جلیل القدر اساتذہ کے زیرِ سایہ مولانا نے فقہ، اصولِ فقہ، صرف و نحو، علمِ کلام، حدیث، تفسیر، عروض و بلاغت، عربی و فارسی ادب، علمِ ہیئت (علم الافلاک)، منطق اور فلسفہ جیسے اہم علوم میں دسترس حاصل کی۔ ان علوم کے مطالعے کے دوران انھوں نے متعدد بنیادی اور مستند کتب کو نہایت انہماک کے ساتھ پڑھا اور ان پر قابلِ قدر عبور حاصل کیا۔ بالخصوص منطق، فلسفہ اور اصول سے انھیں خصوصی شغف تھا،

چنانچہ ان علوم کی اصطلاحات، مباحث اور دقیق مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے 'میر زاہد ملّا جلال'، 'سلم العلوم'، 'ملّا صدرا'، 'قاضی مبارک'، 'ہدایت الحکمت'، 'شراح ہدایت الحکمت'، 'معالم الاصول'، 'قوانین الاصول'، 'رسائل' اور 'مکاسب' جیسی اہم درسی کتابوں کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی، جس سے ان کی علمی بصیرت اور فکری پختگی مزید مستحکم ہوئی۔

علمی مصروفیات کے ساتھ مولانا کو شعر و ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ فرصت کے لمحات میں وہ شعر و سخن کی طرف مائل ہوتے اور موقع بہ موقع اشعار بھی کہتے تھے۔ ان کی ادبی بصیرت اور زبان و بیان پر قدرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مقامی شعرا اکثر ان سے اپنی شاعری پر اصلاح لینے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس مرحلے پر ان کی علمی دلچسپی نصابی حدود سے آگے بڑھ کر ادب، تاریخ اور فکری مباحث تک پھیل گئی۔ وہ فرصت کے لمحات میں غیر نصابی کتب کا مطالعہ کرتے اور اہلِ علم کی تحریروں سے استفادہ کرتے، جس سے ان کا ادبی ذوق نکھرنے لگا اور فکری وسعت میں اضافہ ہوا۔ زبان و بیان کی لطافت، اسلوب کی نزاکت اور خیال کی وسعت ان کے مطالعے کے مستقل عناصر بن گئے۔ اس بیدار ہوتے ہوئے ادبی و فکری شعور نے ان کی شخصیت میں توازن، سنجیدگی اور وقار پیدا کیا اور یہی ذوقِ علم آگے چل کر علمی سفر کی مضبوط بنیاد ثابت ہوا۔

جامعہ کی تعلیم اور فکری بالیدگی کے مرحلے میں ان کی علمی زندگی ایک نئے موڑ میں داخل ہوئی۔ جامعہ کا ماحول ایک وسیع تر علمی دنیا سے آشنائی کا ذریعہ بنا، جہاں مختلف علوم، افکار اور زاویۂ نظر سے واسطہ پڑا۔ اساتذہ کی علمی گہرائی، درسی مباحث کی سنجیدگی اور ہم عصروں کے ساتھ علمی گفتگو نے ان کے ذہن کو مزید روشنی بخشی۔ وہ سوال پیدا کرنے، دلائل پر غور و خوض کرنے اور مختلف آرا کا تقابلی جائزہ لینے لگے۔ اس طرح ان کے اندر تحقیق کا باقاعدہ ذوق پیدا ہوا اور علم کے ساتھ ایک ذمہ دارانہ اور سنجیدہ تعلق قائم ہوا۔

وہ کلاسیکی علمی روایت سے گہرا رشتہ رکھتے ہوئے جدید فکری مباحث سے بھی باخبر رہتے تھے، جس سے ان کی فہم میں اعتدال و توازن پیدا ہوا۔ فلسفہ، تاریخ، ادب و ثقافت پر سنجیدہ دلچسپی نے ان کی فکر کو گہرائی و گیرائی عطا کی اور انھیں سطحیت سے بلند کر دیا۔ یہی فکری پختگی آگے چل کر ان کے علمی اور تدریسی سفر میں رہنما اصول بنی اور انھیں ایک بالغ نظر، صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ فہم و بصیرت شخصیت کے طور پر روشناس کرانے میں معاون ثابت ہوئی۔

جیسا کہ کہا گیا کہ انھوں نے عربی و فارسی کے ساتھ منطق و فلسفہ میں خصوصی مہارت حاصل کی تھی۔ یہ وہ علوم تھے جن کے ذریعہ ان کے ذہن کو ترتیب، استدلال اور تجزیے کی استعداد بہم پہنچی۔ منطق و فلسفہ

میں اس درجۂ کمال کے بعد ان کی نگاہ میں وسعت، گہرائی اور استدلال میں پختگی پیدا ہوگئی۔ وہ مسائل کو روایتی انداز کے بجائے فلسفیانہ اور عالمانہ زاویے سے دیکھنے کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علمی حلقوں میں ایک سنجیدہ، صاحبِ فکر اور فلسفیانہ مزاج رکھنے والی شخصیت کے طور پر اپنی شناخت قائم کر لی۔ وہ کلاسیکی علمی روایت کے نہایت قدر شناس تھے اور اس کے سرمایے کو ماضی کی یادگار نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی رہنمائی کا معتبر سرچشمہ سمجھتے تھے۔ قدیم متون، اسلاف کی تصنیفات اور روایتی علوم میں گہری دسترس حاصل تھی، جس کی بنیاد پر وہ علمی مسائل کو مضبوط حوالوں اور مستند دلائل کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کی نظر میں روایت، تقلید کا نام نہیں تھی بلکہ ایک زندہ اور متحرک علمی تسلسل تھی، جس سے وابستہ رہ کر دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم میں بھی استحکام پیدا کیا جا سکتا ہے۔

وہ بدلتے ہوئے حالات، نئے فکری سوالات اور عصری تقاضوں سے آنکھیں بند نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا سامنا جرأت، بصیرت اور علمی دیانت کے ساتھ کرتے تھے۔ منطق و فلسفہ میں مہارت نے انھیں یہ صلاحیت عطا کی کہ وہ مسائل کے ظاہری پہلوؤں سے آگے بڑھ کر ان کی علت، بنیاد اور نتائج پر غور کریں۔ اسی رویے کی بدولت وہ قدیم علمی ذخیرے کو نئے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے پر قادر ہوئے، جس سے ان کی گفتگو میں استدلالی انداز پیدا ہوتا گیا۔

جدید علوم سے شناسائی کا مرحلہ: جامعہ ناظمیہ کی طالب علمی کے دوران ہی انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یونیورسٹی میں داخلہ ان کی زندگی کا ایک اہم اور فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوا۔ یہاں سے انھوں نے فاضل ادب (۱۹۷۰ء)، دبیر ماہر (۱۹۷۱ء) اور دبیر کامل (۱۹۷۲ء) کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ یہ وہ دور تھا جب وہ روایتی دینی تعلیم کے مضبوط پس منظر کے ساتھ ایک ایسے علمی مرکز میں قدم رکھ رہے تھے جہاں جدید علوم، عصری نظریات اور نئے فکری مباحث کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یونیورسٹی کا آزادانہ اور متنوع علمی ماحول ان کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا، جس نے ان کے ذہن کو نئے نئے سوالات، مختلف زاویۂ نگاہ اور فکری وسعت سے روشناس کرایا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں کلاسیکی اور جدید علوم کا جو حسین امتزاج انھیں میسر آیا، اس نے ان کے علمی افق کو غیر معمولی وسعت عطا کی۔ ایک طرف وہ اپنی مضبوط روایت پسند علمی بنیاد کے ساتھ عربی، فارسی اور دینی علوم کے سرمایے سے وابستہ رہے، تو دوسری جانب انگریزی، تنقید اور تاریخ ادب جیسے مضامین سے بھی واقفیت حاصل کی۔ اس دوطرفہ علمی وابستگی نے ان کے اندر تقابلی شعور پیدا کیا، جس کے ذریعے وہ قدیم و جدید علوم و فنون کے درمیان ربط و تعلق کو بہتر طور پر سمجھنے لگے اور علمی مسائل کو یک رُخی انداز میں دیکھنے کے

بجائے ہمہ جہتی نظر سے پرکھنے لگے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایامِ طالب علمی میں ان کا مطالعہ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوا۔ اب ان کی دلچسپی صرف مذہبی یا کلاسیکی نصوص تک محدود نہ رہی بلکہ جدید فکری تحریروں، مغربی فلسفے، جدید ادبی نظریات اور تاریخ ادب پر بھی مرکوز ہوگئی۔ وہ مختلف نظریات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے اور انھیں اپنی روایتی علمی تربیت کی کسوٹی پر پرکھتے۔ اس عمل نے ان کے اندر ایسا فکری توازن پیدا کیا جس میں نہ اندھی تقلید تھی اور نہ غیر ضروری انکار، بلکہ دلیل، تحقیق اور اعتدال بنیادی اصول بن گئے۔

اس طرح لکھنؤ یونیورسٹی میں گزارے گئے یہ ایام ان کی علمی زندگی میں جدید علوم سے شناسائی کا بہترین مرحلہ ثابت ہوئے۔ یہاں حاصل ہونے والی فکری وسعت اور جدید علمی شعور نے ان کی شخصیت کو ہمہ جہت بنا دیا اور انھیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو سمجھنے کے قابل بنایا۔ یہی تجربہ آگے چل کر ان کی تحریروں، تدریسی اسلوب اور فکری موقف میں نمایاں ہوا، جہاں روایت کی مضبوط بنیاد پر جدید فکر کی روشنی جھلکتی ہے۔

ان کی علمی وفکری تشکیل میں اساتذہ کی رہنمائی کو بنیادی حیثیت حاصل رہی۔ انھوں نے ہمیشہ اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ علم کتابوں سے ہی نہیں بلکہ اہلِ علم کی صحبت اور رہنمائی سے بھی منتقل ہوتا ہے۔ اساتذہ کی شخصیت، ان کا تدریسی اسلوب، علمی دیانت اور فکری سنجیدگی نے ان کے ذہن پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ وہ اپنے اساتذہ کو صرف مدرس نہیں بلکہ مربی ورہنما تصور کرتے تھے۔

فیضانِ صحبتِ معاصرین و رفقا: مولانا کی علمی زندگی میں ان کے معاصرین اور رفقا کا کردار نہایت اہم اور قابلِ قدر رہا ہے۔ ان کے حلقۂ احباب میں ایسے جلیل القدر اہلِ علم شامل تھے جنھوں نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ مولانا کرار حسین مرحوم، مولانا ناظم علی خیرآبادی، مولانا محمد مجتبیٰ حسین مرحوم، مولانا شاہ سلمان مرحوم اور مولانا مختار حسین مرحوم کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف ممتاز علما اور دانشور تھے اور ہیں بلکہ علمی بصیرت اور تحقیقی ذوق وشوق کے اعتبار سے بھی منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی علمی مجالس اور فکری نشستیں علم وادب کا گہوارہ ہوتی تھیں جہاں مختلف علمی موضوعات، دینی مسائل اور ادبی مباحث پر نہایت سنجیدہ گفتگو ہوا کرتی تھی۔ مولانا کو ان اہلِ علم کی رفاقت میسر آئی تو انھوں نے اس کو اپنے لیے قیمتی موقع سمجھا اور ان کی صحبتوں سے بھرپور استفادہ کیا۔

بعد کے زمانے میں بھی مولانا کی وابستگی ایسے اہلِ علم ودانش سے قائم رہی جو علم وادب کی دنیا میں

قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان میں مولانا زین العابدین مرحوم (کوپاگنج)، مولانا سید ذوالفقار حیدر (شیولی، اعظم گڑھ)، مولانا صادق حسین (سمندپور)، مولانا ظہور المصطفیٰ (کوپاگنج)، مولانا دلبر حسنین معروفی، مولانا محمد مہدی حسینی (گھوسی) اور مولانا محمد نقی معروفی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کی تحقیقی بصیرت اور سنجیدہ مزاجی اہلِ علم کے درمیان مسلّم تھی۔ مولانا کو ان جیسے اہلِ فضل و کمال کی قربت حاصل رہی جس کا اثر ان کی علمی شخصیت اور فکری رجحانات میں صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان حضرات کے ساتھ نشست و برخاست نے مولانا کے مطالعے کے دائرے کو وسیع کیا، اور ان کے اندر علمی مباحث کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے اور پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی شخصیت کی تشکیل میں جہاں ان کی ذاتی محنت کا حصہ ہے، وہیں ان رفقائے کار کی صحبت بھی ایک اہم عنصر کے طور پر کارفرما رہی، جس نے ان کے فکری افق کو وسعت عطا کی اور انھیں علمی دنیا میں معتبر مقام تک پہنچنے میں تعاون کیا۔

یہاں ان کے اہم مشاورین کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جن میں الحاج محمد ذکی مرحوم [مبارک پور]، الحاج محبوب حسین صاحب [مبارک پور]، جناب مزمل حسین صاحب [مبارک پور]، مولوی اقبال مہدی عزمی معروفی مرحوم، مولانا ارشاد خلیل مرحوم اور مولانا انصار احمد معروفی کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات سے مولانا کے دیرینہ مراسم تھے، جو خلوص، اعتماد اور باہمی خیر خواہی پر مبنی تھے۔ مولانا مختلف سماجی امور کے ساتھ ذاتی معاملات میں بھی گاہے ماہے ان سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، اور یہ حضرات نہایت اخلاص کے ساتھ اپنی آرا پیش کرتے تھے۔ وقت ضرورت نہ صرف معاونت کرتے بلکہ عملی طور پر بھی ان کے شانہ بشانہ کھڑے رہتے تھے۔

ان کے مزاج کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے اساتذہ اور رفقا کے اثرات کو کبھی چھپاتے نہیں تھے، بلکہ ہمیشہ کھلے دل سے تسلیم کرتے تھے۔ وہ علمی ارتقا کو ایک اجتماعی عمل سمجھتے تھے، جس میں ہر استاد اور ہر رفیق کا حصہ ہوتا ہے۔ اسی احساس کے تحت وہ اپنی تحریروں اور گفتگو میں اپنے محسنین کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کرتے اور اس روایت کو علمی اخلاقیات کا لازمی جزو سمجھتے تھے۔

علمی مزاج کی تعمیر میں معاون عناصر: ان کی علمی شخصیت کی تشکیل میں اساتذہ کی رہنمائی کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ انھوں نے اپنے اساتذہ کے علمی وقار، تدریسی سنجیدگی اور فہم و بصیرت سے گہرا اثر قبول کیا اور ان کی ہدایات کو فقط نصیحت کی حد تک ہی نہیں، بلکہ زندگی کے رہنما اصول قرار دیئے۔ اسی تربیت نے ان کے اندر علمی نظم و ضبط، سنجیدہ مطالعے اور ذمہ دارانہ فکر کی بنیاد رکھی۔

اساتذہ کی صحبت نے ان کے اندر تنقیدی شعور اور تحقیق کا سلیقہ بھی پیدا کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر مسئلے کو جذبات یا روایت کے جمود کے بجائے دلیل، حوالہ اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ اساتذہ کی تنقیدی نگاہ اور علمی احتساب نے انھیں سطحی اور غیر مستند آرا سے محفوظ رکھا۔ ان کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنی علمی ترقی کو کبھی ذاتی کمال قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ کھلے دل سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے تھے کہ ان کے فکری ارتقا میں اساتذہ اور رفقا دونوں کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے محسنین کے اثرات کو قدر و احترام کے ساتھ تسلیم کرتے اور اس اعتراف کو علمی اخلاقیات کا لازمی جز و سمجھتے تھے۔

مولانا کی زندگی میں علم کے ساتھ عمل کی وابستگی ہر مرحلے پر نمایاں نظر آتی ہے۔ عبادات میں پابندی، معاملات میں دیانت اور معاشرت میں حسنِ اخلاق ان کی شخصیت کے روشن پہلو تھے۔ وہ کم سخن تھے لیکن بڑی نپی تلی گفتگو کرتے اور حق بات کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں محسوس کرتے تھے۔ ساتھ ہی علم کو برتری یا تفاخر کا ذریعہ بنانے کے قائل نہیں تھے بلکہ اسے خدمتِ خلق اور اصلاحِ معاشرہ کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کی گفتگو میں نرمی، رویے میں سادگی اور طرزِ زندگی میں قناعت اس بات کی گواہ تھی کہ علم نے ان کے کردار کو سنوارا تھا۔

اس طرح مولانا ارشاد حسین کی حیات ایک روشن استعارہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایسا استعارہ جس میں علم، عمل اور اخلاص ایک دوسرے سے باہم پیوست نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی اہلِ علم کے لیے ایک عملی نمونہ ہے کہ علم اسی وقت بامعنی بنتا ہے جب وہ کردار میں ڈھل جائے۔ یہی پیغام ان کی زندگی کا حاصل ہے اور یہی وہ روشن روایت ہے جسے انھوں نے آنے والی نسلوں کے لیے بطور یادگار چھوڑا۔

عملی زندگی کا آغاز: تحصیل علم کے دوران ہی معاشی ضروریات کے پیشِ نظر محلہ نیا بازار بھاگل پور (بہار) میں امامت کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے لیکن تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۷۲ء میں ہی مولانا نے عملی زندگی کا باضابطہ آغاز کیا اور تدریسی و مذہبی خدمات کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ اسی سال انھوں نے موضع دہیاور، تحصیل ٹانڈہ، ضلع امبیڈکر نگر کے مکتب امامیہ تنظیم المکاتب 'صابرہ نقی' میں تدریس کا فریضہ سنبھالا۔ یہ ان کی تدریسی زندگی کا ابتدائی مرحلہ تھا، مگر اسی دور میں ان کی علمی سنجیدگی، محنت اور تدریسی مہارت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

مکتب صابرہ نقی میں تقریباً آٹھ برس تک ان کا قیام رہا۔ اس مدت میں نہایت انہماک اور دلجمعی کے ساتھ طلبہ کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہے۔ اس دوران علاقے کے عوام میں بھی ان کی شخصیت کے تئیں بے پناہ احترام اور عقیدت پیدا ہو گئی۔ ان کی علمی عظمت کے ساتھ اخلاقی اوصاف اور سادہ طرزِ زندگی

نے لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے خاص مقام پیدا کر دیا۔ اہلِ علاقہ انھیں نہ صرف ایک معلم بلکہ ایک روحانی رہنما کے طور پر دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی خوشیوں اور غموں میں انھیں شریک کرنے کو سعادت سمجھتے اور ان کی موجودگی کو باعث برکت تصور کرتے تھے۔

۱۶ رجون ۱۹۸۰ء کو مولانا کا تقرر مدرسہ باب العلم مبارک پور میں بحیثیت وائس پرنسپل ہوا۔ یہ ادارہ پہلے ہی علمی اعتبار سے نمایاں مقام رکھتا تھا، لہٰذا یہاں ان کی تقرری ان کی علمی صلاحیتوں کے اعتراف کی علامت تھی۔ مدرسہ باب العلم میں انھوں نے نہایت خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور طلبہ کی تربیت میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں۔

ان کی تدریسی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مشکل علمی مباحث کو سادہ اور قابلِ فہم انداز میں پیش کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ فقہ، منطق، فلسفہ اور ادبیات جیسے دقیق موضوعات کی توضیح میں ان کی مہارت طلبہ کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ درس کے دوران وہ مثالوں، استدلال اور تاریخی حوالوں سے بات کو اس طرح واضح کرتے کہ طلبہ کے ذہنوں میں علمی تجسس اور تحقیق کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔

چند برس بعد مدرسہ باب العلم کے حالات کچھ ناموافق ہوئے تو انھوں نے اس کو خیر باد کہا اور جامعہ ایمانیہ ناصریہ جون پور چلے گئے۔ انھیں یہاں تدریسی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ اس ادارے میں انھیں درجاتِ عالیہ کی تدریس کی ذمہ داری سونپی گئی، جو ان کے علمی مقام اور تدریسی مہارت کا واضح اعتراف تھا۔ یہاں انھوں نے اعلیٰ سطح کے طلبہ کو فقہ، اصول اور معقولات کے دقیق مباحث پڑھائے اور اپنے گہرے مطالعے اور وسیع علمی پس منظر سے انھیں مستفید کیا۔

جامعہ ایمانیہ ناصریہ جون پور میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے مولانا نہ صرف طلبہ کے درمیان بلکہ اساتذہ کے حلقے میں بھی جلد ہی ایک محترم شخصیت کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ ان کا اندازِ تدریس نہایت واضح اور مدلل تھا، جس کی وجہ سے طلبہ ان کے دروس سے خاص شغف رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ادارے کے ذمہ داران، بالخصوص سکریٹری، بھی ان کی علمی سنجیدگی، نظم و ضبط اور تدریسی محنت کے معترف ہو گئے۔ چنانچہ ادارے کے تعلیمی ماحول میں ان کی موجودگی ایک مثبت اور متحرک عنصر کے طور پر محسوس کی جانے لگی۔

تاہم علمی دیانت اور اصول پسندی کے ساتھ زندگی گزارنے والے افراد کو اکثر مخالفت اور حسد کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مولانا کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور ان کی صاف گوئی وہاں کے بعض شر پسندوں خصوصاً پرنسپل کو ناگوار گزرنے لگی۔ ادارے کے اندر ایسے افراد بھی موجود تھے جو مختلف وجوہ سے ان کے علمی وقار اور اثر و رسوخ سے ناخوش تھے۔ اسی دوران ادارے میں ایک نہایت افسوسناک اور شرمناک

حادثہ بھی رونما ہوا جس میں اس وقت کے پرنسپل ملوث تھے۔ جب اس معاملے کے بارے میں تحقیق و وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو مولانا سے بھی اس سلسلے میں دریافت کیا گیا، کیوں کہ وہ اپنی راست گوئی اور دیانت داری کے سبب اہلِ ادارہ کے نزدیک قابلِ اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ مولانا نے دیانت اور دینی ذمہ داری کے پیشِ نظر ادارے کے سکریٹری کے سامنے حقیقت بیان کر دی اور اس بات پر زور دیا کہ دینی و تعلیمی اداروں کی حرمت اور اخلاقی وقار کو ہر حال میں برقرار رکھا جانا چاہیے۔

مولانا کا یہ واضح اور اصولی موقف پرنسپل کو ناگوار گزرا۔ اس کے بعد حالات رفتہ رفتہ کشیدہ ہوتے چلے گئے اور مخالف عناصر نے ان کے خلاف مخاصمت کا رویہ اختیار کر لیا۔ ایک دن موقع پا کر پرنسپل کی ملی بھگت سے ان کے رشتہ داروں نے جو مقامی طور پر اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے، رات کے وقت مولانا کو جان سے مارنے کی کوشش بھی کی اور انھیں چاقو سے زخمی کر دیا۔ وہ ان کے قتل کا منصوبہ رکھتے تھے لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا، چنانچہ بفضل خدا بورڈنگ کے بہت سارے بچوں نے انھیں بچایا۔ اس ناخوش گوار صورتِ حال نے ادارے کے علمی ماحول کو متاثر کر دیا اور مولانا کی دل آزاری ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ایسے ماحول میں تدریسی خدمات جاری رکھنا مناسب نہیں رہا، اس لیے انھوں نے جامعہ ایمانیہ ناصریہ کے سکریٹری کے نام اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور اس ادارے سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس واقعے نے ان کے تدریسی سفر میں ایک اہم مگر تلخ موڑ پیدا کیا، تاہم انھوں نے علمی و تدریسی خدمات کا سلسلہ دیگر مقامات پر اسی عزم و حوصلہ کے ساتھ جاری رکھا۔ [مولانا نے سکریٹری کو جو استعفیٰ لکھا تھا اس میں پرنسپل کی شرمناک حرکت کی مکمل تفصیل موجود ہے۔ اس کی ایک کاپی میرے پاس آج بھی محفوظ ہے۔]

جامعہ ایمانیہ ناصریہ جون پور سے علیحدگی کے بعد مولانا ایک بار پھر مدرسہ باب العلم مبارک پور کی مجلس انتظامیہ کے اصرار پر باب العلم گئے، لیکن کچھ نامساعد حالات کے باعث جلد ہی اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کی علمی زندگی کا ایک نیا مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۶ء کو معروف عالم دین حجۃ الاسلام مولانا ناظم علی خیرآبادی نے خیرآباد (ضلع مئو) میں ایک دینی و تعلیمی ادارے کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے چند ممتاز علما سے رابطہ قائم کیا تاکہ اس ادارے کی علمی بنیاد مضبوط اور معیاری ہو۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مولانا کے نام بھی ایک مخلصانہ خط تحریر کیا جس میں خیرآباد میں ایک جامعہ کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے انھیں تدریسی خدمات انجام دینے کی دعوت دی۔ مولانا کی علمی صلاحیتوں اور تدریسی تجربے سے وہ بخوبی واقف تھے، اس لیے چاہتے تھے کہ اس ادارے کی علمی عمارت ایسے اہلِ علم کی نگرانی میں استوار ہو جو اخلاص، علمیت اور تدریسی مہارت کا حسین امتزاج رکھتے ہوں۔

مولانا نے اس دعوت کو نہایت سنجیدگی سے لیا اور اسے ایک ذاتی پیش کش کے بجائے دینی و علمی خدمت کا موقع سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے مولانا ناظم علی خیرآبادی کی اس درخواست کو قبول کرتے ہوئے خیرآباد کا رخ کیا اور وہاں قائم ہونے والے ادارے جامعہ حیدریہ، مدینۃ العلوم، خیرآباد (قیام: ۱۹۸۸ء) میں تدریس کا آغاز کیا۔ اس نئے تعلیمی ادارے کی ابتدائی تشکیل کے دور میں ان کی موجودگی نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔ ان کی شرکت سے ادارے کے تعلیمی ڈھانچے کو استحکام ملا اور طلبہ و اساتذہ دونوں کو ایک باوقار علمی رہنمائی میسر آئی۔

جامعہ حیدریہ میں قیام کے دوران مولانا نے نہایت خلوص اور انہماک کے ساتھ تدریسی فرائض انجام دیئے۔ اگرچہ یہاں ان کا قیام طویل نہ تھا، لیکن اس مختصر عرصے میں بھی انھوں نے طلبہ کی تعلیم و تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی کوششوں سے ادارے کے تعلیمی ماحول میں سنجیدگی اور اعلیٰ دینی تعلیم کا رجحان پیدا ہوا اور جامعہ کی علمی فضا مضبوط بنیادوں پر استوار ہونے لگی۔ اس طرح خیرآباد میں ان کی تدریسی خدمات اس نوخیز ادارے کے علمی استحکام میں اہم سنگ میل ثابت ہوئیں۔

یکم جون ۱۹۹۰ء کو مولانا کے خیرخواہ اور کرم فرما الحاج محبوب حسین صاحب اور کمیٹی کے اراکین کے اصرار پر دوبارہ مدرسہ باب العلم مبارک پور میں ان کی سرکاری مدرس کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی۔ یہ تقرری درحقیقت ان کی علمی وقعت، تدریسی مہارت اور طویل تجربے کا باضابطہ اعتراف تھی۔ اس مرحلے کے بعد ان کی زندگی کا ایک اہم دور شروع ہوا جس میں انھوں نے پوری یکسوئی کے ساتھ تعلیم و تدریس کے مقدس فریضے کو انجام دیا اور طلبہ کی تعلیم و تربیت کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

مدرسہ باب العلم میں ان کی یہ خدمات تقریباً دو دہائیوں تک جاری رہیں اور اس طویل عرصے میں انھوں نے بے شمار طلبہ کی علمی و اخلاقی تربیت کی۔ ان کی شخصیت میں علم و عمل کا جو حسین امتزاج تھا، اس نے طلبہ کے دلوں میں ان کے لیے گہری عقیدت اور احترام پیدا کر دیا۔ وہ تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ طلبہ کی اخلاقی تربیت اور رہنمائی پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے شاگرد مختلف دینی، تعلیمی اور سماجی میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بالآخر ۳۰ر جون ۲۰۱۲ء کو وہ پنشن کے ساتھ سبک دوش ہوئے۔ تاہم ان کی علمی خدمات اور تدریسی فیضان کا سلسلہ عمر کے آخری ایام تک جاری رہا۔

مولانا نے مدرسہ بابُ العلم میں حقیر کی بھی نہایت محبت، شفقت اور دل سوزی کے ساتھ تعلیم و تربیت فرمائی۔ حقیر کا داخلہ انھوں نے ۱۹۹۸ء میں مدرسہ بابُ العلم کے درجہ ششم میں کرایا اور درجہ مولوی تک کی تعلیم وہیں حاصل کرنے کا شرف ملا۔ اس طویل تعلیمی عرصے میں مولانا مرحوم نے بڑی محنت، توجہ اور

اخلاص کے ساتھ علمی بنیادیں استوار کیں۔ خصوصاً صرف ونحو، منطق وفلسفہ اور فقہ واصول جیسے دقیق اور مشکل مضامین میں انھوں نے بڑی جانفشانی سے محنت کرائی اور اس طرح پڑھایا کہ مسائل کی باریکیاں بھی ذہن نشین ہوگئیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد صرف نصاب تک محدود نہ رہیں بلکہ سوچنے سمجھنے، غور وفکر کرنے اور علم کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنانے کی صلاحیت بھی پیدا کریں۔

اعلیٰ تعلیم کے مرحلے پر بھی ان کی شفقت اور سرپرستی کا انداز یہی رہا۔ جب مزید تعلیم کے لیے جامعہ ناظمیہ میں داخلے کا وقت آیا تو وہ حقیر کو لے کر لکھنؤ گئے اور وہاں داخلہ کرایا، جو ان کی غیر معمولی دلچسپی کا روشن ثبوت ہے۔ مدرسہ بابُ العلم میں تدریس کے دوران وہ طلبہ کی ہر ممکن دادرسی کیا کرتے اور ان کی روزمرہ ضروریات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً جب عربی وفارسی بورڈ کے امتحانات قریب آتے تو وہ غیر معمولی محنت کرتے، طلبہ کو اضافی وقت دیتے، مشکل اسباق کی بار بار وضاحت کرتے اور اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کرتے کہ ہر طالب علم امتحان کے لیے پوری طرح تیار ہو۔ ان کی یہی شفقت، خلوص اور لگن تھی جس نے بے شمار طلبہ کی زندگیوں کو سنوارا اور انھیں علمی ودینی میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا۔

تدریس کے ساتھ مولانا دینی ومذہبی خدمات میں بھی سرگرم رہے۔ مسجد حجرہ، شاہ محمد پور، مبارک پور میں طویل عرصے تک نمازِ جماعت کی امامت فرماتے رہے۔ بعد میں یہ ذمہ داری حجۃ الاسلام مولانا محمد مہدی حسینی صاحب قبلہ گھوسوی نے سنبھالی، اور ۲۰۱۱ء سے مولانا کے ایک شاگردِ رشید مولانا کرار حسین اظہری اس خدمت کو تا حال بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

مولانا کی علمی وادبی سرگرمیوں کا ایک اہم پہلو 'ادارۂ تحقیقات اردو وفارسی' پورہ معروف کا قیام تھا جو ۲۰۱۶ء میں پورہ معروف، ضلع مئو میں قائم کیا گیا۔ اس ادارے کے ذریعے انھوں نے علمی وادبی تحقیقات کے فروغ کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی طرح ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی مجلہ 'فیضانِ ادب' کی سرپرستی بھی انھیں کے ذمے تھی، جس کے ذریعے علمی وادبی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ وہ صاحبِ ذوق تھے۔ شعروشاعری سے انھیں خاص شغف تھا اور وقتاً فوقتاً عمدہ اشعار کہتے تھے۔ ان کی شاعری میں سنجیدگی اور زبان کی شستگی نمایاں ہے۔

تبلیغ دین اور وعظ وارشاد کے میدان میں بھی وہ سرگرم رہتے تھے۔ محرم الحرام کے ایام میں عشرۂ مجالس کے لیے مومن پارہ، رائے پور تشریف لے جاتے اور وہاں اہلِ ایمان کو سیرتِ اہلِ بیت رسولؐ اور دینی تعلیمات سے روشناس کراتے۔ اسی طرح ماہِ رمضان المبارک میں بھی وہ اسی مقام پر تبلیغی خدمات انجام دیتے اور لوگوں کی دینی واخلاقی تربیت کا فریضہ ادا کرتے۔

انھوں نے برسوں تک پورہ معروف میں نمازِ جمعہ کی امامت بھی فرمائی اور ۲۰۰۸ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس دوران انھوں نے اپنے خطباتِ جمعہ کے ذریعے دینی شعور بیدار کرنے اور اخلاقی اصلاح کی کوشش کی۔ ان کے خطبات علمی استدلال، قرآنی حوالوں اور اخلاقی نصیحتوں کا حسین امتزاج ہوتے تھے، جن سے سامعین نہایت متاثر ہوتے اور ان کے دلوں میں دین سے وابستگی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

حیاتِ مستعار کا اختتام: مولانا ارشاد حسین دمہ کے مریض تھے اور اس مرض میں تقریباً تین دہائیوں سے مبتلا تھے۔ کئی مرتبہ ان کی طبیعت بہت خراب ہوئی لیکن ان کے شاگردوں اور مومنین کی دعاؤں کا اثر تھا کہ ہر بار وہ اسپتال سے صحت مند ہوکر آئے۔ لیکن ۱۰/اپریل ۲۰۲۵ء کو دمہ کا مرض مزید بڑھ گیا اور ایرا لکھنؤ میڈیکل کالج میں بھرتی کرایا گیا، جہاں انھوں نے ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو تقریباً بارہ بجے دن میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اسی دن ان کی میت لکھنؤ سے آبائی وطن پورہ معروف لائی گئی اور رات میں دس بجے ہزاروں عقیدت مندوں کی موجودگی میں مٹھیا پر تدفین عمل میں آئی۔ ان کی وفات نے علمی و دینی دنیا کو گہرے رنج والم میں مبتلا کر دیا۔ ان کی حیاتِ مستعار کا اختتام بظاہر فردِ واحد کی دنیا سے رخصتی تھی، مگر درحقیقت ایک عہد، ایک روایت اور ایک باوقار علمی دور کا اختتام ہوا۔

ایک معلّم کامل کی داستانِ اثر: مولانا ارشاد حسین بطور معلم ایک ایسی متوازن شخصیت کے حامل تھے جن کے یہاں تدریس نصاب کی تکمیل کا نام نہیں تھی بلکہ ایک مقدس امانت اور ذمہ داری تھی۔ ان کا اندازِ تدریس نہایت سنجیدہ اور دل نشیں تھا، جس میں سختی کے بجائے محبت اور جبر کے بجائے نرمی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ سبق پڑھاتے وقت طلبہ کی ذہنی سطح، استعداد اور نفسیات کو پیشِ نظر رکھتے اور مشکل نکات کو نہایت سادہ، مدلل اور عام فہم انداز میں واضح کرتے تھے۔

ان کی تدریس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ طلبہ کے ذہن کو معلومات سے بھرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کو بھی یکساں اہمیت دیتے تھے۔ وہ علم کو کردار سازی کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس لیے درس کے دوران اخلاقی پہلو، عملی مثالیں اور زندگی سے مربوط اسباق ضرور شامل کرتے۔ طلبہ کے اندر صداقت، دیانت، محنت اور انکساری جیسی صفات پیدا کرنا ان کے تعلیمی مقصد کا بنیادی حصہ تھا۔

ان کی شفقت الفاظ تک محدود نہ تھی بلکہ عمل میں بھی جھلکتی تھی۔ وہ طلبہ کے مسائل کو ذاتی توجہ سے سنتے، ان کی رہنمائی کرتے اور ضرورت پڑنے پر ہر ممکن مدد کے لیے تیار رہتے۔ کمزور طلبہ کے لیے خصوصی توجہ اور حوصلہ افزائی ان کا مستقل معمول تھا، تاکہ کوئی طالب علم احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو۔ اسی خلوص نے

انھیں ایک استاد سے بڑھ کر ایک مربی اور رہنما کا مقام عطا کیا۔ ان کی تعلیم و تربیت نے صرف شاگرد ہی نہیں بلکہ باکردار انسان اور ذمہ دار شہری تیار کیے۔ آج بھی ان کے شاگرد علم و عمل کے میدان میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ ان کے اخلاص، بصیرت اور معلمِ کامل ہونے کا زندہ ثبوت ہیں۔

مولانا ارشاد کا فکری جہان: مولانا ارشاد حسین کی شاعری ان کے فکری و روحانی وجود کی آئینہ دار ہے، جس میں اخلاق، عرفان اور دینی شعور ایک ہم آہنگ وحدت کی صورت میں جلوہ گر ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری جذبات کے اظہار یا لفظی صناعی کا نام نہیں تھی بلکہ اصلاحِ فکر اور تطہیرِ باطن کا ایک موثر وسیلہ تھی۔ اسی لیے ان کے اشعار میں مقصدیت نمایاں نظر آتی ہے اور ہر شعر قارئین کو غور و فکر اور خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے۔

اخلاقی اقدار مولانا کی شاعری کا مرکزی محور ہیں۔ صداقت، دیانت، صبر، انکساری اور خدمتِ خلق جیسے اوصاف ان کے اشعار میں بار بار جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو اس کی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کراتے ہیں اور نفس کی سرکشی، حرص و ہوس اور خودغرضی پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں۔ ان کے اشعار میں نصیحت کا رنگ ضرور ہے، مگر یہ نصیحت خطیبانہ نہیں بلکہ دردمندانہ اور دل نشیں انداز میں سامنے آتی ہے، جس کی وجہ سے قاری اسے بوجھ نہیں بلکہ رہنمائی محسوس کرتا ہے۔

ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں دینی شعور نہایت لطیف اور بامعنی انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ مذہب کو ظاہری اعمال تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کے باطنی پہلوؤں کو اجاگر کرتے تھے۔ توکل، رضا، صبر، شکر اور تقویٰ جیسے تصورات ان کے اشعار میں نہایت سادگی کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو خدا سے جوڑنے کے ساتھ انسان سے انسان کے رشتے کو بھی مضبوط بنانے کی تلقین کرتے ہیں، جس سے ان کی شاعری ایک جامع حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

باطنی سوز اور عرفانی کیفیت مولانا کی شاعری کی روحِ رواں ہے۔ ان کے اشعار میں دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی وہ تپش محسوس کی جا سکتی ہے جو سالک کے سفرِ باطن کا حاصل ہوتی ہے۔ یہ سوز جذباتی کیفیت کے بجائے مجاہدۂ نفس، ریاضت اور تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہے۔ اسی عرفانی رنگ نے ان کی شاعری کو سادگی کے باوجود تاثیر عطا کی ہے۔

مولانا ارشاد شعر کو اصلاحِ فکر اور تزکیۂ نفس کا موثر ذریعہ سمجھتے تھے، اسی لیے ان کی شاعری میں مقصدیت اور ذمہ داری کا احساس نمایاں ہے۔ وہ شعر کے ذریعے قارئین کو آئینہ دکھاتے ہیں تاکہ وہ اپنی کمزوریوں کو پہچانے اور اصلاح کی راہ پر گامزن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فکری جہان لفظوں کی دنیا ہی نہیں

بلکہ اخلاق، عرفان اور عمل کی ایک زندہ روایت بھی ہے، جو قاری کے دل و دماغ پر دیر پا اثر چھوڑتی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ابھی زیرِ ترتیب ہے۔ ان شاءاللہ بہت جلد 'ارمغانِ ارشاد' کے نام سے منظرِ عام پر آئے گا۔

علمی آثار: مولانا ارشاد حسین کے قلمی آثار ان کی علمی بصیرت اور فکری پختگی کا واضح آئینہ ہیں۔ ان کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ علم کو اظہارِ فضل کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے اصلاحِ فکر اور خدمتِ خلق کے لیے بروئے کار لاتے تھے۔ ان کے اسلوب میں علمی وقار کے ساتھ ایسی سادگی پائی جاتی ہے جو قارئین کو مرعوب کرنے کے بجائے ہم کلام بناتی ہے۔ مشکل علمی مباحث کو بھی وہ عام فہم انداز میں پیش کرتے، تاکہ علم خواص تک محدود نہ رہے بلکہ عوام کے لیے بھی رہنمائی کا ذریعہ بن سکے۔

مولانا نے تصنیف و تالیف اور تحقیق و تنقید نیز ترجمہ کے میدان میں قابلِ قدر سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی تصانیف کا دائرہ عقائد، عبادات، تفسیر، علومِ قرآن اور ادبیات تک پھیلا ہوا ہے، جس سے ان کی علمی وسعت اور متنوع ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں ان کی علمی و ادبی کاوشوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ 'فلسفہ توحید' ان کی اہم تصنیفات میں سے ہے۔ اس میں انھوں نے عقیدۂ توحید کو صرف ایک کلامی مسئلے کے طور پر نہیں برتا بلکہ انسانی فکر و حیات کے ایک ہمہ گیر نظام کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں توحید کے نظری و عملی دونوں پہلوؤں کو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ مصنف نے فلسفیانہ مباحث، قرآنی استدلال اور کلامی روایت کو اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ قاری کے سامنے توحید کا تصور ایک زندہ اور فکری حقیقت کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

۲۔ 'افادیتِ نماز' کے عنوان سے ان کی ایک اہم تصنیف عبادت کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کتاب میں نماز کو صرف ایک مذہبی فریضہ کے طور پر بیان نہیں کیا گیا بلکہ اسے انسانی شخصیت کی اخلاقی تعمیر و تطہیر اور سماجی نظم و ضبط کا موثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ مصنف نے قرآن و حدیث کے حوالوں اور عقلی استدلال کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ نماز انسان کے اندر نظم و ضبط، خضوع و خشوع، روحانی بالیدگی اور اجتماعی ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہے۔

۳۔ 'افادیت روزہ' اسی طرح افادیتِ روزہ کے موضوع پر ان کی کتاب بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس تصنیف میں روزے کی انفرادی اور اجتماعی حکمتوں کو نہایت بصیرت افروز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مولانا نے اس کے فقہی احکام کے ساتھ اس کے عرفانی اور روحانی اثرات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک روزہ محض بھوک اور پیاس کا نام نہیں بلکہ نفس کی تربیت، ارادے کی مضبوطی اور انسانی ہمدردی کے جذبے کو

بیدار کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

۴۔ 'تفسیر قرآن' قرآنی علوم کے میدان میں بھی ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ تفسیر قرآن (چند مختصر سورتوں کی فلسفیانہ تشریح) کے عنوان سے ان کی ایک تحریر میں قرآن مجید کی بعض چھوٹی سورتوں کو فکری اور فلسفیانہ زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے قرآنی آیات کے مضامین کو فکری، اخلاقی اور کائناتی حقائق کے تناظر میں بیان کیا ہے، جس سے قارئین کے سامنے قرآن فہمی کا ایک نیا زاویہ سامنے آتا ہے۔

۵۔ 'علوم القرآن': قرآنی علوم سے متعلق ان کی گراں قدر علمی خدمت 'علومُ القرآن' کے عنوان سے ہے۔ اس میں قرآن مجید سے متعلق مختلف علمی مباحث، جیسے نزولِ قرآن، جمع وتدوین، محکم ومتشابہ، اسبابِ نزول اور دیگر موضوعات پر تحقیقی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہ تصنیف فی الحال پروف ریڈنگ کے مراحل میں ہے۔ توقع ہے کہ شائع ہونے کے بعد اہلِ علم کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

۶۔ 'غرائب القرآن': انھوں نے غرائب القرآن کے عنوان سے ایک دلچسپ اور مفید کتاب بھی تصنیف کی ہے۔ اس میں قرآن مجید کی سو اہم آیات کو سوال وجواب کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طریقۂ بیان کی وجہ سے قارئین کے لیے مشکل قرآنی مفاہیم کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور قرآن کے مضامین سے براہِ راست تعلق پیدا ہوتا ہے۔ (یہ کتاب بھی زیرِ اشاعت ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی منظرِ عام پر آئے گی۔)

۶۔ جلاء الصدور ترجمہ معراج العقول (نامکمل): مولانا ارشاد 'معراج العقول' کا جو مشہور ومعروف دعا 'دعائے مشلول' کی شرح ہے، نہایت سادہ، بامحاورہ اور دل نشیں اردو ترجمہ کر رہے تھے، لیکن صحت نے ساتھ نہیں دیا جس کی وجہ سے یہ ترجمہ نامکمل رہ گیا۔

۷۔ ترجمہ کریما (۲۰۱۹ء): مولانا کا ترجمۂ کریما اپنی سادگی، سلاست اور عام فہم اسلوب کے باعث خاص امتیاز کا حامل ہے۔ انھوں نے اصل متن کے معانی ومفاہیم کو برقرار رکھتے ہوئے ایسی سہل اور رواں زبان اختیار کی ہے جو نہ صرف مبتدیوں کے لیے قابلِ فہم ہے بلکہ اہلِ ذوق کے لیے بھی لطف وتاثیر کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ترجمے میں لفظی پیچیدگی یا غیر ضروری ثقالت سے گریز کرتے ہوئے معنوی صحت اور روحِ کلام کو مقدم رکھا گیا ہے، جس کے نتیجے میں عبارت میں ایک فطری روانی اور دل نشینی پیدا ہوگئی ہے۔

۸۔ ترجمہ دوازدہ بند محتشم کاشانی (۲۰۱۹ء): مولانا کا ترجمۂ دوازدہ بند محتشم کاشانی عقیدت، تاثیر اور ادبی شائستگی کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے اس مرثیے کی اصل روح اور سوز وگداز کو نہایت سلیقے اور فنی بصیرت کے ساتھ اردو قالب میں منتقل کیا ہے۔ ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اصل فارسی

کلام کی تاثیر، آہنگ اور جذباتی شدت کو برقرار رکھتے ہوئے زبان کو سادہ، رواں اور دل نشیں رکھا گیا ہے، جس سے قارئین نہ صرف مفہوم تک آسانی سے رسائی حاصل کرتے ہیں بلکہ مرثیے کے دردانگیز ماحول کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ مولانا نے الفاظ کے انتخاب میں نہایت احتیاط اور نزاکت سے کام لیا ہے، جس کے باعث ترجمہ نہ تو خشک محسوس ہوتا ہے اور نہ ہی اصل سے دور۔

۹۔ ترجمہ صد پند لقمان (۲۰۲۰ء): مولانا کا ترجمۂ صد پندِ لقمان اپنی حکیمانہ بصیرت، سادگیٔ بیان اور معنویت کے اعتبار سے نہایت وقیع ہے۔ انھوں نے حضرت لقمان حکیم سے منسوب پُرمعرفت نصائح کو ایسی سہل، شستہ اور عام فہم زبان میں منتقل کیا ہے کہ ہر سطح کے قارئین بآسانی ان کے مضامین تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس ترجمے کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں نصیحت آمیز جملوں کی اصل تاثیر، حکمت کی گہرائی اور اخلاقی پیغام کی جامعیت پوری طرح برقرار ہے۔

۱۰۔ ترجمہ قصیدہ ایوان مدائن (۲۰۲۵ء): ترجمہ قصیدۂ ایوانِ مدائن (مع تشریحِ الفاظ) ان کی علمی بصیرت، ادبی ذوق اور تدریسی مہارت کا بین ثبوت ہے۔ اصل فارسی قصیدے کے جلال، آہنگ اور تاریخی شعور کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے اسے نہایت سلیس، بامحاورہ اور دل نشیں اردو میں منتقل کیا ہے، جس سے قارئین نہ صرف متن کے مفہوم تک بآسانی رسائی حاصل کرتے ہیں بلکہ اس کے تہ در تہ معانی سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کاوش کی ایک نمایاں خصوصیت الفاظ کی تشریح ہے، جس میں مولانا نے مغلق اور دقیق تراکیب کو نہایت سادہ اور واضح انداز میں کھولا ہے۔ معانی کی صحت، اسلوب کی روانی اور توضیح کی جامعیت نے اس ترجمے کو ایک مستند اور قابلِ قدر علمی خدمت کی حیثیت عطا کر دی ہے۔

۱۱۔ 'ارمغان ارشاد' (زیرِ ترتیب): انھوں نے حمد، مناجات، نعت، منقبت، غزل، رباعی، نظم، قطعہ اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ 'ارمغانِ ارشاد' مولانا کی شعری صلاحیتوں اور فکری و روحانی ذوق کا بہترین مظہر ہے، جس میں انھوں نے مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کر کے اپنی ہمہ جہت ادبی استعداد کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس مجموعے میں حمد کے اشعار کے ذریعے انھوں نے خالق کائنات کی عظمت، قدرت اور رحمت کو نہایت عقیدت و انکساری کے ساتھ بیان کیا ہے، جب کہ مناجات میں بندۂ عاجز کی اپنے رب کے حضور التجا، نیاز مندی اور روحانی وابستگی کا نہایت موثر اظہار ملتا ہے۔ نعتیہ اشعار میں حضور اکرم کی ذاتِ اقدس سے ان کی قلبی وابستگی، عشقِ رسولؐ اور عقیدت کا والہانہ رنگ نمایاں ہے، جب کہ منقبت میں اہلِ بیت اطہار کی شان و عظمت کو محبت و احترام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

غزل کے میدان میں مولانا ارشاد حسین نے کلاسیکی شعری روایت کو برقرار رکھتے ہوئے عشق،

زندگی کے نشیب و فراز، اخلاقی قدروں اور انسانی جذبات کو سادہ مگر پراثر اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح رباعیات میں انھوں نے مختصر مگر بلیغ انداز میں حکمت، دانائی اور اخلاقی تعلیمات کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نظموں میں سماجی، اخلاقی اور اصلاحی موضوعات کو خاص اہمیت حاصل ہے، جن کے ذریعے وہ قارئین کو غور و فکر اور اصلاحِ نفس کی دعوت دیتے ہیں۔ تعزیتی نظمیں بھی خاصی تعداد میں کہی ہیں جن میں جذبات و احساسات کی بے کرانی محسوس کی جاسکتی ہے۔ قطعہ اور دیگر اصناف میں بھی ان کی فکری بالیدگی، دینی شعور اور ادبی ذوق کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اس طرح 'ارمغانِ ارشاد' مولانا کی شخصیت کے روحانی، فکری اور ادبی پہلوؤں کا آئینہ دار ہے، جس میں ان کی دینی وابستگی، اخلاقی اقدار اور ادبی ذوق ایک ہم آہنگ اور دل نشیں صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

۱۲۔ علمی، ادبی و مذہبی مضامین: مولانا ارشاد حسین کی خدمات کا ایک روشن پہلو ان کے علمی، ادبی اور مذہبی مضامین ہیں۔ انھوں نے مذہبی اور ادبی میدان میں بیس سے زائد اہم تحقیقی و تنقیدی مضامین تحریر کیے، جن میں مختلف مذہبی و ادبی موضوعات، شخصیات اور مسائل پر سنجیدہ اور عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ ان مضامین میں ان کی تحقیقی بصیرت، تنقیدی شعور اور مطالعے کی وسعت نمایاں ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے وقت سطحی گفتگو پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ تاریخی حوالوں، ادبی شواہد اور علمی استدلال کے ذریعے اپنے موقف کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ادبی موضوعات کے ساتھ مذہبی موضوعات پر بھی ان کی کاوشیں خاصی وقیع اور قابلِ قدر ہیں۔ دینیات، اخلاقیات، اصلاحِ معاشرہ اور اسلامی تعلیمات سے متعلق انھوں نے متعدد مضامین تحریر کیے ہیں۔ ان کے مذہبی مضامین میں وعظ و نصیحت کے ساتھ فکری توازن اور اعتدال کی جھلک موجود ہے، جو قاری کو نہ صرف دینی شعور عطا کرتی ہے بلکہ اسے عملی زندگی میں مثبت تبدیلی کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔ اس طرح ان کے ادبی و مذہبی مضامین مجموعی طور پر ان کی علمی سنجیدگی، فکری پختگی اور اصلاحی مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ یہ مضامین ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور کچھ ابھی اشاعت کے منتظر ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شبانہ امان اللہ
پرنسپل گورنمنٹ گریجویٹ کالج فار وومن، ظفر الحق روڈ، راول پنڈی، رابطہ نمبر: +923355526549

مولانا ارشاد حسین معروفی: ایک عہد ساز شخصیت

تلخیص:

دُنیائے ادب میں بہت سی ایسی نامور شخصیات گزری ہیں جنھوں نے اپنے کام، ہنر اور علم و دانش کی بدولت زمانے سے شہرت عام اور بقائے دوام کی سند پائی اور وہ تاریخ کے افق پر درخشندہ ستارے کی مانند روشن و تاب ناک رہیں۔ ایسی ہی پاک طینت ہستیوں میں سے ایک شخصیت محترم ارشاد حسین کی بھی ہے۔ اُنھوں نے اپنے علم و ہنر، تعلیم و تدریس اور ادبی خدمات کی بدولت برصغیر پاک و ہند کی نمایاں شخصیات کی فہرست میں خصوصی مقام حاصل کیا اور علم و فضل کی شمع روشن کر کے آنے والے زمانے کے لیے مشعل راہ بنے۔

آپ ایک قابل مدرس، ذہین مترجم، قادر الکلام شاعر اور صاحبِ استعداد نثر نگار کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ زندگی بھر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو حرزِ جاں بنائے رہے۔ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ آپ علم، عمل، فکری بلندی، زبان کی شیرینی و حلاوت، شستگی و شگفتگی اور بیان کے خلوص و صداقت کے باعث سامعین کے دل میں گھر کر لیتے۔

آپ نے مختلف اصنافِ سخن مثلاً غزل، نعت، قطعات، رُباعیات، مرثیہ، منقبت میں طبع آزمائی کی۔ اس کے علاوہ نثر میں آپ نے امام خمینی کے عشق و عرفان پر مبنی بارہ قسطوں پر مشتمل مضامین لکھے۔ تقریظ اور مذہبی مضامین بھی آپ کے سرمایۂ علمی میں شامل ہیں۔ آپ نے اپنے عصری شعور کی بدولت حالات حاضرہ پر نظمیں تحریر کیں، یہاں تک کہ کرونا جیسی وبا کے دنوں میں پیش آنے والے واقعات کو بھی منظوم صورت میں پیش کیا۔ آپ کے تراجم بھی اُردُو ادب کے قارئین کے لیے علم و آگہی کے نئے امکانات روشن کرنے کا عمدہ ذریعہ ہیں۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، مدرس، عالم دین، کثیر الجہت شخصیت، شاعر، نثر نگار، مترجم، اعلیٰ اوصاف سے آراستہ شخصیت۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک عالمِ آب وگل میں اربوں انسان آئے اور اپنا عرصۂ حیات گزار کر کوچ کر گئے۔ اگر طبعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ماضی قریب سے عہدِ حاضر تک انسانی زندگی غیر یقینی اور محدود تر ہوتی جا رہی ہے۔ تاریخ کے اوراق گردشِ دوراں کی تیز رفتاری کے باعث جلد پلٹتے ہیں اور نسلِ انسانی کو نامعلوم سمت میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ وقت کی اس تیز گردش میں دُنیا میں کم ہی ایسے اشخاص ہیں جو اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر بھی اپنے کام، ہنر اور علم و دانش کی بدولت شہرت عام اور بقائے دوام کی سند پاتے ہیں۔ ایسے لوگ تاریخ کے افق پر درخشندہ ستارے کی مانند چمکتے اور خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ایسی ہی نیک سیرت شخصیات میں سے ایک شخصیت مولانا ارشاد حسین معروفی کی بھی ہے جنھوں نے اپنی عمر عزیز حصولِ علم، تدریس اور ادبی خدمات میں صرف کی۔

برصغیر پاک و ہند کی زمین اس معاملے میں بڑی زرخیز واقع ہوئی ہے۔ یہاں ہر دور میں ایسی یگانہ اور نابغۂ روزگار شخصیات پیدا ہوتی رہیں جنھوں نے علم و فضل کی شمع روشن کر کے آنے والے زمانے کو بقعۂ نور کر دیا۔ مولانا ارشاد حسین معروفی ایک کثیر الجہت شخصیت کے حامل تھے۔ اِن کی ایک جہت مدرس کی تھی۔ آپ تمام عمر طالبانِ علم کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہے۔ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ضلع مئو (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے شمار وہبی اور اکتسابی صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا۔ آپ کو ودیعت کی گئی خوبیوں اور اوصاف کو مدرسہ باب العلم مبارک پور، جامعہ ناظمیہ لکھنؤ اور لکھنؤ یونیورسٹی نے خوب نکھارا اور سنوارا۔ اپنے وقت کے جید اساتذۂ کرام نے شاگرد کی طرف خاص توجہ کی اور علم و حکمت کے اِس دُرِ نایاب کی بازیافت کر کے خواص کی فہرست میں شامل کر دیا۔ آپ کی علمیت کی مستند گواہی آپ کے پاس موجود عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضل معقولات، فاضل دینیات اور پھر ممتاز الافاضل کی اسناد کی صورت میں موجود ہے۔ صرف و نحو، منطق و فلسفہ، عروض و بلاغت، فقہ و اصول، کلام و تفسیر، حدیث و رجال، ادبیات عربی و فارسی، فنون لطیفہ بالخصوص شعر و شاعری سے شغف آپ کی گوں ناگوں صلاحیتوں پر دال ہے۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کو رب العزت نے اُس عہد کے بڑے اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع فراہم کیا۔ آپ نے بھی حصولِ علم کی تشنگی کو مٹنے نہ دیا اور علم و آگہی کے ان چشموں سے جی بھر کر اکتسابِ فیض کیا۔

مولانا ارشاد حسین صحیح معنوں میں عالم دین اور علم دوست تھے۔آپ نے ہر اُس مقام اور کام سے اجتناب کیا جس سے پرواز میں کوتاہی کا ہلکا سا بھی شائبہ تھا۔آپ کی نظر ہمیشہ مقاصدِ جلیلہ پر رہتی تھی۔آپ نے جامعہ حیدریہ اور باب العلم میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔فلاح و بہبود کے کاموں میں خود کو مصروف رکھا اور زندگی کو با مقصد بنانے کے لیے علمی، دینی، مذہبی اور تدریسی خدمات کو ایک منشور کے تحت مشن سمجھ کر جاری رکھا۔اعلیٰ اخلاق وفضائل اور اوصاف جمیلہ سے مزین عالم باعمل تھے۔لاتعداد ایسے شاگرد پیدا کیے جنھوں نے آپ کے نقش قدم کی پیروی اور اتباع کو معمول زندگی بنا کر علم وآگہی کے دِیے روشن کیے۔آپ کا طریقۂ تدریس یکتا اور مثالی تھا۔داخلی پاکیزگی اور روحانی بالیدگی سے مملو حیات طیبہ نسل نو کے لیے بالعموم اور طلبہ کے لیے بالخصوص راہ عمل کا درجہ رکھتی تھی۔ذہین وفطین اور قابل طلبہ کے ساتھ نسبتاً کمزور طلبہ کی دادرسی اور معاونت آپ کے فرائض منصبی کا جزوِ لازم تھی۔اگر آپ کے آثارِ علمی کی فہرست مرتب کی جائے تو اس امر کا ادراک ہوتا ہے کہ قدرت نے آپ کو کس قدر علم و ہنر سے نوازا تھا۔فلسفۂ توحید، افادیتِ نماز، افادیتِ روزہ، تفسیر قرآن (چند سور قصار)، بلاغت قرآن (نامکمل) علوم القرآن، جلاء الصدور (ترجمہ معراج العقول [نامکمل])، سو کے قریب غزلیں، بیس کے قریب حمدیں، نعتیں اور مناقب، امام خمینی کی شاعری میں عشق وعرفان پر بارہ قسطوں پر مشتمل مضامین، تقریظ، علمی اور مذہبی مضامین ..... یہ سب آثار آپ کے علمی قد وقامت کی بلندی کی دلیل ہیں۔

مولانا کو زندگی کے مختلف ناپسندیدہ حالات کا مقابلہ کرنا پڑا، مگر علم وحکمت اور دانش وبینش کے ساتھ صبر وحلم کی شمشیر آب دار سے حالات کی خرابیوں کا سر قلم کرتے رہے اور اپنے علمی، دینی، مذہبی اور تدریسی مشن کو مسلسل آگے بڑھاتے رہے۔مدرسہ سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب وطن میں مقیم ہو گئے اور اس سے قبل بھی جب وطن تشریف لاتے تو دیگر ملاقاتیوں کے علاوہ سنی علما بھی منطق وفلسفہ کے مباحث کی تشریح وتحصیل کے لیے مولانا سے رابطہ کرتے تھے۔مولانا سچے خادمِ دین کی طرح نہایت خندہ پیشانی سے اُن کے مشکل مسائل وسوالات کو حل کرتے تھے، جس کے نتیجے میں اہلِ سنت کے علما بھی آپ کے بے حد گرویدہ تھے۔[1]

اپنی ذات میں علم کا سمندر سمونے والی یہ ہستی حلم وتواضع، عجز وانکسار، فہم وفراست اور اجتہاد کی خوبیوں سے مالا مال تھی۔نظم ونثر، دونوں پر ایک جیسی دست رس رکھنے کا ثبوت آپ کے تحریری سرمائے سے بخوبی ہوتا ہے۔تصانیف وتراجم آپ کے کمالاتِ علمی کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔اُردُو ادب ہو یا عربی ادب، مولانا ارشاد حسین معروفی دونوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔بہ حیثیتِ معلم اپنے شاگردوں کے لیے

شفیق و کریم تھے۔ تمام عمر اپنے اردگرد موجود افراد کے قلوب و اذہان کی طہارت و پاکیزگی کا سامان بہم پہنچانے میں لگے رہے۔ اپنے علم و عمل، فکری اوج، زبان کی حلاوت، شستگی و شگفتگی، بیان کے خلوص و صداقت کی بدولت سامعین کے دل میں اُترنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی شاعری کو باطنی جذبات و احساسات کا وسیلۂ ابلاغ سمجھتے اور اپنی اس وہبی صلاحیت کو مذہبی افکار، اخلاقی اقدار، انسانی ہم دردی، رُوحانی کیف کی عکاسی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ خدمتِ خلق کو شعار سمجھتے اور سادہ، مترنم اور پُراثر اُسلوبِ شعر سے قلب و نظر کی تطہیر کرتے جاتے۔ کردار کی ایک نمایاں خوبی آپ کا حد سے بڑھا ہوا اِنکسار تھا۔ کمالاتِ علمی نے کبھی آپ کا دماغ خراب نہیں کیا اور فطری سادگی اور عاجزی ہر ہر قدم پر آپ کے ہم سفر رہی۔ آپ کے حلقۂ دروس سے فیض یاب ہونے والے افراد درجۂ اجتہاد پر فائز ہو چکے تھے، مگر اِس کے باوصف آپ کے اندر کہیں سے علو و برتری کا جذبہ نظر نہیں آتا تھا۔ چھوٹوں سے شفقت اور بزرگوں کی خدمت و توقیر آپ کا شعار تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا شوق اتنا کہ ایک ہی بات کو کئی کئی بار مختلف انداز سے طلبہ سے بیان کرتے تاکہ کسی صورت بات ذہن نشین ہو جائے۔ تکرار سے نہ کبیدہ خاطر ہوتے نہ اکتاہٹ کا شکار۔ ۲؎

آپ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو مترجم کا ہے۔ 'ایوان مدائن از خاقانی' کا ترجمہ، الفاظ کے معنی کی تشریح و تعبیر آپ کی صلاحیتوں کی بھرپور عکاس ہے۔ خاقانی کا مدائن کی بربادی کا مرثیہ آپ کے حسن کلام کی تاثیر سے قلب میں احساس کی شمع جلاتا ہے ؎

ہان! ای دل عبرت بین! از دیدہ عبر کن! ہان!
ایوان مدائن را آئینۂ عبرت دان

ترجمہ: اے عبرت سے دیکھنے والے دل! دیکھ کر عبرت حاصل کر! ایوان مدائن کو عبرت کا آئینہ سمجھ!

نی زال مدائن کم از پیرزن کوفہ
نہ ہجرۂ تنگِ این کمتر ز تنور آن

ترجمہ: مدائن کی زال (بوڑھی عورت) کوفہ کی بڑھیا سے کم نہیں اور اس کا تنگ حجرہ اس کے تنور سے کم نہیں۔ ۳؎

'صد پند لقمان' کا اصلی متن کے ساتھ اُردُو ترجمہ قارئین کو پند و نصائح سے اخلاقی تربیت کا اعلیٰ نمونہ فراہم کرتا ہے۔ اس میں موجود سو نصیحتیں اُردُو کے قارئین کو راہِ عمل دکھاتی اور دین و دُنیا کی کامیابی کا درس دیتی ہیں۔

۱۔فرزندم ہیچ کس وہیچ چیز را با خدا شریک مکن۔
۲۔با پدر و مادرت بہترین رفتار را داشتہ باش۔

ترجمہ:۱۔میرے بیٹے! کسی شخص اور کسی چیز کو خدا کا شریک نہ کر۔ ۲۔اپنے ماں باپ کے ساتھ بہترین سلوک کر۔ ۴؎

شیخ سعدی شیرازی کی 'کریما' کا ترجمہ بھی معاشرے کی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے۔اس کے مختلف حصے یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ثنا، نفس سے خطاب، بخیل کی مذمت، کرم کے فوائد، سخاوت کی صفات، تکبر کی مذمت، علم کی فضیلت، تواضع کی صفت، عدل، جاہلوں سے کنارہ کشی، قناعت، مذمت حرص، مذمت ظلم، صفت وفا، مذمتِ شیطان، بیان صبر، راستی، شکر، کذب کی مذمت کا ترجمہ انسانی سیرت و اخلاق کے عرفان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔انسانی نفس کی صفات، مثبت اور منفی رُجحانات کا تفصیلی بیان انسانی شخصیت کو اوصافِ کاملہ سے سرفراز کرنے اور ہدایت کا راستہ دکھانے کی عمدہ تفسیر ہے۔دو اشعار کے ترجمے دیکھیے ؎

کریما بجخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

ترجمہ:اے کریم! ہمارے حال پر بخشش کر کہ میں خواہش نفس کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔

زبان تا بود در دہان جای گیر
ثنائے محمد بوَد دل پذیر

ترجمہ: جب تک منہ میں زبان باقی رہے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف دل کو خوش گوار لگے۔ ۵؎

'دوازدہ بند محتشم کاشانی' کا اُردُو ترجمہ مع مقدمہ، شہادت امام حسین کا پُر اثر بیان ہے۔ترجمہ نگاری ایک فن ہے۔اصل تحریر یا فن پارے کے معنی اور مفاہیم متعین کرنا، ربط و تسلسل، سلاست اور ہم آہنگی کے بغیر ترجمہ بے رنگ اور پھیکا نظر آتا ہے اور پڑھنے والا اس سے حظ نہیں اُٹھا سکتا۔اِن اوصاف سے عاری ترجمہ معانی و مفاہیم کے موثر ابلاغ کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ترجمے کے بارے میں ڈاکٹر محمود احمد کاوش کا کہنا ہے:

''ترجمہ کرنا آسان کام نہیں۔طبع زاد تحریر کی نسبت ترجمہ کرنا مشکل ہے۔روسی شاعر Yevgeny Yevtushenko نے ایک دفعہ لکھا تھا:

"Translation is like a woman. If it is beautiful, it is not faithful. If it is faithful, it most certainly not beautiful."

یعنی ترجمے کی مثال عورت کی سی ہے۔ اگر (ترجمہ) خوب صورت ہو تو وفادار نہیں ہوگا؛ اگر وفادار ہو تو غالب امکان یہ ہے کہ خوب صورت نہیں ہوگا۔

اب ترجمہ کرنے والے کا اصل اِمتحان یہ ہے کہ ترجمے کو اصل متن کے مطابق رکھتے ہوئے وفاداری کا حق بھی ادا کرنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عبارت کے حسن و دِل کشی کو بھی قائم رکھنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ نگار کو دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہو، اور ظاہر ہے یہ ایک مشکل شرط ہے کیوں کہ کسی شخص میں دونوں زبانوں کی ایک جیسی صلاحیت شاذ ہی ہوتی ہے۔ پھر ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ترجمہ کرنے والے کے لیے اُس مزاج سے نہ صرف واقف ہونا لازمی ہے، بلکہ اُسے اِس مزاج کو دُوسری زبان میں منتقل کرنے کا گُر بھی آنا چاہیے۔ ہر زبان کا مخصوص روزمرہ اور محاورہ ہوتا ہے، ترجمہ کرتے وقت اس کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ ترجمہ نگار کو مصنف کے طرزِ احساس اور اُسلوب کو گرفت میں لے کر اُسے ترجمے کی زبان میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ گویا ترجمہ نگار کو لفظوں کے باطن میں اُتر کر اُن کی رُوح کو ترجمے کی زبان میں سمونے کا مشکل کام انجام دینا ہوتا ہے۔''[۲]

جب ہم مُندرجۂ بالا اقتباس میں بیان کی گئی شرائط کی روشنی میں مولانا ارشاد حسین معروفی کے تراجم پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے تمام ترجمے اصول ترجمہ کے لوازمات کو مدنظر رکھ کر کیے ہیں۔ آپ نے کوشش کی ہے کہ ماخذ زبان میں جو مطالب ادا ہوئے ہیں، اُنھیں ہدفی زبان میں ویسے ہی ادا کیا جائے۔ پھر اصل کے مزاج اور رُوح کو بھی ترجمے میں سمو دیا جائے۔

'ریاض عروض'، 'اُردُو مرثیے کی جمالیات اور ڈاکٹر عابد حسین حیدری' اور 'مولانا حسرت موہانی کی سیاسی شاعری' پر مولانا کی رائے انتہائی صائب اور دلائل سے بھرپور ہے۔ آپ نے اپنے تبصروں میں تلخیص سے کام لیا ہے۔ کیمونزم کے بارے میں سیر حاصل مباحث اور حوالہ جات کی مدد سے سند بھی فراہم کی ہے۔ علاوہ ازیں امام خمینی کی شاعری میں عشق و عرفان کے حوالے سے آپ کا تحریر کردہ مضمون اَسرار و رُموز سے آگاہی کا ذریعہ ہے۔ امام خمینی کی شاعری منتشر اشعار کی صورت میں تھی۔ بعد ازاں اسے 'آثار الحجۃ' اور 'دانشوران' کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کی شاعری میں موجود ہر نکتے کی موثر تشریح و تعبیر کر کے فارسی زبان سے نابلد افراد کو بھی امام خمینی کے فکری و فنی اثاثے سے رُوشناس کرانے کی خدمت کی ہے۔ امام خمینی کی شاعری کے بنیادی موضوعات بالخصوص غزلیات میں عشق حقیقی کا

عرفان، فنا فی اللہ، عالم کی ہر شے میں موجود مظہر خداوندی، تسبیح و تقدیس کے تمام معاملات کو مولانا ارشاد حسین معروفی نے فنی چابک دستی اور باریک بینی سے قرطاس کی زینت بنایا۔ اگرچہ امام خمینی کا کلام مکمل طور پر دست یاب نہیں اور اُن کے بے شمار اشعار تلف ہو چکے ہیں، پھر بھی جو کلام ملتا ہے، اُس کے مطالعے سے فکری مباحث، عقل، منطق، فلسفہ کے علاوہ زندگی کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ترجمے کی صورت میں پیش کرنا مولانا ارشاد کا علمی کارنامہ ہے۔ اِس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''نابغۂ روزگار، مفکر اسلام، روح اللہ خمینی کا شمار بیسویں صدی عیسوی کے بلند پایہ عالموں میں ہوتا ہے۔ اُن کی شخصیت دُنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ وہ بیک وقت ایک مفکر و مدبر، باکمال عالمِ دین، فقیہ، دانش مند، فلسفی، عارف اور سیاسی رہنما ہونے کے باوجود باذوق شاعر بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں قرآن وسنت کے مفاہیم کو بخوبی سمویا اور روزمرہ کے پیچیدہ مسائل اور مشکلات کو قرآن وسنت کی روشنی میں فلسفہ و عرفان کی آنچ دے کر اِس طرح برتا کہ بالکل شریعت سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔''[۷]

امام خمینی نے استدلالی انداز، عشق و عرفان، سوز دروں، فلسفیانہ بصیرت، سماجی شعور کے جو موتی اصناف شاعری مثلاً غزل، رُباعی، قصیدہ، قطعات، مسمط، ترجیع بند کی شکل میں پروئے، وہ فارسی شاعری کی روایت کو نہ صرف مضبوط کرتے ہیں، بلکہ اسے تاب ناکی بھی عطا کرتے ہیں۔ امام خمینی اور امام غزالی کے تصورِ عشق کے تفاوت کو مولانا ارشاد حسین نے واضح کیا ہے اور امام خمینی کے تصورِ عشق و عرفان کے بنیادی عناصر پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کے مخلصانہ انداز، اُمتِ مسلمہ سے محبت اور مسلمانانِ اسلامیہ کو پند و نصائح کی تفصیلات فراہم کیں۔ نیز اُن کے اُسلوب اور فنِ شاعری کے لوازمات، صنائع بدائع، تشبیہات، استعارات، تلمیحات، علامات، مستند اصطلاحات اور بحور کا عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔

مولانا کی ایک اور علمی کاوش 'آلِ رضا کی مرثیہ گوئی: تطہیرِ غم سے تجلی شعور تک' قابلِ تحسین ہے۔ مولانا نے ادب کو احساس کا استعارہ قرار دیا اور آلِ رضا کی مرثیہ گوئی کو اجتماعی شعور اور فکری احتجاج کا لسانی پیکر قرار دیا۔ آلِ رضا کی مرثیہ گوئی اور اُن کے خانوادے کی ادبی کاوشوں نے بیسویں صدی میں مرثیہ گوئی کو نیا ذوق اور فکری زاویہ دیا۔ اِس ضمن میں مولانا کا نقطۂ نظر ذیل کے اقتباس میں پیش کیا جاتا ہے:

''آلِ رضا کی مرثیہ گوئی اُردو ادب میں اُس روایت کی توسیع ہے جس نے میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کے بعد مرثیے کو مذہب سے اُٹھا کر انسانیت کے دائرے میں داخل کیا۔ اُنھوں نے زبان کو وقار بخشا، خیال کو وسعت عطا کی اور مرثیے کے جذبے کو عصری معنویت بخشی۔ اُن

کے مراثی نہ صرف سوگ کا آئینہ ہیں، بلکہ زندگی کے شعور کا درس بھی۔ اُن کے مرثیے محض فن نہیں ایک روحانی تجربہ ہے جو قاری کے باطن کو منور کرتے ہیں اور دِلوں میں تسلیم و رضا کی شمع روشن کرتے ہیں۔''۸؎

آلِ رضا کے حالاتِ زندگی ہوں یا عملی زندگی، آرزو لکھنوی سے اصلاحِ شاعری بذریعہ خط کتابت ہو یا لکھنؤ میں اپنا خاص مقام و مرتبہ بنانے کی جدوجہد کا سفر، مولانا نے بڑی عمدگی کے ساتھ اِن تمام مراحل کو بیان کیا ہے۔ 'نوائے رضا' اور 'غزل معلّٰی' ان کی ابتدائی تصانیف تھیں مگر ۱۹۳۴ء میں اُنھوں نے مرثیہ گوئی کا آغاز کیا اور اُردُو کے کلاسیکی مرثیے کی روایت کو مضبوط تر کیا۔ علاوہ ازیں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد کے مرثیے کے منشور میں علامتی زبان، زبان و بیان کی متانت، کلاسیکی رنگ، عظمتِ انسانی، اصلاحِ معاشرہ اور بیداریِ ضمیر کی شمولیت کو بیان کیا ہے۔

مولانا ارشاد حسین کی شاعری بھی فلسفہ و عرفان، عشقِ حقیقی اور آلِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بے پناہ محبت کی عکاسی کرتی ہے۔ آپ کا جو کلام دست یاب ہوا ہے، اس میں شامل حمدیہ اور نعتیہ اشعار اُن کے قادرالکلام شاعر ہونے کی دلیل ہیں۔ ذیل میں نمونۂ حمد دیا جاتا ہے ؎

کلیم طور کے جلوے کا تار ختم نہ ہو
یہ نورِ ارض و سما کا وقار ختم نہ ہو
وجودِ واجبِ ذاتی کی ذات کے صدقے
وجوبِ غیر کا بھی اضطرار ختم نہ ہو ۹؎

اب آپ کے نعتیہ کلام کا نمونہ بھی دیکھتے چلیں ؎

میں تری خاکِ نقشِ پا ہوتا
تیرا خادم جو مصطفیٰ ہوتا
خاک ہوتا میں تیرے آنگن کی
تیرے قدموں کو چومتا ہوتا ۱۰؎

مولانا ارشاد حسین نے دلی کیفیات کا اللہ کے حضور مناجات کی صورت میں بھی اظہار کیا ہے۔ یہ مناجات اُن کی سوز مندی، فکری اِرتقا اور حساسیت کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے غزلیات بھی کہی ہیں۔ اِن میں عشقِ حقیقی کی جا بجا جھلکیاں ملتی ہیں۔ آپ کی غزلوں کے موضوعات میں کاروبارِ حیات کے نشیب و فراز، زندگی کی بے ثباتی، معمولاتِ زندگی کی اصل حقیقت، عبرت انگیزی اور اعمال کے نتائج

ہیں۔آپ کی غزل سے یہ دو شعر بہ طورِ نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

اگر چڑھائی کبھی آستیں خفا ہو کر
ترے جمال کے سب نقش آئینے میں رہے
ہے تیرا قول کہ بس انتظار میں ہے مزہ
اگر یہ سچ ہے تو ہم عمر بھر مزے میں رہے ۱۱

مولانا کے نزدیک دُنیا کی حقیقت ایک تماشا گاہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔اِس سے دل لگانا اور اِسے ابدی جان کر آخرت سے بے خبری انسانی مقصدِ حیات کی ناکامی ہے۔مولانا نے قطعات بھی کہے ہیں۔ قطعات کے چیدہ چیدہ موضوعات میں زندگی کے اسرار و رُموز، حکمت و دانائی اور پند و نصائح شامل ہیں۔

اگر اَوجِ ثریا کے ہو طالب
کتاب انکساری پڑھتے جاؤ ۱۲

مولانا کے سرمایۂ شعری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمۃ الزہرا کی منقبت بھی شامل ہیں۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں لکھتے ہیں۔

ہماری ماں کی ہے آغوش تربیت کا اثر
دلوں میں حبِّ علی بے حساب رکھتے ہیں
علی سے بغض ہے کفر و نفاق اے ارشادؔ
یہ خود سے پوچھیے کیا دل میں آپ رکھتے ہیں ۱۳

مولانا نے حضرت امام حسن علیہ السلام کی مدح میں بھی اشعار کہے ہیں۔مناقب کا یہ سلسلہ حضرت امام حسین علیہ السلام، جناب علی اکبر، امام زین العابدین، امام باقر، امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، امام محمد تقی، امام علی نقی، امام حسن عسکری، امام مہدی، حضرت عباس اور حضرت زینب کو محیط ہے۔مولانا کی اہل بیتِ اطہار سے محبت، اِرادت و عقیدت اور اُن کے فضائل کا بیان جذب و کیف سے معمور ہے۔اِن مقدس ہستیوں کے بارے میں قلم فرسائی ایک خاص تقدیس، کیفیتِ قلبی اور اِحتیاط کی متقاضی ہے، مولانا نے ان سب کو ملحوظِ خاطر رکھ کر مناقبِ اہلِ بیتِ اطہار بیان کیے ہیں۔آپ نے سلام کی صنف میں بھی اظہارِ خیال کیا۔کربلا کے حوالے سے ان کے یہ دو شعر دیکھیے۔

تُو شہادت گاہِ اولادِ نبی ہے کربلا
دینِ حق کو تُو نے بخشی زندگی ہے کربلا

تُو ہے اِک روضہ، ریاضِ جنت الفردوس کا
آ گیا جو بھی یہاں پر جنّتی ہے کربلا ۱۴؎

بیان کی صفائی، قلبی وابستگی، زبان کی شستگی، اُسلوب کی پختگی، موضوعات کی گہرائی و گیرائی آپ کے فن شعر گوئی کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں۔ فنی و فکری، ہر دو اِعتبار سے آپ کی شاعری اُردُو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ مولانا نے عصری شعور اور معاملاتِ شب و روز کا عمیق مطالعہ و مشاہدہ کر رکھا تھا۔ وہ ظالم اور مظلوم، آزاد اور غلام، کمزور اور طاقتور کی کشمکش ازلی سے بخوبی واقف تھے۔ آپ نے ظلم و جبر کے خلاف قلم چلایا۔ اس کے علاوہ نظم 'ہم کیا ہیں؟' اور کرونا کے حوالے سے نظمیں لکھ کر عہدِ حاضر کے موضوعات کو اپنے قلم کی زینت بنایا۔ نظم 'رُوحِ حقیقت' آپ کی شعوری بالیدگی کی عمدہ نظیر ہے۔ ان کے علاوہ تعزیتی نظمیں، تعارفی نظمیں اور قطعات بھی آپ کے علمی سرمائے کا حصہ ہیں۔

صلحِ حدیبیہ اگر فتحِ مبین ہے
ہے تیرا کام دین مبیں کے وقار کا
فرزندِ مصطفی تری جرأت کے میں نثار
نوکِ قلم سے کام لیا ذوالفقار کا ۱۵؎

مولانا کے شعری اثاثے میں مرثیہ امام زین العابدین بھی شامل ہے۔ عیدِ غدیر کے بارے میں ان کے یہ اشعار دیکھیے۔

بلّغ کی شان دیکھیے آ کر غدیر میں
صحرا کی دُھوپ، حشر کا منظر غدیر میں
حجاج سب پسینے میں ڈوبے ہیں اس طرح
جیسے کہ بہہ رہا ہو سمندر غدیر میں ۱۶؎

یہ مرثیہ مسدس کی ہیئت میں تحریر کیا گیا ہے اور بیان و اُسلوب کی عمدہ مثال ہے۔ مولانا ارشاد حسین عہد حاضر کی کثیر الجہت اور علم و ہنر سے آراستہ شخصیت تھے۔ آپ کی علمی، ادبی اور عملی خدمات کا اظہار انتہائی ضروری ہے۔ آپ کے سرمایۂ علمی کی تشریح و تعبیر مستقبل کے امکانات کو روشن کرے گی۔ ان کے فکر و فن کی گہرائی، فصاحت و بلاغت کی اگر مکمل تعبیر کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ انتہائی عرق ریزی کا کام ہے۔ آپ کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کے معانی و مفاہیم بحرِ حکمت میں چھپے گوہر یکتا کا درجہ رکھتے ہیں۔ بلاشبہہ آپ کا شمار عہدِ حاضر کے صاحبِ کمال اشخاص میں ہوتا ہے۔ آپ کی رحلت

کے بعد بھی آپ کا فیضان، بہ صورتِ فیضان حیدر اور فیضان ادب جاری و ساری ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔آہ! استاذ الاساتذہ، جامعہ حیدریہ مدینۃ العلوم، خیرآباد، ضلع مئو، ۲۰۲۵ء، ص ۱۳

۲۔ایضاً، ص ۲۵

۳۔سہ ماہی 'فیضانِ ادب' جولائی تا ستمبر ۲۰۲۵ء، ص ۱۶۹

۴۔سہ ماہی 'فیضانِ ادب' جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء، ص ۱۵۰

۵۔سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۳۔ ۱۶۴

۶۔ڈاکٹر محمود احمد کاوش: 'دیباچۂ مترجم' مشمولہ: 'یکّہ و تنہا: کدار شرما'، اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی، جنوری ۲۰۲۲ء، ص ۱۳۔ ۱۴

۷۔سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، جنوری تا جون ۲۰۱۶ء، ص ۱۸

۸۔سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، جنوری تا مارچ ۲۰۲۶ء، ص ۲۴

۹۔سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۶ء، ص ۴۳۶

۱۰۔ایضاً، ص ۴۳۸

۱۱۔ایضاً، ص ۴۸۱

۱۲۔ایضاً، ص ۵۵۳

۱۳۔ایضاً، ص ۴۹۵

۱۴۔ایضاً، ص ۵۲۱

۱۵۔ایضاً، ص ۵۵۰

۱۶۔ایضاً، ص ۵۳۰

☆☆☆

مولانا کرار حسین اظہری
استاد مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ، رابطہ نمبر: 9506112499

مولانا ارشاد حسین: حیات، خدمات اور علمی وراثت

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی (۱۹۴۹ء۔۲۰۲۵ء) ایک ہمہ جہت علمی، دینی اور ادبی شخصیت تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی تدریس، تبلیغ اور تربیتِ نسلِ نو کے لیے وقف کردی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اشاعت العلوم سے حاصل کی۔ بعد ازاں مدرسہ باب العلم مبارک پور اور جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے اعلیٰ دینی تعلیم مکمل کی، جہاں سے آپ نے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔ اس دوران آپ کو جلیل القدر علما کی صحبت نصیب ہوئی، جس نے آپ کی علمی وفکری شخصیت کو جلا بخشی۔

مولانا ارشاد کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے دینی اور عصری تعلیم کو یکجا کر کے ایک متوازن علمی مزاج پیدا کیا۔ آپ نہ صرف ایک کامیاب مدرس تھے بلکہ ایک شفیق مربی اور رہبر بھی تھے۔ آپ کا اندازِ تدریس محض نصاب تک محدود نہ تھا بلکہ طلبہ کی ذہن سازی، فکری تربیت اور اخلاقی اصلاح پر مبنی تھا۔ ان کی حاضر جوابی، علمی استحضار اور مدلل گفتگو نے انھیں ممتاز مقام عطا کیا۔

تصنیف وتحقیق کے میدان میں بھی آپ نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ 'فلسفہ توحید'، 'افادیتِ نماز'، 'بلاغتِ قرآن' اور 'علوم القرآن' جیسی اہم تصانیف آپ کے علمی ورثے کا حصہ ہیں، جب کہ شاعری میں بھی آپ کو ملکہ حاصل تھا۔

اخلاقی اعتبار سے آپ شفقت، اخلاص اور ایثار کا پیکر تھے۔ آپ کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو آپ کے علمی فیض کو آگے بڑھا رہی ہے۔ آپ کی وفات علمی دنیا کے لیے ایک بڑا نقصان ہے، مگر آپ کا علمی وتربیتی ورثہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، سوانح حیات، تدریس، دینی تعلیم، عصری تعلیم، علمی خدمات، تصنیف و تالیف، فلسفۂ توحید، علوم القرآن، بلاغتِ قرآن، اردو و فارسی ادب، غزل گوئی۔

(ولادت: ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء۔ وفات: ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء، ۱۵/شوال ۱۴۴۶ھ، دوشنبہ)

اکملُ العلماء، اَدَقُّ الادباء، استاذُ الاساتذہ، اَخدمُ الطلبہ، اَجمعُ المعلمین، اَشفَقُ المدرسین..... یہ فقط القاب نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت علمی و اخلاقی شخصیت کی آئینہ دار تعبیرات ہیں۔ مولانا ارشاد حسین صاحب قبلہ معروفی ممتازُ الافاضل ابن محمد شمس الدین، پورہ معروف، ضلع مئو کی وہ ممتاز علمی ہستی تھے جنھوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ تدریس، تبلیغ اور تربیتِ نسلِ نو میں صرف کیا۔ آپ کا انتقال ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو تقریباً بارہ بجے دن، لکھنؤ کے ایرامیڈیکل کالج میں دورانِ علاج ہوا۔ اس سانحۂ ارتحال نے علمی و دینی حلقوں کو سوگوار کر دیا اور اہلِ علم کو ایک ایسے مربی و شفیق استاد سے محروم کر دیا جس کی مثال کم نظیر ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم وطنِ عزیز کے معروف ادارے 'اشاعت العلوم' میں ہوئی جہاں درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۲ء میں مدرسہ باب العلم مبارک پور کے درجہ ششم میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں باب العلم علمی وقار اور اساتذۂ فن کی وجہ سے ممتاز مقام رکھتا تھا۔ آپ نے حجۃ الاسلام مولانا علی ارشاد نجفی، مولانا فیاض حسین واعظ اور مولانا عبدالحمید شاہ ناظرؔ جیسے جید علما سے کسبِ فیض کیا۔ یہ وہ اساتذہ تھے جن کی علمی سخت گیری اور اخلاقی شفقت نے ایک باکمال شاگرد کو جنم دیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ 'ارشاد' (حجۃ الاسلام مولانا علی ارشاد نجفی) نے دوسرا 'ارشاد' پیدا کیا، گویا ہادیِ (نجفی) قوم نے ایک مہدی (ارشاد معروفی) کو راہِ ہدایت کے لیے قوم کے سپرد کیا۔ مولانا سلمان شاہ مبارک پوری اور مولانا ناظم علی صاحب قبلہ واعظ دام ظلہ ہم جماعت رہے۔ درجہ ہفتم تک آپ میرے چچا جناب الحاج محبوب حسین اظہری کربلائی کے بھی ہم جماعت تھے۔

۱۹۶۵ء میں مولوی الٰہ آباد بورڈ کے امتحان میں شریک ہوئے۔ شاعرِ اہلِ بیت جناب ایوبؔ مبارک پوری کی نگرانی میں الٰہ آباد گئے اور امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۶۶ء کے آغاز میں مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں عالم الف میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۲ء میں ممتازُ الافاضل کی آخری سند حاصل کی۔

ناظمیہ کے دورِ طالب علمی میں آپ کی شخصیت علمی جدّت اور فکری بالیدگی کا حسین امتزاج بن کر ابھری۔ اس زمانے میں آپ کو سرکار مفتی احمد علی اور آیت اللہ مولانا روشن علی خان جیسے جلیل القدر اساطینِ

علم کی شاگردی نصیب ہوئی۔ یہ وہ نفوسِ قدسیہ تھے جن کی مجالس علم، بصیرت، تقویٰ اور استقامت کی عملی تفسیر بن جاتی تھیں۔ آپ نے ان اکابر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے فقہ، اصول، تفسیر اور کلام کے دقیق مباحث میں ایسی مہارت حاصل کی کہ کم عمری ہی میں فہم وادراک کی پختگی نمایاں ہونے لگی۔ اساتذہ کی نگاہِ انتخاب نے آپ کی ذہانت، سنجیدگی اور شغفِ تحصیل کو پہچان لیا تھا۔ چنانچہ آپ نہ صرف درس میں ممتاز تھے بلکہ آدابِ شاگردی اور سنجیدہ طرزِ فکر میں بھی نمایاں تھے۔

اسی کے ساتھ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے عصری تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا، جو آپ کے ہمہ جہت ذوقِ علم اور وسعتِ نظر کی روشن دلیل ہے۔ یہ فیصلہ اس بات کا غماز تھا کہ آپ علم کو محدود دائروں میں مقید دیکھنے کے قائل نہ تھے بلکہ دینی اور عصری معارف کے درمیان ایک بامعنی ربط قائم کرنا چاہتے تھے۔ یونیورسٹی کے علمی ماحول نے آپ کے اندر تنقیدی شعور، تحقیقی اسلوب اور استدلالی توازن کو مزید جِلا بخشی، جب کہ دینی درس گاہ کی روحانی فضا نے اس علم کو اخلاقی وقار اور ایمانی حرارت عطا کی۔ یوں آپ کی شخصیت میں عقل ونقل، روایت ودرایت اور فکر وعمل کا ایسا حسین امتزاج پیدا ہوا جو کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

تحصیل علم کے بعد ۱۹۷۲ء میں تحصیل رزق کی غرض سے موضع دہیاور، تحصیل ٹانڈہ، ضلع امبیڈکر نگر کے مکتب امامیہ تنظیم المکاتب 'صابرہ نقی' میں تدریس شروع کی۔ آٹھ سالہ قیام کے دوران آپ نے نہایت دلجمعی اور انہماک سے تدریس کی۔ وہاں کے عوام آپ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور ہر خوشی وغم میں شرکت کو باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔

۱۶/جون ۱۹۸۰ء کو مدرسہ باب العلم مبارک پور میں تدریس کا آغاز کیا۔ چند برس بعد جامعہ ایمانیہ ناصریہ جون پور میں خدمات انجام دیں، جہاں درجاتِ عالیہ کی تدریس آپ کے سپرد رہی۔ ۱۹۸۸ء میں جامعہ حیدریہ خیرآباد، ضلع مئو تشریف لے گئے اور وہاں بھی علمی فیضان جاری رکھا۔

یکم جون ۱۹۹۰ء سے دوبارہ باب العلم میں سرکاری مدرس کی حیثیت سے تقرری ہوئی اور ۳۰/ جون ۲۰۱۲ء کو پنشن کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔ تدریس کے ساتھ مسجد حجرہ شاہ محمد پور، مبارک پور میں نمازِ جماعت کی امامت فرماتے رہے۔ بعد ازاں یہ ذمہ داری حجۃ الاسلام مولانا محمد مہدی حسینی صاحب قبلہ گھوسوی نے سنبھالی اور ۲۰۱۱ء سے آپ کے کمترین شاگرد کو یہ سعادت حاصل ہے۔

آپ 'ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی' پورہ معروف کے بانی اور رسالہ 'فیضانِ ادب' کے سرپرست تھے۔ علمی وادبی ذوق آپ کی شخصیت کا نمایاں پہلو تھا۔ آپ نکتہ سنج، صاحبِ اسلوب اور دقیق مسائل و مباحث پر مضامین لکھتے تھے۔ شاعری میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی تحریروں میں استدلال کی قوت،

زبان کی صفائی اور فکر کی پختگی نمایاں تھی۔ محرم الحرام میں عشرہ اور ماہِ رمضان میں تبلیغ کے لیے مومن پارہ، رائے پور تشریف لے جاتے۔ ۲۰۰۸ء تک چند سال پورہ معروف میں نمازِ جمعہ بھی پڑھائی۔

آپ کی اخلاقی عظمت اور تدریسی اسلوب ایک ایسے معلم کی تصویر پیش کرتے ہیں جس کے نزدیک علم اوراق ودفاتر کی زینت نہ تھا بلکہ دل ودماغ کی روشنی اور کردار کی تشکیل کا ذریعہ تھا۔ آپ واقعی اس مقولے کے جیتے جاگتے مصداق تھے کہ ''علم در سینہ باشد نہ در سفینہ''۔ آپ کے پاس معلومات کا ذخیرہ ہی نہیں، بلکہ استحضارِ علم کی ایسی غیر معمولی صلاحیت تھی کہ کوئی بھی سوال پیش کیا جاتا تو فوراً مدلل، مربوط اور محققانہ جواب سامنے آ جاتا۔ نہ توقف، نہ تردد، بلکہ دلائل کی ترتیب اور نکات کی وضاحت کے ساتھ ایسا جامع بیان کہ سامعین حیرت زدہ رہ جاتے۔ بڑے بڑے فضلا فی البدیہہ اظہار سے محروم دکھائی دیتے ہیں، لیکن مولانا موصوف اس فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ یہ حاضر جوابی فقط ذہانت کا کرشمہ نہ تھی بلکہ برسوں کی ریاضت، گہرے مطالعے اور علمی انہماک کا ثمرہ تھی۔

آپ کا اندازِ تدریس نصاب کی تکمیل تک محدود نہ تھا، بلکہ ذہن سازی، تربیت اور فکری آبیاری اس کا اصل مقصد تھا۔ مشکل ترین مباحث کو سادہ، مربوط اور قابلِ فہم انداز میں بیان کرنا آپ کا خاص وصف تھا۔ آپ درس دیتے ہوئے عبارت کی تہ تک پہنچتے، پس منظر کو واضح کرتے، احتمالات بیان کرتے اور پھر ترجیحی رائے دلائل کے ساتھ پیش فرماتے۔ طلبہ کو سوال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کے اشکالات کو نہایت سنجیدگی سے سنتے۔ یوں درس گاہ علمی مکالمے کی زندہ فضا میں تبدیل ہو جاتی۔ آپ کی گفتگو میں ٹھہراؤ، استدلال میں توازن اور لہجے میں شفقت ایسی ہم آہنگی کے ساتھ جمع تھی کہ طالبِ علم خود کو ایک محفوظ اور باوقار علمی ماحول میں محسوس کرتا۔

اخلاقی اوصاف میں آپ کی سب سے نمایاں جھلک طلبہ کے ساتھ بے پناہ شفقت اور خیر خواہی تھی۔ امتحانات کے دنوں میں آپ کی بے قراری دیدنی ہوتی۔ گویا آپ خود امتحان دے رہے ہوں۔ آپ کو یہ فکر لاحق رہتی کہ کہیں کوئی طالبِ علم ناکام نہ ہو جائے، کسی کی محنت رائیگاں نہ ہو جائے۔ بیماری اور ضعف کے ایام میں بھی درس کا شوق سرد نہ پڑا۔ جسمانی عوارض کے باوجود تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ استقامت دراصل علم سے عشق اور ذمہ داری کے احساس کا مظہر تھی۔ آج آپ کے شاگردوں کی طویل فہرست ملک و بیرونِ ملک پھیلی ہوئی ہے۔ سبھی اپنے مقام پر خدمتِ دین و دنیا میں مصروف ہیں۔ یہی آپ کی زندگی کا روشن ترین سرمایہ اور صدقۂ جاریہ ہے، جو رہتی دنیا تک آپ کے فیض کو جاری وساری رکھے گا۔

رمضان المبارک کی شب ہائے قدر میں آپ نے راقم اور برادرِ محترم حجۃ الاسلام مولانا حسن اختر کو

فون پر اپنے لیے اور شریکۂ حیات کے لیے دعا کی تلقین کی۔ یہ ہماری آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ آپ کی رحلت نے ہمیں روحانی یتیمی کا احساس دلایا۔ میری متعدد کتب پر آپ نے عالمانہ تقریظیں تحریر کی تھیں۔

دوشنبہ کی شب دس بجے پورہ معروف میں عالی جناب مولانا ناظم علی صاحب قبلہ واعظ خیرآبادی دام ظلہ العالی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ علما، فضلا، مومنین اور شاگردوں کی کثرت قابلِ دید تھی۔ تدفین کے بعد رات ایک بجے گھر (مبارک پور) واپسی ہوئی۔ نمازِ وحشت ادا کی گئی اور دعائے مغفرت کا اہتمام ہوا۔

آپ کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر مولانا ذیشان حیدر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (لکھنؤ کیمپس) میں پروفیسر ہیں، منجھلے بیٹے ماسٹر سلمان حیدر اور ان کی اہلیہ مضافات مئو میں اسکول ٹیچر ہیں، جب کہ چھوٹے صاحبزادے مولانا فیضان حیدر 'فیضانِ ادب' کے ذریعے علمی و ادبی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں اور دربھنگہ (بہار) کے سی۔ایم کالج (للت نارائن متھلا یونیورسٹی) میں بحیثیت استاد خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین کی شخصیت علم و عمل، اخلاق و ایثار اور تدریس و تربیت کا حسین امتزاج تھی۔ انھوں نے اپنے کردار اور خدمات سے ثابت کیا کہ ایک استاد معلّم ہی نہیں بلکہ رہبرِ قوم بھی ہوتا ہے۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مدتوں پُر نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، درجات بلند کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عنایت فرمائے۔ ع:

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

علمی ورثہ اور فکری جہات:

مولانا ارشاد حسین کی علمی زندگی کا ایک اہم پہلو اُن کی تصنیفی و تحقیقی خدمات ہیں۔ اگرچہ آپ کی بیشتر تصانیف غیر مطبوعہ رہیں، تاہم اُن کا علمی وزن اس بات کا متقاضی ہے کہ انھیں باقاعدہ اشاعت کے ذریعے علمی دنیا کے سامنے لایا جائے۔ آپ کے آثار کی فہرست نہایت متنوع اور جامع ہے، جو آپ کی فکری وسعت اور تحقیقی ذوق کی آئینہ دار ہے:

۱۔ فلسفۂ توحید: اس کتاب میں توحید کے نظری و عملی پہلوؤں کو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے توحید کو کلامی مسئلہ نہیں بلکہ انسانی حیات کے ہمہ گیر نظام کے طور پر واضح کیا۔

۲۔ افادیتِ نماز: اس تصنیف میں نماز کے روحانی، اخلاقی اور سماجی اثرات کو مدلل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۔افادیتِ روزہ: روزے کی انفرادی و اجتماعی حکمتوں پر مشتمل یہ تحریر فقہی اور عرفانی دونوں جہات کی حامل ہے۔

۴۔تفسیرِ قرآن (چند چھوٹی سورتوں کی فلسفیانہ تشریح): اس میں آپ نے مختصر سورتوں کی فلسفیانہ تفسیر کی ہے، جس سے قرآن فہمی کا ایک نیا زاویہ سامنے آتا ہے۔

۵۔بلاغتِ قرآن: اعجازِ بیانی اور اسلوبیاتی محاسن پر مبنی یہ کام آپ کے ادبی ذوق کی علامت ہے۔

۶۔علومُ القرآن: قرآنی مباحث کے مختلف عناوین پر تحقیقی مواد، جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ پروف ریڈنگ کے مرحلے میں ہے۔ان شاءاللہ عنقریب منظرِ عام پر آئے گا۔

۷۔ارمغانِ ارشاد: آپ کا شعری سرمایہ فکری سنجیدگی اور جذبۂ عشق و معرفت سے لبریز ہے۔اس میں حمد، مناجات، نعت، منقبت، غزل، رباعی، قطعہ، سلام، نظم اور دیگر اصنافِ سخن شامل ہیں۔ان شاءاللہ یہ شعری مجموعہ جلد ہی منظرِ عام پر آئے گا۔

۸۔بیس سے زائد تقاریظ: متعدد علمی، ادبی اور مذہبی کتب پر آپ نے تقریظات لکھی ہیں جو بذاتِ خود علمی اسناد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۹۔غرائب القرآن: اس میں قرآن مجید کی سو اہم آیات کو سوال و جواب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۰۔متعدد مضامین (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) جن میں سے کچھ مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور کچھ ابھی اشاعت کے منتظر ہیں۔

۱۱۔'امام خمینی کی شاعری میں عشق و عرفان': یہ سلسلۂ مضامین چند اقساط پر مشتمل ہے۔اس کی چند قسطیں 'فیضانِ ادب' میں شائع بھی ہوئی ہیں۔(ملاحظہ ہو: کشکولِ اظہری، جلد ۲۵، ص ۵۲۔۵۵)

یہ فہرست اس امر کی شاہد ہے کہ آپ کی علمی کاوشیں فقط تدریس تک محدود نہ تھیں بلکہ تحقیق و تصنیف اور تنقید کے میدان میں بھی آپ کی گہری دلچسپی تھی۔کشکولِ اظہری کی پچیسویں جلد کی ترتیبِ جدید کے دوران جب یہ سطور تحریر کی جا رہی تھیں تو مولانا ارشاد حسین معروفی کی رحلت کی جانسوز خبر موصول ہوئی۔ چنانچہ ان کے حالات و آثار کا اضافہ اس جلد میں کر دیا گیا تاکہ یہ علمی یادگار محفوظ رہے۔(کشکولِ اظہری، جلد ۲۵، ص ۵۰۔۵۲، بعد نمبر ۴۳/۲۸/؛ نیز جلد ۸، نمبر ۷۹) دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، ان کے آثار کو شرفِ قبولیت عطا کرے، اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالسلام جیلانی
صدر شعبۂ فارسی، ملت کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 7505754877

مولانا ارشاد حسین کی فارسی خدمات

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین ایک جید عالم، ادیب اور مترجم تھے جنھوں نے فارسی زبان و ادب کی خدمت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ کی پیدائش ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پورہ معروف، ضلع مئو (یو۔پی) میں ہوئی۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم پورہ معروف اور مبارک پور کے مدارس سے حاصل کی جب کہ اعلیٰ تعلیم جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے مکمل کی۔ تدریسی خدمات کے ساتھ آپ نے وعظ و نصیحت کے ذریعے بھی عوام کی رہنمائی کی۔ ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

مولانا کی علمی و ادبی خدمات میں مختلف دینی و اخلاقی موضوعات پر تصانیف کے ساتھ فارسی متون کے اردو تراجم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے شیخ سعدی کی 'کریما'، خاقانی کے 'قصیدۂ ایوان مدائن'، محتشم کاشانی کے دوازدہ بند کا نہایت سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا۔ ان تراجم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام قاری کے لیے بھی قابلِ فہم ہیں، جس سے فارسی ادب تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔

ترجمہ ایک نہایت دقیق فن ہے جس کے لیے زبان پر عبور اور دینی، ادبی و تاریخی شعور ضروری ہے۔ مولانا ارشاد حسین ان تمام اوصاف سے متصف تھے۔ ان کی خدمات ایسے دور میں اور بھی اہم ہو جاتی ہیں جب فارسی زبان سے رغبت کم ہوتی جا رہی ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے فارسی ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور ان کے تراجم نے اردو داں طبقے کو فارسی افکار سے روشناس کرایا۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، فارسی خدمات، اردو تراجم، کریما، قصیدۂ ایوان مدائن، دوازدہ بند، امام خمینی کی شاعری، دینی و ادبی خدمات۔

مولانا ارشاد حسین ۱۸؍اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پورہ معروف، ضلع مئو، یو۔پی میں پیدا ہوئے۔آپ نے ابتدائی تعلیم اشاعت العلوم اور ثانوی تعلیم مدرسہ باب العلم مبارک پور، اعظم گڑھ سے اور اعلیٰ تعلیم جامعہ ناظمیہ لکھنؤ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے پائی۔تحصیل علم کے بعد آپ نے مختلف مدارس وادارے میں تدریسی خدمات انجام دیں اور اپنے مواعظہ حسنہ سے خلقِ خدا کو مستفیض فرمایا۔اس کے بعد اس جہان فانی سے اپنا رختِ سفر باندھا اور ۱۴؍اپریل ۲۰۲۵ء کو مالک حقیقی سے جا ملے۔[۱]

ڈاکٹر فیضان حیدر کی قیام گاہ پر ناچیز کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ سیدھی سادی اور متانت وسنجیدگی کی حامل شخصیت نظر آئی۔دورانِ ملاقات فارسی ادب پر گفتگو چلی تو موصوف نے فارسی زبان کی ارزش و اہمیت اور متقدمین شعرا پر ایسی گفتگو کی کہ میں ششدر رہ گیا کہ اس عمر میں اتنی اچھی یادداشت وہ بھی تسلسل کے ساتھ، جملے چھوٹے چھوٹے اور ٹھہر کر بولتے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ وہ درس گاہ میں درس دے رہے ہوں۔

مولانا ارشاد حسین ان عبقری شخصیات میں سے ہیں، جو دینی علوم کے ساتھ عصری علوم سے بھی کماحقہ واقف اور عربی، فارسی، اردو، ہندی زبانوں سے بخوبی آشنا تھے۔طبیعت موزوں پائی تھی، اسی لیے شعروادب سے بھی ذوق رکھتے تھے۔چنانچہ نظم ونثر دونوں میدانوں میں آپ کے علمی آثار موجود ہیں۔ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

علمی خدمات: فلسفہ توحید، بلاغت القرآن، علوم القرآن، ترجمہ معراج العقول [نامکمل]، افادیت نماز، افادیت روزہ وغیرہ جو زیر طبع ہیں۔صد پند لقمان، کریما، قصیدہ ایوان مدائن، دوازدہ بند محتشم کاشانی اور امام خمینی کے منتخب عشقیہ وعرفانی اشعار کے اردو ترجمے جو شائع ہو چکے ہیں۔یہ ترجمے اتنے آسان اور سلیس ہیں کہ عام قاری بھی اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔مذکورہ تصانیف اور تراجم سے موصوف کی علمی صلاحیتوں اور مختلف زبانوں سے آشنائی کا علم ہوتا ہے۔لیکن یہاں ان کی فارسی خدمات زیر بحث ہے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بڑا دشوار کن عمل ہے۔اول تو مترجم کا دونوں زبانوں (یعنی جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے) پر مہارت ہونا ضروری ہے۔دوسرے قرآن وحدیث، عربی وفارسی تراکیب، اقوال علما وبزرگان اور تاریخ کی بھی کماحقہ واقفیت ہونا لازمی ہے تاکہ متن کا مفہوم اور شاعر وادیب کا مقصود ترجمے میں صاف دکھائی دے۔

کریما: شیخ سعدی کی تصنیف پندنامہ کا ایک حصہ ہے جو اخلاقیات پر مبنی ہے۔شیخ سعدی (وفات: ۵۸۰ھ)[۲] فارسی ادب کے مشہور شاعر وادیب ہیں۔نثر میں ان کی تصنیف گلستاں ہے جو آداب

معاشرت، تربیت اور اخلاق پر مشتمل ہے۔ منظوم تصانیف میں بوستان (اخلاقی مثنوی)، پند نامہ (اخلاقی رسالہ) اور کلیات ہیں، جن میں فارسی و عربی قصائد، مراثی، غزلیات، رباعیات، خطابات، ہزلیات اور قطعات وغیرہ شامل ہیں۔

جب ہندوستان میں فارسی زبان سکہ رائج الوقت تھی تو مکاتب میں یہ رسالہ بچوں کی تربیت اور اخلاقی درستگی کے لیے پڑھایا جاتا تھا اور آج بھی بعض مدارس، مکاتب اور اسکول کے نصاب میں یہ شامل ہے۔ رسالہ کی ابتدا حمد و نعت سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد مختلف موضوعات مثلاً نفس کی پاکیزگی، عجز و انکساری، عدل و انصاف، سچائی، قناعت، سخاوت و بخشش، تکبر کی مذمت، بخل کی مذمت، جھوٹ کی مذمت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بطور نمونہ یہاں چند اشعار مولانا ارشاد حسین کے ترجمے کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نگشت[۳]

ترجمہ: تیری عمر عزیز کے چالیس سال گزر گئے۔ (مگر) تیرا مزاج لڑکپن کی حالت سے نہ پھرا۔ یعنی تمہاری عمر کے چالیس سال گزر گئے اور تو اسی بچکانہ باتوں اور کاموں میں لگا ہوا ہے۔ عمر عزیز کا اتنا بڑا حصہ گزر جانے کا تم کو احساس تک نہیں ہے۔

مکن تکیہ بر عمر نا پائیدار
مباش ایمن از بازیِ روزگار[۴]

ترجمہ: نہ ٹکنے والی عمر پر بھروسہ مت کر، زمانہ کے فریب سے بے خوف نہ رہ۔ یعنی زندگی فانی ہے اور زمانہ بے وفا ہے، اس لیے زمانہ کے مکر و فریب سے مطمئن نہ رہو۔

منہ پای بیرون ز کویِ وفا
کہ از دوستان می نیرزد جفا[۵]

ترجمہ: وفا کی گلی سے پاؤں مت نکال کہ دوستوں سے ظلم مناسب نہیں ہوتا۔

مگردان ز کوی وفا روی دل
کہ در روی جانان نباشی خجل[۶]

ترجمہ: وفا کی گلی سے منھ نہ پھیر تا کہ معشوق کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔

قصیدہ ایوان مدائن: یہ فارسی کے مشہور شاعر خاقانی کا ایک قصیدہ ہے۔ افضل الدین متخلص بہ

خاقانی ۱۱۲۶ھ میں شیروان میں پیدا ہوئے، تعلیم وتربیت پاکر شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں کمال پیدا کیا۔ ۷؎ جب وہ ۵۵۱ھ میں حج کے لیے گئے تو واپسی پر مدائن جو ساسانی بادشاہوں کا پایۂ تخت رہ چکا تھا، اسے دیکھنے کی انھیں خواہش ہوئی اور وہیں سے وہ مدائن چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر جب انھوں نے کسریٰ کے محلوں کی تباہی اور اس کی مٹتی ہوئی شوکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ان کا دل بھر آیا اور اسی دل برداشتگی کے عالم میں ایوان مدائن کے نام سے ایک قصیدہ لکھا جن کے چند اشعار مع ترجمہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

هان! ای دل عبرت بین از دیده عبر کن هان
ایوان مداین را آئینه عبرت دان ۸؎

(ترجمہ: اے عبرت سے دیکھنے والے دل! دیکھ کر عبرت حاصل کر! ایوان مدائن کو عبرت کا آئینہ سمجھ۔) یعنی اے لوگو! سلطنت وطاقت پر گھمنڈ مت کرو۔ بڑی بڑی تہذیبیں اور بڑے بڑے تاجدار مٹ گئے۔ دیکھو! کل ساسانی بادشاہوں کی کیا شان وشوکت تھی، آج ان کا نام ونشان نہیں ہے، ان کے محلات کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کھنڈرات سے عبرت حاصل کرو۔

این است همان ایوان کز نقش رخ مردم
خاکِ درِ او بودی دیوارِ نگارستان ۹؎

(ترجمہ: یہی وہ ایوان ہے جس کی دہلیز کی مٹی انسانوں کے چہرے کے نقش سے نگارستان کی دیوار بن گئی تھی۔)

خاقانیٔ ازین درگه دریوزهٔ عبرت کن
تا از درِ تو زین پس دریوزه کند خاقان ۱۰؎

(ترجمہ: اے خاقانیؔ اس درگاہ سے عبرت کی بھیک مانگ تاکہ کل خاقان (بادشاہ) تیرے در سے بھیک مانگے۔)

دوازدہ بند محتشم کاشانی: کمال الدین محتشم کاشانی ۹۰۵ھ میں کاشان میں پیدا ہوئے۔ ۱۱؎ وہیں تعلیم وتربیت پاکر پروان چڑھے، شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوگئے تو غزل وقصیدہ میں طبع آزمائی کی اور دسویں صدی ہجری کے بلند پایہ شعرا میں شمار ہوئے۔ بعد میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی کمال پیدا کیا۔ بلاشبہہ جو مقام میر انیس کو اردو مرثیہ گوئی میں حاصل ہے، وہی مقام محتشم کاشانی کو فارسی مرثیہ گوئی میں حاصل ہے۔ محتشم کاشانی کے دوازدہ بند کا ترجمہ مولانا ارشاد حسین نے کیا ہے، جس کا ایک بند

مع ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

این کشتۂ فتادہ بہ ہامون حسین توست
وین صید دست وپا زدہ درخون حسین توست

ترجمہ: یہ مقتول جو دشت میں پڑا ہوا ہے وہ آپ کا حسین ہے اور یہ شکار جس کے ہاتھ پاؤں خون میں رنگین ہیں، آپ کا حسین ہے۔

این نخل تر کز آتش جان سوزِ تشنگی
دود از زمین رساندہ بہ گردون حسین توست [۱۲]

ترجمہ: یہ نخل تر جس نے اپنی پیاس کی جاں سوز آگ کا دھواں زمین سے آسمان تک پہنچا دیا ہے، آپ کا حسین ہے۔

این ماہی فتادہ بدریای خون کہ ہست
زخم از ستارہ بر تنش افزون حسین توست

ترجمہ: یہ ماہی (مچھلی) جو دریا میں پڑی ہوئی ہے جس کے جسم پر ستاروں سے زیادہ زخم کے نشان ہیں، وہ آپ کا حسین ہے۔

این غرقہ محیط شہادت کہ روی دشت
از موج خون او شدہ گلگون حسین توست

ترجمہ: یہ شہادت کے سمندر میں ڈوبا ہوا، جس کے خون کی موج سے پورا دشت سرخ ہو گیا ہے، وہ آپ کا حسین ہے۔

این خشک لب فتادۂ دور از لبِ فرات
کز خون او زمین شدہ جیحون حسین توست

ترجمہ: یہ خشک لب جو فرات کے ساحل سے دور پڑا ہے، جس کے خون سے زمین، دریائے جیحون بن گئی ہے، آپ کا حسین ہے۔

این شاہ کم سپاہ کہ با خیل اشک و آہ
خرگاہ زین جہان زدہ بیرون حسین توست

ترجمہ: یہ مٹھی بھر لشکر کا سردار جو اشک و آہ کے گروہ کے ساتھ اس جہان فانی کے خیمہ سے کوچ کر گیا ہے، وہ آپ کا حسین ہے۔

این قالب طپان کہ چنین ماندہ بر زمین
شاہ شہید ناشدہ مدفون حسین توست

ترجمہ: یہ تڑپتا ہوا جسم جو زمین پر پڑا ہوا ہے، یہ شاہ شہیداں جو دفن نہیں ہوا ہے، وہ آپ کا حسین ہے۔

چون روی در بقیع بہ زہرا خطاب کرد
وحش زمین و مرغ ہوا را کباب کرد

ترجمہ: جب بقیع کی طرف رخ کر کے زہرا سے فریاد کی (تو ان کی پُرسوز کن آہ نے) زمین کے جانور اور ہوا میں اڑنے والے پرندوں کو کباب کر دیا۔

روح اللہ امام خمینی (وفات: ۱۹۸۹ء) بیسویں صدی عیسوی کی وہ نابغۂ روزگار شخصیت ہے جو صدیوں بعد منصۂ شہود پر آتی ہے۔ وہ عالم تھے، مفکر تھے، مدبر تھے، فلسفی تھے، سیاست داں تھے، سیاسی و مذہبی رہنما تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، اسلامی روایات کے پاسدار تھے۔ مصلح قوم تھے اور انقلاب اسلامی ایران کے علمبردار تھے۔ انھوں نے اپنے فکر و عمل سے ایران میں انقلاب برپا کر دیا۔ امام خمینی کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ابن عربی کی فلسفیانہ اور مولانا روم و حافظ کی عشقیہ شاعری سے متاثر تھے۔ آپ کے اشعار اگرچہ یک جا نہیں ملتے، لیکن جو بھی اشعار 'آثار الحجۃ' اور 'آئینہ دانشوران' میں ملتے ہیں، ان سے ان کی شاعرانہ شخصیت نکھر کر صفحۂ قرطاس پر آجاتی ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کے عشق و عرفان میں ڈوبے ہوئے اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے چند اشعار مع ترجمہ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

من در ہوای دوست گذشتم ز جان خویش
دل از وطن بریدم و از خاندان خویش [۱۳]

ترجمہ: میں نے محبوب کی تمنا میں اپنی جان گنوادی اور دل کو اپنے وطن و خاندان سے الگ تھلک کر لیا۔

من بہ خال لبت ای دوست گرفتار شدم
چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم [۱۴]

ترجمہ: اے پیارے میں تیرے ہونٹوں کے تل پر قربان ہو گیا ہوں۔ تیری خمار آلود نگاہوں کو دیکھا اور عشق کا بیمار ہو گیا۔ حافظ شیرازی کی پیروی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

الا یا ایہا الساقی ز می پرساز جامم را
کہ از جانم فرو ریزد ہوای ننگ و نامم را [۱۵]

ترجمہ: ہاں ہاں! اے ساقی میرے جام کو شرابِ عشق سے بھر دو، اس لیے کہ نام و ناموس کی خواہش میری روح سے ٹپکتی ہے۔

آن کس کہ بزعم خویش عارف باشد
غواص بدریای معارف باشد
روزی اگر از حجاب آزاد شود
بیند کہ بہ لاک خویش واقف باشد[16]

وہ شخص جو اپنے وہم و خیال میں عارف ہوتا ہے، وہ دریائے معرفت میں غوطہ لگاتا ہے۔ اگر وہ (اللہ تعالیٰ) ایک دن اپنے حجاب سے باہر آجائے تو وہ اپنی شیخی سے واقف ہوگا۔

چون بہ عشق آمدم از حوزۂ عرفان دیدم
آنچہ خواندیم و شنیدیم ہمہ باطل بود[17]

ترجمہ: جب میں وادیِ عشق میں ڈوبا تب میں نے عرفان کی منزل دیکھی کہ جو کچھ میں نے پڑھا اور سنا تھا وہ سب باطل و مہمل تھا۔

آج جب کہ تعلیم یافتہ گھروں میں فارسی زبان سے بے رغبتی و بے اعتنائی پائی جاتی ہے اور خود اپنے گھروں میں فارسی زبان اجنبی ہوتی جارہی ہے، ایسے حالات میں مولانا ارشاد حسین کے ترجمے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ لوگ جو فارسی زبان سے نابلد ہیں وہ ان اردو تراجم کے ذریعہ فارسی شعرا و ادبا کے افکار و خیالات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یقیناً مولانا ارشاد حسین نے مختلف شعرا کے کلام اور اخلاقی اشعار کے ترجمے کر کے فارسی ادب کی بہترین خدمت کی ہے۔ ان کے حالات زندگی اور علمی و ادبی کارناموں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ ایک ادیب تھے، شاعر تھے، علوم دینیہ سے واقف تھے اور اسرار و رموز الٰہی سے آشنا۔ ساتھ ہی فارسی زبان سے رغبت و لگاؤ رکھتے تھے اور اس کے فروغ کے لیے اپنے گوشۂ دل میں جگہ رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے فارسی زبان و ادب کو فروغ دینے کے لیے اپنے قلم کو جنبش دی اور فارسی ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ اسی سلسلے کی کڑی ڈاکٹر فیضان حیدر ہیں کہ ان کے والد گرامی نے اپنے فرزند ارجمند کو فارسی زبان پڑھنے کی طرف آمادہ کیا تاکہ ان کے حصے کا جو کام باقی رہ گیا ہے، وہ اسے پورا کر سکیں۔ بلاشبہہ ڈاکٹر فیضان حیدر نے اپنے والد گرامی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا اور آج وہ فارسی زبان و ادب کے استاد ہیں اور فارسی ادب کی خدمت کرنے اور اسے فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

(۱) فیضان حیدر (مدیر)، فیضانِ ادب، سہ ماہی، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۶ء، ص ۱۰
(۲) مقبول بیگ بدخشانی، ادب نامہ ایران، آئیڈیل پرنٹنگ ورکس لاہور، سن ندارد، ص ۴۳۶
(۳) فیضان حیدر (مدیر)، فیضانِ ادب، سہ ماہی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۴
(۴) ایضاً، ص ۱۶۵
(۵) ایضاً، ص ۱۷۷
(۶) ایضاً، ص ۱۷۷
(۷) مقبول بیگ بدخشانی، ادب نامہ ایران، آئیڈیل پرنٹنگ ورکس لاہور، سن ندارد، ص ۴۳۹
(۸) فیضان حیدر (مدیر)، فیضانِ ادب، سہ ماہی، جولائی تا ستمبر ۲۰۲۵ء، ص ۱۶۹
(۹) ایضاً، ص ۱۷۰
(۱۰) ایضاً، ص ۱۷۲
(۱۱) مقبول بیگ بدخشانی، ادب نامہ ایران، آئیڈیل پرنٹنگ ورکس لاہور، سن ندارد، ص ۶۲۹
(۱۲) فیضان حیدر (مدیر)، فیضانِ ادب، سہ ماہی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۷۵
(۱۳) ایضاً، جنوری تا جون ۲۰۱۶ء، ص ۱۸
(۱۴) ایضاً، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۲
(۱۵) ایضاً، ص ۱۶
(۱۶) ایضاً، ص ۲۰
(۱۷) ایضاً، ص ۲۰

☆☆☆

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن
شعبۂ عربی، فارسی، اردو و اسلامک اسٹڈیز، وشو بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن، رابطہ نمبر: 9635193411

مولانا ارشاد حسین معروفی کی ادبی خدمات

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین کا جہاں زیادہ زور اسلامی و اخلاقی کتابوں اور درس و تدریس پر تھا وہیں دوسری طرف ان کے فارسی سے اردو تراجم بہت پر مغز اور معنی خیز ہیں مثلاً انھوں نے خاقانی کے قصیدہ ایوان مدائن، محتشم کاشانی کے دوازدہ بند، صد پند لقمان اور شیخ سعدی کی کریما کا اردو ترجمہ بخوبی کیا ہے۔ ارشاد حسین کی شاعری باطنی جذبات و احساسات کی ترجمان ہے۔ ان کے اشعار میں مذہبی احساسات، اخلاقی اور انسانی ہمدردی کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ نعتیہ اور منقبتی شاعری میں ایک خاص روحانی کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار سادہ، مترنم اور پرکشش ہیں جو سننے والوں کے دلوں کو فرحت و انبساط بخشتے ہیں۔ ان کی حمدیں، نعتیں، منقبتیں، غزلیں اور اصلاحی اشعار آج بھی لوگوں کی سماعتوں میں گونج رہے ہیں۔ اگرچہ مولانا کی غزلیں کلاسیکی روایت کی زمین میں جڑی ہوئی شاخیں ہیں، لیکن ان کی نسوں میں وہی تازہ لہو دوڑتا ہے جو معاصر انسانی تجربے اور داخلی جدو جہد کا عطیہ ہے۔ یہ غزلیں روایت کا بوجھ نہیں اٹھاتیں بلکہ روایت کو نئے امکانات عطا کرتی ہیں۔ یہی ان کی اصل فنی قوت ہے اور ان کے کلام کی درخشاں شناخت بھی۔

کلیدی الفاظ:

حالات زندگی، ادبی خدمات، فارسی خدمات، اردو خدمات، ترجمہ کریما، ترجمہ قصیدۂ ایوان مدائن، ترجمہ دوازدہ بند، ترجمہ صد پند لقمان۔

.....

مولانا ارشاد حسین کی شخصیت میں علم، وقار، شگفتگی اور تہذیب کا ایک دل آویز امتزاج پایا جاتا

تھا۔ ان کی گفتگو میں ایسی لطافت اور دل نشینی تھی جو سننے والوں کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ ان کی ظرافت محض ہنسی مذاق تک محدود نہیں تھی بلکہ اس میں ایک اخلاقی شعور اور تہذیبی وقار بھی شامل تھا۔ ان کا لطیفہ کبھی کسی کی دل آزاری کا سبب نہیں بنتا تھا۔ وہ طنز کی دھار کو اس قدر معتدل رکھتے کہ اس میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا، نہ کہ جراحت اور دل شکنی کا۔ اسی طرح مزاح کو بھی وہ نہایت شائستگی اور اعتدال کے ساتھ برتتے تھے، جس میں نہ تمسخر کی آمیزش ہوتی اور نہ تحقیر کی کوئی جھلک۔ ان کی ہلکی سی شوخی محفل کو بوجھل بنانے کے بجائے اسے سبک اور خوش گوار بنا دیتی تھی۔ اس شگفتگی کے نتیجے میں نہ صرف مجلس کی فضا میں تازگی پیدا ہوتی بلکہ دلوں میں قربت بھی بڑھتی اور گفتگو زیادہ قابلِ قبول ہو جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ مولانا ظرافت کو تفریح کا محض ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے تہذیبِ کلام اور تسہیلِ ابلاغ کا ایک مہذب اور باوقار اسلوب تصور کرتے تھے، جہاں مسکراہٹ فکر کی راہوں کو ہموار کرتی اور شگفتگی سنجیدگی کی رفیق بن کر جلوہ گر ہوتی۔

مولانا ارشاد حسین ابن محمد شمس الدین ابن محمد سلیمان کربلائی کی پیدائش ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو اتر پردیش کے ضلع مئو کے مردم خیز اور علمی قصبہ پورہ معروف میں ہوئی۔ یہ خطہ قدیم زمانے سے دینی اور علمی روایات کا حامل رہا ہے، جہاں مذہبی تعلیم اور علمی ذوق کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مولانا کا تعلق بھی ایک ایسے گھرانے سے تھا جس میں دین داری، علمی شغف اور اخلاقی تربیت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن ہی سے ان کے اندر علم سے محبت اور دینی خدمات کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے مقامی مدرسہ میں حاصل کی جہاں انھوں نے قرآنِ کریم کی تعلیم کے ساتھ ابتدائی اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لیے مدرسہ بابُ العلم مبارک پور (اعظم گڑھ) میں داخل ہوئے۔ یہ ادارہ اپنے علمی معیار اور تدریسی روایت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے اسی مدرسہ میں درجہ پنجم سے اپنی باقاعدہ دینی تعلیم کا آغاز کیا اور نہایت محنت، لگن اور علمی ذوق کے ساتھ اپنی تعلیمی منازل طے کیں۔ مدرسہ باب العلم ہی سے انھوں نے مولوی کی سند حاصل کی اور اپنی علمی استعداد کا بھرپور اظہار کیا۔

ان کی طالب علمی کے زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں مدرسہ باب العلم کی جانب سے عربی و فارسی بورڈ کے مولوی امتحان میں شریک ہونے والے تین طلبہ میں مولانا ارشاد حسین بھی شامل تھے۔ اس زمانے میں ملک میں بلیک آؤٹ کا ماحول تھا، اس کے باوجود یہ طلبہ امتحان دینے کے لیے الہ آباد گئے۔ یہ ایک نہایت دشوار اور ہمت آزما مرحلہ تھا، لیکن ان طلبہ نے نہ صرف اس امتحان میں شرکت کی بلکہ

تینوں نے فرسٹ ڈویژن سے کامیابی حاصل کر کے مدرسہ کا نام روشن کیا۔

مدرسہ باب العلم سے درجہ مولوی پاس کرنے کے بعد مولانا نے اپنی اعلیٰ دینی تعلیم جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں حاصل کی، جو برصغیر کے ممتاز دینی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں انھوں نے نہ صرف فقہ، اصول اور معقولات کی تعلیم حاصل کی بلکہ ادب اور دینیات کے مختلف علوم میں بھی مہارت پیدا کی۔ جامعہ ناظمیہ سے انھوں نے عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضل معقولات، فاضل دینیات اور ممتاز الافاضل جیسی اہم اسناد حاصل کیں۔ یہ اسناد ان کی علمی قابلیت اور تعلیمی جدوجہد کی روشن دلیل ہیں۔

جامعہ ناظمیہ میں قیام کے دوران انھیں متعدد جلیل القدر اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ ان کے اساتذہ میں حجۃ الاسلام والمسلمین مفتی سید احمد علی، مولانا محمد حسین نجفی، مولانا سید مرتضیٰ نقوی، مولانا سید محمد اطہر، مولانا سید محمد شاکر، مولانا محمد ایوب، مولانا ابن حیدر اور مولانا روشن علی جیسے نامور اساتذہ شامل ہیں۔ ان جلیل القدر اساتذہ کی علمی تربیت و رہنمائی نے مولانا کی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔

دورِ طالب علمی میں مولانا نے متعدد اہم دینی اور ادبی کتب کا مطالعہ کیا۔ ان میں شرح لمعہ، شرح کبیر، معالم الاصول، رسائل و مکاسب، سلم العلوم، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا، شرح جامی، شافیہ، فصول اکبری، میر زاہد ملا جلال، دیوانِ متنبی، حماسہ، دیوانِ ابو طالب اور دیوانِ امیر المومنین جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ ان کتب کے گہرے مطالعے نے مولانا کے علمی ذوق کو جلا بخشی اور انھیں علومِ دینیہ کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا کو ضلع امبیڈکر نگر کے موضع دہیاور میں امامِ جمعہ و جماعت مقرر کیا گیا اور وہاں کے مکتب میں تعلیم کے لیے مامور کیا گیا۔ یہاں انھوں نے تقریباً دس برس تک نہایت اخلاص اور ذمہ داری کے ساتھ دینی خدمات انجام دیں۔ ان کی امامت صرف نماز کی ادائیگی تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اس علاقے کے دینی اور تعلیمی احیا کے لیے بھی سرگرم رہے۔ انھوں نے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور انھیں علمِ دین حاصل کرنے کی ترغیب دلائی۔ ان کی محنت اور خلوص کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے متعدد شاگرد بعد میں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے قم مقدس (ایران) گئے اور وہاں سے تعلیم حاصل کر کے قوم و ملت کی خدمت میں مصروف ہیں۔

مولانا کے شاگردوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے اور ان میں سے بہت سے افراد آج مختلف علمی و دینی اداروں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے نمایاں شاگردوں میں مولانا کرار حسین اظہری، مولانا سلطان حسین، مولانا کاظم حسین، مولانا ڈاکٹر اصغر اعجاز، مولانا ڈاکٹر ذیشان حیدر، مولانا ڈاکٹر احتشام الحسن،

مولانا سید محمد عباس رضوی اور مولانا سبط حیدر جیسے نام شامل ہیں۔ یہ شاگرد آج اپنے اپنے میدان میں خدمات انجام دے کر اپنے استاد کی علمی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین کا انتقال ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو ایرا لکھنؤ میڈیکل کالج میں ہوا۔ ان کی وفات علمی اور دینی حلقوں کے لیے ایک بڑا صدمہ تھی۔ انھوں نے اس دارِ فانی کو خیر باد کہہ کر حیاتِ جاوداں کی طرف سفر کیا، مگر ان کی خدمات، ان کا اخلاق، اور ان کی علمی یادگاریں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ان کے شاگرد، اہلِ خانہ اور عقیدت مند آج بھی ان کی تعلیمات اور اخلاقی وراثت کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی دو بیٹیوں کی شادیاں ان کی زندگی ہی میں ہو چکی تھیں۔ ان کے بیٹوں میں ڈاکٹر ذیشان حیدر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سلمان حیدر سرکاری اسکول میں بطور استاد خدمات انجام دے رہے ہیں، جب کہ ڈاکٹر فیضان حیدر دربھنگہ (بہار) میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یوں مولانا کی علمی و اخلاقی روایت ان کے اہلِ خانہ کے ذریعے بھی آگے بڑھ رہی ہے اور ان کی یادیں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

مولانا کو زندگی میں مختلف ناپسندیدہ حالات کا مقابلہ کرنا پڑا مگر علم کے ساتھ حلم اور دانش و بینش کے ساتھ صبر کی شمشیر آبدار سے حالات کی خرابیوں کو قطع و بریدہ کر کے نہایت سکون سے مقابلہ کرتے رہے اور اپنے علمی، دینی اور تدریسی مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔ مدرسہ سے سبک دوش ہونے کے بعد جب وطن میں مقیم ہو گئے اور اس کے قبل بھی جب وطن تشریف لاتے تھے تو وطن کے سنی علما بھی منطق اور فلسفہ کے مباحث کی تشریح و تحلیل کے لیے مولانا سے رابطے کرتے اور مولانا نہایت خندہ پیشانی سے ان کے مشکل مسائل و سوالات کو حل کرتے تھے جس کے نتیجہ میں اہل سنت کے علما بھی ان کے بے حد گرویدہ تھے۔

مولانا کا طریقہ تدریس ایسا تھا کہ بچوں کے ذہن میں درس کا مفہوم نقش ہو جایا کرتا تھا۔ وہ بچوں کو بڑے خلوص سے درس دیتے تھے۔ ان کی نظر ہمیشہ کمزور طلبہ پر ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے پڑھائے ہوئے بچے ان کی پڑھائی ہوئی کتابوں میں کبھی ناکام نہیں ہوتے تھے۔ مدرسہ بورڈ کے امتحانات کے دوران ان کی جلالت علمی کا صحیح اندازہ ہوتا تھا۔ ان سے جس فن کا جو سوال کیا جاتا فی البدیہ ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیا کرتے تھے، جیسے تمام علوم ان کے سامنے مستحضر ہوں۔ یہ کمال بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

ادبی خدمات:

بانی 'ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی' اور رسالہ 'فیضان ادب' کے سرپرست مولانا ارشاد حسین علمی و ادبی ذوق کے مالک تھے اور یہ آپ کی شخصیت کا نمایاں کارنامہ ہے۔ آپ نکتہ سنج اور صاحب اسلوب تھے، اور دقیق مضامین کے مصنف بھی۔ شاعری میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی تحریروں میں استدلال کی قوت، زبان کی صفائی اور فکر کی گہرائی نمایاں ہے۔ آپ بہترین استاد اور با اخلاق انسان تھے، آپ کا انداز فقط درس و تدریس کی تکمیل تک محدود نہ تھا، بلکہ ذہن سازی، تربیت اور فکری آبیاری اس کا اصل مقصد تھا۔ مشکل ترین مباحث کو سادہ، مربوط اور قابل فہم انداز میں بیان کرنا آپ کا خاص وصف تھا۔ آپ درس دیتے ہوئے عبارت کی تہ تک پہنچتے، پس منظر واضح کرتے، احتمالات بیان کرتے اور پھر ترجیحی رائے دلائل کے ساتھ پیش فرماتے۔ طلبہ کو سوال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کے اشکالات کو نہایت سنجیدگی سے سنتے۔ آپ کی گفتگو میں ٹھہراؤ، استدلال میں توازن اور لہجے میں شفقت ایسی ہم آہنگی کے ساتھ جمع تھی کہ طالب علم خود کو محفوظ اور باوقار ماحول میں محسوس کیا کرتے تھے۔

فارسی خدمات:

۱۔ مولانا ارشاد حسین نے مختلف شعرا، فلاسفہ اور حکما مثلاً شیخ سعدی، محتشم کاشانی، خاقانی اور حکیم لقمان کے کلام کو فارسی سے اردو تراجم کے ذریعے دقیق اور معنی خیز انداز میں پیش کیا، جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ خاقانی کے 'قصیدہ ایوان مدائن' کے ترجمہ کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں ۔

هان! ای دل عبرت بین! از دیده عبر کن !هاں
ایوان مداین را آئینۂ عبرت دان!

ترجمہ: اے عبرت سے دیکھنے والے دل! دیکھ کر عبرت حاصل کر! ایوان مدائن کو عبرت کا آئینہ سمجھ!

خود دجله چنان گرید صد دجلۂ خون گویی
کز گرمی خونابش آتش چکد از مژگان

ترجمہ: خود دجلہ اس طرح گریہ کناں ہے جیسے سو خونیں نہریں بہہ رہی ہوں، اس کے خون آلود پانی کی گرمی سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پلکوں سے آگ ٹپک رہی ہو۔

دندانۂ هر قصری پندی دهت نو نو
پند سر دندانه بشنو ز بن دندان

ترجمہ: ہر قصر کی بنیاد تم کو نصیحت آمیز سبق دے گی، محل کی چوٹی سے نصیحت سن جو اس کی بنیاد (موجودہ کھنڈر) میں ہے۔[۱]

۲۔ شیخ سعدی شیرازی کی 'کریما' کو جو متعدد عنوان کے تحت اخلاقیات، پند و نصائح، حکمت اور فلسفہ مثلاً در ثنای پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، خطاب بہ نفس، در مدح کرم، در صفت سخاوت، در مذمت بخیل، در صفت تواضع، در مذمت تکبر، در فضیلت علم، در فضیلت عدل، در مذمت ظلم، در صفت قناعت، در مذمت حرص، در صفت طاعت و عبادت، در مذمت شیطان، در بیان شراب عشق، در صفت وفا، در بیان راستی، در بیان صبر، در بیان فضیلت شکر، در مذمت کذب اور در منع امید از مخلوقات پر مشتمل ہے، نہایت پر معنی اور سلیس انداز میں ترجمہ کیا ہے۔ چند اشعار مع اردو ترجمہ اس طرح ہیں ؎

تکبر مکن زینہار ای پسر
کہ روزی ز دستش در آیی بہ سر

ترجمہ: اے لڑکے! ہرگز تکبر نہ کر کہ ایک دن اس کے ہاتھ سے منھ کے بل گرے گا۔

بنی آدم از علم یابد کمال
نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

ترجمہ: اولاد آدم علم سے کمال پاتی ہے شوکت و مرتبہ اور مال و متاع سے نہیں۔

چو ایزد ترا این ہمہ کام داد
چرا بر نیاری سر انجام داد

ترجمہ: جب اللہ نے تجھ کو یہ تمام کام بخشے ہیں تو کیوں عدل کے تقاضے کو پورا نہیں کرتا۔

دلا! در قناعت بہ دست آوری
در اقلیم راحت کنی سروری

ترجمہ: اے دل اگر تو قناعت حاصل کرے تو راحت کے ملک میں حکومت کرے۔[۲]

۳۔ مولانا ارشاد حسین نے کمال الدین علی محتشم کاشانی کے 'دوازدہ بند' جو کربلا سے متعلق ہے، کا فارسی سے اردو میں نہایت خوش اسلوبی اور معنی خیز انداز میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا پہلا بند مثال کے لیے مع ترجمہ ملاحظہ کریں ؎

باز این چہ شورش است کہ در خلق عالم است — باز این چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است
باز این چہ رستخیز عظیم است کز زمیں — بی نفخ صور خاستہ تا عرش اعظم است

این صبح تیرہ باز دمید از کجا کزو کار جہان و خلق جہان جملہ درہم است
گویا طلوع می‌کند از مغرب آفتاب کاشوب در تمامی ذرّات عالم است
گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست این رستخیز عام کہ نامش محرم است
در بارگاہ قدس کہ جای ملال نیست سرہای قدسیان ہمہ بر زانوی غم است
جن و ملک بر آدمیان نوحہ می‌کنند گویا عزایِ اشرفِ اولادِ آدم است

خورشیدِ آسمان و زمین نورِ مشرقین
پروردۂ کنار رسول خدا حسین

اردو ترجمہ: ۱۔ یہ کیسی فریاد و فغاں، کیسی عزا اور کیسا نوحہ و ماتم ہے جو مخلوقات میں برپا ہے؟؛ ۲۔ یہ کیسی قیامت عظمیٰ ہے جو حضرت اسرافیلؑ کے صور پھونکے بغیر زمین سے عرش اعظم تک مچی ہوئی ہے؟؛ ۳۔ یہ تاریک صبح کہاں سے نکل آئی جس کے باعث دنیا اور مخلوق کے سارے کام ٹھپ پڑ گئے ہیں۔؛ ۴۔ گویا مغرب سے آفتاب طلوع ہو گیا ہے (جو آثار قیامت میں سے ایک ہے) جس کی وجہ سے دنیا کے تمام ذرّات میں انتشار ہے۔؛ ۵۔ یہ عام قیامت جس کا نام محرم ہے، اگر میں اسے قیامت دنیا سے تعبیر کروں تو غلط نہ ہوگا۔؛ ۶۔ رب کی مقدس بارگاہ میں جو رنج و غم سے عاری ہے، وہاں بھی تمام قدسیوں کے سر غم کی وجہ سے زانو پر جھکے ہوئے ہیں۔؛ ۷۔ جن و ملک آدمیوں پر نوحہ کر رہے ہیں گویا یہ اولاد آدم کے شریف ترین انسان کی عزا ہے۔؛ ۸۔ (ہاں وہ) آسمان و زمین کے آفتاب، شرق و غرب کے نور، رسول خدا کی آغوش کے پروردہ حسین ہیں۔[۳]

۴۔ معروفی صاحب نے 'صد پند لقمان' کو بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے جو بہت پر کشش اور دلچسپ ہے، جس کی چند نصیحتیں بطور مثال مع اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ فرزندم ہیچ کس و ہیچ چیز را با خدا شریک مکن۔
اردو ترجمہ: میرے بیٹے! کسی شخص اور کسی چیز کو خدا کا شریک نہ کر۔
۲۔ با پدر و مادرت بہترین رفتار را داشتہ باش۔
اپنے ماں باپ کے ساتھ بہترین سلوک کر۔
۳۔ بدان کہ ہیچ چیز از خدا پنہان نمی ماند۔
یاد رکھ کہ کوئی چیز خدا سے پوشیدہ نہیں رہتی۔
۴۔ نماز را آن گونہ کہ شایستہ است بپادار۔

نماز کو جس طرح مناسب ہو قائم رکھ۔[۴]

علمی و ادبی اور مذہبی خدمات:

مولانا ارشاد حسین کی فارسی اور اردو ادب میں بہترین خدمات ہیں، ان کی زندگی کا ایک اہم پہلو ان کی تصنیفی و تحقیقی سرگرمیاں ہیں۔ اگرچہ آپ کی بیشتر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں، تاہم ان کا علمی وزن اس بات کا متقاضی ہے کہ انھیں باقاعدہ اشاعت کے ذریعے علمی دنیا کے سامنے لایا جائے۔ آپ کی کاوش اور آثار کی فہرست نہایت متنوع اور جامع ہے، جو آپ کی فکری وسعت اور تحقیقی ذوق کی آئینہ دار ہے:

۱۔ فلسفۂ توحید: اس کتاب میں توحید کے نظری و عملی پہلوؤں کو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے توحید کو کلامی مسئلہ نہیں بلکہ انسانی حیات کے ہمہ گیر نظام کے طور پر واضح کیا۔

۲۔ افادیت نماز: اس کتاب میں نماز کے روحانی، اخلاقی اور سماجی اثرات کو مدلل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ افادیت روزہ: روزے کی انفرادی و اجتماعی حکمتوں پر مشتمل یہ تحریر فقہی اور عرفانی دونوں جہات کی حامل ہے۔

۴۔ تفسیر قرآن: (اس میں چند چھوٹی سورتوں کی فلسفیانہ تشریح ہے): ارشاد صاحب نے اس میں مختصر سورتوں کی فکری اور فلسفیانہ توضیح کی ہے، جس سے قرآن فہمی کا ایک نیا زاویہ سامنے آجاتا ہے۔

۵۔ بلاغت قرآن: اعجاز بیانی اور اسلوبیاتی محاسن پر مبنی یہ کام آپ کے ادبی ذوق کی علامت ہے۔

۶۔ علوم القرآن: قرآنی مباحث کے مختلف عناوین پر تحقیقی مواد، جو ابھی غیر مطبوعہ اور پروف ریڈنگ کے مرحلے میں ہے۔ جلد ہی منظر عام پر آنے کی امید ہے۔

۷۔ ارمغان ارشاد: آپ کا شعری سرمایہ، جس میں حمد، مناجات، نعت، منقبت، غزل، رباعی، قطعہ، اور دیگر اصناف شامل ہیں۔ (زیر طبع)

۸۔ تقریباً بیس تقاریظ: متعدد علمی کتب پر آپ کی تقریظات، جو بذات خود علمی اسناد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۹۔ غرائب القرآن: اس میں قرآن مجید کی سو اہم آیات کو سوال و جواب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۰۔ متعدد مضامین (مطبوعہ و غیر مطبوعہ): مختلف رسائل و جرائد میں شائع شدہ اور غیر مطبوعہ مقالات۔

۱۱۔امام خمینی کی شاعری میں عشق وعرفان: یہ سلسلۂ مضامین چند اقساط پر مشتمل ہے۔اس کے بعض حصے 'فیضان ادب' میں شائع بھی ہوئے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے جن کی ذات میں دینی بصیرت، روحانی بالیدگی اور ادبی لطافت اس طرح باہم مدغم ہوگئی تھیں کہ ان کی تخلیقی شخصیت ایک منفرد ہم آہنگی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ان کے یہاں شاعری محض اظہارِ فن کا ذریعہ نہیں بلکہ تزکیۂ نفس، فکری تطہیر اور خودسازی کا ایک موثر وسیلہ بھی تھی۔

اگر ان کے کلام کو شعریات کے بنیادی اصولوں، فنی سومات، جمالیاتی اقدار اور تصورِ حیات و کائنات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کی تخلیقی شخصیت اپنی پوری تابندگی کے ساتھ نمایاں ہوجاتی ہے۔وہ شاعری کو صرف جذبات کے بے ساختہ اظہار تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے ایک منظم فنی ضابطے کے طور پر برتتے ہیں، جہاں ہیئت، عروض، زبان اور معنی باہم مل کر ایک متوازن اور مربوط وحدت کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔اس فنی توازن کے باعث ان کا کلام نہ صرف فکری اعتبار سے وقیع نظر آتا ہے بلکہ جمالیاتی سطح پر بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔[۵]

مولانا ارشاد کی غزل گوئی کلاسیکی اردو غزل کی روایت سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ان کے اشعار معنویت، روانی اور بندش کی چستی کے حامل ہیں اور ان میں اظہار کی ایک سلیقہ مند سادگی پائی جاتی ہے۔ عشق، ہجر، بے بسی اور انسانی کرب جیسے موضوعات ان کے یہاں محض ذاتی تجربات کی صورت میں نہیں بلکہ ایک علامتی اور آفاقی معنی اختیار کر لیتے ہیں، جس سے ان کے کلام میں فکری وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ جمالیاتی سطح پر ان کی شاعری میں لفظیات کی نزاکت، تشبیہات کی لطافت، استعارات کی گہرائی اور تلمیحات کی فنی ترتیب اشعار کی معنویت کو دو چند کر دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ ایک شعوری فنی عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حمد، مناجات، نعت، منقبت اور سلام کی اصناف میں بھی مولانا ارشاد حسین نے اپنے فنی کمال کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عقیدت کے جذبات کو محض جذباتیت تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے فکری شعور اور فنی وقار کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ان کی حمدیہ شاعری توحید اور عرفانِ الٰہی کی ترجمان ہے، جب کہ نعتیہ کلام میں عشقِ رسول، ادب اور احتیاط کا ایک نہایت حسین امتزاج نظر آتا ہے۔اسی طرح منقبت اور سلام میں انھوں نے اہلِ بیتِ رسولؐ کی قربانیوں اور ان کے اخلاقی و روحانی پیغام کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ صرف مذہبی عقیدت کا اظہار نہیں رہتا بلکہ ایک

تہذیبی، اخلاقی اور انسانی قدر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس طرح مولانا ارشاد حسین کی شاعری دینی شعور، روحانی احساس اور ادبی جمالیات کے سنگم کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان کی شخصیت کے ہمہ جہت علمی و فکری وقار کا عکاس ہے۔

امام خمینی کے حوالے سے مضامین کے مطالعے سے یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ مولانا ارشاد حسین نے نہایت بصیرت افروز، طائرانہ مگر جامع انداز میں امام خمینی کی ہمہ جہت شخصیت کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ انھوں نے امام خمینی کو محض ایک سیاسی یا مذہبی رہنما کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ ان کی شخصیت کے مختلف علمی و روحانی پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ وار تحریر میں امام خمینی کے شاعرانہ ذوق، فلسفیانہ انداز فکر، عارفانہ واردات، دانشمندانہ بصیرت اور ایک جلیل القدر فقیہ و عالمِ دین کی حیثیت سے ان کی کردار سازی کو بڑی مہارت کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ مضمون کی چوتھی قسط میں مولانا ارشاد حسین نے تصوف اور عرفان کی معروف اصطلاح یعنی 'شراب' کی معنوی اور علامتی حیثیت کو بڑی لطافت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق شراب یہاں اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں بلکہ بطورِ مطلق مستی، مدہوشی اور جذبۂ محبتِ حق کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ عارفوں اور سالکوں کی اصطلاح میں یہ وہ روحانی کیف و سرور ہے جو انسان کو محبتِ الٰہی کی شدت میں سرشار کر دیتا ہے۔ اسی مناسبت سے عشق، ذوق، وجد، مستی اور مدہوشی جیسی روحانی کیفیات کو بھی شراب سے تشبیہ دی جاتی ہے، کیوں کہ یہ کیفیات انسان کو ظاہری حدود سے اوپر اٹھا کر ایک اعلیٰ روحانی تجربے سے آشنا کرتی ہیں۔

اسی ضمن میں مولانا ارشاد حسین نے عارفِ نامدار عراقی ہمدانی کی تعبیر کا حوالہ دیتے ہوئے اس نکتے کو واضح کیا ہے کہ شراب دراصل عشق کے غلبے کی علامت ہے۔ جب عشقِ حقیقی کا غلبہ دل و دماغ پر چھا جاتا ہے تو انسان کی حرکات و سکنات عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں بعض اعمال بظاہر سادہ لوح افراد کو باعثِ ملامت محسوس ہوتے ہیں، حالاں کہ حقیقت میں وہ روحانی واردات اور سلوک کی بلند منازل کا مظہر ہوتے ہیں۔ اسی لیے اہلِ کمال وہی افراد قرار پاتے ہیں جو سیر و سلوک کی انتہائی منازل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور جن کی باطنی کیفیت عام انسانی پیمانوں سے مختلف ہوتی ہے۔

امام خمینی کی شاعری اور فکری روایت بھی اسی عارفانہ ذوق سے سرشار ہے، جہاں عشقِ الٰہی کی شدت انسان کو ظاہری قیود سے آزاد کر کے حقیقتِ مطلق کے ادراک تک پہنچا دیتی ہے۔ اس طرح مولانا ارشاد حسین کی یہ تحریر نہ صرف امام خمینی کی فکری و روحانی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ

عرفانی ادب کی باریک اور رمزی اصطلاحات کی معنوی گہرائی کو بھی نہایت بلیغ اور دل نشیں انداز میں واضح کرتی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ایوان مدائن (اردو ترجمہ): مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب، جولائی تا ستمبر ۲۰۲۵ء، ص ۱۶۹۔۱۷۰

۲۔کریما (اردو ترجمہ): مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۸۔۱۷۲

۳۔دوازدہ بند (اردو ترجمہ): مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۵ و ۱۷۱

۴۔صد پند لقمان (اردو ترجمہ): مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب، جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء، ص ۱۵۰

۵۔فیضان ادب، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۶ء، ص ۱۳۷۔۱۴۰

☆☆☆

ڈاکٹر رفیق احمد
استاد شعبۂ اردو، ڈی سی ایس کے پی جی کالج، مئوناتھ بھنجن، رابطہ نمبر: 9236126977

مولانا ارشاد حسین معروفی: حیات اور تخلیقی سفر

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی پورہ معروف (مئو) کے ایک جید عالم، قادر الکلام شاعر اور مخلص مدرس تھے، جنھوں نے علمی، ادبی اور دینی میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے اور ۱۴/ اپریل ۲۰۲۵ء کو وفات پائی۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم پورہ معروف اور مبارک پور میں حاصل کی، جب کہ اعلیٰ تعلیم جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے مکمل کی۔ درس و تدریس کو بطور پیشہ اختیار کرتے ہوئے مختلف اداروں میں خدمات انجام دیں اور ۲۰۱۲ء میں سبک دوش ہوئے۔

مولانا معروفی عربی و فارسی پر گہری دسترس رکھتے تھے اور علومِ قرآن، ترجمہ نگاری اور کلاسیکی ادب میں نمایاں مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی کے اہم متون کا اردو ترجمہ کیا، جن میں خاقانی کے قصیدہ 'ایوانِ مدائن'، سعدی کی 'کریما' اور دیگر تصانیف شامل ہیں۔ شاعری میں ان کی شناخت ایک سنجیدہ غزل گو کی حیثیت سے ہے، جن کے یہاں عرفانِ ذات، احتسابِ نفس اور جمالیاتی اقدار کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت اور عصری شعور کا خوب صورت سنگم نظر آتا ہے۔ انھوں نے حمد، نعت، منقبت، غزل اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی۔ بحیثیت مجموعی مولانا معروفی کی شخصیت علم، ادب اور تدریس کا روشن استعارہ ہے، اور ان کی ادبی میراث نئی نسل کے لیے قیمتی سرمایہ۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، اردو شاعری، غزل، کلاسیکی ادب، فارسی ترجمہ، علومِ قرآن، تدریس، ادبی خدمات، عرفانِ ذات، جمالیات، فیضانِ ادب، تحقیقی خدمات۔

شہر ہنروراں اور دیارِ فضا ابن فیضی مئوناتھ بھنجن سے تقریباً سات کلومیٹر کی دوری پر شمال مغرب کی جانب ٹونس ندی کے کنارے پر واقع پورہ معروف (پورہ گھاٹ) کا زرخیز اور مردم خیز علاقہ اہل علم اور نامور علما حضرات کی ایسی بستی ہے جس کی سیر دیدۂ عبرت نگاہ سے ضرور کرنی چاہیے۔ ماضی قریب اور عصر حاضر میں یہاں کے مشہور و معروف علما ہندوستان کے نامور دینی مدارس اور اسلامی طرز فکر کی دانش گاہوں میں تشنگان علوم اسلامیہ کو سیراب کر رہے ہیں۔ پورہ معروف میں دینی تعلیم کا غلبہ ہے جو قابل تعریف ہے، مگر بدلتے ہوئے حالات میں عصری تقاضوں کے مدنظر یہاں اب جدید علوم کے ادارے کی جانب بھی توجہ دینی چاہیے، جو وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ امید ہے کہ اس جانب یہاں کے اہل علم اور دانشور حضرات خصوصی توجہ دیں گے۔

پورہ معروف کے زرخیز علمی علاقے میں جو دینی و اسلامی ادارے اور مدارس و جامعات ہیں ان میں خاص طور سے مدرسہ معروفیہ، مدرسہ سراج العلوم، مدرسہ اشاعت العلوم، مدرسہ ضیاء العلوم، مدرسہ ابو ہریرہ اور مدرسہ امامیہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تعلیم نسواں کے نام پر صرف دینی تعلیم کا بندوبست ہے۔ اس سلسلے میں جو چار دینی و اسلامی ادارے لڑکیوں کی مذہبی تعلیم پر خصوصی توجہ صرف کر رہے ہیں ان میں مدرسہ ام حبیبہ، مدرسہ ہاجرہ للبنات، مدرسہ محمودیہ للبنات اور مدرسہ ابو ہریرہ للبنات کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

دینی و علمی اعتبار سے مشاہیر پورہ معروف میں ماضی قریب میں جو نامور علما تھے یا موجودہ دور میں جو اہل علم اور دانشور حضرات ملک کے مختلف علاقوں میں علمی، ادبی اور تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے اپنی گراں قدر خدمات سے تشنگان علوم کو سیراب کر چکے ہیں یا سیراب کر رہے ہیں اس کی طویل فہرست میں مولانا عبدالجبار معروفی، مولانا عبدالستار معروفی، مولانا حکیم محمد طاہر معروفی، مولانا محمد یاسین معروفی، مولانا مولانا زین العابدین معروفی، حیات طاہر کے مصنف مولانا محمد عثمان معروفی، خیر البشر کوثرؔ معروفی، مولانا ارشاد حسین معروفی، ڈاکٹر ذیشان حیدر معروفی، ڈاکٹر فیضان حیدر معروفی، مولانا ارشاد خلیل معروفی، مولانا انصار احمد معروفی، مولانا امانت اللہ معروفی اور مولانا اسامہ ارشاد معروفی وغیرہ کے اسما قابل ذکر ہیں۔

پورہ معروف کی سرزمین علمی و ادبی اور شعر و شاعری کے لحاظ سے بھی کافی زرخیز رہی ہے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے مشاہیر پورہ معروف کو خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد عثمان معروفی صاحب کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف کے علاوہ دیگر علما اور دانشور حضرات نے بھی قابل ذکر تصنیفی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ شعر و شاعری کے حوالے سے پورہ معروف کا نام ادبی دنیا تک پہنچانے میں جن لوگوں نے گراں قدر علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں، ان میں 'نغمات کوثر' کے مصنف اور نامور

شاعر خیر البشر کوثرؔ معروفی اور مولانا ارشاد حسین معروفی کا نام خصوصی طور پر توجہ کا مستحق ہے۔

مئو سے سات کلومیٹر کے معمولی فاصلے پر واقع پورہ معروف کا قصبہ ۲۰۲۳ء میں نگر پنچائت کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور اسے نگر پنچائت کرتھی جعفر پور کا نام دیا گیا ہے، مگر عوامی حلقے میں یا قصبہ پورہ گھاٹ یا پورہ معروف کے نام سے ہی مشہور و معروف ہے۔ پورہ معروف، کرتھی جعفر پور کے علمی و ادبی اور شعری منظر نامے پر نامور عالم دین اور شاعر مولانا ارشاد حسین معروفی کی علمی و ادبی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ کو شعر و شاعری اور علمی و ادبی کارناموں سے خصوصی دلچسپی تھی۔ آپ کی ولادت ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو اور وفات ۱۴/ اپریل ۲۰۲۵ء کو ہوئی۔ آپ درس و تدریس کے مقدس ترین پیشے سے وابستہ تھے۔ تدریسی مصروفیات کے علاوہ اپنے آپ کو علمی و ادبی اور تحقیقی و تخلیقی کاموں میں مشغول رکھتے تھے۔

آپ کی ابتدائی و ثانوی تعلیم پورہ معروف اور مبارک پور میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے اور مدرسہ باب العلم میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ایک طویل مدت تک مقدس پیشے تدریس سے وابستہ رہتے ہوئے ۲۰۱۲ء میں سروس سے سبک دوش اور وظیفہ یاب ہوئے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی علمی و ادبی اور شعری خدمات لائق تحسین اور قابل فخر ہیں۔ ادبیات عربی و فارسی پر آپ کو قدرتِ کاملہ اور دسترس حاصل تھی۔ علوم القران اور تراجم قرآن کے بارے میں بھی گہری واقفیت حاصل تھی اور اس میدان میں آپ نے علمی و تحقیقی کارنامے بھی انجام دیئے ہیں۔ آپ کی دو کتابیں زیر اشاعت ہیں اور چند ہی دنوں میں منظر عام پر آجائیں گی۔

مولانا ارشاد حسین پورہ معروف کے مشہور علمی و ادبی ادارہ تحقیقات اردو و فارسی کے بانی، سرپرست اور بنیاد گزار ہیں۔ افسوس کہ اس ادارے سے شائع ہونے والا معتبر اور موقر رسالہ سہ ماہی 'فیضان ادب' آپ جیسے اہل علم حضرات کی سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کا شمار ادبی دنیا میں بنیادی طور پر شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ آپ نے اردو غزل کی زلف گرہ گیر کو سنوارنے اور سجانے میں طویل مدت صرف کی ہے۔ آپ کی شاعری میں فلسفیانہ موضوعات کا بیان بڑے سادہ اور پروقار اسلوب میں ہوا ہے۔ آپ کی غزلوں میں علمی و ادبی اور دینی و مذہبی شعور نمایاں ہے۔ عصری حسیت اور جمالیاتی اقدار کا بیان آپ کی غزلیہ شاعری کی اصل شناخت ہے۔ عرفان ذات، خود احتسابی اور تصفیہ نفس آپ کی شاعری کا محور ہے۔ کلاسیکی شاعری سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی غزلوں میں متقدمین شعرا کی پیروی بڑے سلیقے سے کی ہے۔ مجموعی طور پر آپ کی شاعری کلاسیکیت اور موسیقیت کی

ترجمانی کرتی ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی صاحب کے نزدیک شاعری تفریح طبع یا موڈ فریش کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ عرفان نفس اور احتساب ذات کا اہم ذریعہ اور منفرد وسیلہ ہے۔ آپ کی شاعری میں جمالیاتی قدروں کا بیان بڑے ہی دل کش اور دل فریب انداز میں ہوا ہے۔ آپ کی شاعری ماضی کی حسین روایات واقدار کی پاسداری، حال کی ترجمانی وعکاسی کرنے کے ساتھ ہی مستقبل کا اشاریہ بھی ہے۔ آپ کی غزلوں میں جدید موضوعات اور عصری مسائل کا بیان بہت ہی نرالے انداز میں ہوا ہے۔ غزلوں میں گھسے پٹے قدیم موضوعات اور قدامت پسندی سے بیزاری کے باوجود بھی آپ کا کلام قدیم موضوعات سے محفوظ نہیں ہے۔ علامت نگاری، رمزیت اور اشاریت کے علاوہ تشبیہات واستعارات اور حسین تلمیحات کا دل کش اسلوب میں بیان آپ کی شاعری کی نمایاں اور ممتاز ومنفرد خوبیاں ہیں۔

دینی وملی اور مذہبی خیالات ونظریات اور افکار ومسائل کے بیان میں آپ کے قلم کا جواب نہیں۔ غزلوں سے ذرا ہٹ کر اگر بات کی جائے تو حمد، نعت، منقبت، رباعی اور سلام میں مولانا معروفی کو ید طولیٰ اور قدرت کاملہ حاصل ہے۔ موصوف کی نعتیہ شاعری کی داد نہ دینا بڑی کم ظرفی اور جانبداری ہوگی۔ مولانا ارشاد حسین معروفی صاحب کی شعری کائنات میں غزل، نظم، حمد، نعت، مناجات، منقبت، سلام، قطعہ، قصیدہ سہرا اور تعزیتی نظمیں شامل ہیں۔ میرے نزدیک مولانا معروفی کی غزلیں ادب عالیہ کا مقام رکھتی ہیں۔ مذکورہ اصناف شاعری میں ان کی مذہبی طرز فکر کی شاعری کے مقابلے میں ان کی پر وقار غزلیں ادب وشاعری کی تاریخ میں موصوف کو جاودانی شہرت ومقبولیت اور پذیرائی عطا کریں گی۔

مجموعی طور پر مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری میں قدیم وجدید موضوعات کے بیان کے ساتھ ہی عصری حسیت، غم دوراں، غم جاناں اور غم زیست کا بیان بڑے سلیقے اور دل کش اسلوب میں ہوا ہے۔ میرے ناقص خیال میں مولانا معروفی کی شاعری میں عہد حاضر اور موجودہ حالات کے سنگین مسائل کی ترجمانی وعکاسی بڑی افادیت واہمیت کی حامل ہے۔ موصوف کی غزلیں انسانی جذبات وخیالات اور نظریات وافکار کی عکاسی میں ان کی نظموں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ بحیثیت شاعر ان کا قد عصر حاضر کے غزل گو شعرا میں بہت بلند ہے۔

عربی وفارسی لفظیات کے ساتھ ہی فلسفیانہ موضوعات کے بیان اور شعری شناخت کے لحاظ سے مولانا ارشاد حسین معروفی کا مجموعی کلام بڑی معنی خیزی رکھتے ہوئے موجودہ ادبی وشعری منظر نامے پر بڑی اہمیت اور جداگانہ شناخت کا حامل ہے۔ غیر ضروری باتوں سے بچتے ہوئے اور طولت سے گریز کرتے

ہوئے مولانا موصوف کی شاعری کے مطالعے کے بعد ان کی منتخب غزلوں سے چند ہی اشعار بطور نمونہ کلام یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

وہ زلف رخ سے ہٹا لے تو صبح پھوٹ پڑے
بکھیر دے تو تصور ہو شامِ ظلمت کا
ارشادؔ نے جھیلی ہیں کچھ ایسی گزرگاہیں
جن راہوں پہ چل پانا آسان نہیں ہوتا
کسی کی رات اجالوں میں اب گزرتی ہے
تڑپ رہا ہے کوئی دن میں روشنی کے لیے
دل سے تمھاری یاد نہ جائے تو کیا کروں
اک لمحہ بھی قرار نہ آئے تو کیا کروں
سکون چاہو تو گندی فضا سے دور رہو
وفا کے نام پہ ورنہ کوئی دغا دے گا

مولانا ارشاد حسین معروفی صاحب کو کلاسیکی فارسی شعریات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ آپ کو عربی اور فارسی زبان پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ خصوصاً فارسی کے متقدمین شعرا کا کلام آپ کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے فارسی کے مشہور کلاسیکی شاعر خاقانی کے مشہور قصیدہ 'ایوان مدائن' کا فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے جو 'فیضان ادب' میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ 'صد پند لقمان' مع اردو ترجمہ انتہائی جامع، معنی خیز اور نصیحت آموز ہے۔ فارسی زبان و ادب کے مشہور شاعر شیخ سعدی شیرازی کی 'کریما' کا اردو ترجمہ انتہائی دل کش اور سادہ اسلوب میں کیا ہے۔ کمال الدین علی محتشم کاشانی کے 'دوازدہ بند' کو مقدمہ اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مختصر یہ کی آپ کو فارسی شعر و ادب اور کلاسیکی شاعری سے خصوصی دلچسپی تھی۔ گزشتہ صفحات میں آپ کی شعری خدمات کے ذکر کے بعد یہاں مولانا معروفی صاحب کی تعلیم و تدریس کی جانب کچھ اہم باتیں لکھی جا رہی ہیں تاکہ ان کی زندگی، ان کا علمی و ادبی پس منظر قارئین کی نگاہوں سے مخفی نہ رہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی صاحب کی ابتدائی تعلیم پورہ معروف کے مشہور ادارہ مدرسہ اشاعت العلوم میں ہوئی۔ آپ نے یہاں پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مبارک پور کے اہم ادارہ مدرسہ باب العلم جہاں سے آپ تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے سبک دوش ہوئے، ۱۹۶۲ء میں درجہ ششم میں

داخلہ لیا۔ یہاں آپ کے اہم اساتذہ میں مولانا علی ارشاد نجفی، مولانا فیاض حسین واعظ، مولانا عبدالحمید شاہ ناظر وغیرہ کے نام انتہائی اہم اور قابل ذکر ہیں۔ یہاں زیر تعلیم آپ کے نامور رفقا اور ہم جماعت میں محبوب حسین اظہری، مولانا سلیمان شاہ مبارک پوری اور مولانا ناظم علی واعظ وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

درس نظامیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی ۱۹۶۵ء میں عربی و فارسی بورڈ، الہ آباد سے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ کے مشہور و معروف ادارہ مدرسہ ناظمیہ میں ۱۹۶۶ء میں درجہ عالم میں داخلہ لیا اور اس نامور ادارہ سے ۱۹۷۲ء میں ممتاز الافاضل کے کورس کی تکمیل کی اور سند فراغت حاصل کی۔ مدرسہ ناظمیہ کے لائق اور قابل فخر اساتذہ نے آپ کی جو علمی و ادبی اور تعلیمی و مذہبی رہنمائی کی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ ان میں خاص طور سے مولانا مفتی احمد علی اور آیت اللہ مولانا روشن علی خان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

مولانا معروفی نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی ۱۹۷۲ء میں دہیاور، ضلع امبیڈکر نگر کے مکتبہ امامیہ تنظیم المکاتب 'صابرہ نقی' میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، اور یہاں آٹھ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۲ء سے آپ مختلف اداروں میں مدرس کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، جن میں مدرسہ باب العلم، مبارک پور اور جامعہ ایمانیہ ناصریہ، جون پور کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ یہاں آپ عربی کے اونچے درجات مثلاً عالمیت، فضیلت میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب جامعہ حیدریہ خیرآباد کا قیام ہوا تو مولانا اس میں بھی تدریس کے مقدس ترین پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ آپ کی علمی و تدریسی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مبارک پور کے مشہور سرکاری مدرسہ باب العلم میں یکم جون ۱۹۹۰ء سے ۳۰/ جون ۲۰۱۲ء تک تدریسی خدمات انجام دے کر فرائض منصبی سے سبک دوش ہوئے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی علمی و ادبی حیثیت تسلیم شدہ ہے۔ آپ عالم باعمل تھے۔ اپنے مذہبی عقائد و نظریات کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مشغول رہتے تھے۔ اسی کے ساتھ علوم قرآن سے بھی خصوصی دلچسپی تھی۔ علمی و ادبی، تدریسی و تصنیفی اور تخلیقی و تحقیقی کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے۔ ترجمہ نگاری خصوصاً فارسی کی کلاسیکی شاعری کے اردو ترجمے میں بھی منہمک رہے۔ نصابی کتابوں کی درس و تدریس سے خصوصی دلچسپی تھی۔ طلبہ و شاگردوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی دل کھول کر کیا کرتے تھے۔ آپ کے تخلیقی و تحقیقی کام زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں جن میں خاص طور سے فلسفہ توحید، افادیت نماز، افادیت روزہ، علوم قرآن، بلاغت قرآن، تقریباً سو سے زائد غزلیں اور دو درجن سے زائد قصائد اور کتابوں پر

تقریظ وغیرہ آپ کے دینی و مذہبی، علمی و ادبی تحقیقی و تصنیفی اور تخلیقی و شعری کارنامے ہیں۔

مختصر یہ کہ مولانا ارشاد حسین معروفی کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے ادبی و تحقیقی مقالے بھی لکھے ہیں۔ جو موقر رسالہ سہ ماہی 'فیضان ادب' اور دیگر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں، جن میں 'امام خمینی کی شاعری میں عشق و عرفان' اور 'مولانا حسرت موہانی کی سیاسی شاعری' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ 'اردو مرثیہ کی جمالیات از ڈاکٹر عابد حسین حیدری' نامی مطبوعہ مقالہ بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کی علمی و ادبی اور تدریسی خدمات کے اعتراف میں ۳۶ صفحات پر مشتمل ایک مختصر اور جامع کتابچہ 'آہ! استاذ الاساتذہ' کے نام سے جامعہ حیدریہ مدینۃ العلوم، خیرآباد کے شعبہ نشر و اشاعت نے آپ کی وفات کے بعد مجلس چہلم کے موقع پر (۲۰۲۵ء) شائع کیا ہے۔ یہ کتابچہ ارشاد فہمی اور ارشاد شناسی کی اولین مگر بہترین کوشش ہے۔

مولانا ارشاد معروفی کی ایک بہو اور تینوں بیٹے سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر ذیشان حیدر معروفی، ماسٹر سلمان حیدر معروفی اور سہ ماہی رسالہ 'فیضان ادب' کے مدیر ڈاکٹر فیضان حیدر معروفی سے ہمیں پرامید رہنا چاہیے کہ یہ حضرات اپنے والد محترم کی علمی میراث اور ادبی و شعری کارناموں کو جو ابھی غیر مطبوعہ ہیں، منظر عام پر لانے کی کوشش کریں گے، تاکہ اس سے نئی نسل استفادہ کر سکے۔ 'فیضان ادب' کے خصوصی شمارہ ''مولانا ارشاد حسین نمبر'' کے لیے ڈاکٹر فیضان حیدر کی فرمائش اور درخواست پر چند صفحہ سیاہ کیے جا رہے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

☆☆☆

ڈاکٹر زُہرہ خاتون
شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، رابطہ نمبر: 9810906056

مولانا ارشاد حسین: ایک اجمالی تعارف

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین برصغیر کی اس روشن روایت کے نمائندہ تھے جس میں ادب کو جمالیاتی اظہار کے بجائے اصلاحِ معاشرہ اور اخلاقی بیداری کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اعظم گڑھ، جون پور اور مئو کے اہم علمی مراکز سے وابستگی نے آپ کی شخصیت کو علمی و تہذیبی اعتبار سے مضبوط بنیاد فراہم کی۔

مولانا کی شاعری میں سادگی، تاثیر اور فکری بلندی نمایاں ہے، جس میں تصوف، اخلاقیات اور انسانی اقدار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کا کلام داخلی کرب، تجربۂ حیات اور متوازن فکر کا حسین امتزاج ہے، جو قاری کو متاثر کرنے کے ساتھ متفکر بھی بناتا ہے۔ ان کی شاعری میں حق گوئی، جرأتِ اظہار، سماجی شعور اور انسانی ہمدردی کے عناصر نمایاں ہیں، جو انھیں ایک بیدار ضمیر شاعر کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔

بطور مصلح، مولانا نے اپنی نثر و شاعری کے ذریعے معاشرتی برائیوں، جہالت اور اخلاقی زوال پر تنقید کی اور اصلاح کا مثبت راستہ دکھایا۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ حمد، نعت، سلام اور منقبتِ اہلِ بیت پر مشتمل ہے۔ ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو ان کی وفات اردو ادب کے لیے ایک بڑا نقصان ہے، تاہم ان کا ادبی ورثہ آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ رہے گا۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، اردو شاعری، اصلاحِ معاشرہ، اخلاقی اقدار، تصوف، حق گوئی، سماجی شعور، حمد و نعت، اہلِ بیت، اردو ادب۔

برصغیر کی ادبی روایت میں ایسے علما و شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے زبان و ادب کو محض

جمالیاتی اظہار تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے اصلاحِ معاشرہ، اخلاقی بیداری اور فکری رہنمائی کا ذریعہ بھی بنایا۔ مولانا ارشاد حسین اسی روایت کی ایک اہم کڑی ہیں، جنھوں نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں یکساں طور پر علمی خدمات انجام دی ہیں۔

ہندوستان اپنی ثقافت اور گنگا جمنی تہذیب کے لیے دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ یہاں کے قصبات و قریات نے ادب و ثقافت اور تہذیب و معاشرت کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ ایسی جگہیں تھیں جہاں اربابِ علم وفن پُرسکون ماحول میں رہ کر اپنے مشاغل میں مصروف رہتے۔ نیز علم وادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ بھی ہوتا رہتا۔ ہندوستان کے اتر پردیش میں اعظم گڑھ بھی ایک ایسا ہی زرخیز خطہ رہا ہے جس کے قصبات وقریات علم و ادب کے میدان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ کئی بڑی ہستیاں اس سرزمین سے وابستہ رہیں، جن میں سے اہم ترین علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، سید سلیمان ندوی وغیرہ کے اسمائے گرامی سرفہرست نظر آتے ہیں۔ اسی سرزمین سے متعلق مئو بھی ایک ایسا ضلع ہے جہاں بے شمار علما و شعرا گزرے اور اپنی گراں قدر تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ دینی و دنیاوی دونوں ہی علوم میں بیش بہا اضافے کیے۔ ایسی ایسی قدآور شخصیات اور مشاہیر علم وفن پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف جہانِ علم و فن میں اضافہ کیا بلکہ قوم وملت کی رہنمائی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایسی ہی ایک ادب نواز شخصیت کا یہاں ذکر کروں گی، جنھوں نے جہانِ علم وادب میں ایک روشن باب کا اضافہ کیا اور یہ شخصیت ہے مولانا ارشاد حسین کی، جن کا تعلق اسی معروف خطہ مئو سے تھا۔

مولانا کی پیدائش ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم 'اشاعت العلوم' سے اور ثانوی تعلیم کے لیے مدرسہ باب العلم، مبارک پور کا انتخاب کیا۔ ۱۹۶۵ء میں مولوی الٰہ آباد بورڈ سے اور عالمیت کی سند مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ سے حاصل کی۔ ۱۹۷۲ء میں ممتاز الافاضل کی اعلیٰ سند سے سرفراز ہوئے۔ فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر وحدیث اور علم الکلام جیسے دقیق موضوعات پر آپ نے نمایاں دسترس حاصل کی۔ البتہ عصری تعلیم کے تقاضوں کو پُر کرنے کے لیے آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے رابطہ کیا۔ اس طرح تمام دینی و دنیاوی علوم کے حصول کے بعد آپ کی شخصیت میں مزید فکر وعمل کا حسین امتزاج پیدا ہوا، جس نے آپ کی فکری جہات کو مہمیز کیا اور آپ نے درس وتدریس کے ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

مولانا کا شمار ان اہلِ علم میں کیا جاتا ہے جن کی تربیت دینی علوم کے ساتھ ساتھ فارسی وعربی زبان و ادب کی گہری کلاسیکی روایت کے ساتھ ہوئی۔ عربی یا فارسی زبان ان کے لیے محض ادبی اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ علمی وفکری ابلاغ کا وسیلہ بھی تھی۔ جب کہ اردو کے ذریعہ وہ اپنے اصلاحی افکار عام طبقے تک پہنچاتے تھے۔

اردو میں مولانا کی شاعری کلاسیکی اسلوب کی حامل ہے۔ان کے شعری مجموعہ (ارمغان ارشاد [غیر مطبوعہ]) میں تصوف، اخلاق، توحید اور انسانی اقدار نمایاں ہیں۔اردو نثر میں ان کے اصلاحی مضامین فکری پختگی اور دینی شعور کے عکاس ہیں۔البتہ اردو میں ان کی شاعری زیادہ تر اصلاحی اور بامقصد نظر آتی ہے۔ان کے اشعار میں سادگی، تاثیر اور اخلاقی پیغام نمایاں ہے۔اردو میں جو مضامین ہیں ان میں سماجی برائیوں پر تنقید اور تعلیم و تربیت کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔بطور مصلح مولانا کا بنیادی مقصد فرد اور معاشرے کی اخلاقی تعمیر تھا۔وہ تعلیم، کردار سازی، دینی شعور اور اعتدال کے قائل تھے۔ان کی تحریروں میں سماجی رسم و رواج کی خرابیوں، جہالت اور اخلاقی زوال پر تنقید ملتی ہے اور ساتھ ہی اصلاح کا مثبت لائحۂ عمل بھی پیش کرتے ہیں۔ یہاں آپ کے کلام کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں، جو آپ کے افکار کا بہترین مظہر ہیں۔

مولانا ارشاد کی شاعری اپنے اندر ایک گہری سنجیدگی، داخلی کرب اور تجربۂ حیات کی پختگی سموئے ہوئے ہے۔ان کے کلام میں جذبات کی سطحی تپش نہیں بلکہ ایک دھیمی آنچ ہے جو قاری کے دل میں دیر تک اثر انداز رہتی ہے۔ان کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف اس کی سادگی میں پنہاں گہرائی ہے، وہ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کے بجائے عام فہم زبان میں ایسے مضامین باندھتے ہیں جو انسانی باطن کے نہایت پیچیدہ گوشوں کو چھو لیتے ہیں۔ان کے یہاں فکر و احساس کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے، جہاں جذبہ اپنی شدت کے ساتھ موجود ہے مگر عقل کی رہنمائی سے بے قابو نہیں ہوتا۔یہی توازن ان کے کلام کو وقار اور متانت عطا کرتا ہے، اور قاری کو محض محظوظ ہی نہیں کرتا بلکہ متفکر بھی بناتا ہے۔

ان کی شاعری میں انسانی رشتوں، محبت کے تقاضوں، اور زندگی کی کٹھنائیوں کا ایک بھرپور شعور ملتا ہے۔وہ جذبات کو فقط بیان نہیں کرتے بلکہ انھیں اخلاقی اور فکری تناظر میں پیش کرتے ہیں، جس سے ان کا کلام اعلیٰ مقصدیت کا حامل بن جاتا ہے۔ان کے یہاں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ ایک خاموش استقامت بھی جھلکتی ہے، جو قاری کو حوصلہ اور حیات کی معنویت کا احساس دلاتی ہے۔مولانا ارشاد کی شعری فضا میں داخلی سچائی، خلوص اور تجربے کی روشنی نمایاں ہے، جس کے باعث ان کا کلام وقتی اثر سے آگے بڑھ کر دیرپا ادبی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

اظہارِ کرم کرنا آسان نہیں ہوتا پھر اس کا نبھا پانا آسان نہیں ہوتا
اک وقت بھی آتا ہے جب راہِ محبت میں مرمر کے جیے جانا آسان نہیں ہوتا

مولانا ارشاد کی شاعری میں حق گوئی اور جرأتِ اظہار ایک بنیادی وصف کے طور پر ابھرتی ہے، جس کے باعث ان کا کلام محض جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک زندہ ضمیر کی آواز بن جاتا ہے۔وہ اپنے عہد کے تلخ

حقائق کو نہایت بے باکی سے پیش کرتے ہیں، لیکن اس بے باکی میں شور و غوغا کے بجائے ایک مہذب احتجاج کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں ظلم و ناانصافی کے خلاف ایک مسلسل داخلی مزاحمت محسوس ہوتی ہے، جو قاری کے اندر بھی بیداری پیدا کرتی ہے۔ ان کے یہاں طنز کی ہلکی سی کاٹ بھی موجود ہے، مگر وہ کبھی سطحی یا محض دل آزاری کے لیے نہیں ہوتی بلکہ فکری معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہی خوبی ان کی شاعری کو وقتی ردِعمل کے دائرے سے نکال کر ایک سنجیدہ ادبی مکالمے میں تبدیل کر دیتی ہے۔

مولانا ارشاد کے کلام میں سماجی شعور اور انسانی ہمدردی کی ایک مضبوط لہر بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں، طبقاتی فرق اور انسانی محرومیوں کو نہایت دردمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جس سے ان کے کلام میں ایک اخلاقی وقار پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں نصیحت یا تلقین کا انداز براہِ راست نہیں بلکہ نہایت لطیف اور اثر انگیز ہے، جو قاری کو خود سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک طرف حقیقت نگاری کی سختی ہے تو دوسری طرف امید اور حوصلے کی کرن بھی، جو زندگی کے کٹھن حالات میں بھی انسان کو ثابت قدم رہنے کا درس دیتی ہے۔ یہی امتزاجِ احساس و فکر ان کے کلام کو نہ صرف دل نشیں بناتا ہے بلکہ اسے ایک بامعنی اور دیرپا ادبی حیثیت بھی عطا کرتا ہے۔

جب بھی حق کے لیے آواز اٹھائی ہم نے — اس نے ہر بار انوکھا ستم ایجاد کیا
دل دہلنے لگے بے دردوں کے آخر ارشادؔ — دردمندوں نے عجب درد سے فریاد کیا
امیر شہر کو کیا اس کا غم ہے — اگر مفلس کوئی بھوکا رہے گا
اسے ہر چیز مل جائے گی جس کو — طلب کا حوصلہ پختہ رہے گا
اگر ارشادؔ ہے شیشہ کے گھر میں — تو پتھر کا اسے خطرہ رہے گا

مولانا ارشاد کی تخلیقی جہت کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کے یہاں افسردگی، یاسیت یا اضمحلال کی فضا نہیں بلکہ ایک مثبت اور متحرک فکر کارفرما ہے، جو قاری کو جمود سے نکال کر عمل اور بیداری کی طرف مائل کرتی ہے۔ ان کا تخلیقی شعور محض داخلی کرب کی عکاسی تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اس کرب کو ایک تعمیری قوت میں بدل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک طرف دردمندی ہے تو دوسری طرف ایک روشن نصب العین بھی، جو انسانی اقدار کی بلندی، اخلاقی تطہیر اور روحانی ارتقا کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ان کے کلام میں تحریک کا یہ پہلو نہایت لطیف انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے، جہاں قاری غیر محسوس طریقے سے ایک اعلیٰ مقصد کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

مزید یہ کہ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ حمد، نعت، سلام اور منقبتِ اہلِ بیت سے مزین ہے، جس

سے ان کی گہری روحانیت اور عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان اصناف میں بھی ان کا انداز تقلیدی نہیں بلکہ ایک سچے جذبے اور داخلی وابستگی کا آئینہ دار ہے، جو قاری کے دل میں احترام اور عقیدت کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ ان کی وفات ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو ہوئی، جو اردو ادب کے لیے ایک اہم خسارہ ہے، کیوں کہ ان کے ساتھ ایک ایسا صاحبِ فکر اور صاحبِ دل شاعر رخصت ہوا جس نے اپنی تخلیقات کے ذریعے نہ صرف ادبی دنیا کو متمول کیا بلکہ انسانی اور روحانی قدروں کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا ادبی ورثہ یقیناً آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا اور ان کی یاد ان کے فکر انگیز اور اثر آفریں کلام کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اس تفصیلی مطالعے سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ مولانا ارشاد حسین کی شخصیت ایک شاعر یا ادیب کی ہی نہیں، بلکہ ایک ہمہ جہت مفکر، مصلح اور صاحبِ کردار انسان کی تھی، جنھوں نے علم و ادب کو زندگی کے عملی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔ ان کے کلام اور نثر میں جو فکری سنجیدگی، اخلاقی بالیدگی اور روحانی گہرائی پائی جاتی ہے، وہ دراصل ان کے وسیع مطالعے، عمیق مشاہدے اور خلوصِ نیت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے نہ صرف فرد کی داخلی اصلاح کی طرف توجہ دلائی بلکہ معاشرتی سطح پر بھی ایک مثبت تبدیلی کا شعور بیدار کیا۔ ان کی شاعری میں جہاں داخلی کرب اور حیات کے تلخ تجربات کی جھلک ہے، وہیں امید، حوصلہ اور عمل کی دعوت بھی موجود ہے، جو قاری کو مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر ایک روشن اور بامقصد زندگی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس اعتبار سے مولانا ارشاد کا کلام ایک زندہ پیغام اور تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔

حاصلِ مطالعہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ارشاد حسین نے برصغیر کی اس درخشاں ادبی و دینی روایت کو نہایت وقار کے ساتھ آگے بڑھایا، جس میں علم، ادب اور اخلاق کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ اعتدال، توازن اور انسان دوستی کے قائل تھے، اور یہی عناصر ان کے فکری نظام کی بنیاد بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے نہ صرف اپنے عہد کے مسائل کی نشاندہی کی بلکہ ان کا حل بھی ایک مہذب اور مثبت انداز میں پیش کیا۔ ان کی وفات کے بعد اگرچہ ایک عہد کا اختتام ہوتا ہے، لیکن ان کا ادبی سرمایہ آج بھی زندہ اور متحرک ہے، جو آنے والی نسلوں کو نہ صرف فکری رہنمائی فراہم کرے گا بلکہ انھیں اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کی طرف بھی مائل کرے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمود احمد کاوش
شعبۂ اُردُو، یونیورسٹی آف نارووال، نارووال (پاکستان)، رابطہ نمبر: 923007764252+

مولانا ارشاد حسین معروفی اور اُن کا سرمایۂ حمد و نعت

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی کا شمار جید علما میں ہوتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں دینی علوم پر دست رس رکھتے تھے۔ آپ نے تمام عمر مادّی اغراض سے بالاتر ہو کر دین کی خدمت کرنے میں گزار دی۔ مختلف مدارس میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ مشکل سے مشکل مقامات کو آسان اور عام فہم انداز میں سمجھانے پر قدرت رکھتے تھے۔ آپ غیر متعصب شخصیت تھے۔ دیگر مسالک سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی علمی اِشکال کے حل کے لیے آپ سے رجوع کرتے تھے۔ آپ کے قلم میں بے حد روانی تھی۔ آپ نے نظم اور نثر، دونوں کو وسیلۂ اظہار بنایا۔

گو آپ کا تحریری علمی سرمایہ کمیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں، مگر کیفیت کے اعتبار سے انتخاب ہے۔ آپ نے جو حمدیہ کلام لکھا، اُس میں منطق و فلسفہ کی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں۔ جہاں تک آپ کی نعتیہ شاعری کا تعلق ہے تو ہر ہر شعر میں عشقِ رسول کا جذبہ کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ آدابِ بارگاہِ نبوی کے حوالے سے بھی آپ نے کئی مقامات پر بات کی ہے۔ قرآنی تلمیحات کا استعمال بھی آپ کے نعتیہ کلام کا ایک وصفِ خاص ہے۔ اسی طرح اتحادِ ملتِ اسلامیہ کی آرزو بھی آپ کی لکھی ہوئی نعتوں کا ایک موضوع ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین معروفی، مدرسۂ امامیہ صابرہ نقی، جامعہ حیدریہ خیر آباد، جامعہ ایمانیہ ناصریہ جون پور، باب العلم مبارک پور، مدرس، اخلاقِ حسنہ، قادر الکلام اور پختہ فکر شاعر، عشقِ رسول، اتحادِ اُمت۔

بعض اصحابِ علم و فضیلت شہرت سے بے نیاز دُنیا سے بے گانہ وار گزر جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ

ہیں جو ریا کاری اور نمود و نُمایش سے کوسوں دُور رہتے ہوئے علم و ادب کو پروان چڑھانے میں اپنے شب و روز صرف کر دیتے ہیں۔ انھیں کسی دُنیاوی غرض یا مادّی منفعت کا خیال تک نہیں آتا۔ انھی پاک طینت ہستیوں کے طفیل دُنیا میں علم و آگہی کے چراغ روشن ہوتے ہیں اور جہالت و گم رہی کی تاریکیاں مٹ جاتی ہیں۔ ایسے درویشانِ خدا مست کسی قوم کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا شمار بھی اِنھی صاحبانِ کمال میں ہوتا ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی ۱۸؍اکتوبر ۱۹۴۹ء کو محمد شمس الدین کے ہاں یو۔ پی کے ضلع مئو میں پورہ معروف کے مقام پر پیدا ہوئے۔ مقامِ پیدائش کی نسبت سے 'معروفی' اُن کے نام کا حصہ ہے۔ محلہ پارہ میں مدرسۂ اشاعتِ علوم تھا۔ اسی مدرسے میں درجۂ پنجم تک تعلیم پائی۔ یہاں منشی زین العابدین اور مولانا عبدالرؤف نے اپنے ہونہار شاگرد کی طرف خاص توجہ دی۔ منشی زین العابدین کو حساب کی تدریس میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ سکھانے والا اپنے فن کا ماہر تھا اور سیکھنے والا مشتاق۔ ہونہار شاگرد نے پانچویں درجے تک منشی زین العابدین سے حساب سیکھا۔

مقامی مدرسے سے درجۂ پنجم کے امتحان میں کامیابی کے بعد ۱۹۶۲ء کے آغاز میں مولانا نے مدرسۂ باب العلم مبارک پور میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی اُنھیں دو قابل اور ذہین اساتذہ کی راہ نُمائی میسر آئی۔ علامہ علی ارشاد نجفی مبارک پوری اور مولانا فیاض حسین واعظ نے اپنے شاگرد کی تعلیمی بنیادوں کو اور مستحکم کر دیا کہ اِن پر قصرِ رفیع الشان تعمیر کیا جا سکے۔ اِن کریمین نے آپ کو عربی زبان و ادب، فقہ و اُصول، بلاغت و عروض اور منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے کے قابل کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں آپ نے الٰہ آباد بورڈ سے امتیاز کے ساتھ مولوی کی سند حاصل کی۔ یہاں سے فراغت پا کر آپ نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور جامعہ ناظمیہ میں داخل ہوئے۔ سات سال اِس ادارے میں طالب علم رہے۔ ایک کے بعد ایک درجہ طے کرتے ہوئے آپ نے فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضلِ معقولات اور فاضل دینیات کی اسنادِ فضیلت حاصل کیں۔ ۱۹۷۲ء میں یہاں سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔ آپ کو صرف و نحو، منطق و فلسفہ، فقہ و علم کلام، تفسیر و حدیث، عروض و بلاغت پر اُستادانہ مہارت حاصل تھی۔ آپ کو عربی اور فارسی پر مکمل دست رس حاصل تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے درس و تدریس اور دعوت و اِرشاد کا پیشہ اختیار کیا۔ آپ نے مختلف اداروں میں اپنے علم و فضل کی ضو پاشیوں سے اپنے تلامذہ اور عوام الناس کے قلوب کو منور کیا۔ ۱۹۷۲ء میں ضلع امبیڈکر نگر کی تحصیل ٹانڈہ کے موضع دہیاور میں قائم مدرسۂ امامیہ صابرہ نقی میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ کوئی آٹھ سال کا عرصہ یہاں گزارا۔ ۱۶؍جون ۱۹۸۰ء کو بمدرسۂ باب العلم مبارک

پور میں درجاتِ عالیہ کی تدریس پر مامور ہوئے۔ آپ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ چند سال یہاں گزارنے کے بعد آپ کی اگلی منزل جامعہ ایمانیہ ناصریہ جون پور قرار پائی۔ یہاں آپ کئی برس تک اعلیٰ درجات کو پڑھاتے رہے۔ مولانا ناظم علی خیر آبادی کی سرپرستی میں جامعہ حیدریہ خیر آباد قائم ہوا تو اِس اِدارے کے اوّلین مدرس آپ ہی مقرر ہوئے۔ مولانا کا طریق تدریس اس قدر دِل نشیں، جان دار اور شان دار تھا کہ دیگر مدارس کے طلبہ آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے چلے آئے۔ آپ کی کوششوں سے یہ نوزائیدہ ادارہ خوب پھلا پھولا اور اِسے استحکام نصیب ہوا۔ اب باب العلم مبارک پور کی انتظامیہ نے آپ سے ایک بار پھر رابطہ کیا اور واپسی پر اصرار کیا۔ چنانچہ آپ اپنی مادرِ علمی میں چلے آئے، لیکن کسی قسم کا کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ یہاں درجاتِ عالیہ کی تدریس آپ کے ذمے تھی۔ آپ بیس سال سے زیادہ عرصے تک اس ادارے میں علم کے موتی بکھیرتے رہے اور ذہین شاگرد اُنھیں چنتے رہے۔ ۲۰۱۲ء میں یہیں سے سبک دوش ہوئے۔ ماہِ رمضان المبارک میں آپ کو مختلف مقامات سے دعوت ملتی اور آپ طالبانِ رُشد و ہدایت کی تشنگی کا سامان فراہم کرتے رہے۔

جس طرح ایک مشاق جوہری پتھر کو تراش کر ہیرا بنانے کا فن جانتا ہے، اسی طرح آپ اپنے شاگردوں کو سنوارنے اور نکھارنے کے گُر جانتے تھے۔ آپ ادق سے ادق اسباق کو سہل بنا کر پیش کرتے۔ ایک بات کو کئی پہلوؤں سے اِس طرح کھول کر بیان کرتے کہ کوئی گوشہ یا پہلو تشنہ نہ رہ پاتا۔ طلبہ کو سمجھانے کی خاطر آپ عملی مثالوں سے وضاحت کرتے۔ یوں آپ کے فرمودات سامعین کے دلوں میں اُترتے چلے جاتے۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ مدارس میں اساتذہ اپنے طالب علموں پر سختی کرتے ہیں۔ مولانا سراپا شفقت اور مجسم محبت تھے۔ آپ نرم دل تھے۔ کرختگی یا درشتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مسئلے کے سمجھنے میں دِقت یا دُشواری ہوتی تو آپ نرمی سے اُسے سمجھاتے۔

مولانا کی ایک اور خوبی اُن کے حافظے کا قوی ہونا تھا۔ آپ کا علم مستحضر تھا۔ آپ فی البدیہ جواب دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کوئی سوال کرتا تو کیا کیا گرہیں کھولتے چلے جاتے اور ایسے ایسے نکتے سامنے لاتے جو سطحِ بین قسم کے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتے۔ دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ کی نرمیِ گفتار اور حلاوتِ کلام آپ کے تلامذہ اور سامعین کو آپ کا گرویدہ بنا دیتی۔ آپ کی شستہ و رُفتہ زبان، آپ کی تحریر و تقریر دونوں میں برابر جھلکتی تھی۔

مولانا ارشاد حسین معروفی سے جویانِ علم کی ایک کثیر تعداد نے کسبِ فیض کیا۔ آپ کے تلامذہ نجف اور قُم کی درس گاہوں سے بھی فارغ التحصیل ہوئے۔ یوں آپ کے لگائے گئے ننھے پودے اب تن آور

درخت بن چکے ہیں۔آپ کے شاگرد آپ کے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

مولانا کو اللہ کریم نے نیک اور صالح اولاد سے نوازا۔آپ کے تینوں بیٹے درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔سب سے بڑے بیٹے ڈاکٹر ذیشان حیدر مولانا آزاد نیشنل اُردُو یونی ورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔دُوسرے بیٹے سلمان حیدر ایک سرکاری اسکول میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں، جب کہ تیسرے بیٹے ڈاکٹر فیضان حیدر دربھنگہ (بہار) میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔بین الاقوامی تحقیقی جریدہ سہ ماہی 'فیضانِ ادب' انھی ڈاکٹر فیضان حیدر کی اِدارت میں نکلتا ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو ایرا لکھنؤ میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل میں زندگی کے آخری سانس لیے۔اسی روز آپ کے جسد خاکی کو آپ کے آبائی قصبے پورہ معروف لایا گیا جہاں رات کے دس بجے ہزاروں سوگواران کی موجودگی میں تدفین عمل میں آئی۔

جہاں تک مولانا ارشاد حسین معروفی کی سیرت کا تعلق ہے تو مولانا صابر وشاکر تھے۔مولانا نے صبر اور حلم کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔آپ نے ناسازگاریِ حالات کا مقابلہ نہایت تحمل اور صبر واستقامت سے کیا۔مولانا اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔آپ دُوسروں کے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آنے والے انسان تھے۔آپ کے دل میں ملتِ اسلامیہ کا درد تھا۔ملت کی زبوں حالی پر آپ افسردہ ہوجاتے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تنگ نظری اور تعصب سے پاک تھے۔مسلکی اعتبار سے آپ اہل تشیع تھے،لیکن اہل سنت کے علما سے ملنے میں کوئی عار نہ تھی۔پورہ معروف میں اہلِ سنت کے علما بعض منطقی اِشکال کے حل کے لیے آپ کے پاس آتے۔آپ نہایت خندہ پیشانی سے ان سے پیش آتے۔یوں علمائے اہلِ سنت کے ساتھ آپ کے خوش گوار مراسم قائم ہوگئے۔جب مولانا وفات پاگئے تو بہت سے اہلِ سنت آپ کے جنازے میں شریک ہوئے اور اظہارِ تعزیت کے لیے بھی آتے رہے۔

مولانا نمود ونمائش کو پسند نہیں کرتے تھے۔آپ اُن لوگوں میں سے تھے جو خاموشی سے کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ریاکاری گویا آپ کو چھو کر نہیں گزری تھی۔عجز واِنکسار آپ کی بہت بڑی خوبی تھی۔علمی اعتبار سے بلند مرتبے کے مالک تھے،لیکن غرورِ علمی کا شائبہ تک نہیں تھا۔سادگی آپ کی شخصیت کا لازمی جزو تھی۔مولانا انسانیت کے سچے خادم تھے۔جذبۂ خدمتِ خلق آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔یتیموں، ناداروں اور محتاجوں کے ہمیشہ کام آتے۔اپنی بساط سے بڑھ کر مستحقین کی مدد کرتے۔ڈاکٹر فیضان حیدر کے بقول آپ خدمتِ خلق کو دین کی سب سے بڑی خدمت کہا کرتے تھے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو نظم ونثر،دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔بے نیازی

دیکھیے، آپ نے اپنی کتابوں کو چھپوانے کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ اب آپ کے صاحب زادے ڈاکٹر فیضان حیدر آپ کے چھوڑے ہوئے علمی سرمائے کو مرتب کرنے اور شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کی چار کتابیں_ فلسفۂ توحید، اِفادیتِ نماز، اِفادیتِ روزہ اور علوم القرآن شائع کی جارہی ہیں۔بعض کتابوں کے ناتمام مسودات موجود ہیں۔ان میں تفسیر قرآن، بلاغتِ قرآن اور جلاء الصدور (ترجمۂ معراج العقول) شامل ہیں۔ ہر چند آپ موزوں طبع تھے اور شاعری کے اسرار و رُموز سے خوب واقف تھے، لیکن آپ نے اِس طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔آپ کی پچاس سے زائد غزلیات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں اور تقریباً اتنی ہی اشاعت کی منتظر ہیں۔اسی طرح حمد و نعت اور مناقب کا ایک قلیل سرمایہ آپ کی علمی یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔

امام خمینی کی شاعری میں عشق و عرفان کے موضوع پر آپ نے بارہ اَقساط میں مضامین تحریر کیے۔ ان میں سے چند قسطیں مجلہ فیضانِ ادب میں شائع ہوئی ہیں۔سطورِ ذیل میں مولانا کی حمدیہ شاعری پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔مولانا کی صرف دو حمدیں دست یاب ہوئی ہیں، اِس لیے یہاں انھی دو حمدوں کے حوالے سے بات کی جائے گی۔

مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شاعری اِس بات پر دال ہے کہ آپ ایک پختہ فکر، بالغ نظر اور قادر الکلام شاعر تھے۔آپ فلسفہ و منطق کے عالم تھے۔آپ کی شاعری میں بھی فلسفہ و منطق کی اصطلاحات ملتی ہیں۔مثال کے طور پر آپ کی ایک حمدِ باری تعالیٰ سے چند اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔اِس میں وجودِ واجبِ ذاتی (ایسی ہستی جو اپنے وجود کے لیے کسی دُوسری علت یا سہارے کی محتاج نہ ہو، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔) اور وجوبِ غیر (ایسی ہستی جو اپنے وجود کے لیے کسی دُوسری علت یا سہارے کی محتاج ہو، جیسے مخلوقات۔) کی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔

وجودِ واجبِ ذاتی کی ذات کے صدقے
وجوبِ غیر کا بھی اضطرار ختم نہ ہو ا۔

اسی حمد کے شعر میں منطق کی ایک اصطلاح دلیلِ لِمّی بھی استعمال ہوئی ہے۔اِس کا مطلب ہے علت سے معلول تک۔ایسی دلیل جو کسی چیز کے ہونے کی وجہ بیان کرے، اُسے دلیلِ لِمّی کہا جاتا ہے۔مولانا کہتے ہیں۔

کہاں ہو معرفتِ حق دلیلِ لِمّی سے
تحیرِ بصرِ نوربار ختم نہ ہو ۲۔

اگلے شعر میں منطق کی تین اصطلاحات ـــــــ دلیلِ اِنّی، اثر اور موثر ـــــــ برتی گئی ہیں۔ اثر کے معنی ہیں معلول، جب کہ موثر کے معنی ہیں علت۔ دلیلِ اِنّی ضد ہے دلیلِ لِمّی کی۔ دلیلِ اِنّی سے مراد وہ اِستدلال ہے جس میں اثر (معلول) کے ذریعے موثر (علت) تک پہنچا جائے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب ہمیں کسی چیز کے وجود کا علم ہو، لیکن اُس کی وجہ معلوم نہ ہو تو ہم اُس کے آثار سے اُس کی وجہ کو بیان کرتے ہیں۔ اب شعر ملاحظہ کیجیے ؎

شناخت اُس کی ہے ممکن دلیلِ اِنّی سے
اثر کے ساتھ موثر کا پیار ختم نہ ہو ۳؎

مولانا کی حمدیہ شاعری میں بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے آیاتِ قرآنی کا مفہوم صاف جھلکتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۹۰ میں اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

ترجمہ: بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کی باہم تبدیلی میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اب حمد کا شعر دیکھیے جس میں مذکورہ آیت کو نظم کیا گیا ہے ؎

خلقتِ ارض و سما اور روز و شب کا اِختلاف
عاقلوں کو محوِ فکرِ جاوِداں کس نے کیا ۴؎

جس حمد سے مذکورۂ بالا شعر لیا گیا ہے، وہ شروع سے آخر تک استفہامیہ انداز لیے ہوئے ہے۔ ہر شعر میں شاعر، قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ نظامِ کائنات کون چلا رہا ہے۔ اس حمد سے چند شعر ذیل میں نقل کیے جا رہے ہیں ؎

بوئے گل کو نذرِ شامِ گلستاں کس نے کیا
عندلیبِ خوش گلو کو نغمہ خواں کس نے کیا
درد ہے تو درد کا درماں بھی اُس کے پاس ہے
دہر میں رنج و خوشی کو جوڑواں کس نے کیا ۵؎

نعت کہنا بڑی سعادت کی بات ہے۔ یہ صنف اِس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہاں ہر لفظ سوچ سمجھ کر لکھا جائے۔ حزم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ نعت اُس ہستیِ بے مثل کے حضور نیاز مندی کے اظہار کا نام ہے جس کی بارگاہِ عالیہ میں آوازوں کو پست رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

حضرت محمد رسول اللہ خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلّم کے معاملے میں ذرّہ برابر بے ادبی یا گستاخی کی گنجائش نہیں۔ یہ وہ بارگاہِ قدس ہے جہاں ذرا سی بے اعتدالی عمر بھر کے اعمال کی غارت گری کا باعث بن سکتی ہے۔ چنانچہ اہلِ نظر نے وادیِ نعت میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔ ایک مثال سے اِحتیاط کی وضاحت بہتر انداز میں ہو سکے گی۔ شیخ عبدالعزیز عزت بخاریؒ (م:۱۰۸۹ھ) کا شعر ہے ؎

ادب گاہیست زیرِ ایں زمیں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا [۶] ؎

ڈاکٹر تحسین فراقی نے مذکورہ شعر کو یوں نقل کیا ہے ؎

ادب گاہیست در زیرِ زمیں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا [۷] ؎

علامہ محمد اقبال کو عزت بخاری کے مذکورہ شعر میں زیرِ ایں زمیں / در زیرِ زمیں کے الفاظ مناسب نہ لگے۔ چنانچہ آپ نے اِس شعر میں ایک لطیف تصرف کیا اور اسے ارمغانِ حجاز کے عنوان حضورِ رسالت کے آغاز میں یوں درج کیا ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا [۸] ؎

صوفی فقیر محمد کو علامہ محمد اقبالؒ کے تصرفِ مذکور سے اتفاق ہے، لیکن وہ اِس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

''عزت بخاری کے مصرع میں 'در زیرِ زمیں' کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا تو پھر 'زیرِ آسماں' کیوں کہا جائے۔ کیوں نہ اِس زیر کو خارج از بحث کیا جائے اور شایانِ شان ترکیب استعمال میں لا کر مصرع مرصع کیا جائے۔ ع:

ادب گاہیست بر فرشِ زمیں از عرش نازک تر'' [۹]

اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو نعت گوئی کی نزاکتوں اور مشکلات کا خوب اندازہ تھا۔ چنانچہ آپ نے لکھا ہے:

''اور حقیقتاً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں۔ اِس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچا جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے..... نعت شریف میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے۔'' [۱۰] ؎

عرفی شیرازی نے بھی ایسی ہی بات کی ہے ؎

عرفی مشتاب این رہِ نعت ست نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغست قدم را ۱۱

جس ہستی کے اوصافِ حمیدہ خالقِ کائنات بیان کر رہا ہو، اُس کے کمالات کا اِحاطہ کرنا ذہنِ انسانی کے بس میں کہاں! مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو فکرِ انسانی کی اِس نارسائی کا خوب احساس و اِدراک ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں ؎

ہے کہاں آدمی کے اِمکاں میں نعتِ سرکارِ بحر و بر لکھنا
نعت ہے یہ کوئی غزل تو نہیں ہے یہ خنجر کی دھار پر لکھنا ۱۲ ؎

مولانا نے بارگاہِ نبوی کے آداب کو بھی اپنی نعت کا موضوع بنایا ہے۔ ایک نعت سے یہ دو شعر دیکھیے۔ انھیں پڑھتے ہوئے سورۂ الحجرات کی وہ آیات ذہن میں آتی ہیں جن میں خالقِ کائنات نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہونے والوں کو آداب کی تعلیم دی ہے ؎

سر خم کرو تعظیم سے، اکڑو نہ یہاں پر
یہ سوچ کے آؤ کہ پیمبر کی گلی ہے
ارشادِ خدا ہے کہ کرو بات ادب سے
اُونچی نہ ہو آواز یہ دربارِ نبی ہے ۱۳ ؎

مولانا ارشاد حسین معروفی نے اپنے نعتیہ کلام میں نبیِ ختمی مرتبت کے معجزات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ذیل کے تین اشعار میں چار معجزات بیان کیے گئے ہیں ؎

کلمہ پڑھتے ہیں ہاتھ پر کنکر
جھکتے قدموں میں ہیں شجر لکھنا
ایک انگشت کے اشارے سے
ہوتا دو نیم ہے قمر لکھنا
آدمی کیا ہے تابعِ فرماں
ہیں قدم بوس جانور لکھنا ۱۴ ؎

کفارِ مکہ کے معجزہ طلب کرنے پر اللہ تعالیٰ کے آخری رسول نے اُنگلی کا اِشارہ کیا اور چاند دولخت ہو گیا۔ اسے معجزۂ شق القمر کہتے ہیں۔ سورۂ القمر کا آغاز ہی اِس معجزے سے ہوتا ہے۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ ترجمہ: قیامت قریب آ پہنچی اور چاند پھٹ گیا۔

اِس معجزے کا ذکر مولانا کے کئی اشعار میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے ؎

کیے ہیں ایک اشارے میں چاند کے ٹکڑے
کلامِ پاک میں یہ صاف صاف لکھا ہے ۱۵؎

اللہ کے آخری نبی کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ کنویں میں لعابِ مبارک ڈالا تو کھارا پانی میٹھا ہو گیا۔ واقعہ یوں ہے کہ مدینہ منورہ سے مغرب کی جانب بئر اِھاب نامی ایک کنواں ہے۔ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے اپنا لعابِ دہن اِس کنویں میں ڈالا تھا۔ اِس کنویں کو مدینہ طیبہ کا زم زم کہا جاتا تھا اور لوگ آبِ زم زم کی طرح اس کا پانی شہروں اور اَطرافِ عالم میں لے جایا کرتے تھے۔ اس معجزے کا ذکر مولانا کے ایک شعر میں یوں ملتا ہے ؎

لعاب ڈال دیا جب کنویں میں آقا نے
یہ معجزہ ہے کہ شفاف آب نکلا ہے ۱۶؎

مولانا کی نعتیں ہر لحاظ سے معیاری ہیں۔ ان نعتوں کا لفظ لفظ عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ اِن نعتوں سے اُس والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جو مولانا کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ گرامی قدر سے تھی۔ مختصر بحر کی اِس نعت میں عشقِ نبی کی کیفیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے ؎

خاک ہوتا میں تیرے آنگن کی
تیرے قدموں کو چومتا ہوتا
سانس لیتا تو تازگی ملتی
تیرے گلشن کی میں ہوا ہوتا
جس کو ملتا قبولیت کا شرف
تیرے لب کی میں وہ دُعا ہوتا ۱۷؎

اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلویؒ نے فرمایا تھا ؎

وہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دُور ہے، یہی شمع ہے کہ دُھواں نہیں ۱۸؎

مولانا نے بھی سرکارِ دو جہاں کے حسنِ یکتا کی تعریف کی ہے۔ انداز دیکھیے ؎

میں حسن و قبح کے کُل فلسفے سے واقف ہوں

یہ کیسا حسن ہے جس میں کوئی برائی نہیں ۱۹؎

مولانا ارشاد کے نعتیہ کلام میں تلمیحات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ زنانِ مصر، حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کے جلووں میں اِس قدر محو ہوئیں کہ اُنھوں نے بجائے پھل کاٹنے کے، اپنی اُنگلیاں کاٹ لیں۔ مولانا نے واقعۂ مذکور کو تلمیح کی صورت میں یوں رقم کیا ہے؎

زنانِ مصر سے پوچھے کوئی کرشمۂ حسن
کٹی ہیں اُنگلیاں، احساسِ نارسائی نہیں ۲۰؎

مولانا نے اپنی نعتوں میں قرآنی تلمیحات کا بھی استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ طٰہٰ کی بارھویں آیت دیکھیے: اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی۔ (ترجمہ: میں تو تمھارا پروردگار ہوں، سوتم اپنے جوتے اُتار دو۔ بے شک تم پاک وادی طویٰ میں ہو۔) اب اس آیت میں موجود لفظ فاخلع کا بہ طورِ تلمیح اِستعمال ملاحظہ کیجیے؎

کلیمِ طور ہی جانیں ترے نعلین کی منزل
خدا نے اُن سے فاخلع کہہ دیا تو پیادہ پا آئے ۲۱؎

مولانا نے قرآنِ حکیم کا مطالعہ ڈوب کر کیا تھا۔ اُنھوں نے عمر بھر قرآنِ حکیم پڑھا اور پڑھایا۔ اس کا اثر آپ کی نعتیہ شاعری پر بہ طورِ خاص دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے نعتیہ اشعار میں بعض آیاتِ بیّنات کا مفہوم سمو دیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ النجم کی تیسری اور چوتھی آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی۔ (ترجمہ: اور وہ کوئی بات خواہش سے نہیں کہتے۔ وہ وحی ہی ہوتی ہے جو اُنھیں کی جاتی ہے۔) اب اس آیت کے مفہوم پر مشتمل نعت کا یہ شعر دیکھیے؎

خدا کا حکم نہ جب تک ملے اِسے اِرشاد
مرا رسول کہاں کچھ کلام کرتا ہے ۲۲؎

علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری میں کئی مقامات پر عقل و عشق کا موازنہ کیا گیا ہے۔ آپ نے عقل پر عشق کو ترجیح دی ہے کہ عقل ظن و تخمین سے باہر نہیں نکل سکتی۔ عقل کا دائرۂ کار محدود ہے۔ اِس کے برعکس عشق کی حدود کا کوئی تعین نہیں۔ عقل نفع و ضرر کے چکر سے باہر قدم نہیں رکھتی، جب کہ عشق نتائج سے بے نیاز کر گزرتا ہے۔ عقل چراغِ راہ کا کام تو دیتی ہے، لیکن منزل تک رسائی اِس کے بس کی بات نہیں۔ عقل مصلحت اندیش ہے جب کہ عشق کی لغت میں سمجھوتا یا مصلحت نام کا لفظ ہی نہیں ہے۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کی نعتوں میں بھی فکرِ اقبالؒ کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے؎

فرازِ عشق کی منزل کو کوئی کیا جانے
جہاں پہ عقل کی پرواز کی رسائی نہیں ۲۳؎

مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اتحادِ عالمِ اسلام کے خواہاں تھے۔ دُنیا میں مسلمان فرقوں اور مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسو کروڑ کی آبادی والی یہ قوم مغربی قوتوں کی غلامی کیے ہوئے ہے۔ اگر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور صحیح معنوں میں ملتِ واحدہ ہونے کا ثبوت فراہم کریں تو سامراجی اور صہیونی طاقتیں کبھی اُن کا استحصال نہ کر سکیں۔ علامہ محمد اقبالؒ بھی اتحادِ عالمِ اسلام کے داعی تھے۔ آپ کا دل مسلمانوں کے انتشار اور تفریق کو دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا۔ جوابِ شکوہ میں آپ نے مسلمانوں کی نا اتفاقی کے بارے میں کہا؎

منفعت ایک ہے اِس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک ۲۴؎

مولانا بھی اقبال کے ہم خیال ہیں۔ وہ اپنی ایک نعت میں کہتے ہیں؎

اللہ بھی ایک، پیمبر بھی، قرآن بھی ایک ہے قبلہ بھی
پھر کس لیے قومِ مسلم میں تفریق یہ پائی جاتی ہے ۲۵؎

مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتوں کا ایک وصفِ خاص ان کی سادگی اور روانی ہے۔ آپ نہایت سادہ اور آسان لفظوں میں شعر گوئی کا ہنر جانتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں دِیئے گئے اشعار ملاحظہ کیجیے۔ یہ اشعار کس قدر سادہ، سہل اور رَواں ہیں؎

فضیلتوں کے فلک پر یہ صرف تنہا ہے
جہاں میں کوئی کہاں مصطفیٰ کے جیسا ہے ۲۶؎

مولانا نے اپنی نعتوں میں ہادیِ برحق حضرت محمد کی سیرتِ طیبہ کو بھی موضوع بنایا ہے۔ بعثتِ رسول سے قبل کے عرب معاشرے میں ہونے والے ظلم و بربریت، ناانصافی اور قتل و غارت گری کا نقشہ کھینچا ہے اور پھر رسولِ خدا کی تشریف آوری سے برپا ہونے والے انقلاب کی تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ کفر و شرک کے بادل چھٹ گئے اور توحیدِ باری تعالیٰ کا اُجالا چار دانگِ عالم میں پھیل گیا؎

نورِ خدا بھی، مطلعِ انوار بھی یہی

دُنیا میں ہر طرف ہے اُجالا رسول کا ۲۷؎

پیغمبرِ اکرم آئے ہیں، مظلوموں کا دِل جھوم اُٹھا
اب ظلم و تشدد کی دُنیا، بنیاد سے ڈھائی جاتی ہے ۲۸؎

کسریٰ کے گرے کنگرے، آتش کدہ گل ہے
زندہ ہوا دیں، کفر کی گردن پہ چھری ہے
چھٹنے لگا جب جھوٹ کی لعنت کا اندھیرا
محسوس ہوا شمع صداقت کی جلی ہے ۲۹؎

مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مختصر سرمایۂ حمد و نعت کے جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ کی دینی شاعری میں قرآنِ مجید، احادیثِ مبارکہ اور منطق کے حوالے ملتے ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی نعتوں سے اُس عشق کا اندازہ ہوتا ہے جو آپ کو رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی ذاتِ اقدس سے تھا۔ ان نعتوں میں سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی جھلکیاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ امتِ مسلمہ کے انتشار و افتراق اور زبوں حالی پر شاعر کی تشویش اور اتحادِ ملت کی آرزو بھی اِن نعتوں کا موضوع ہے۔

اپنی تدریسی مصروفیات میں انہماک و استغراق کی وجہ سے مولانا شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکے۔ اگر آپ فکرِ سخن کے لیے زیادہ وقت نکال سکتے تو اُردُو کے سرمایۂ حمد و نعت میں بیش قدر اضافہ دیکھنے کو ملتا۔ اب جب کہ مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دارِ فنا سے دارِ بقا کی طرف سدھار چکے، اُن کے لیے دُعا کی جاسکتی ہے کہ پروردگارِ عالم اِن حمدوں اور نعتوں کو قبول فرمائے، اپنے محبوب نبی اور آلِ نبی کے تصدق سے آپ کے درجات کو بلند فرمائے اور آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ 'انتخابِ کلام'، مشمولہ: سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۶ء، ص ۴۳۲
۲۔ ایضاً، ص ۴۳۲ ۳۔ ایضاً، ص ۴۳۲
۴۔ ایضاً، ص ۴۳۲۔ ۴۳۳ ۵۔ ایضاً، ص ۴۳۲۔ ۴۳۳
۶۔ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین: 'بارگاہِ رسالت میں'، مشمولہ: سہ ماہی 'فکر و نظر'، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی،

بین الاقوامی، ص ۴۶

۷۔ڈاکٹر تحسین فراقی: 'اقبال کی اُردُو شاعری کا مختصر فنی جائزہ'، مشمولہ: ماہ نامہ 'قومی زبان'، انجمن ترقی اُردُو پاکستان، کراچی، نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۴۵

۸۔علامہ محمد اقبال: 'ارمغانِ حجاز'، شیخ مبارک علی تاجر کتب، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور، طبع اوّل ۱۹۳۸ء، ص ۲۵

۹۔صوفی فقیر محمد: 'آدابِ نعت'، ادارۂ گلستانِ اسلام، سرگودھا ۲۰۰۳ء، ص ۶۳ بحوالہ: شاکر کنڈان: 'سرگودھا کا دبستان شاعری' (جلد اوّل)، اکادمیات، ۳۹۱۔این سمن آباد، لاہور، طبع اوّل ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۵

۱۰۔مولانا محمد مصطفی رضا خان: 'ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت'، مجلس المدینۃ العلمیہ، کراچی، محرم الحرام ۱۴۳۴ھ/نومبر ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۷

۱۱۔محمد جمال الدین عرفی شیرازی: 'قصائدِ عرفی'، مطبع قیومی، کان پور، ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء، ص ۵

۱۲۔'انتخابِ کلام'، مشمولہ: سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۶ء، ص ۴۳۷

۱۳۔ایضاً، ص ۴۴۲

۱۴۔ایضاً، ص ۴۳۷

۱۵۔ایضاً، ص ۴۴۱

۱۶۔ایضاً، ص ۴۴۱

۱۷۔ایضاً، ص ۴۳۵

۱۸۔احمد رضا خان فاضل بریلوی: 'حدائقِ بخشش' (کامل)، رضا دارُالاشاعت، ضلع بریلی شریف، ۱۹۸۵ء، ص ۶۲

۱۹۔'انتخابِ کلام'، مشمولہ: سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۶ء، ص ۴۳۹

۲۰۔ایضاً، ص ۴۳۹

۲۱۔ایضاً، ص ۴۴۰

۲۲۔ایضاً، ص ۴۴۱

۲۳۔ایضاً، ص ۴۳۹

۲۴۔محمد اقبال: 'بانگِ درا'، کریمی پریس، لاہور، طبع اوّل ۱۹۲۴ء، ص ۲۲۴

۲۵۔'انتخابِ کلام'، مشمولہ: سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۶ء، ص ۴۴۱

۲۶۔ایضاً، ص ۴۴۰

۲۷۔ایضاً، ص ۴۳۶

۲۸۔ایضاً، ص ۴۴۱۔۴۴۲

۲۹۔ایضاً، ص ۴۴۲

☆☆☆

ڈاکٹر محسن رضا رضوی
ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی، رابطہ نمبر: 9431443778

ارشادِ نبیؐ کا نکتہ داں: ارشاد حسین معروفی

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی صاحب کا تعلق اتر پردیش کے مردم خیز گاؤں پورہ معروف سے تھا، جہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ باب العلم، مبارک پور اور جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔ تدریسی خدمات کے ساتھ انھوں نے مختلف دینی و تبلیغی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور طویل عرصے تک مدارس میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔

ادبی اعتبار سے معروفی صاحب ایک گوشہ نشیں مگر صاحبِ طرز شاعر تھے جنھوں نے حمد، نعت، منقبت، رباعی اور غزل سمیت متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی شاعری کلاسیکی روایات کی پاسدار ہے اور زبان و بیان پر ان کی مضبوط گرفت نمایاں ہے۔ خاص طور پر نعتیہ کلام میں ان کا اسلوب سادہ، پراثر اور عقیدت و محبت سے لبریز ہے۔ انھوں نے نعت گوئی میں شریعت کے تقاضوں اور آداب کا خاص خیال رکھا اور کہیں بھی غلو یا حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

ان کے اشعار میں معجزاتِ نبویؐ، قرآنی تلمیحات اور احادیث کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے، جیسے شق القمر، معراج اور دیگر واقعات کو انھوں نے نہایت سلیقے سے نظم کیا ہے۔ ان کا کلام سہلِ ممتنع کی عمدہ مثالیں پیش کرتا ہے اور ان میں فکری سنجیدگی اور جذباتی گہرائی موجود ہے۔ اگرچہ ان کا بیشتر کلام محفوظ نہ رہ سکا، تاہم جو کچھ دستیاب ہے وہ ان کی بلند شعری صلاحیت کا مظہر ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے کمیت کے بجائے کیفیت کو ترجیح دی۔

کلیدی الفاظ:

ارشاد حسین معروفی، نعتیہ شاعری، حمد و منقبت، کلاسیکی شعری روایت، معجزاتِ نبویؐ، شق القمر، واقعہ

معراج، قرآنی تلمیحات، سہل ممتنع، گوشہ نشینی، کیفیتِ کلام۔

کس نے نعتِ مصطفیٰ کا بھی شرف بخشا مجھے
مجھ کو ارشادِ نبیؐ کا نکتہ داں کس نے کیا

مولانا ارشاد حسین معروفی (۱۹۴۹ء۔۲۰۲۵ء) کا مولد و مدفن اتر پردیش کی ایک مردم خیز بستی پورہ معروف، ڈاکخانہ کرتھی جعفر پور، ضلع مئو ہے۔ ابتدائی اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم گھر اور مقامی مکتب میں ہوئی۔ منشی زین العابدین اور مولانا عبدالرؤف سے علوم متداولہ حاصل کیا خصوصاً علم حساب کا درس لیا۔ پھر مدرسہ باب العلم، مبارک پور میں درجہ ششم میں داخل کیے گئے۔ یہیں سے مولوی کی سند حاصل کی۔ یہاں سے فراغت کے بعد جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے دیگر اسناد حاصل کیں اور یہیں سے ۱۹۷۲ء میں ممتاز الافاضل بھی ہوئے، جس کی بنیاد پر اس ادارے کے سربراہ کے ہاتھوں سرفراز بھی کیے گئے۔ اس کے بعد موضع دہیاور، تحصیل ٹانڈہ، ضلع امبیڈکر نگر چلے آئے اور مدرسہ صابرہ نقی میں مدرسی اختیار کر لی۔ مختلف وقتوں میں مختلف مقامات پر ماہ رمضان میں مواعظ حسنہ اور نماز جماعت کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۰ء میں مدرسہ باب العلم، مبارک پور میں درجات عالیہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ چند دنوں یہاں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد جامعہ ایمانیہ ناصریہ، جون پور میں خدمات کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ ۱۹۸۸ء میں جامعہ حیدریہ، خیرآباد میں مدرس مقرر ہوئے۔ آخرش اپنی مادر علمی باب العلم، مبارک پور واپس آ گئے اور یہاں درجات عالیہ کی تدریس سے متعلق ہو گئے۔ یہیں سے ۲۰۱۲ء میں سبک دوش ہوئے۔ انتقال ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو ایراز لکھنؤ میڈیکل کالج لکھنؤ میں ہوا اور تدفین اسی دن رات دس بجے پورہ معروف کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

فیضان حیدر اپنے رسالے 'فیضان ادب' میں گاہے ماہے اپنے والد کا کلام شائع کرتے رہے ہیں۔ ارشاد حسین معروفی کے کلام بلاغت نظام کا ایک مختصر انتخاب اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ اس انتخاب میں حمد، نعت، منقبت، رباعی اور غزل کے عمدہ نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ بیشتر گوشہ نشیں شاعروں کی طرح ارشاد حسین معروفی نے بھی اپنے کلام کو کبھی کسی رسالے میں اشاعت کے لیے بھیجا نہ ان کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ بے نیازانہ زیست کرتے رہے اور تاعمر تقریباً تارک محافل رہے۔ اس لیے ان کا سرمایہ کلام تقریباً نظر انداز ہو گیا یا کر دیا گیا۔ اطلاع کے مطابق ان کی اکثر تخلیقات نذر طاق نسیاں ہو گئیں۔ جو انتخاب میرے پیش نظر ہے وہ بھی پرانے کاغذات اور ڈائری کے خستہ اوراق سے بہ مشکل تمام

نقل کیا گیا ہے۔ بہرحال! میں ذیل میں ان کی نعت گوئی کے حوالے سے چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

ارشاد حسین معروفی دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ عمر بھر دینی تعلیم پر زور دیتے رہے۔ شاعری کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ حمد، نعت، منقبت، سلام، مرثیہ، نوحہ، قطعہ، رباعی، غزل غرض تقریباً ہر صنف میں اپنے احساسات وجذبات کو شعری پیکر عطا کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی شاعر کی شخصیت کا آئینہ اس کا کلام ہوتا ہے جس میں اس کی شعری شخصیت کے مختلف پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ شاعری جذبات کے بے تحاشہ سیلاب کا نام ہے۔ یعنی Poetry is the spontaneous overflow of powerful feelings۔

جب کسی Original اور اصیل فکر رکھنے والے شاعر پر جذبات واحساسات کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ شعر گوئی کے عمل سے گزرتا ہے۔ اس عمل کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے، اور وہ اپنے کلام سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ یہاں سے اس کے قاری کی ذمہ داری کا آغاز ہوتا ہے۔ ارشاد حسین معروفی کا تعلق اسی قبیل کے شاعروں سے تھا۔

ارشاد حسین معروفی ایک کم گو شاعر تھے۔ ان کی ابتدائی تربیت اور مشق ومزاولت کا پس منظر کلاسیکی شعری روایات سے وابستہ ہے، جس سے انھیں بڑا فیض پہنچا ہے۔ زبان کے رموز ونکات اور اظہار وبیان پر قدرت حاصل ہوئی۔ احساس وفکر کی دولت بے پایاں نے انھیں تخلیقی اظہار میں فیضان پہنچایا۔

ملک سخن کے تاجداران نے حمد الٰہی کے بعد ختم رسلؐ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی مدح میں اپنے قلم کو سجدہ ریز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ائمہ اطہار اور اہل بیت کی شان میں بھی رطب اللسان رہے ہیں۔ کچھ یہی صورت معروفی صاحب کے یہاں بھی ملتی ہے۔ نعت کا تعلق چوں کہ بنیادی طور پر عقیدت بلکہ حسن عقیدت اور جذبہ عقیدت سے ہے، اس لیے اس میں حضور پاکؐ کے عملی اور علمی اعجازات ومعجزات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ شعرا حضرات نے معجزات اور اعجازات کے بیان میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے، مگر کسی کسی کے یہاں ایک ذرا سی لغزش الوہیت اور نبوت کے درمیان پائے جانے والے نازک رشتے میں دراڑ پیدا کر دیتی ہے۔ معروفی صاحب کا کلام ایسی لغزشوں اور کوتاہیوں سے پاک نظر آتا ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار میں عشق وعقیدت کا بے محابہ پہلو ضوفشاں ہے۔

خاک ہوتا میں تیرے آنگن کی تیرے قدموں کو چومتا ہوتا
رہ گزر ہوتا تیری منزل کی راہ تیری میں دیکھتا ہوتا
ہوتا نعلین تیرے پیروں کی عرش تلووں کو چومتا ہوتا

نعت کا موضوع ارتقا پذیر اور بتدریج بڑھنے والا رہا ہے۔ یہ جس قدر ارتقا پذیر، وسیع اور ہمہ گیر ہے رحمۃٌ للعالمین احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ، سرکار دو عالم، حبیب خدا کی ذات والا صفات اسی قدر بلند و برتر اور لامحدود ہے۔ دنیا جہان کی مختلف قوم وملت، مذاہب اور مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے شعرا نے اس صنف کو مختلف ہیئت اور انداز میں برتا ہے۔ باوجود اس کے حضور اکرمؐ کی ذات پر کچھ لکھتے ہوئے خامہ خونچکاں اور نطق سر بہ گریباں نظر آتا ہے۔

بڑھتے ہوئے عہد اور حالات کے ساتھ یہ موضوع ذات رسول مقبولؐ سے بڑھ کر کائنات اور اس کی مبادیات تک پھیل چکا ہے۔ روز بہ روز رونما ہونے والے سائنسی انکشافات ان مباحث کا پردہ چاک کر رہے ہیں اور زمانہ انگشت بدنداں ہے۔ ایک شق القمرؐ کے معجزہ ہی کو لیجیے۔ اردو، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کے شاعروں نے اس معجزے اور ایسے معجزات و کرامات کو نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ نظم کیا ہے۔ کمال الدین اسماعیل (متوفی: ۶۳۵ھ) جنھیں خلّاق المعانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، شق القمر کے متعلق فرماتے ہیں ؎

انگشت معجز تو، کہ تیغی ست آبدار
یک زخم او کند سپر ماہ را دو نیم

اس معجزہ کو دیکھیے معروفی صاحب نے کس خوب صورت انداز میں شعری جامہ پہنایا ہے ؎

ایک انگشت کے اشارے سے
ہوتا دونیم ہے قمر لکھنا

.....

کیے ہیں ایک اشارے میں چاند کے ٹکڑے
کلام پاک میں یہ صاف صاف لکھا ہے

مشرکین مکہ کے اصرار پر حضورؐ نے چاند کو دو ٹکڑے کر دکھایا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع اور دیگر مواقع پر اپنی انگلیاں پیالے میں ڈالیں تو پانی جاری ہو گیا جس سے سارا لشکر سیراب بھی ہوا اور لوگوں نے وضو بھی کیا۔ جانوروں، پتھروں اور درختوں کا راہ چلتے جھک جھک کر آپ کو سلام کرنا، اطاعت و تعظیم میں سر جھکانا کلام پاک اور احادیث سے ثابت ہے اور مختلف مذہب وملت سے تعلق رکھنے والے شعرائے کرام اس سے متفق بھی ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار معروفی صاحب مرحوم کے پیش ہیں ؎

کسی چمن کی طرف سے اگر گزر ہو جائے

درخت آپ کو جھک کر سلام کرتے ہیں

ایک مستند حدیث ہے کہ ابوجہل کی بیٹی نے اپنی بند مٹھی (جس میں کنکر تھے) دکھا کر سوال کیا تھا کہ میں آپ پر اس وقت ایمان لاسکتی ہوں جب آپ بتادیں کہ میری بند مٹھی میں کیا ہے۔ آپؐ کے ایک اشارے پر مٹھی میں بند پتھر نے کلمہ پڑھ کر تصدیق کردی۔ اس معجزہ کو معروفی صاحب نے اس طرح منظوم کیا ہے ؎

ہے کلمہ گویوں میں شامل جماد بھی ارشادؔ
نبی کے ہاتھ پہ پتھر کلام کرتے ہیں

سورۃ النجم کی آیت نمبر ۳/اور ۴/میں ارشادرب العزت ہے کہ :وَمَایَنطِقُ عَنِ الھوٰی اِن ھوَاِلَّا وَحی یوحیٰ۔ اس آیت کا منظوم ترجمہ معروفی صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے ؎

خدا کا حکم نہ جب تک ملے اسے ارشادؔ
مرا رسول کہاں کچھ کلام کرتا ہے

اسی طرح واقعہ معراج کو بھی مختلف زبان سے متعلق شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے شعری جامہ پہنایا ہے۔ معروفی صاحب نے بھی اس باب میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں اور عشق رسول اکرمؐ کا مظاہرہ کیا ہے ؎

عشق خیرالبشر اگر لکھنا ان کی معراج کا سفر لکھنا
قاب قوسین ہو کہ او ادنیٰ ادنُ منی کے باب پر لکھنا

.....

کلام رب ہوا محبوب سے اک خاص لہجے میں خدا ہی جانے وہ منزل جہاں پہ مصطفیٰ آئے
ترقیات سے سمجھو مسافت معراج وہ ایک پل میں فلک سے زمیں پہ آتا ہے
نبی سے بات کی حق نے علی کے لہجے میں حبیب کو یہی لہجہ پسند آتا ہے

ایک شعر مزید ملاحظہ کیجیے۔ یہ شعر سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال ہے ؎

آدمی کیا ہے تابع فرماں
ہیں قدم بوس جانور لکھنا

یہ تلمیح کا شعر ہے اور صحیح مسلم سے ماخوذ ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ باغ میں تشریف لے گئے۔ سامنے ایک اونٹ نظر آیا۔ اس نے جیسے ہی آپؐ کو دیکھا اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ آپؐ اس کے پاس گئے اور کوہان اور کاندھوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ پرسکون ہوگیا اور خاموشی اختیار کرلی۔ آپؐ نے دریافت

کیا کہ اس کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری جوان سامنے آیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسولؐ! یہ میرا اونٹ ہے۔ تب آپؐ نے فرمایا: کیا تم ان جانوروں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے جن کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں مالک بنایا ہے۔ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور تھکاتے ہو۔

عرفی جو ایک بڑا قصیدہ گو بھی ہے اور اسے اپنی غزل گوئی پر بھی ناز ہے، لیکن جب وہ نعت پاک کی جانب رجوع کرتا ہے تو سنبھل جاتا ہے اور نعت گوئی کی حدود جو شریعت نے مقرر کیے ہیں، اس سے تجاوزات کی منزل سے اس طرح ہوشیار کرتا ہے ؎

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را
گیرم کہ خرد حصر کند مایۂ نعتش آن حوصلہ آخر ز کجا نطق و رقم را

ارشاد حسین معروفی نے عرفی کے اس شعر کو ان الفاظ میں رقم کیا ہے کہ شعر سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال بن جاتا ہے ؎

نعت ہے یہ کوئی غزل تو نہیں ہے یہ خنجر کی دھار پر لکھنا

یہاں ارشاد حسین معروفی صاف لفظوں میں نعت اور غزل کے درمیان فرق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں حفظ مراتب کا اس درجہ خیال رکھا جاتا ہے کہ دوسری صنف سخن اس کی گرد تک نہیں پہنچتی۔ شاعر کو الوہیت اور نبوت کے فرق پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ عین القضات کے اس جملے یا مثل پر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے: ''باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار۔'' ذیل میں ایک پوری نعت نقل کر رہا ہوں جو سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال ہے ؎

عشق خیرالبشر اگر لکھنا ان کی معراج کا سفر لکھنا
قاب قوسین ہو کہ او ادنیٰ ادنُ منی کے باب پر لکھنا
ہے کہاں آدمی کے امکاں میں نعت سرکار بحر و بر لکھنا
آپ تو نور ہیں حقیقت میں اور پیکر میں ہیں بشر لکھنا
نور سے کل جہاں منور ہے ان کی آمد کا ہے اثر لکھنا
جس سے عاجز جہاں ہے اس کی ثنا چاہتا ہے یہ بے خبر لکھنا
نعت ہے یہ کوئی غزل تو نہیں ہے یہ خنجر کی دھار پر لکھنا
کلمہ پڑھتے ہیں ہاتھ پر کنکر جھکتے قدموں میں ہیں شجر لکھنا
ایک انگشت کے اشارے سے ہوتا دو نیم ہے قمر لکھنا

آدمی کیا ہے تابع فرماں ہیں قدم بوس جانور لکھنا
در پہ ارشادؔ ان کے شاہ و گدا سب جھکاتے ہیں اپنا سر لکھنا

نعتیہ کلام کہنے والے شاعر کو جن کڑی اور سخت منزلوں کا سامنا ہوتا ہے اور جن پابندیوں سے گزرنا ہوتا ہے معروفی صاحب ان منزلوں سے بخوبی آشنا نظر آتے ہیں۔اس صنف سخن میں حفظ مراتب کا پاس ولحاظ، انداز تخاطب، مضامین اور انتخاب الفاظ کے ساتھ محفل نبویؐ میں حاضری، دربار نبویؐ میں نشست و برخاست کے بھی مخصوص اور متعینہ آداب ہیں۔کلام پاک کی سورۃ الحجرات کی دوسری آیت میں اس آداب کی طرف واضح طور پر اشارہ ملتا ہے۔بیان ہوا ہے کہ ''اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز پر بلند نہ کرنا اور ان سے اس طرح بلند آواز میں بات بھی نہ کرنا جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو یا پکارتے ہو۔کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال تباہ ہو جائیں اور تمہیں اس کا پتہ بھی نہ چلے۔'' اس پس منظر میں معروفی صاحب کے یہ اشعار دیکھیے۔

سر خم کرو تعظیم سے اکڑو نہ یہاں پر یہ سوچ کے آؤ کہ پیمبر کی گلی ہے
ارشاد خدا ہے کہ کرو بات ادب سے اونچی نہ ہو آواز یہ دربار نبیؐ ہے

اس مختصر سی تحریر سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ارشاد حسین معروفی مرحوم کی جہاں فن پر گرفت خاص تھی وہیں اسلامی، مذہبی اور قرآنی تعلیمات سے بھی آشنا تھے۔قرآنی تلمیحات واشارات، قصص قرآن پر ان کی گہری نظر تھی۔انھوں نے نعت کے موضوعات کو عہد حاضر کے مسائل ومباحث سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔محاکات ومنظر نگاری کی بھی عمدہ مثالیں ان کے یہاں ملتی ہیں۔معروفی صاحب نے وہ تمام آداب ملحوظ خاطر رکھے جو نعت گوئی کے لیے لازمی شرائط قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

میں نے اوپر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا اجمال یہ ہے کہ معروفی صاحب ایک ایسے سخنور تھے جو نام ونمود سے دور گوشۂ تنہائی میں اعجاز سخن سے کام لیتے رہے۔عوامی مقبولیت سے دور کا رشتہ بھی نہیں رکھا۔اپنی جودت طبع سے شعر وسخن کی شمعیں روشن رکھیں۔جہاں تک میں نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کمیت سے زیادہ کیفیت پر زور صرف کیا ہے۔جو کچھ کہا سنجیدگی سے کہا اور منتخب کہا۔

☆☆☆

ڈاکٹر فیضان جعفر علی
استاد درجاتِ عالیہ، مدرسہ عقیلہ بنی ہاشم لکھنؤ، رابطہ نمبر: 8874669937

عطر مدحتِ اہل بیت رسولؐ

مولانا ارشاد حسین معروفی کی منقبت گوئی

تلخیص:

اردو شاعری کی مذہبی اصناف میں منقبت کو ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے، کیوں کہ یہ صنف محض ادبی اظہار نہیں بلکہ عقیدت، روحانیت اور اخلاقی شعور کی نمائندہ بھی ہے۔ منقبتی شاعری کے ذریعے شعرا نے نہ صرف اہلِ بیت اطہار اور دیگر مقدس ہستیوں کے فضائل بیان کیے بلکہ اسلامی تہذیب کی اخلاقی و فکری اقدار کو بھی نسل در نسل منتقل کیا۔ اس صنف کی اہمیت اس اعتبار سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ ادب اور ایمان کے درمیان ایک مضبوط ربط قائم کرتی ہے۔ اردو ادب میں منقبت گوئی کی روایت اگرچہ قدیم ہے، تاہم ہر دور میں بعض شعرا نے اس صنف کو روایتی اظہار سے نکال کر فکری اور تہذیبی معنویت عطا کی۔ ایسے شعرا میں مولانا ارشاد حسین معروفی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی منقبت گوئی عقیدت، تاریخی شعور، اخلاقی پیغام اور فنی شعور کے حسین امتزاج کی نمائندہ ہے۔ انھوں نے منقبت کو صرف جذباتی اظہار تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے اصلاحِ نفس، تربیت اور روحانی آگہی کا ذریعہ بنایا۔ زیرِ نظر مطالعہ کا مقصد مولانا ارشاد حسین معروفی کی منقبت گوئی کا فنی، فکری اور موضوعاتی جائزہ لینا ہے، تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ ان کے یہاں منقبت کس طرح شخصیت پرستی سے بلند ہو کر اقدار، کردار اور اخلاقی معنویت کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اس مقالہ میں ان کی شاعری کے اسلوب، موضوعات، تاریخی شعور، جذبۂ عقیدت اور اصلاحی پہلوؤں کا تجزیہ کیا جائے گا، نیز یہ بھی دیکھا جائے گا کہ انھوں نے مذہبی صنف کی فکری حدود کے اندر رہتے ہوئے تخلیقی امکانات کو کس طرح وسعت دی۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین معروفی، منقبت نگاری، اوصاف و اقدار، اہل بیت اطہار، فضائل و مناقب، تاریخی

شعور، عقیدت و جذبات۔

اردو ادب کی شعری روایت میں منقبت ایک نہایت معتبر، باوقار اور روحانی صنفِ سخن کی حیثیت رکھتی ہے۔ منقبتی شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں، خصوصاً حضرت محمد مصطفیٰؐ، اہلِ بیتِ اطہار، صحابۂ کرام اور اولیائے عظام کے فضائل، مناقب، اخلاقی اوصاف اور روحانی عظمت کو شعری پیکر میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صنف محض عقیدت کے اظہار تک محدود نہیں بلکہ ایمان، محبت، معرفت اور اخلاقی تربیت کا ایک موثر ادبی وسیلہ بھی ہے، جس کی جڑیں اسلامی تہذیب کے ابتدائی ادوار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ عربی و فارسی ادب میں منقبت کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت موجود رہی ہے، جو بعد ازاں اردو شاعری میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ برصغیر کی مذہبی و ثقافتی فضا نے اس صنف کو خصوصی فروغ عطا کیا، جہاں شعرا نے اسے خلوصِ دل، فنی مہارت اور ادبی وقار کے ساتھ برتا۔ فنی اعتبار سے منقبتی شاعری میں سلاستِ بیان، خلوصِ نیت، جذبۂ عقیدت اور اخلاقی پاکیزگی بنیادی عناصر شمار ہوتے ہیں۔ اس صنف میں مبالغہ آرائی یا محض لفظی صناعی کے بجائے روحانی تاثیر، معنوی صداقت اور قلبی وابستگی کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

عربی، فارسی اور اردو کے شعری سرمائے کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تقریباً ہر دور کے شعرا نے حمد و نعت کے ساتھ ساتھ آلِ رسولؐ، اہلِ بیت اطہار، خلفائے راشدین، بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کی شان میں مدحیہ اشعار تخلیق کیے ہیں۔ دراصل یہ تمام مقدس ہستیاں ہر مسلمان کے نزدیک اس لیے قابلِ احترام ہیں کہ انھیں قربِ الٰہی اور بارگاہِ رسالت میں غیر معمولی مقام و منزلت حاصل ہے۔ چنانچہ جب کوئی شاعر کسی برگزیدہ شخصیت کی مدح کرتا ہے تو اس کے دل میں اس ہستی کے لیے عقیدت، احترام اور محبت کے جذبات فطری طور پر موجزن ہو جاتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب کسی شخصیت سے والہانہ محبت پیدا ہو جائے تو اس سے وابستہ ہر شے اور ہر نسبت بھی عزیز اور محترم محسوس ہونے لگتی ہے۔ خصوصاً جب معاملہ عشقِ رسول اور محبتِ علی کا ہو تو ان مقدس ہستیوں سے وابستہ دیگر شخصیات بھی اپنی روحانی نسبت کے باعث دلوں میں احترام اور عقیدت کا مقام حاصل کر لیتی ہیں، کیوں کہ رسول اکرم نے اپنی سیرتِ مبارکہ اور ارشادات کے ذریعے جن ہستیوں کو قربت و فضیلت عطا فرمائی، امتِ مسلمہ کے دلوں میں ان کے لیے محبت و توقیر کا جذبہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اردو ادب کی اصنافِ شعری میں جس طرح ہمارے معتبر ناقدین نے صنفِ مرثیہ کو بنیادی طور پر دو قسموں میں متعارف کرایا ہے، جس میں مرکزی حیثیت عاشورائی یا

کربلائی مرثیہ کو دی گئی ہے اور شخصی مرثیے کو ایک الگ زمرے میں رکھا گیا ہے، اسی طرح منقبتی شاعری کو ممدوح کی عظمت وقداست کے پیشِ نظر دو بنیادی قسموں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کی منقبت میں اُن منقبتی اشعار کو رکھا جا سکتا ہے جن میں اسلام کی اُن برگزیدہ شخصیات کے فضائل وکمالات مذکور ہوں جو بعدِ پیغمبر اکرمؐ سب سے زیادہ بافضیلت و باکرامت ہوں جنھیں اصطلاح میں 'عترت رسول' کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ منقبت کی دوسری قسم میں اُن بزرگانِ دین کے فضائل وکمالات پر مبنی شعری سرمائے کو رکھا جا سکتا ہے، جن کا مرتبہ عترتِ رسول کے بعد حساب کیا جاتا ہے جنھیں ہم اصحاب، انصار، تابعین یا بزرگانِ دین جیسے متعدد عناوین سے یاد کرتے ہیں۔ اس طرح کی تقسیم بندی سے منقبت گوئی کی صنف کو نہ صرف یہ کہ سمجھنے اور پرکھنے میں آسانی ہوگی بلکہ منقبتِ خاص اور منقبتِ عام کی شعری ومعنوی ابعاد وجہات کی تعبیر وتفہیم قدرے آسان تر ہو جائے گی۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی منقبتوں کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ انھوں نے مناقب اہلِ بیت کو ادبی روایت کے بجائے گہری قلبی وابستگی کے تحت اختیار کیا۔ اگرچہ انھوں نے غزل، سلام اور نظم بھی کہی، تاہم اپنی شعری شناخت منقبت سے وابستہ کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں ؎

اگر ارشادؔ تجھ میں شاعری کی کچھ بھی شُدبُد ہے
غزل کو چھوڑ کر تو منقبت پہچان رکھے گا

ان کی منقبتوں میں عقیدتی جذبات کی ایک رواں لہر محسوس ہوتی ہے۔ یہ جذبات نہ صرف شاعر کے باطنی عشق کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ تاریخی واقعات اور مذہبی شخصیات کے کردار کو بھی زندہ صورت میں پیش کرتے ہیں۔ دراصل شعر کی اصل روح جذبات ہی ہوتے ہیں جو تخیل کے ساتھ مل کر کلام کو اثر آفرینی عطا کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''.....خیال کے ساتھ جذبات بھی شامل ہوں، یہ صفت اگر خیال میں موجود نہ ہوگی تو باوجود تمام خوبیوں کے شعر ایک پیکرِ بے جان وروح، ایک گل بے رنگ وبو رہے گا۔ خیال کتنا ہی سچا، سادہ، بلند اور باریک کیوں نہ ہو لیکن اگر اس میں تڑپ نہیں یعنی جذبات کی آمیزش نہیں تو وہ شاعرانہ خیال نہ ہوگا، حکیمانہ یا واعظانہ خیال ہوگا۔''(۱)

مولانا ارشاد حسین معروفی کی منقبت گوئی میں یہی جذباتی صداقت نمایاں نظر آتی ہے ؎

جو بابِ علم سے کچھ انتساب رکھتے ہیں — وہ سوئے دار بھی جانے کا خواب رکھتے ہیں
جو عشقِ نام علی کی کتاب رکھتے ہیں — وہ زندگی کا مکمل نصاب رکھتے ہیں

لبوں کو دے کے جو مدح علی کی سوغاتیں ہم اپنے لہجے کو معراج یاب رکھتے ہیں
ہماری ماں کی ہے آغوش تربیت کا اثر دلوں میں حبِّ علی بےحساب رکھتے ہیں
علی سے بغض ہے کفر و نفاق اے ارشادؔ یہ خود سے پوچھیے کیا دل میں آپ رکھتے ہیں

منقبت کا تعلق چوں کہ پروردگارِ عالم کی برگزیدہ اور مقدس ہستیوں سے ہوتا ہے، اس لیے جب کوئی شاعر منقبتی شاعری میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے فکر کے زاویے متعین کرتا ہے تو یہی زاویے اس کی شاعری کو فرش سے عرش تک معنوی بلندی عطا کر دیتے ہیں۔ تاہم اس تخلیقی سفر میں اس امر کا خاص لحاظ رکھنا ناگزیر ہوتا ہے کہ جس متبرک ہستی کی مدح کی جا رہی ہو، اس کے ادب و احترام کے تمام تقاضے پوری سنجیدگی کے ساتھ ملحوظ رہیں، کیوں کہ یہی تقاضے عقیدت کے حقیقی معیار کی تکمیل کرتے ہیں۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کی منقبتوں کا مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ انھوں نے اظہارِ مدح میں بے پناہ ادب، اخلاص اور روحانی احترام کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے یہاں عقیدت رسمی یا لفظی نہیں، بلکہ شعوری اور قلبی وابستگی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ چوں کہ منقبت نگاری کی اولین شرط ہی عقیدت ہے، اس لیے منقبت کا اصل جوہر بھی اسی رنگِ عقیدت سے نمایاں ہوتا ہے، اور مولانا کے کلام میں یہی عنصر ان کی شاعری کی روح بن کر سامنے آتا ہے۔ عقیدت کی مختلف صورتوں کے بارے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کہتے ہیں:

> ''عقیدت کے اظہار کی کئی شکلیں ہوتی ہیں، ایک سطح پر انسان محض رسماً اپنی عقیدت کا اعلان کرتا ہے۔ دوسری سطح وہ ہے جہاں انسان دل سے کسی فرد کی توقیر تو کرے لیکن اس کا عمل اس کی فکر کا ہمنوا نہ ہو۔ عقیدت کی بہترین صورت اس وقت سامنے آتی ہے جب انسان کے رگ و پے میں ممدوح کی محبت لہو بن کر گردش کرنے لگے۔''(۲)

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مذکورہ رائے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جب مولانا ارشاد حسین کی منقبت نگاری کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی شاعری عقیدت کی اسی تیسری اور اعلیٰ صورت کی مظہر ہے، جہاں انسان اپنے ممدوح کی محبت میں اس قدر ہمہ تن ڈوب جاتا ہے کہ اس کے کردار، افکار اور طرزِ عمل کو اپنی عملی زندگی کا نمونہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا ارشاد حسین کی منقبتوں میں یہی شعوری وابستگی نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے ممدوحین کو ایسے روشن میناروں سے تعبیر کیا ہے جن کی نورانی روشنی سے انھوں نے اپنی زندگی کے راستوں کو منور اور آراستہ کیا۔ درحقیقت مولانا موصوف نے اسوۂ رسولؐ، آلِ رسولؐ اور اہلِ بیت اطہار ہی کو اپنی منقبتی شاعری کا بنیادی موضوع بنایا اور ان مقدس ہستیوں کے ذکر کے ذریعے ایک تبلیغی اور اصلاحی پیغام عام کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی منقبتوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا

ہے کہ انھوں نے تاریخِ اسلام کے تسلسل اور مرحلہ وار واقعات کو نہایت شعوری انداز میں اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے، جیسے کہ مستند تاریخی مصادر میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ رسول اکرم کی پرورش و تربیت، حضرت علی کی خانۂ کعبہ میں ولادت، شبِ ہجرت، صلحِ امام حسن، اور غزواتِ بدر، خیبر اور خندق جیسے اہم تاریخی واقعات کو انھوں نے گہرے انہماک اور عقیدت کے ساتھ اپنی منقبتوں میں سمویا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ مولانا ارشاد حسین نے منقبت نگاری کو رسمی یا روایتی شاعرانہ مشق کے طور پر اختیار نہیں کیا، بلکہ جس مقدس ہستی کی مدح قلم بند کی، اس سے متعلق تاریخی روایات اور واقعات کا سنجیدہ مطالعہ بھی ان کے پیشِ نظر رہا، جس نے ان کی منقبتوں کو فکری اعتبار اور تاریخی استناد عطا کیا۔

جنگ خیبر ہو کہ خندق ہو کہ ہوں بدر و احد
دیکھ لی دیکھنے والوں نے شجاعت ان کی

.....

شب ہجرت نبی کی جاں بچائی
ابوطالب کے یہ نور نظر ہیں
کوئی غزوہ ہو یا کوئی سریّہ
علی ہر حال میں دیں کی سپر ہیں

.....

مبارز جب طلب کرتا تھا کلِّ کفر خندق میں
مقابل کلِّ ایماں برسر پیکار آئے ہیں
پرانا در مقفل ہے ولادت طے ہے کعبے میں
نئے در سے حرم میں حیدر کرار آئے ہیں

.....

صلح حدیبیہ کو ہے صلح حسن پہ ناز
یہ صلح ہے کہ امن جہاں کا پیام ہے
تاریخ کر رہا ہے رقم وقت کا امام
دنیا سمجھ رہی ہے حسن بے حسام ہے
صفین کہہ چکی ہے شجاعت کو مرحبا
حیدر کا لال شیر خدائے انام ہے

.....

سجدے میں ابلیس انگوٹھا چباتا رہ گیا
جس کو محویت کا ہے تحفہ دیا سجاد نے
معجزہ ہے ان کے ہونٹوں کا کہ گویا ہوگیا
سنگ اسود کو جو اک بوسہ دیا سجاد نے

.....

خدا جانے کہ کب تک قید خانے کی مشقت سے
اندھیرے میں چراغ دل جلائے حضرت کاظم
جو عورت آپ کے بہکانے کو زنداں میں آئی تھی
اسے بھی راہ حق پر کھینچ لائے حضرت کاظم

جہاں تک جدید منقبتی شاعری کا تعلق ہے تو وہ محض مدح یا جذباتی اظہار نہیں رہی، بلکہ یہ اسلامی تاریخ کی فکری تعبیر بن چکی ہے۔ تاریخی تلمیحات کے ذریعے مولانا ارشاد حسین نے ماضی کو حال سے جوڑا ہے اور اہلِ بیت کی شخصیات کو زندہ اخلاقی و سماجی نمونہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح منقبت روایت، تاریخ اور فکر کا حسین امتزاج بن جاتی ہے۔ مذکورہ مثالوں سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی منقبت گوئی دراصل ان کے عمیق روحانی ذوق، تاریخِ اسلام کے گہرے مطالعے اور سیرتِ ائمہ

سے والہانہ وابستگی کی روشن مثال ہی نہیں ہے، بلکہ ان کی منقبتی شاعری میں جو تلمیحاتی نظام کی وسعت ہے اس سے دیگر اصناف سخن بھی کافی حد تک اپنے معنوی وفنی امکانات کو وسیع تر کر سکتی ہیں۔ اسی طرح ان کی منقبت گوئی کا اصل سرچشمہ وہ قلبی بصیرت ہے جو تربیت، مشاہدے اور مذہبی مطالعے کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ مولانا موصوف اہلِ بیت اطہار کے محض روایتی مداح نہیں بلکہ ان کے مقام ومرتبہ کو تاریخی، دینی اور فکری تناظر میں سمجھنے والے شاعر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی منقبتیں سطحی جذباتیت سے محفوظ رہتی ہیں اور عشق ومعرفت کے حسین امتزاج کی نمائندہ بن جاتی ہیں۔

ایک کامیاب منقبتی شاعر وہ ہے جو اپنے ممدوح کی عظمت ورفعت کو اس انداز سے بیان کرے کہ قاری یا سامع کے دل میں نہ صرف احترام اور محبت کے جذبات بیدار ہوں بلکہ اس کی عملی زندگی میں بھی مثبت تبدیلی کی تحریک پیدا ہو۔ اس اعتبار سے منقبتی شاعری کا ایک نہایت اہم پہلو اس کا اصلاحی اور تربیتی کردار ہے، کیوں کہ یہ صنف محض مدح وتوصیف تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اخلاقی اقدار کی ترسیل کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ مولانا ارشاد حسین معروفی چوں کہ پیشے سے مدرس تھے اور تربیت واصلاح کے اصولوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے، اس لیے ان کی منقبتی شاعری میں یہ پہلو نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے انسان کو صبر، عدل، تقویٰ، ایثار، حق پسندی اور محبت جیسے اوصاف اپنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے یہاں اہلِ بیت اطہار کی سیرت محض تاریخی روایت نہیں بلکہ عملی نمونۂ حیات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں ان کی منقبت محض جذباتی مدح نہیں رہتی بلکہ ایک بامقصد اور عملی پیغام میں ڈھل جاتی ہے، جو فرد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرتی تطہیر اور اخلاقی استحکام کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

جلاتے جاؤ جہالت میں آگہی کا چراغ — زمانہ بھول نہ پائے گا روشنی کا چراغ
کوئی جلائے محبت میں دشمنی کا چراغ — جلاؤ ہاتھ سے خود اپنے دوستی کا چراغ
اجالا پھیل گیا ہر طرف زمانے میں — تقی کے گھر میں جو روشن ہوا نقی کا چراغ
فساد و دہشت و ظلم و عناد ختم ہوئے — جلایا آپ نے جب امن و آشتی کا چراغ
انھیں کے ذکر سے زینت دو اپنی محفل کو — سدا جلاتے رہو مدحت علی کا چراغ (۳)

مولانا کی منقبت نگاری کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کے یہاں شخصیت پرستی کے بجائے اوصاف، اقدار اور اخلاقی معیارات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ائمۂ طاہرین اور اہلِ بیتِ رسولؐ سے وابستہ مقدس شخصیات کی مدح میں محض جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان صفات کو اجاگر کرتے ہیں جو انسان کو اخلاقی رفعت اور روحانی بلندی عطا کرتی ہیں۔ اس طرح ان کی منقبت محض عقیدت کا اظہار نہیں

رہتی بلکہ ایک اخلاقی اور فکری درس گاہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ادبی و فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا ارشاد کے لب و لہجے میں سلاست و روانی اور برجستگی بھی ہے۔ انھوں نے آسان اور عام فہم لفظیات کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کو انتہائی آسان اسلوب میں بیان کیا ہے۔

مولانا کی منقبت گوئی کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ان کی شاعری روایتی عقیدت کا اظہار نہیں، بلکہ ایک شعوری، فکری اور روحانی تجربے کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے منقبت کو شخصیت پرستی کے محدود دائرے سے نکال کر اخلاقی اقدار اور انسانی کردار کی تشکیل کا وسیلہ بنایا۔ ان کے یہاں اہلِ بیت اطہار کا ذکر تاریخی احترام کے ساتھ ساتھ عملی رہنمائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی منقبتوں کی ایک نمایاں خصوصیت تاریخی شعور اور مذہبی مطالعے کی گہرائی ہے، جس کے باعث واقعاتِ اسلامی محض روایت نہیں رہتے بلکہ زندہ معنویت کے حامل بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے کلام میں جذبۂ عقیدت اور فکری توازن ایک ساتھ جلوہ گر ہیں، جس سے ان کی شاعری جذباتیت سے محفوظ رہتے ہوئے معرفت اور آگہی کی سطح تک پہنچ جاتی ہے۔ فنی اعتبار سے مولانا ارشاد زبان و بیان پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ سادہ مگر باوقار اسلوب، علامتی اظہار، قرآنی تلمیحات اور معنوی گہرائی ان کی منقبتوں کو ادبی اعتبار سے بھی اہم بناتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اصلاحی اور تربیتی پہلو نمایاں ہے، جس کے ذریعے وہ قاری کو صبر، عدل، محبت، ایثار اور حق پسندی جیسے اعلیٰ انسانی اوصاف اپنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ارشاد حسین معروفی کی منقبت نگاری اردو کی مذہبی شاعری کی روایت میں ایک باوقار اضافہ ہے، جہاں عقیدت و فن، تاریخ و روحانیت اور احساس و فکر ایک متوازن ہم آہنگی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کی منقبتیں نہ صرف مذہبی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں بلکہ اخلاقی و روحانی تربیت کا موثر ادبی وسیلہ بھی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، ہماری شاعری، نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۶ء، ص ۲۱

۲۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۲

۳۔ زیرِ نظر مقالہ میں لائے گئے بطور نمونہ تمام اشعار مولانا ارشاد حسین معروفی کے دست نویس نسخہ (ان کی ذاتی کاپی) سے ماخوذ ہیں جسے ان کے فرزند ڈاکٹر فیضان حیدر نے راقم الحروف کو بھیجا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید الفت حسین
صدر شعبۂ اردو، اَروِند مہیلا کالج، پٹنہ، رابطہ نمبر: 6201788749

مولانا ارشاد حسین: ذکر اہل بیت کا نغمہ گو

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین کی منقبتی شاعری مذہبی ادب میں ایک اہم اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔ حمد و نعت کے بعد منقبت ایک نہایت مقدس صنفِ سخن ہے، جس میں اہلِ بیت، صحابہ اور اولیائے کرام کے فضائل و مناقب بیان کیے جاتے ہیں۔ اس روایت کا آغاز عہدِ نبوی سے ہوا اور عربی و فارسی کے بعد اردو ادب میں بھی اسے خاصا فروغ حاصل ہوا۔

مولانا ارشاد حسین ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہترین عالم دین، مدرس اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں دینی جذبہ، اخلاقی قدریں اور عقیدت کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، سلام اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی، مگر ان کی منقبتی شاعری کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کے کلام میں اہل بیت خصوصاً حضرت فاطمہ زہرا، حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور دیگر ائمہ معصومین کے فضائل نہایت دل نشیں اور موثر انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ صرف مدح تک محدود نہیں رہتے بلکہ واقعاتِ کربلا، سیرتِ ائمہ اور اسلامی تاریخ کے اہم پہلوؤں کو بھی شعری قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی شاعری سادگی و روانی، فصاحت و بلاغت اور عقیدت کا حسین امتزاج ہے۔

مولانا ارشاد حسین کی شخصیت دینی اور اخلاقی و سماجی کردار کے لحاظ سے بھی نہایت بلند تھی۔ ان کی شاعری اصلاحِ معاشرہ، محبت اہلِ بیت اور انسانی اقدار کے فروغ کا ذریعہ ہے۔ ان کا ادبی سرمایہ اگرچہ مکمل طور پر مدوّن نہیں ہو سکا، مگر اس کی اہمیت مسلم ہے اور اسے محفوظ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

کلیدی الفاظ:

منقبت نگاری، مذہبی شاعری، اہلِ بیت، مولانا ارشاد حسین، اردو ادب، سیرتِ ائمہ، کربلا، عقیدت، اسلامی تاریخ، اخلاقی اقدار۔

مذہبی شعر و ادب میں حمد اور نعت کے بعد منقبت اور مرثیہ سب سے مقدس صنفِ سخن ہے۔ نوحہ، مناجات اور سوز و سلام کی بھی اپنی دینی و مذہبی اہمیت ہے۔ مذہبی شاعری میں منقبت نگاری کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ اس کے تقدس اور احترام کے مدنظر ہر ادوار کے عظیم المرتبت شعرائے کرام نے منقبت گوئی کو دل سے لگائے رکھا۔ شاعروں اور فن کاروں نے ثواباً اور عقیدتاً بھی ایسے کلام کہے، کیوں کہ یہ نجات اخروی کا ضامن تصور کیا جاتا ہے اور دیگر دینی و مذہبی شاعری میں منقبت کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ صنفِ سخن اہل بیت علیہم السلام، اولیا و اوصیا اور صحابۂ کرام کے لیے مخصوص ہے جس میں ان کی سیرت وصفات اور فضیلتیں بیان ہوتی ہیں۔ ذوات مقدسہ ائمہ معصومین، خاتون جنت، جناب ابوطالب اور کربلا کے شہیدوں اور اسیروں کے فضائل و مناقب اس کے خاص موضوع رہے ہیں جن سے ہزاروں اوراق بھرے پڑے ہیں۔ قرآن و احادیث میں اہل بیت کے فضائل و مناقب متعدد جگہ پر بیان کیے گئے ہیں اور ان سے محبت رکھنے پر خاص زور دیا گیا ہے:

> ''اہل بیت اطہار منقبت نگاری کا نہایت اہم موضوع ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ان کے فضائل کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: آپ کہہ دیجیے کہ میں اس پر (تبلیغ اسلام پر) اجر کا سوال نہیں کرتا سوائے محبت ذوی القربیٰ کے۔ **قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ**۔ شوریٰ، آیت: ۲۳۔''[۱]

دنیا کی متعدد زبانوں میں اسلامی تاریخ کی ذوات مقدسہ کی عظمت و فضیلت بیان کی گئی ہیں۔ عربی اور فارسی زبان میں مذہبی شاعری کی ایک خاص روایت رہی ہے جو بہت قدیم بھی ہے۔ منقبتی کلام کے اولین نقوش عرب میں ملتے ہیں۔ اس کے بعد سرزمین ایران کو فضیلت حاصل ہوئی۔ عربی کے بعد فارسی میں بے شمار عاشقان رسول و آل رسول شعرائے کرام نے دختر رسول و خدیجۃ الکبریٰ حضرت فاطمہ زہرا اور داماد پیغمبر حضرت علی ابن ابی طالب کی زندگی اور شان میں منقبتی کلام پیش کیے۔ حضرت علی و جناب فاطمہ اور ائمہ معصومین سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا۔ عربی میں ائمہ معصومین اہل بیت علیہم السلام کے بے شمار فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے خلیفہ چہارم اور اہل تشیع کے امام اوّل مظہر العجائب حضرت علی کی عظمت اور مناقب ملاحظہ فرمائیں۔

علیؑ حبّه جُنّته قسیم النّار و الجَنّه
وصی المصطفیٰ حقا امام الانس و الجِنّه

ترجمہ: علی کی محبت سپر کا کام دیتی ہے (آتش جہنم سے بچانے والی ہے) اور حضرت علی جنت اور دوزخ کے تقسیم کرنے والے ہیں۔ خدا کی قسم آپ حضرت محمد مصطفیٰ کے وصی ہیں اور تمام انسانوں اور جنات کے امام ہیں۔''[۲]

عربی اور فارسی زبان میں اس صنف سخن کا وقیع ذخیرہ موجود ہے۔ جب فارسی زبان سے منقبت نگاری اردو میں منتقل ہوئی تو اس زبان میں بھی خصوصیت سے مذہبی شاعری کو لوگوں نے اپنے سینے سے لگایا اور خصوصیت سے جناب فاطمہ زہرا اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت وصفات اور فضائل بیان کیے۔ فارسی کے بعد اردو شاعری میں منقبت نگاری کا رواج عام ہوا اور یہ صنف شاعری پروان چڑھی۔ اردو شاعری کی ابتدائی نشوونما میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان کے یہاں مذہبی شاعری میں منقبتی کلام کثرت سے ملتے ہیں۔ چوں کہ اردو شاعری فارسی کی مرہون منت ہے، اس لیے فارسی کلام کا اثر اردو شاعری پر پڑنا فطری اور ناگزیر تھا۔ شعرائے اردو نے اپنے کلام کو معیار بخشنے کی خاطر فارسی کی تشبیہات واستعارات اور دیگر لوازمات شعری کو بھی اپنایا۔ جب فارسی میں منقبت نگاری کا آغاز ہوا تو خصوصیت سے سرزمین ایران کے فارسی شعرا نے اپنے کمال فن سے اس صنف سخن کو معیار بخشا اور وسعت دی۔ اس کے بعد فارسی شاعری کے زیر اثر اردو میں منقبت نگاری کی داغ بیل پڑی اور اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔

واضح ہو کہ عربی میں حسان بن ثابت انصاری اور فرزدق، اور فارسی میں محتشم کاشی منقبتی شاعری میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو زبان (دکنی) میں حضرت علی جن کا لقب حیدرِ کرار اور شیر خدا ہے، کی منقبت صوفیائے کرام کے ابتدائی زمانے کے خواجہ بندہ نواز گیسودراز یا گولکنڈہ کے ابتدائی دور (قلی قطب شاہی) سے منسوب ہے۔ دکنی اردو میں اس کا آغاز حضرت علی کی منقبت سے ہوا، اور اس صنف سخن کو شمالی ہند کے شعرا نے ارتقا بہم پہنچایا۔ ہندوی اور اردو زبان میں امیر خسرو، میر تقی میر، میر انیس، مرزا دبیر وغیرہ کے نام اس اعتبار سے بہت نمایاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فارسی کے مقابلے میں اردو منقبتی کلام کا اثاثہ قدرے مختصر ہے لیکن اردو زبان میں اس کی تاریخ بہت مستحکم رہی ہے۔ ایسے عظیم المرتبت شعرا و ادبا جن کی اردو اور فارسی دونوں میں خاص شعری شناخت ہے، ان کے فارسی اور اردو زبان میں ائمہ معصومین کی شان میں کہے گئے منقبتی کلام اور قصائد بہت گراں قدر ہیں۔ ایسے شاعروں میں ملا وجہی، قلی قطب شاہ، میر تقی میر، مرزا سودا، مرزا غالب اور علامہ اقبال کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ غالب نے فارسی اور اردو میں

اہل بیت کی شان میں انتہائی بلند پایہ قصائد و مناقب کہے ہیں۔ میر انیس نے اسی لیے غالب کی وفات پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یقین کل کے ساتھ کہا۔

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے مرحوم ہوئے جوارِ رحمت میں گئے
مدّاح علی کا مرتبہ اعلیٰ ہے غالب اسداللہ کی خدمت میں گئے

حمد خدا اور نعت رسول کے بعد مذہبی شاعری میں سب سے زیادہ فضیلت منقبت کی ہے۔ قرآن و احادیث کی روشنی میں ائمہ اہل بیت کے فضائل و مناقب سے ہزاروں اوراق بھرے پڑے ہیں۔ کلام پاک اور احادیث میں کئی مقامات پر اہل بیت اطہار کی فضیلتیں اور شان اقدس بیان کی گئی ہیں۔ اردو زبان میں ابتدا سے ہی منقبتی شاعری کا موضوع خصوصیت سے ائمہ معصومین کی ذات و صفات رہی ہے۔ خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ اردو میں اہل بیت کے فضائل و مناقب لوگوں نے بیان کیے ہیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کے نزدیک ''منقبت کا اصل شاعر وہ ہے جو رسول و آل رسول سے محبت اور ان کی پیروی کرے۔'' خوشنودی خدا اور رسول کے پیش نظر شاعروں نے خاصی تعداد میں اس صنف شاعری میں طبع آزمائی ہے۔ کیوں کہ منقبت نگاری بندے کی نجات کا ضامن بھی تصور کی جاتی ہے۔ ایسے کلام کا ایک بڑا حصہ حضرت علی مرتضی، شیر خدا کی شان میں ملتا ہے۔ حمد اور نعت کی طرح منقبت نگار شاعر اور ادیبوں کی بھی کمی نہیں، بہت سے ایسے اہم شعرا موجود ہیں جو خصوصی طور پر اردو میں منقبت گوئی کے لیے بھی اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ حمدیہ کلام میں اللہ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی حمد و ثنا پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ نعت اور منقبت، رسول اور ائمہ معصومین، اولیا اور صحابہ کرام کی حیات طیبہ اور ان کی سیرت، معجزات و کمالات کی مظہر ہیں۔ احسن زیدی لکھتے ہیں:

> ''منقبت نگاروں نے صحابہ کرام، ائمہ عظام اور بزرگان ذوی الاحترام سے اظہار عقیدت کے علاوہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایسے اشعار اخلاقی درستی کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ اس قسم کی نظمیں مذہب سے لگاؤ اور محبت پیدا کرنے میں بڑی مدد ثابت ہوتی ہیں۔ ہادیانِ امم اور داعیان حق کسی ایک گروہ یا قبیلہ کی ہدایت کے لیے نہیں آتے بلکہ تمام بنی نوع انسان کو صراط مستقیم دکھانے کے لیے آتے ہیں۔ اس لیے ان کا پیغام عالم گیر ہوتا ہے اور ہر مذہب و ملت کا فرد ان کے پیغام اور سیرت پاک سے فیضان حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ نعتیہ اور منقبتی شاعری میں صرف مسلمان شاعروں نے ہی گلہائے عقیدت پیش نہیں کیے بلکہ غیر مسلم شاعروں نے بھی آئمہ اہل بیت

اور دوسرے بزرگان دین سے اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔''[۳]

منقبتی شاعری پر ثواباً مختصر سی گفتگو کے بعد زیر نظر مضمون کے ساتھ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ پہلے مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ کی عظیم المرتبت ذات اور علمی، مذہبی اور فنی خوبیوں کا بھی جائزہ لیا جائے، اس کے بعد ان کے منقبتی کلام کو زیر تحریر لایا جائے۔ لیکن یہاں پر اس امر کی گنجائش بہت کم ہے، لہٰذا اس حوالے سے صرف چند الفاظ پر ہی اکتفا کرنا میری مجبوری ہے۔ علمی، ادبی اور مذہبی اعتبار سے موصوف کی شخصیت کثیر الجہت ہے۔ وہ اس دور کے ایک جید عالم دین، واعظ اور خطیب تھے۔ استاد کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور شاعری کے فن کا اچھا ہنر رکھتے تھے۔ انھوں نے غزل، قطعہ، قصیدہ، رباعی کے علاوہ حمد، نعت، سلام اور منقبت میں طبع آزمائی کی ہے۔ ارشاد حسین اپنے ادبی و مذہبی ذوق کے ساتھ امامت، خطابت، تبلیغ اور وعظ و نصیحت کے لیے بھی مشہور تھے۔ انھوں نے فلسفہ توحید، افادیت نماز، افادیت روزہ اور بلاغت قرآن جیسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی۔ حب الوطنی پر مبنی ان کی نظم اپنے وطن اور ملک سے بے پناہ محبت کی ضامن ہے۔ مولانا موصوف نے شاعری کی مختلف ہیئت میں اہل بیت کی سیرت، اخلاق اور فضائل بیان کیے ہیں۔ عظیم المرتبت ادبی و مذہبی شخصیات کے انتقال پر تعزیتی نظمیں اور قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ادبی، مذہبی اور شعری لحاظ سے قابل اعتبار شخصیت کے مالک تھے:

> ''ان کی شاعری دینی جذبے، اخلاقی اقدار اور انسانی جذبات و احساسات کی ترجمان ہے۔ انھوں نے حمد، نعت، منقبت، غزل، سہرا اور سماجی موضوعات پر اشعار کہے ہیں۔ ان کی شاعری میں خیالات کی وسعت، زبان کی چاشنی اور جذبات کی صداقت کا حسین امتزاج موجود ہے جو قاری کے دل و دماغ کو مسحور کر دیتا ہے۔ اشعار میں موسیقی کی سی روانی اور بحر و قافیہ کی ہم آہنگی موجود ہے۔ تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال ان کی شاعری کو مے دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ اشعار میں سادگی، روانی اور سلاست قابلِ ستائش ہے۔''[۴]

جیسا کہ ذکر ہوا مولانا ارشاد حسین کی شخصیت ادبی، اخلاقی، مذہبی اور تعلیمی اعتبار سے اہم تھی، ایک باعمل عالم تھے، انسانیت کے تحفظ پر خاص زور دیتے رہے، ساری زندگی ائمہ معصومین کی سیرت اور عمل کے مطابق گزاری۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ بھی ان میں جو اہم خوبی تھی وہ یہ کہ قوم و ملت کی ترقی اور خوشحالی کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ وہ ماحول میں بہتری اور تعلیم و تربیت کے ساتھ انسانی ہمدردی، بھائی چارگی اور امن و امان کی بحالی پر خاص زور دیتے تھے۔ ارشاد حسین مرحوم اپنی عمر کے آخری پڑاؤ اور ضعیفی میں بھی موجودہ زمانے کی صورتحال اور قوم و معاشرت کے احوال سے بے خبر نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کا

ہر فرد ان کے انتقال پر آج انھیں نم آنکھوں سے یاد کر رہا ہے۔ چوں کہ اپنی پوری زندگی دینی خدمت اور مدرسہ میں بحیثیت مدرس گزاری، اس لیے قوم کے بچے بچیوں کو بھی اس کا ضرور احساس ہوگا۔

مولانا ارشاد حسین کی زندگی اس امر پر دال ہے کہ موصوف پرانی اقدار کے حامل اور قابل تعظیم علمائے کرام میں سے تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک سچے عالم دین کی خوبیوں سے معمور تھا۔ ماضی کے جید علمائے کرام کی صفات ان میں مضمر تھیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اپنے دور کے جید عالم دین کی آخری نشانی تھے۔ ان کی خطابت ہو یا مختلف النوع کلام، ان میں ایک خاص کشش اور اثر پایا جاتا ہے۔ موصوف نے جتنے بھی ادبی و مذہبی اور علمی اثاثے چھوڑے، وہ انھیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے بہت سے کلام اوراق پریشاں کے مانند بکھرے پڑے ہیں جنھیں کتابی صورت میں محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے وہ اپنی گراں قدر تخلیقات کو محفوظ کرنے اور اسے کتابی صورت میں شائع کرانے کے تئیں ہمیشہ بے نیاز رہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی منتظر اشاعت غیر مطبوعہ تحریریں یکے بعد دیگرے ضرور منظر عام پر آئیں گی۔ کیوں کہ ان کے صاحب زادگان جناب ذیشان حیدر، جناب سلمان حیدر اور جناب فیضان حیدر..... تینوں برادران ماشاءاللہ بہت ذہین اور تعلیمی شعبے سے وابستہ ہیں۔

مولانا ارشاد حسین نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ادبی کلام بھی کہے ہیں لیکن ان کے مذہبی کلام خصوصیت سے توجہ کے طالب ہیں۔ وہ قرآن و احادیث کی روشنی میں باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ موصوف نے تدریس، تقریر اور اپنے کلام سے خدمت دین کی، جس میں اسلام کی ذوات مقدسہ کی معرفت پر ہمیشہ زور دیتے رہے۔ مذہبی شاعری سے متعلق ان کے کلام میں بہت جاذبیت پائی جاتی ہے۔ پہلے حمد اور نعت کے چند اشعار ملاحظہ کرلیں ۔

کلیم طور کے جلوے کا تار ختم نہ ہو — یہ نورِ ارض و سما کا وقار ختم نہ ہو
وجود واجب ذاتی کی ذات کے صدقے — وجوبِ غیر کا بھی اضطرار ختم نہ ہو
جہانِ زیست کو بخشی ہے اس نے شادابی — خزاں کے ڈر سے چمن کی بہار ختم نہ ہو

.....

میں تری خاکِ نقش پا ہوتا — تیرا خادم جو مصطفیٰ ہوتا
خاک ہوتا میں تیرے آنگن کی — تیرے قدموں کو چومتا ہوتا
بن کے خاکِ شفا زمانے میں — سارے دردوں کی اک دوا ہوتا

مولانا کی مذہبی شاعری اور منقبتی کلام اس امر کے مظہر ہیں کہ انھوں نے ائمہ معصومین اہل بیت

علیہم السلام کی زندگی کے ہر پہلو کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ اللہ اور رسول کے پیغامات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے تقریر کے ساتھ تحریر کو بھی موثر خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ منقبت گوئی میں خاص دلچسپی لی۔ کیوں کہ یہ صنف سخن ائمہ اہل بیت کی سیرت و صفات پیش کرنے کا ذریعہ ہے۔ موصوف نے اردو شاعری میں حمدیہ اور نعتیہ کلام بھی کہے ہیں۔ عصر حاضر سے تعلق رکھنے والے منقبت گو شعرا جن کی خاصی تعداد ہے، ان میں ارشاد حسین اپنی شاعرانہ اور فن کارانہ بصیرت کی وجہ سے لائق احترام ہیں۔ ایک عالم دین ہوتے ہوئے فن شاعری کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ ان کے مذہبی کلام میں خاص کشش پائی جاتی ہے۔ ان کے سنجیدہ کلام بھی قابل ستائش ہیں جن کی اپنی معنویت ہے۔ رسول و آل رسول کے فضائل و کمالات پر مبنی کلام موصوف کی عالمانہ بصیرت اور تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر اور وسیع مطالعے کے مظہر ہیں۔ ائمہ معصومین کی شان میں ان کے اندر بے پناہ مدحت کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ وہ کہتے ہیں ؎

وہی تو حشر میں دے گا تمھیں ضیا ارشادؔ
جو منقبت میں جلاؤ گے شاعری کا چراغ

.....

اگر ارشادؔ تجھ میں شاعری کی کچھ بھی شُدبُد ہے
غزل کو چھوڑ کر تو منقبت پہچان رکھے گا

مولانا ارشاد حسین جو عالمانہ شان رکھتے تھے، جن کی شخصیت نہایت روحانی اور ایمانی تھی۔ ان کی مجلس چہلم میں موجود علمائے عظام اور سامعین کرام نیز ان کے چند ساتھی اور کئی فارغین شاگردوں نے اپنے اپنے طور پر انھیں عقیدت کا خراج پیش کیا اور ان کی دعائے مغفرت فرمائی۔ ان صاحبان کی موجودگی اور گفت و شنید سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ مولانا مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کا راہ اجل کو سدھار جانا یقیناً شعر و ادب اور تہذیب و ثقافت کا ایک بڑا خسارہ ہے جس کا مستقبل قریب میں پُر ہونا آسان نہیں۔ ان جیسی شخصیت دور حاضر کے علمی اور دینی میدان میں اب عنقا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان کے یہاں منقبتی کلام میں سب سے پہلے جناب فاطمہ زہرا اور حضرت علی کی منقبت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

دیکھ کر جنت کے اوپر اختیارِ فاطمہ
کل خواتین بہشتی ہیں نثارِ فاطمہ

پنجتن آتے ہیں جب ارشاد چادر کے تلے
آیت تطہیر بنتی ہے حصارِ فاطمہ

.....

جو بابِ علم سے کچھ انتساب رکھتے ہیں
وہ سوئے دار بھی جانے کا خواب رکھتے ہیں

جو عشق نام علی کی کتاب رکھتے ہیں
وہ زندگی کا مکمل نصاب رکھتے ہیں

کسے پتہ نہیں ہر مسئلے کا حل ہیں علی زباں پہ بارہا ''لولا'' جناب رکھتے ہیں

حضرت محمد مصطفی کی لختِ جگر حضرت فاطمہ زہرا اور ائمہ اہل بیت کی ذواتِ مقدسہ پر نہ جانے کتنے مناقب کہے گئے۔ شاعرِ مشرق علامہ نے بھی کئی منقبتی کلام پیش کیے ہیں۔ خاتون جنت، سیدۃ نساء العالمین جناب فاطمہ زہرا جن کے القاب الطاہرہ، المرضیہ، الزکیہ اور الصدیقہ ہیں، جو رحمۃٌ للعالمین کی بیٹی، رسول کی آنکھوں کا نور، حضرت علی ابن ابی طالب کی زوجہ اور حسن و حسین کی والدہ ہیں۔ علامہ اقبال کی ام الائمہ جناب فاطمہ زہرا کی منقبت کے حوالے سے ڈاکٹر عراق رضا زیدی کی تحریر 'حضرت فاطمہ زہرا کو اقبال کا خراجِ عقیدت' بہت اہم ہے۔ علامہ اقبال نے بی بی فاطمہ زہرا کی فضیلتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا، بی بی زہرا جناب مریم سے افضل ہیں۔ یہ اسلام کی ایک ایسی بیٹی ہیں جن کے احترام میں رسول اللہ کھڑے ہو جاتے تھے۔ جناب فاطمہ میں تربیت رسول کے مدنظر اس عبارت کو ملاحظہ فرمائیں:

> ''سعید بن مسیب نے ابن عباس سے روایت بیان کی ہے کہ رسول فرماتے ہیں کہ میں اپنی بیٹی فاطمہ زہرا کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ محشر کے دن ناقہ نور پر سوار ہو کر آئی ہے۔ اس کے داہنی جانب ستر ہزار فرشتے، بائیں جانب ستر ہزار فرشتے، آگے ستر ہزار فرشتے، پیچھے ستر ہزار فرشتے ہیں اور میری امت کی مومنہ عورتوں کی جنت کی طرف قیادت کر رہی ہے۔ بس جو عورت دن رات میں پانچ وقت کی نماز پڑھے گی رمضان میں روزے رکھے گی۔ حج بیت اللہ الحرام کرے گی، اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرے گی، اپنے شوہر کی اطاعت کرے گی اور میرے بعد علی کی ولایت اور امامت کا اقرار کرے گی وہ میری بیٹی فاطمہ کی شفاعت کے وسیلے سے داخلِ جنت ہوگی۔ فاطمہ تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں۔''[۵]

مولانا ارشاد حسین کی زندگی کے دو پہلو ملتے ہیں ایک کا تعلق دینی و مذہبی اور ادبی و شعری خدمات سے ہے تو دوسرا سماجی، تعلیمی اور اصلاحی سرگرمیاں ہیں۔ مضمون کے موضوع کے مطابق یہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ مولانا موصوف کی عظمت اور انفرادیت ان کی مذہبی رواداری اور تعلیمی، تدریسی اور ادبی و شعری کارنامے کی وجہ سے ہے۔ ان کے مذہبی کلام میں حمد و نعت کے علاوہ ائمہ معصومین کی منقبتیں قابل توجہ ہیں جو مرحوم کی راسخ العقیدگی کی مظہر ہیں، ساتھ ہی اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ قرآن و احادیث اور واقعات اسلامی پر نہ صرف ان کی بڑی عمیق نظر تھی بلکہ وہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے بتائے ہوئے راستے پر تاحیات عمل پیرا رہے۔

موصوف نے غزل، نظم، رباعی، مثنوی، قطعہ اور قصیدہ کے علاوہ جو مناجات، تعزیتی نظمیں، قطعہ

تاریخ، سلام، نوحے اور مرثیے کہے ہیں، ان کے اعلیٰ ادبی ذوق وشعور کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے یہاں مذہبی شاعری میں گمراہی کے شکار افراد کو راہ مستقیم دکھانے اور انسانی خدمت اور اس کی تعلیمات سے آگاہ کرنے کی صلاحیت پوشیدہ ہے۔ ان کے جتنے بھی علمی اور دینی کارنامے ہیں وہ ان کی فنی وفکری جہات کے مظہر ہیں۔ ارشاد حسین کا مذہبی شاعری سے جذباتی اور فطری لگاؤ تھا۔ ان کی تحریر وتقریر ہو یا ان کا تدریسی عمل سبھی بہت موثر ثابت ہوئے ہیں جن میں اصلاح ونصیحت کے پہلو مضمر ہیں۔ ان کی شاعری کے حوالے سے یہ امر قابل توجہ ہے کہ جتنی عمدہ مذہبی شاعری کی، ان کی غزلیں اور نظمیں وغیرہ بھی اتنی ہی بہترین اور معنویت سے بھرپور ہیں۔ حمد، نعت، منقبت، قصیدہ، رباعی، قطعہ، سلام، مناجات وغیرہ جیسی شاعری میں انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ ان میں ایک مضمون کو مختلف طریقے سے شعر کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر تھا۔

جہاں تک ارشاد حسین کی منقبت گوئی کا تعلق ہے تو انھوں نے ہر امام کی شان میں الگ الگ منقبتیں کہی ہیں۔ جناب فاطمہ زہرا، حضرت امام علی، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق، حضرت امام موسیٰ کاظم، حضرت امام علی نقی، حضرت امام محمد تقی، حضرت امام حسن عسکری اور حضرت امام مہدی علیہم السلام کے علاوہ حضرت عباس، جناب زینب، شیر خوار علی اصغر اور جناب سکینہ کے مناقب بھی کہے ہیں۔

مولانا نے فاطمہ زہرا کی کئی فضیلتوں کو منقبتی کلام میں بیان فرمایا ہے۔ دختر رسول جناب فاطمہ زہرا کی مثال پوری کائنات میں نہیں ملتی۔ یہاں پر انھوں نے جناب فاطمہ زہرا کی عبادت کا ذکر کیا ہے۔ جناب فاطمہ کی ذات مقدسہ کو ستر ہزار فرشتے سلام پیش کرتے ہیں۔ آپ کو تمام عالمین کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ آپ تمام نبیوں کے سردار کی دختر اور حضرت علی کی زوجہ ہیں۔ اللہ کے رسول نے کہا فاطمہ! میری پارہ جگر، نور نظر، میری میوہ دل ہے۔ جس نے اس کو رنج پہنچایا اور تکلیف دی اس نے مجھے رنج پہنچایا، جس نے اس کو خوش رکھا اس نے مجھے خوش رکھا۔ یہ میرے اہل بیت میں سب سے پہلے مجھ سے ملحق ہوگی۔ رسول نے کہا کہ میرے بعد اس کا بڑا خیال رکھنا اور حسن وحسین میرے فرزند ہیں جو میرے شجر زندگی کے دو پھول ہیں، یہ دونوں جوانان جنت کے سردار ہیں، حسن وحسین کا بھی اتنا ہی خیال رکھنا جتنا تم اپنی چشم وگوش کا دھیان رکھتے ہو لیکن بعد رسول کیا ہوا اسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ ام الائمہ جناب فاطمہ زہرا جن کے معجزات وکرامات ایسے ہوں کہ ان کے گھر جنت کا کھانا اترے، جسم اطہر سے خوشبوئے جنت آئے، جائے عبادت، بیٹھنے کی جگہ پر نزول ملائکہ اور تسبیح فاطمہ پڑھنے سے بہت سی مشکلات آسان ہوں، ایسی ذات مقدس کا کیا کہنا، جس کی تعظیم میں خود رسول کریم کھڑے ہوتے ہوں۔ مولانا ارشاد حسین نے اسے ایک شعر

میں اس طرح بیان کیا ہے۔

مرسلِ اعظم کھڑے ہوجاتے ہیں تعظیم کو
منصبِ جزوِ رسالت ہے وقارِ فاطمہ

مولانا ارشاد حسین نے قرآن و احادیث کی روشنی میں فاطمہ زہرا کے مناقب میں محمد مصطفی اور حضرت خدیجہ کبریٰ کی بیٹی جو کائنات کی ایک عظیم خاتون ہیں، جن کے گھر پہ رضوان جنت خیاط بن کر آئے، جن کی عظمت میں سورۂ دہر نازل ہوا، جن کی تعظیم کو رسول اللہ کھڑے ہو جاتے ہوں، جو تمام جہانوں کی خواتین کی سردار ہیں اور جن کے صبر، زہد و تقوی اور عبادت کا قرآن و احادیث میں جگہ جگہ ذکر آیا ہے۔ مناقب و فضیلت اور عظمت سیدۃ النساء العالمین حضرت فاطمہ کو مولانا موصوف نے مختصر اشعار میں فن کاری کے ساتھ بیان کیا ہے، جن میں تمام فضیلتیں سمٹ آئی ہیں۔

دیکھ کر جنت کے اوپر اختیار فاطمہ — کل خواتین بہشتی ہیں نثارِ فاطمہ
گھر پہ رضوانِ جناں خیاط بن کر آ گیا — صدق کی تصدیق ہے یا اقتدارِ فاطمہ
نذر مانی تین روزوں کی خدا کے واسطے — دہر کا سورہ ہوا نازل بکار فاطمہ
پنجتن جب آتے ہیں ارشاد چادر کے تلے — آیت تطہیر بنتی ہے حصار فاطمہ

.....

لقب جو امّ ابیہا کا مل گیا تم کو — ترے کرم سے رسالت بحال ہے زہرا
تری فضیلتوں کی حد و انتہا نہ رہی — کہاں زمانے میں تیری مثال ہے زہرا

رسول کی بیٹی، خاتون جنت کی سردار فاطمہ زہرا اور جنھیں رسول نے حوریہ کہا، ان کے تقویٰ، صبر اور سادگی وغیرہ کو موصوف نے یوں بیان کیا ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ کریں۔

تری ثنا ہو ادا یہ محال ہے زہرا — کرے جو دعویٰ یہ کس کی مجال ہے زہرا
عظیم مرتبہ تیرا حقیر فکر مری — میں کیسے مدح کروں یہ سوال ہے زہرا
نبی کی ذات ہے سارے جہان کی رحمت — نبی کی آپ ہیں رحمت کمال ہے زہرا
ترے فدک کا یہ صدقہ ہے بعد پیغمبر — عرب کے پاس جو مال و منال ہے زہرا
ہو دور ضعفِ رسالت کسائے یمنی سے — تمھاری ایک ردا کا یہ حال ہے زہرا

مولانا ارشاد حسین نے منقبت فاطمۃ الزہرا کے بعد ائمہ معصومین کی شان و فضیلت میں متعدد مناقب کہے ہیں۔ یہاں حضرت علی ابن ابی طالب کے مناقب کا جائزہ لینے سے قبل بتا دوں کہ لغات میں

لفظ منقبت کے معنی خصوصیت سے اہل بیت، اولیا و اوصیا اور صحابہ کرام کی تعریف، توصیف اور ثنا خوانی کے معنوں میں ہے۔ عموماً منقبت میں حضرت علی کی فضیلت و کمالات کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے۔ سید امداد امام اثر لکھتے ہیں:

> ''قصیدہ کی اصل غرض یہ ہے کہ شاعری کے پیرایہ میں مسائل اخلاقی و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو یا حمد خداوند نعت محمد مصطفی و منقبت علی المرتضیٰ و آئمہ باصفا سے شاعر کو ثواب عقبیٰ حاصل ہو اور سامعین کو ذکر خدا اور رسول و آئمہ سے توفیق عبادت پیدا ہو۔''[٦]

حضرت امام علی کی ذات مبارکہ کی بے شمار فضیلتیں ہیں۔ رسول اللہ کے بعد آپ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ اور اہل تشیع کے امام اوّل ہیں۔ قرآن اور احادیث داماد پیمبر حضرت علی کے فضائل و مناقب سے بھرے پڑے ہیں۔ نصیری کی نظر بھٹکی تو حضرت علی کی کرامات اور معجزات دیکھ کر آپ کو خدا سمجھ بیٹھے۔ حضرت علی کو جن لوگوں نے خدا کا بیٹا یا مجسمہ سمجھا، انھیں آپ نے سمجھایا اور توبہ کرنے کا موقع دیا اور توبہ نہیں کرنے پر ختم کیا۔ حضرت علی کی پوری زندگی اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے لیے وقف تھی۔ حضرت علی سے متعلق عقیدہ ہے کہ ان کی آنکھ عین اللہ، ہاتھ یداللہ، چہرہ وجہ اللہ اور ان کا نفس نفس اللہ ہے۔ بستر نبی پر لیٹ کر حضرت علی نے رسول خدا کی جان بچائی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹی! میں نے اللہ پاک کے آخری نبی، رسول ہاشمی کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک علی کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ سبحان اللہ! علما فرماتے ہیں یہ حضرت علی کی خصوصی فضیلت ہے۔ حضرت امام علی نے اسلام کی کئی جنگیں فتح کیں۔ رسول اللہ نے خیبر کا علم حضرت علی کو دیا۔ رسول اللہ نے علی کی محبت کو ایمان اور ان سے دشمنی اور بغض کو کفر و نفاق کہا ہے۔ رسول نے فرمایا حضرت علی روشن چہرے والے اور مومن کے امام اور ولی ہیں۔

مولانا نے حضرت علی ابن ابی طالب کے علم، حلم، عدل، شجاعت اور معجزات و کمالات کو منقبت میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کر دیا ہے جن سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ موصوف اس صنف سخن میں کس قدر مہارت رکھتے تھے۔ محمد و آل محمد کی شان میں کہے گئے ان کے منقبتی کلام اس امر کے ثبوت ہیں کہ مرحوم میں ائمہ معصومین کی زندگی کا بڑا گہرا اور بسیط مطالعہ تھا۔ دختر رسول کے بعد داماد پیمبر حضرت علی ابن ابی طالب سے متعلق مناقب کے چند اشعار ؎

حرم میں جب بتوں کو توڑنے سرکار آئے ہیں علی بھی زیب دوشِ احمد مختار آئے ہیں

ایک ہی در سے جو سائل کو کرے مستغنی سچ ہے حاتم سے بھی بڑھ کر ہے سخاوت ان کی

دوسری منقبت کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

اگر حالات زیادہ پر خطر ہیں تو پھر خطبے علی کے پر اثر ہیں
شب ہجرت نبی کی جاں بچائی ابوطالب کے یہ نورِ نظر ہیں
علی اس طرح ہیں دوش نبی پر کہ جیسے پاؤں ان کے عرش پر ہیں

حضرت علی، دختر رسول اور ائمہ ہدیٰ کے مناقب کے ساتھ حضرت عباس علمدار کے مناقب اور اوصاف حمیدہ کو سامنے رکھ موصوف نے جو منقبتیں کہی ہیں، انھیں پڑھ کر واقعات کے مناظر بھی نگاہوں میں آجاتے ہیں۔ موصوف نے حضرت امام حسن کی منقبت میں کلام پیش کیے ہیں۔ امام حسن ائمہ اہل بیت کی ترتیب میں دوسرے امام ہیں۔ آپ شبیہ رسول ہیں، کیوں کہ اپنے نانا حضرت محمد مصطفیٰ سے حسن و جمال میں بہت مشابہ تھے۔ مورخین نے تاریخ کی کتابوں میں اس کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ ائمہ معصومین کی زندگی اور ان کے کردار کے پیش نظر سید محمد باقر شمس لکھنوی نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں 'الفاروق' کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

''امام کی فطرت پیغمبر کی فطرت کے قریب واقع ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب، محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ امت میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا جوہر نفس انبیا کے جوہر نفس کے قریب ہوتا ہے، اور یہ جماعت اصل فطرت میں خلفائے انبیا ہیں۔''[۷]

مولانا ارشاد حسین نے امام حسن مجتبیٰ کے فضائل و مناقب کو جس خوبی اور خوب صورتی سے بیان کیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ امام کی سخاوت، سائل اور دستر خوان کا بارہا لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ موصوف نے بھی امام کی پاکیزہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ امام کی ولادت باسعادت پر بھی منقبت کے اشعار پیش کیے ہیں۔ امام کے فیضان علم نیز حاکم وقت کی بیعت اور صلح کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ارشاد حسین کی منقبت سے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

در حسن پہ جو سائل سوال کرتا ہے وہ فیض علم سے محکم جواب پاتا ہے
حسن کا خلق ہے خلقِ نبی کا آئینہ عدو جو آئے فداکار بن کے جاتا ہے
فضائیں کیوں نہ معطر ہوں مشک و عنبر سے چمن میں فاطمہ کے آج پھول کھلتا ہے
زمانہ ہوگیا، صدیاں گزر گئیں لیکن جہاں میں آج بھی خلقِ حسن کا چرچا ہے
یہ ایک صلح ہے بیعت نہیں ہے حاکم کی حسن کے سارے شرائط کو اس نے مانا ہے

امام کی منقبت کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں۔

صلح حدیبیہ کو ہے صلح حسن پہ ناز یہ صلح ہے کہ امن جہاں کا پیام ہے
تاریخ کر رہا ہے رقم وقت کا امام دنیا سمجھ رہی ہے حسن بے حسام ہے
صفین کہہ چکی ہے شجاعت کو مرحبا حیدر کا لال شیرِ خدائے انام ہے

منقبت امام حسین میں شاعر نے نبی کریم کے محبوب نواسے، حضرت علی و فاطمہ کے لختِ جگر اور سردار جنت حضرت امام حسین کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے امام عالی مقام کی حق وصداقت کے لیے عظیم قربانی اور ان کی شجاعت وصبر ورضا کو سامنے رکھا ہے۔ حق وصداقت اور انسانیت کے تحفظ کی خاطر امام نے جو قربانی پیش کی، پوری کائنات میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس حوالے سے یہ اشعار دیکھیے۔

ہیں نبی سجدے میں اور پشت پہ سجدے کا وقار زیر خنجر جو کرے سجدۂ سبحاں ہے حسین
جب ضرورت ہوئی اسلام کو خوں دینے کی یہ بہتر نہیں، سو جان سے قرباں ہیں حسین

امام عالی مقام کی قربانی مصلحت خداوندی، استقامت اور محبت الٰہی کی مثال پیش کرتی ہے جس کا پرتو پوری کائنات مل کر بھی پیش نہیں کر سکتی۔ امام عالی مقام نے دین اسلام اور اس کی بقا وحفاظت کی خاطر اپنے بھرے کنبے کے ہمراہ شہید ہونا گوارا کیا، لیکن باطل قوتوں کے سامنے اپنا سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اس قربانی میں اہل بیت کی طہارت، امام کا پیغام واقعہ کربلا اور درس انسانیت مضمر ہے۔ تاریخ کی روشنی میں مولانا موصوف نے حضرت امام حسین کی قربانی اور ان کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے آپ کی عبادت، ریاضت، علم، حلم، شجاعت، صبر وشکر جیسے کئی پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ آپ کی عبادت ایسی کہ سجدے میں سر، گلے پہ خنجر اور تین دن کی بھوک و پیاس کے عالم میں بھی نماز کو قضا ہونے نہیں دیا۔ آل رسول پر جس قدر مصیبت کے پہاڑ ڈھائے گئے شاید آسمان اور زمین نے کبھی بھی ایسے مظالم نہیں دیکھے۔ اسلام کو اپنے برے اعمال سے بدنام اور شرمسار کرنے والے قیامت تک کے لیے اب خود ہی ذلیل وخوار ہو رہے ہیں اور لعنت و ملامت ان کا ہمیشہ کے لیے مقدر بن چکا ہے۔ رسول کے بعد اسلام پر جب جب مصیبت آئی علی مرتضیٰ اور حسن وحسین نے سینہ سپر ہو کر دین اسلام کی لاج رکھی۔ اسی لیے خواجہ اجمیری کو یہ کہنا پڑا کہ حسین شاہ بھی ہیں اور بادشاہ بھی ہیں، حسین دین بھی ہیں اور دین کی پناہ بھی۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین دین است حسین دیں پناہ است حسین
سر داد نداد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لاالہ است حسین

مولا ارشاد حسین نے جہاں امام عالی مقام کے کئی فضائل ومناقب بیان کیے ہیں، وہیں نواسہ رسول

امام حسین اور ان کے خانوادے پر ڈھائے گئے مصائب کو بھی یاد کیا ہے۔ بھوک اور پیاس کے عالم میں کربلا میں دشمنوں کی یلغار اور بھرے گھر کی شہادت کو امام نے گوارا کیا لیکن دین اسلام اور انسانیت کو پامال ہونے نہیں دیا۔ امام نے دین کی بقا کی خاطر بندگی کی سب سے عظیم مثال قائم کی، یہ عبادت اور تلاوت کلام رب تا قیامت یاد رکھی جائے گی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جن کے صدقے میں ہوئی سارے جہاں کی تخلیق
پانچوں انوار میں اک نورِ درخشاں ہے حسین
خون سے جس نے کیا گلشن دیں کو سیراب
تشنہ لب دے دیا سر ایسا نگہباں ہے حسین
نوک نیزہ پہ تلاوت ہے کلام رب کی
سچ ہے ارشادؔ یہ خود بولتا قرآں ہے حسین

اس منقبت میں موصوف فطرس اور حر بن یزید ریاحی کے واقعے کو بھی سامنے لاتے ہیں، اور امام کی عظمت اور کرامت کو بیان کرتے ہیں۔ فطرس فرشتے کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ حکم پروردگار کی تاخیر کے سبب اس کے بال و پر سلب کر لیے گئے تھے، لیکن جب سردار اور وارث جنت امام حسین کے جھولے سے اس کو مس کرایا گیا، تو اسے دوبارہ بال و پر عطا ہوا۔ تاریخ نے لکھا کہ حُر یزیدی لشکر کا سپہ سالار تھا، جب اسے امام کی معرفت حاصل ہوئی تو اس نے لشکر سے خود کو علیحدہ کیا اور حق کے ساتھ ہو کر باطل قوتوں سے اپنے بھائی، بیٹے اور غلام کے ہمراہ جام شہادت نوش فرمایا اور حر سے حر علیہ السلام بن گئے۔ میر انیس کا مرثیہ ''بخدا فارس میدانِ تہور تھا حرؑ'' بہت مشہور ہے جس کا ہر بند حضرت حر کی معرفت پر مبنی ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے اس واقعے کے ذیل میں فرمایا۔

حر کو جنّت دی، عطا کر دیا پر فطرس کو جس کو جو چاہیے ویسا ترا احساں ہے حسین

حضرت امام حسین کے فرزند حضرت علی اکبر کو ہو بہو رسول کی تصویر سمجھا جاتا ہے۔ قد و قامت، چہرہ اور آنکھیں رسول سے مشابہ تھیں۔ یہی مشابہت ان کے انداز گفتگو میں بھی تھی۔ ائمہ معصومین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عظمت و فضیلت میں سب کے سب یکساں ملتے ہیں۔ حضرت علی اکبر تاریخ کربلا میں اپنی عظیم شہادت کے لیے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ نسل حضرت ابو طالب میں کربلا کے پہلے شہید ہیں جن کے والد امام حسین ابن علی اور والدہ حضرت لیلیٰ ہیں۔ مولانا ارشاد حسین نے امام کی فضیلت و مناقب بیان کرتے ہوئے واقعات کربلا کے ہر مناظر کو سامنے رکھا ہے۔ موصوف نے اس لمحے کی طرف بھی قاری کو

متوجہ کیا ہے جب اہل بیت پر مصائب کی گھڑی آن پڑی تھی۔ موصوف نے اذان علی اکبر کا بھی ذکر کیا ہے۔ واضح ہو کہ علی اکبر نے جو اذان دی، اس میں رسول کریم کی آواز کی جھلک تھی، صبح روز عاشورہ کی اس اذان کو سن کر اہل بیت کے خیموں میں کہرام اور ماتم برپا ہو گیا تھا۔ عشق الٰہی کا نمونہ ایسی اذان اس سے پہلے کبھی نہیں سنی گئی، اسی لیے یہ اذان 'اذان علی اکبرؑ' سے یاد کی جاتی ہے۔ ارشاد حسین نے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

حضر ہو یا سفر وہ دین کا عنوان رکھے گا — مدینے کا مسافر کربلا کی آن رکھے گا
اگر اکبر اذاں نہ دیں سوالِ فجر اٹھ جائے — بلا کے دشت میں کچھ تو عجب ذیشان رکھے گا
فدا ہو گر زلیخائے جہاں اس پر تو حیرت کیا — یہ شکلِ افتخارِ یوسفِ کنعان رکھے گا
اسے خود حق کی جانب کھینچ لے گی صبحِ عاشورہ — سپاہِ شام میں کوئی اگر ایمان رکھے گا
عطش ایسی کہ خود پانی بھرے نہر فرات آ کر — سمندر پیاس کا خشکی میں اک مہمان رکھے گا
ستم کی فوج میں اک آنسوؤں کا سیل اُمڈے گا — پدر جب طفل تشنہ کو سر میدان رکھے گا
بلا کے دشت میں دے کر اذانِ صبحِ عاشورہ — ''علی اکبر زبان مصطفیٰ کی جان رکھے گا''
حبش کے اک موذن نے مدینے کو شرف بخشا — مدینے کا موذّن کربلا کی شان رکھے گا
اگر ارشادؔ تجھ میں شاعری کی کچھ بھی شدبد ہے — غزل کو چھوڑ کر تو منقبت پہچان رکھے گا

مولانا ارشاد حسین نے چوتھے امام حضرت زین العابدین کی منقبت میں بھی کئی اشعار کہے ہیں۔ زین العابدین امام حسین کے فرزند اور حضرت علی اکبر اور کربلا کے ننھے شیر خوار حضرت علی اصغر کے بھائی تھے۔ جناب سکینہ بنت الحسین اور جناب فاطمہ صغریٰ آپ کی بہنیں تھیں۔ آپ کی والدہ حضرت رباب بنت امرؤالقیس تھیں۔ شریکۃ الحسین جناب زینب کے ہمراہ یہ شہزادیاں واقعات کربلا کے بعد اسیر ہو کر شام گئیں اور امام عالی مقام حضرت حسین کے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا۔ امام زین العابدین نے یزیدی سپاہیوں کے ہر مظالم سہے اور صبر و استقامت کی مثال پیش کرتے ہوئے خواتین اور بچوں کی حفاظت کی۔ آپ کربلا میں موجود تھے، بیماری کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہیں لے سکے۔ امام کے القاب زین العابدین، سید الساجدین، سید العابدین وغیرہ ہیں۔ موصوف کے منقبتی کلام میں حضرت زین العابدین کے سجدے کی اہمیت اور ان کے لقب کے حوالے سے یہ شعر ملاحظہ کریں۔

رب نے زین العابدیں کا دے دیا ان کو لقب — دیں کو جب اخلاص کا سجدہ دیا سجاد نے

مولانا نے امام کی شان میں منقبت کے کئی بیش بہا اشعار قلم بند کیے ہیں جو حضرت سجاد کی کثرت

عبادت اور زہد و تقوی کی مثال پیش کرتے ہیں اور اہل باطل کے مظالم کو بے نقاب کرتے ہیں۔ چند اشعار ؎

ترا صحیفہ ہے اک مخزنِ دعا سجاد — جو بارگاہ خدا میں ہے التجا سجاد
غرور تھا بہت شیطان کو عبادت پر — ترے سجود کو دیکھا تو کی ثنا سجاد
جلا رہے تھے تو خیموں کو آگ کے شعلے — مگر جلی ہوئی بیعت کی تھی چتا سجاد
اذاں دلائی تھی خطبے کو روکنے کے لیے — مگر وہی بنی تبلیغ کی بنا سجاد
خوشی کی بزم میں شرکت نہیں کریں گے امام — شریک ہوں گے جو ہو مجلس عزا سجاد
میں اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں گا ارشادؔ — ملے نصیب سے جو تیری گردِ پا سجاد

حضرت زین العابدین کا مرتبہ اور ان کی عظمت میں بے شمار مناقب کہے گئے جن میں امام کے زہد و تقویٰ، پاکیزگی و بلندی موضوع بنے ہیں۔ آپ ایسے خاندان سے ہیں جن سے محبت رکھنا ایمان کی دلیل ہے اور نفرت کفر ہے۔ آپ سے محبت کے عوض نیکیاں برستی ہیں اور راہ نجات آسان ہو جاتی ہے۔ ارشاد حسین نے یہاں پر امام علیہ السلام کے تاریخی اور انتہائی فصیح و بلیغ خطبے کو پیش نظر رکھا ہے جو دربار یزید میں دیا تھا۔ اس خطبے سے یزید کے جھوٹے پروپیگنڈے بے نقاب ہوئے اور اہل شام پر یہ ثابت ہو گیا کہ یزید باطل پرست تھا۔ امام نے خود کی پہچان کرواتے ہوئے فرمایا: میں مکہ و منیٰ کا بیٹا ہوں، میں محمد مصطفی کا بیٹا ہوں، میں علی مرتضیٰ کا بیٹا ہوں، میں فاطمہ زہرا کا بیٹا ہوں۔ امام نے دربار یزید میں طویل اور بہت فصیح و بلیغ خطبہ فرمایا تھا۔ اس خطبے کے پس منظر میں مولانا کے چند اشعار اور ملاحظہ کریں ؎

شام کے دربار میں خطبہ دیا سجاد نے — پتھروں کے دل کو بھی پگھلا دیا سجاد نے
کربلا میں لاش بیعت کی سلگتی رہ گئی — شام میں قصر یزیدی ڈھا دیا سجاد نے
سجدے میں ابلیس انگوٹھا چباتا رہ گیا — حس کو محویت کا ہے تحفہ دیا سجاد نے
معجزہ ہے ان کے ہونٹوں کا کہ گویا ہو گیا — سنگ اسود کو جو اک بوسہ دیا سجاد نے
اشکِ غم جب ہو گئے گوہر تو کچھ حیرت نہیں — ہاتھ کے دھوون کو تو ہیرا دیا سجاد نے
حشر تک قائم امامت کا رہے گا سلسلہ — صورت باقر نمائندہ دیا سجاد نے
مدح میں ان کی ہے اب رطب اللساں ارشادؔ بھی — شاعری کا جب اسے دیدہ دیا سجاد نے

حضرت امام باقر آئمہ اہل بیت میں پانچویں امام ہیں۔ آپ کا مشہور لقب باقر اور کنیت ابو جعفر ہے۔ آپ کو اپنے پدر بزرگوار حضرت زین العابدین کی وفات کے بعد اللہ نے امام مقرر کیا۔ آپ کی روایات تفسیر، حدیث اور ملفوظات علوم کا قیمتی سرمایہ اور بحر بے کراں ہیں۔ اللہ نے آپ کو ہر علم سے

نوازا۔ ''یہ محمد ہے خدا نے اسے سب علم دیا۔'' امام باقر کی فضیلتوں کو اس وقت سے لے کر آج تک کے علما نے فضائل اور قصائد کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ آپ واقعات کربلا میں شریک تھے۔ ارشاد حسین نے امام باقر کے پاکیزہ اوصاف کا بڑا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے امام کی ذات عظیم اور فضیلت وکمالات کو بیان کرتے ہوئے جو منقبتیں کہی ہیں، ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جو قسمت سے تمہارے در کو پالے حضرت باقر — اسے مل جائیں حکمت کے اجالے حضرت باقر
پیمبر نے سلامِ ناز کہلایا تھا جابر سے — صحابی ہے گلے اس کو لگالے حضرت باقر
یہ میرا پانچواں نائب ہے، نام اس کا محمد ہے — نہ کیوں علموں کی یہ بنیاد ڈالے حضرت باقر
کبھی نہ نعمت دنیا کی خواہش کی زمانے میں — جو جی چاہے وہ جنت سے منگالے حضرت باقر
مسلمانوں کو گر درپیش پیچیدہ مسائل ہوں — تو پھر وہ دین کی عزت بچالے حضرت باقر
محمد نام ہے تیرا یہ ارشادؔ پیمبر ہے — عنانِ دین ہے تیرے حوالے حضرت باقر

.....

رحمت رب کی زمانے میں فراوانی ہے — گلشن دہر میں خوشبو کی یہ طغیانی ہے
آج ہے فاطمہ کے گھر میں گل تر آیا — پوتا شبیر کا سجاد کا وہ جانی ہے
یہ محمد ہے خدا نے اسے سب علم دیا — علم کی حد تو کسی نے نہ کبھی جانی ہے
پڑھ کے اس سے ہوئے ہیں کتنے امامانِ جہاں — مدرسہ آپ کا تعلیم میں لافانی ہے
اس گھرانے کے سبھی لوگ محمد ہیں مگر — آج کے جشن میں باقر کی ثنا خوانی ہے
ہے فضیلت کے بیاں کرنے سے عاجز ارشادؔ — کیوں کہ ہر قول وعمل آپ کا قرآنی ہے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب صادق ہے۔ آپ امام محمد باقر کے بیٹے امام زین العابدین کے پوتے اور امام حسین کے پڑپوتے تھے۔ آپ کے بڑے فضائل ہیں۔ امام کی سیرت اور واقعات وکرامات سے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ آپ کی علمی خدمات، اقوال اور معجزات سے سبھی واقف ہیں۔ امام کے ارشادات بیش بہا خزانے کی طرح ہیں۔ آپ کی شخصیت اور علمی افکار پر لکھی گئیں کتابیں، قصائد اور مناقب وغیرہ نہ صرف آپ کی ذات کو سمجھنے میں آسانیاں فراہم کرسکتے ہیں، بلکہ دنیا والوں کو جینے کی صحیح راہ دکھا سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ انھیں سنجیدگی سے پڑھا، سمجھا اور اس پر عمل کیا جائے۔ مولانا ارشاد حسین نے امام کے فضائل ومناقب اس طرح بیان کیے ہیں۔

حصول علم کی گر ہو ضرورت حضرت صادق — تمھارے در کی ہے محتاج خلقت حضرت صادق

تمھارے جامعہ میں آتے تھے اطراف عالم سے ہزاروں طالبانِ علم و حکمت حضرت صادق
حدیث و فقہ ہوں تفسیر ہو کہ علم عقلی ہو سبھی حاصل ہوئے تیری بدولت حضرت صادق
نبی کی طرح ان کے صدق کا سکہ ہوا جاری یقیناً ہیں شہنشاہِ صداقت حضرت صادق
ہمارے فقہ کو کہتی ہے فقہ جعفری دنیا عدیم المثل تھی تیری فقاہت حضرت صادق

حضرت امام موسیٰ کاظم اہل بیت پیغمبر سے ہیں۔ یہ ائمہ معصومین علیہم السلام میں ساتویں امام ہیں۔ آپ جعفر صادق کے فرزند ہیں۔ موسیٰ ابن جعفر آپ کا نام اور کنیت ابوالحسن ہے۔آپ کے القاب کاظم،صالح،امین اور باب الحوائج ہیں۔کاظم اور باب الحوائج بہت مشہور القاب ہیں۔عباسی دور میں آپ پر نہایت مشکل ترین اور سخت حالات مسلط کیے گئے لیکن تمام تر سختیوں اور ایذا رسانی کے باوجود صبر وشکر سے کام لیا اور اپنے علم وتقوی اور تحمل کے سہارے اسلام کو سینچتے رہے۔ ہارون رشید نے امام کو جب ایک لمبی مدت تک قید میں رکھا اور قتل کا ارادہ کیا تو قاتل نے کہا کہ اللہ کی روز وشب عبادت کرنے والے کو قتل کر کے میں کیوں اپنی عاقبت خراب کروں؟ مولانا ارشاد حسین نے اس پس منظر میں یہ اشعار کہے ہیں ۔

فلک نے تم پہ کتنے ظلم ڈھائے حضرت کاظم مگر نہ حرف شکوہ لب پہ لائے حضرت کاظم
مسلسل کاظمین الغیظ ہے وردِ زباں ان کے غموں کی دھوپ میں بھی مسکرائے حضرت کاظم
نسب تیرا ہے اعلیٰ کس قدر کردار ہے روشن زمانے بھر پہ چھائے تیرے سائے حضرت کاظم
خدا جانے کہ کب تک قید خانے کی مشقت سے اندھیرے میں چراغ دل جلائے حضرت کاظم

امام موسیٰ عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔آپ کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ روز وشب کا بیشتر حصہ عبادت الٰہی اور حمد وثنا میں گزارتے تھے۔امام علیہ السلام اپنے زمانے کے عظیم المرتبت عالم تھے۔ مولانا کی ایک منقبت کے یہ چند اشعار دیکھیے جن میں کئی اہم تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

آج کیوں دہر میں رحمت کی گھٹا چھائی ہے بول اے باد صبا کوئی خبر لائی ہے
کیسی مے خانے میں یہ دھوم مچی ہے ساقی مست کیا ہیں، نظر رند بھی للچائی ہے
خانہ جعفر صادق میں ہے موسیٰ کا ورود کہہ دو فرعون زمانہ سے قضا آئی ہے
ظلم کی قید سے ہو جائے بغاوت نہ کہیں جلد کردے رہا اس میں تری اچھائی ہے
اک یہودیہ ہے بھیجی گئی بہکانے کو دیکھ لے اب وہی اسلام کی شیدائی ہے
نام موسی کا ملا اور لقب ہے کاظم ساتھ ہیبت کے وہ مصداقِ شکیبائی ہے
آتے ہیں بن کے گدا در پہ سلاطین جہاں ابن مریم کی بھی اس در پہ مسیحائی ہے

یہ بلندی کی ملک کرتے ہیں روضے کا طواف رفعتِ مدح تو ارشادؔ نے بھی پائی ہے

امام رضا علیہ السلام ائمہ اہل بیت میں آٹھویں امام ہیں۔آپ حضرت امام موسی کاظم کے فرزند ہیں، نام علی، رضا لقب اور کنیت ابوالحسن ہے۔امام رضا کو اللہ نے بہت سی فضیلتیں بخشیں اور ہر رجس سے دور رکھا اور اس طرح سے پاک و پاکیزہ رکھا جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔آپ کے مناقب وفضائل اور علم و کمالات کو بہت سے مورخین اور تواریخ داں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے:''وسیلہ النجات میں ہے کہ: اونکو علم ما کان و ما یکون آباواجداد سے وراثتاً پہنچا تھا۔اور روضۃ الاحباب میں مروی ہے کہ امام علی الرضا ہر زبان اور لغت میں فصیح و دانا ترین مردم تھے،اور جو شخص جس زبان میں باتیں کرتا تھا اوسکو اوسی زبان میں جواب دیتے تھے۔علامہ قونوی نے شرح حاوی صغیر میں اور علامہ محمد مبین لکھنوی نے وسیلہ النجات میں کتاب جامع الاصول ابن اثیر جزری سے نقل فرمایا ہے کہ صدی دوم کے آغاز پر مذہب امامیہ کے مجدد حضرت علی ابن موسی الرضا تھے۔''[۸] ان فضائل ومناقب کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہزاروں مسلمان روضے پہ آکے طوافِ عقیدت کریں سر جھکا کے
ہے بچپن میں بھی علم کا رعب اتنا حکومت چلی در پہ شاہ ہدا کے
کوئی دعوئے علم جتنا بھی کرلے برابر نہیں نقش پائے رضا کے
جو نکلا ہے گھر سے ضمانت میں تیری مسافر وہ ہے امن میں اب خدا کے
ہوا شیر قالین زندہ حقیقت اشارے ملے تھے جو حکم رضا کے
ضرورت پڑی گر ولایت کی دیں کو حکومت بھی کی دینِ حق کو بچا کے
فضائل سمندر ہیں ارشادؔ قطرہ کھڑا ہے وہ ساحل پہ تیری ثنا کے

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام ائمہ معصومین میں نویں امام ہیں۔آپ حضرت امام رضا کے فرزند ہیں۔کمسنی میں امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ابوجعفر کنیت اور جواد اور تقی القاب ہیں۔آپ کا نام محمد ابن علی ہے۔آپ کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی اور بہت کم عمری میں شہید ہوئے،آپ اپنے دادا امام موسی کاظم کے پہلو میں دفن ہیں۔بغداد کے کاظمین میں آپ کا عظیم الشان روضہ مبارک ہے۔زہر دے کر آپ کو شہید کیا گیا۔آپ کے فضائل اور معجزات و کرامات بہت مشہور ہیں۔کم عمری میں امامت کے عہدے پر فائز ہوئے۔آپ غیب کی خبریں رکھتے تھے۔حضرت امام تقی کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے۔امام تقی کے اوصاف بہت سے علمائے اسلام نے رقم کیے ہیں،جن کی روشنی میں مولانا ارشاد حسین نے متعدد کلام کہے ہیں۔

ہوا گلوں سے معطر ہوئی تقی جواد بہار جھوم کے آتی رہی تقی جواد

بہت ہی مختصر چوبیس سال کی تھی حیات مگر یہ صدیوں پہ بھاری رہی تقی جواد
نصیب والے جو پہنچے تمھارے روضے پر مراد اُن کی برآور ہوئی تقی جواد

مولانا نے اپنی منقبتی شاعری میں ان کی زندگی کے واقعات اور تبلیغ دین کو اس طرح شعری پیکر میں ڈھالا ہے کہ ائمہ اہل بیت نے دین کے لیے جتنی مشقتیں برداشت کیں اور قربانیاں پیش کیں سب نگاہوں میں گھوم جاتی ہیں۔ یہاں پر ارشاد حسین نے امام تقی کی امامت، سخاوت، زہد وتقوی اور علم کی ضیا پاشی اور توسیع غرض تمام امور کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔

تری سخا سے ہے حیران حاتم طائی سمندروں کو ہے شرمندگی تقی جواد
جہاں میں علم کے دریا بہادیے تونے پیاس تشنہ دلوں کی بجھی تقی جواد

اسی موضوع پر مولانا موصوف دوسرے منقبتی کلام میں یوں کہتے ہیں۔

کس کی آمد سے ہے تقویٰ کی فضیلت روشن جس کی حاتم سے بھی بڑھ کر ہے سخاوت روشن
پانی پانی ہے سمندر ترے دل کے آگے کس قدر جود و سخا کی ہے کرامت روشن
در سے تیرے نہیں پلٹا کوئی خالی دامن اے جواد و سخی! ہے تیری عنایت روشن
ہوگیا فیض تقی سے رواں دریائے علوم ہر طرف ہوگئی مولا کی امامت روشن

اس طرح کے کئی کلام ہیں جن میں مولانا موصوف نے ایک مضمون کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ امام سے متعلق چند اشعار اور ملاحظہ کریں۔

چاند سورج ہی نہیں کسبِ ضیا سے مخصوص
نور سے ان کے ہے تنویر کی خلقت روشن
آپ کے علم سے مامون کو حیرانی ہے
ہار سے ہوگئی یحییٰ کی خجالت روشن
مرتبہ دیکھ کے داماد بنایا اپنا
اپنی بیٹی کی بھی جب دیکھ لی نیت روشن
روضۂ بابِ حوائج پہ کہاں سے آئی
مشکلوں سے ہے یہ مشکل کی شکایت روشن
آپ کی چاہیے ارشادؔ پہ تھوڑی سی نظر
اس کے اشعار میں ہے گوشۂ مدحت روشن

امام علی نقی علیہ السلام، جنھیں امام ہادی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے، سلسلۂ امامت کی دسویں کڑی ہیں اور علم، تقویٰ اور اخلاقِ عالیہ کے پیکر ہیں۔ آپ کم عمری ہی میں منصب امامت پر فائز ہوئے، مگر اپنی غیر معمولی علمی بصیرت اور روحانی کمال کے باعث آپ نے اہلِ زمانہ کو حیران کر دیا۔ عباسی دور کی سیاسی نیرنگیوں کے باوجود آپ نے دینِ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی اشاعت، عقائد کی اصلاح اور اہلِ بیت علیہم السلام کی سیرت کی ترویج کا فریضہ نہایت حکمت اور صبر کے ساتھ انجام دیا۔ امام علی نقی کی حیاتِ طیبہ صبر، استقامت، حلم اور خدا پر کامل توکل کی ایک روشن مثال ہے، جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ مولانا ارشاد نے ان کی کئی منقبتیں لکھی ہیں جن میں ان کے فضائل و خصائل بیان کیے ہیں۔ ایک منقبت کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

جلاتے جاؤ جہالت میں آگہی کا چراغ — زمانہ بھول نہ پائے کا روشنی کا چراغ
کوئی جلائے محبت میں دشمنی کا چراغ — جلاؤ ہاتھ سے خود اپنے دوستی کا چراغ
اجالا پھیل گیا ہر طرف زمانے میں — تقی کے گھر میں جو روشن ہوا نقی کا چراغ
فساد و دہشت و ظلم و عناد ختم ہوئے — جلایا آپ نے جب امن و آشتی کا چراغ
غروب ہوگیا عباسیوں کا سورج بھی — مگر ہے آج بھی روشن علی نقی کا چراغ
انھیں کے ذکر سے زینت دو اپنی محفل کو — سدا جلاتے رہو مدحت علی کے چراغ
وہی تو حشر میں دے گا تمھیں ضیا ارشادؔ — جو منقبت میں جلاؤ گے شاعری کا چراغ

امام حسن عسکری ہمارے نبی آخر محمد مصطفیٰ کی نسل سے ہیں۔ آئمہ معصومین میں گیارہویں امام ہیں۔ آپ کی مثال دیگر اماموں کی طرح تھی۔ علم و حلم، عفو و کرم اور سخاوت و ایثار کے لیے اپنی مثال آپ تھے۔ امام حسن عسکری کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ سخت پابندیوں اور ایذا رسانی میں بھی روزے رہتے، نمازیں پڑھتے اور ذکر اللہ کرتے تھے۔ آپ کا اخلاق نہایت بلند تھا جس کی وجہ سے سب کے دلوں میں سمائے ہوئے تھے۔ امام حسن عسکری معتمد خلیفہ کے ہاتھوں زہر سے شہید کیے گئے۔ دشمنوں نے آپ کو بہت سخت ایذا پہنچائی، قید و بند میں رہے، سخت نظر بندی کے دوران آپ کو زہر دیا گیا۔ مولانا کہتے ہیں۔

دنیا میں یادگار ہے تفسیر آپ کی
قرآن بولتا ہے نبی کی، وصی کی بات
عباسیوں کی سلطنت صدیوں کی بات ہے
ہر لب پہ چل رہی ہے ابھی عسکری کی بات

سلطان معتمد ہے، یہ ہے وقت کا امام
جب بھی چلے گی بات تو ہوگی اسی کی بات
ارشادؔ کو کبھی نہیں دیوان کی تلاش
ممدوح کو پسند ہے دردِ ولی کی بات

مولانا ارشاد حسین نے اہل بیت پیغمبر مصطفیٰ کے امام آخرالزماں کی شان اور فضیلت میں بھی منقبتیں کہی ہیں۔آپ فرزند امام حسن عسکری اور آخری امام ہیں۔اہل تشیع کا ماننا ہے کہ آپ دنیا میں آچکے ہیں لیکن عالم غیب میں ہیں۔آپ جب ظہور فرمائیں گے تو دنیا کو انصاف سے بھر دیں گے۔آپ کی آمد کے لیے مومنین عرصے سے منتظر ہیں اور اللہ سے دعا گو ہیں۔آپ جب ظہور فرمائیں گے تو دنیا کو تمام برائیوں سے پاک کریں گے اور ہر طرف اچھائی، نیکی، انصاف اور امن وسکون کا بول بالا ہوگا۔امام زمانہ کی شان میں ان کی ایک منقبت ملاحظہ کیجیے ؎

حُسن وہ جو عسکری کے لال کی صورت میں ہے — پھر کہاں وہ یوسفِ کنعان کی قسمت میں ہے
روشنی دیتا ہے جیسے ابر میں بھی آفتاب — غیب میں رہ کر ہدایت آپ کی عادت میں ہے
اے امامِ منتظَر! عرصے سے ہم ہیں منتظِر — آپ کب آئیں گے دنیا دید کی حسرت میں ہے
پھر فراعینِ زمانہ کر رہے ہیں ظلم و جور — اس کا حل اب موسیٰ عمران کی ہیبت میں ہے
ظلم سے مملو یہ دنیا عدل سے بھر جائے گی — ذوالفقاری کاٹ، شانِ حیدری حجت میں ہے
ذوالفقارِ حیدری چلتی تھی نسلیں دیکھ کر — درحقیقت یہ صفت بھی آپ کی سیرت میں ہے
لے گا جب وہ انتقامِ خونِ فرزندِ رسول — تب یزید وقت سمجھے گا اثر لعنت میں ہے
چرخ سے آئیں گے عیسیٰ ہوں گے ماموم امام — کاش عیسائی سمجھ لیتے کہ حق حجت میں ہے
مدح کا ارشادؔ لفظوں میں بیاں ممکن نہیں — دل سمجھتا ہے مزہ جو آپ کی مدحت میں ہے

مولانا کی منقبتی شاعری اپنی سادگی، صفائی اور دل نشینی کے باعث منفرد مقام کی حامل ہے۔ان کے یہاں زبان نہایت سلیس، رواں اور عام فہم ہے، مگر اس سادگی کے پردے میں روحانی وابستگی بھی جلوہ گر ہے۔انھوں نے ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کی مدح وثنا کو رسمی انداز میں برتنے کے بجائے عقیدت، محبت اور قلبی وارفتگی کے ساتھ ایک زندہ تجربے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ان کی منقبت گوئی کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں عقیدت کے ساتھ عجز وانکسار کی کیفیت پوری شدت سے محسوس ہوتی ہے۔وہ اپنے آپ کو ایک ادنیٰ مداح کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اہلِ بیت

اظہار کے حضور اپنی نیازمندی اور فکری فروتنی کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے منقبت کے تقاضوں یعنی تقدسِ الفاظ، شائستگیٔ بیان اور احترامِ معانی کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ ان کی منقبتوں میں لفظوں کا انتخاب نہ صرف محتاط اور بامعنی ہے بلکہ ہر لفظ اپنے مقام پر معنویت سے بھرپور ہے۔ انھوں نے نہ تو مبالغہ آرائی کی بے جا راہوں کو اختیار کیا اور نہ ہی جذباتی شدت میں توازن کھویا، بلکہ ایک معتدل، مہذب اور سنجیدہ لہجے میں اہلِ بیت کے فضائل و مناقب کو پیش کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ارشاد حسین کی منقبت گوئی عقیدت و ادب، سادگی و تاثیر اور فکر و فن کا ایک ایسا حسین مرقع ہے جس میں زبان کی شائستگی، جذبے کی صداقت اور اظہار کی وقار آمیز لطافت ایک ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ اردو میں منقبت نگاری، مقالہ نگار: احسن زیدی، گورنمنٹ اسلامیہ کالج فیصل آباد، بہ اجازت پنجاب یونیورسٹی مراسلہ ۸۱۳ / جی۔ایم، مورخہ اکتیس جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۳۸

۲۔ مناقب اہل بیت، انتخابات از صوفیائے کرام، اصل مع ترجمہ اردو، مرتبہ: محمود علی مرزا عفی عنہ، سلسلہ نمبر۔۱، ص ۷

۳۔ اردو میں منقبت نگاری، مقالہ نگار: احسن زیدی، گورنمنٹ اسلامیہ کالج فیصل آباد، بہ اجازت پنجاب یونیورسٹی مراسلہ ۸۱۳ / جی۔ایم، مورخہ اکتیس جولائی ۱۹۷۹ء، ص ۸۲

۴۔ سہ ماہی فیضان ادب، مئو، یوپی، جنوری تا مارچ ۲۰۲۵ء، ص ۱۴۷

۵۔ فاطمہ زہرا فکر و شخصیت، مرتبہ: پروفیسر خانم طلعت عزیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ص ۶۷

۶۔ کاشف الحقائق (جلد دوم)، امداد امام اثر، مکتبہ معین الادب، اردو بازار، لاہور، ص ۱۹۶

۷۔ زین العابدین کی سیاسی زندگی، مولف: محمد باقر شمس لکھنوی، ضیا پریس، کراچی، ص ۱۶

۸۔ تاریخ احمدی، مولف: نواب شیخ احمد حسین صاحب خان بہادر، ص ۵۲۔۳۵۱

☆☆☆

ڈاکٹر فیضان حیدر
استاد شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ایم کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 7388886628

مولانا ارشاد حسین کی شعری کائنات

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین کثیر الجہت شخصیت کے حامل ہیں۔ان کی ذات میں دینی و مذہبی شعور، روحانی بالیدگی اور ادبی جمالیات ایک دوسرے سے اس طرح مدغم ہوجاتے ہیں کہ ان کی شاعری اظہارِ فن کے ساتھ تزکیۂ نفس اور خود سازی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ان کے کلام کو شعریات کے بنیادی اصولوں یعنی رسومیات، جمالیات اور تصورِ حیات و کائنات کی روشنی میں پرکھا جائے تو ان کی تخلیقی شخصیت پوری طرح روشن ہوجاتی ہے۔وہ شاعری کو جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک منظم فنی ضابطے کے طور پر برتتے ہیں، جہاں ہیئت، عروض، زبان اور معنی سب ایک متوازن وحدت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

مولانا ارشاد کی غزل گوئی کلاسیکی اردو غزل کی روایت سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ان کے اشعار معنویت، روانی اور بندش کی چستی کے حامل ہیں۔عشق، ہجر، بے بسی اور انسانی کرب جیسے موضوعات ان کے یہاں انفرادیت کے بجائے علامتی اور آفاقی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جمالیاتی سطح پر ان کی شاعری میں لفظیات، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کی فنی ترتیب اشعار کی معنویت کو دوچند بنا دیتی ہے۔

حمد، مناجات، نعت، منقبت اور سلام میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ وہ عقیدت کو فنی وقار اور فکری شعور کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہیں۔ان کی حمدیہ شاعری توحید، عبدیت اور عرفان کی ترجمان ہے، نعتیہ کلام عشقِ رسولؐ، ادب اور احتیاط کا حسین امتزاج ہے، جب کہ منقبت اور سلام میں اہلِ بیت رسول کی قربانی کو اخلاقی اور تہذیبی استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

قطعہ، قصیدہ، سہرا اور تعزیتی نظموں میں بھی اختصار، وقار اور معنوی تہ داری نمایاں ہے۔ مجموعی طور پر مولانا ارشاد کی شاعری روایت اور عصری حسیت کے امتزاج سے ایک ایسی شناخت قائم کرتی ہے جو سنجیدگی، تاثیر اور جمالیاتی حسن سے بھرپور ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، کلاسیکی شعریات، غزل، جمالیات، رسومیات، تصورِ حیات، رباعی، حمد، مناجات، نعت، منقبت، سلام، قطعہ، قصیدہ، سہرا، تعزیتی نظمیں۔

کسی بھی شاعر کی تخلیقی عظمت سمجھنے کے لیے اس کے کلام کو موضوعاتی سطح کے ساتھ شعریات کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں دیکھنا لازمی ہے۔ شعریات کے تین اہم عناصر رسومیات، جمالیات اور تصورِ حیات و کائنات، کسی بھی شاعر کی فکری و فنی ساخت کو واضح کرتے اور اس کا ادب میں مقام متعین کرتے ہیں۔ جب ہم مولانا ارشاد حسین (۱۹۴۹۔۲۰۲۵ء) کی شاعری کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بھی اسی مکمل شعری نظام کے تحت عالم وجود میں آتی اور اپنی شناخت قائم کرتی ہے۔

ان کے یہاں ہیئت، صنفی شعور اور عروضی پابندی فقط فنی التزام نہیں بلکہ شعری روایت سے گہری وابستگی کا نتیجہ ہیں۔ غزل، حمد، مناجات، نعت، منقبت، سلام، نظم، قطعہ اور تعزیتی نظمیں غرض ہر صنف میں مولانا اپنی فنی دسترس، صنفی تقاضوں اور روایت کے شعوری احترام کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں، جو ان کی شاعری کو ایک مضبوط اور معتبر بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

مولانا ارشاد کی شاعری کی رسومیات میں کلاسیکی روایت کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے، بالخصوص غزل میں جہاں وہ بحر، قافیہ اور معنوی اکائیت جیسے اصولوں کی پوری طرح پاس داری کرتے ہیں۔ ان کے اشعار اپنی معنوی تکمیل خود رکھتے ہیں اور کسی خارجی سہارے کے محتاج نہیں ہوتے۔ کلاسیکی غزل کے تین بنیادی کردار عاشق، معشوق اور رقیب ان کے کلام میں علامتی سطح پر موجود رہتے ہیں، مگر یہ کردار فردِ واحد تک محدود رہنے کے بجائے ایک وسیع تجربے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح نعت، منقبت، سلام اور تعزیتی نظموں میں بھی وہ فقط عقیدت کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ شعری ساخت، لفظیات اور تہذیبی رمزیت کے ذریعے ان اصناف کو فنی وقار عطا کرتے ہیں۔

جمالیاتی سطح پر مولانا کی شاعری ربط، روانی اور تناسبِ لفظی کی عمدہ مثال ہے۔ ان کے یہاں بندش کی چستی اس درجہ نمایاں ہے کہ شعر پڑھتے ہوئے کسی قسم کی لفظی رکاوٹ یا معنوی بوجھل پن کا

احساس نہیں ہوتا۔ وہ الفاظ کو معانی کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بناتے بلکہ انھیں شعری حسن کا فعال جزو بنا دیتے ہیں۔ مضمون آفرینی، خیال بندی اور کیفیت آفرینی ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں، جہاں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی سمیٹنے کی کیفیت موجود ہے۔ خاص طور پر ان کی غزلوں میں تہ داری، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کا استعمال قاری کو کئی معنوی امکانات کی طرف متوجہ کرتا ہے، جو کلاسیکی شعری جمالیات کی روحِ رواں ہے۔

مولانا ارشاد کا تصورِ حیات و کائنات ایسے تہذیبی اور روحانی شعور سے منسلک ہے جو تقدیر، صبر و رضا، دردمندی اور اخلاقیات کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ ان کے یہاں عشق، حصولِ خواہش کا ذریعہ نہیں بلکہ صفائے قلب و ذہن، پاکیزگیٔ روح، اخلاقی تطہیر اور روحانی ارتقا کا موثر وسیلہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی تصور کے تحت ان کی شاعری میں فرد سے زیادہ انسان، ذات سے زیادہ کائنات اور لفظ سے زیادہ معنی کی اہمیت ہے۔ اس طرح مولانا کی شاعری کلاسیکی اردو شعریات کی روایت میں رہتے ہوئے بھی فکری سنجیدگی، تہذیبی وقار اور تخلیقی انفرادیت کے باعث ایک معتبر اور قابلِ فخر شعری سرمایہ بن جاتی ہے۔

مولانا ان برگزیدہ اہلِ قلم میں شامل ہیں جن کی شخصیت میں علم دین کی متانت، درویش صفت انسان کا وقار اور ایک متین اور سنجیدہ شاعر کا لطیف جمالیاتی ذوق یکجا نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں جہاں ایک طرف دین کی روشنی ہے، وہیں دوسری طرف احساسات کی نرمی، جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی شائستگی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ شعری تخلیقات میں ان کی شخصیت کی وہ داخلیت جھلکتی ہے جس کی بنیاد اخلاص، سادگی اور روحانیت پر قائم ہے۔ ان کا شعری سرمایہ بظاہر مختصر ہے، مگر معنویت و کیفیت سے بھرپور، فکری رچاؤ اور تاثیر سے مملو ہے۔

مولانا ارشاد کی شاعری ہمہ جہتی تنوع کی حامل ہے جو اردو شاعری کی روحانی و تہذیبی روایت کو نہ صرف آگے بڑھاتی ہے بلکہ اسے نئی حرارت اور داخلی صداقت سے ہمکنار بھی کرتی ہے۔ ان کے یہاں شاعری وارداتِ دل اور تشکیلِ فکر کا مشترکہ عمل ہے۔ گویا ان کے اشعار میں الفاظ و تراکیب نئی معنویت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ ان کا امتیاز یہی ہے کہ وہ روح کو چھو لینے والی سادگی کے ساتھ ایسا سماں باندھ دیتے ہیں جو قاری کو زندگی کے اسرار و رموز، ایمان و ایقان، انسانیت اور عشقِ حقیقی کے باب میں نئے زاویوں سے غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کی غزل میں احساس و تجربے کی نزاکت، حمد میں توحید کی گونج، مناجات میں بندگی کا انکسار، نعت میں عشقِ رسول کا والہانہ پن، منقبت میں اہلِ بیتِ رسول کی رفعت و منزلت، قطعے میں حکمت و موعظت اور تعزیتی نظموں میں انسانی درد کی لطافت موجود ہے۔

مولانا ارشاد کی شاعری کا سب سے اہم پہلو ان کی غزل گوئی ہے۔ ان کی غزلیں کلاسیکی اردو غزل کی رسومیات سے گہری وابستگی رکھتی ہیں۔ وہ غزل کو اظہارِ ذات کا وسیلہ بنانے کے ساتھ باقاعدہ شعری صنف کے طور پر نباہتے ہیں اور اس کے فنی تقاضوں مثلاً بحر، وزن، قافیہ اور ردیف وغیرہ کو بڑی فنی چابک دستی سے برتتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہر شعر اپنی معنوی اکائی رکھتا ہے اور کسی خارجی تسلسل کا محتاج نہیں ہوتا، جو کلاسیکی غزل کی بنیادی شرط ہے۔ مطلع کی مضبوطی، قافیے کی گرفت اور ردیف کے بامعنی استعمال سے وہ غزل کی فنی ساخت کو مزید مستحکم بناتے ہیں، جس سے ان کی غزلیں روایت کی پاس داری کے ساتھ عصری حسیت کی آئینہ دار بھی ہوگئی ہیں۔

جمالیاتی سطح پر مولانا کی غزلیں روانی اور بندش کی چستی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کے اشعار میں الفاظ کا انتخاب اس درجہ محتاط اور مناسب ہوتا ہے کہ نہ تو کوئی لفظ زائد محسوس ہوتا ہے اور نہ ہی کہیں کوئی معنوی خلا پیدا ہوتا ہے۔ مضمون آفرینی اور خیال بندی ان کی غزلوں کے نمایاں اوصاف ہیں، جہاں وہ عشق، ہجر اور حرماں نصیبی جیسے مکرر مضامین کو نئے زاویۂ نظر سے باندھتے ہیں۔ ان کے یہاں کیفیت آفرینی بھی بھرپور ہے، بہت سے اشعار معنوی سادگی کے باوجود قاری کو جذباتی گرفت میں لے لیتے ہیں، جو کلاسیکی غزل کی جمالیات کا خاصہ ہے۔

تصورِ حیات و کائنات کے اعتبار سے مولانا ارشاد کی غزلیں راضی بہ رضا اور دردمندانہ شعور کی حامل ہیں۔ ان کی غزل کا عاشق فردِ واحد نہیں بلکہ ایک علامتی وجود ہے، جو انسانی بے بسی، تمناؤں کی نارسائی اور ہجر کی ناگزیر حقیقت کا نمائندہ ہے۔ معشوق بھی ان کے یہاں فرد نہیں بلکہ ایک تجریدی حسن ہے جو مطلق اختیار کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی عمومیت کے سبب ان کی غزلوں میں انفرادیت کے بجائے آفاقیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس طرح مولانا ارشاد حسین کی غزلیں کلاسیکی اردو شعریات کی روایت میں ایک سنجیدہ اور باوقار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان کی غزلوں میں عشقیہ مضامین، ہجر و حرماں نصیبی، عاشق کی بے بسی اور معشوق کی بے نیازی اسی علامتی نظام کے تحت جلوہ گر ہوتے ہیں جو کلاسیکی روایت کا خاصہ ہے۔ مضمون آفرینی، خیال بندی اور معنوی تہ داری ان کی غزلوں کو فکری وسعت عطا کرتی ہیں، جب کہ روانی اور بندش کی چستی انھیں جمالیاتی سطح پر کامیاب بناتی ہیں۔

مولانا کا شعری مزاج اردو و فارسی کی کلاسیکی روایات سے فیضیاب ہے اور ان کے بطن سے جنم لینے والی عصری حسیت کا حامل بھی۔ ان کی غزلوں میں قدیم جمالیات کا وقار بھی ہے اور عصر حاضر کی داخلی

کشمکش وفکری انفرادیت کا سراغ بھی۔ اگر چہ وہ روایت کے سرچشموں سے روشنی حاصل کرتے ہیں، لیکن یہ روشنی تقلید محض نہیں بلکہ تخلیقیت کی حامل ہے۔ روایت ان کے لیے معتبر نمونوں تک رسائی کے ساتھ ایسی قوت کے طور پر سامنے آتی ہے جس پر وہ اپنی شعری انفرادیت کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور غزل کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''غزل کے سلسلے میں یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ مغربی نظریۂ فن کے مطابق یہ فن پارہ ہو یا نہ ہو، مشرقی نظریۂ فن کے مطابق یہ بھی فن کا ایک روپ ہے اور اس میں بحر، قافیے اور ردیف کے ذریعہ سے ذہن کی ایک خاص رو، کیفیات کے ایک خاص آہنگ، جذبات کی ایک خاص لے، ایک مخصوص فضا کی آئینہ بندی کی جاتی ہے۔ بحر ایک بساط عطا کرتی ہے۔ قافیہ اس بساط کی سطح پر تکرار اور توقع کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذہن کو ایک روشنی اور روح کو ایک بالیدگی عطا کرتا ہے اور ردیف حالت یا زمانے یا شرط کے ذریعہ سے اسے چستی اور چابک دستی عطا کرتی ہے۔''[۱]

آلِ احمد سرور کے پیش کردہ تصوراتِ غزل کی روشنی میں اگر مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کا شعری رویہ روایت کی تقلید کے ساتھ منظم فکری اور جمالیاتی شعور کا اظہار ہے۔ مولانا کے یہاں غزل ایک باقاعدہ فنی نظام کے تحت سانس لیتی ہے، جہاں بحر سب سے پہلے ایک ایسی ہموار اور مستحکم بساط فراہم کرتی ہے جس پر خیال اضطراب اور دشواری کے بغیر جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کی منتخب بحریں فکر کو نہ بوجھل ہونے دیتی ہیں اور نہ منتشر، بلکہ معنی کو اعتدال، وقار اور روانی عطا کرتی ہیں۔ یہی بحر ان کے اشعار میں ذہنی رو کو ایک نئی سمت دیتی اور کیفیات کے بہاؤ کو فنی ضبط میں رکھتی ہے۔ ان کی ایک غزل کے یہ اشعار اس بات کا بیّن ثبوت ہیں ؎

ہم ان کی خیالوں میں تصویر بناتے ہیں
کچھ نقش بناتے ہیں کچھ نقش مٹاتے ہیں
کاغذ پہ نہ بن پائی جب صورتِ جانانہ
تب ذہن کے گوشے میں اک بت کو سجاتے ہیں
جب مشکلیں پڑتی ہیں مایوس نہیں ہوتے
شب بھر تری یادوں کے ہم دیپ جلاتے ہیں
لرزش میں ہے لو، ہم تو شمعِ شبِ آخر ہیں

بجھتے ہیں تو عالم کو پُر نور بناتے ہیں
ارشادؔ نے جو چھوڑے ہیں نقش زمانے میں
ہر طالبِ منزل کو وہ راہ دکھاتے ہیں

غزل کے باب میں مولانا کا کمال یہی ہے کہ وہ روایت کے بنیادی تقاضوں یعنی زبان و بیان کی کلاسیکی تہذیب اور جہانِ معنی کی فکری وسعت کو نہایت متوازن انداز میں برتتے ہیں۔ ان کی غزلیں زبان کے تخلیقی حسن، تراکیب کی نفاست اور بیان کی شائستگی سے مالا مال ہیں اور معنوی سطح پر بھی داخلی اضطراب، عرفانی اشارات اور عصری شعور کی مشعل لیے ہوئے ہیں۔

ان کی غزلوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ داخلی تجربے کو غزل کی کلاسیکی ساخت میں یوں سمیٹتے ہیں کہ معنی کا دائرہ شخصی احساسات تک محدود نہیں رہتا بلکہ سیلانی کیفیت اختیار کر لیتا ہے اور اسے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور روحانی وسعتوں سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ مثلاً جب وہ عشق اور حسن کے ازلی تضاد کو بیان کرتے ہیں تو روایتی مضامین نہیں دہراتے، بلکہ اس تضاد کی نئی تعبیری جہتیں تلاش کرتے ہیں۔ عشق کے مزاج کو حسن کی ناز برداری سے ہم رنگ کرنے کی خواہش ہو یا آرزو کے اخلاقی مضمرات، ان کے یہاں نئی معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ترکیبوں کی تازگی اور مضمون کی ندرت کلاسیکی غزل کے سرچشمے سے پھوٹتی ضرور ہے لیکن جذباتی کیفیت اور ہیئت میں عصری حسیت سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔

اسی طرح مولانا کی غزلوں میں خودی اور بے خودی جیسے دقیق مضامین بھی نئے زاویوں کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ خودی کو روحانی وقار تصور کرتے ہیں، لیکن جب یہی خودی انانیت کی حدوں میں داخل ہو جائے اور انسانیت سے دور لے جانے لگے تو اس کی تردید بھی کرتے ہیں۔ ایک شعر میں خودی کی مضبوطی کا جلال ہے تو دوسرے میں اسی خودی کو آگ میں ڈال دینے کا عرفانی رجحان، یہ تضاد نہیں بلکہ اس داخلی سفر کی علامت ہے جو ہر باشعور روح طے کرتی ہے۔

لاکھ اٹھتی ہیں جہاں میں آندھیاں
حوصلہ ہے شمع کا پھر بھی جواں
لاکھوں مجنوں مر گئے ہیں راہ میں
میں ابھی کرتا ہوں طے سب دوریاں
ہو گیا بوڑھا مگر اے فرطِ شوق
تو نے رکھّا ہے مجھے اب بھی جواں

آنسوؤں کا ضبط کرنا شرط ہے
رازِ الفت کا نہ ہوجائے عیاں

مولانا کی غزلوں میں ایک اور اہم جہت اثر انگیزی ہے جو غزل کے موضوعات میں تازگی پیدا کرتی ہے۔ خواہ دلِ بے تاب کی دھڑکنوں کا بیان ہو یا نگاہِ شوق کا راز، خواہ زخموں کی درماں سے بیزاری ہو یا انسان کی داخلی تڑپ، ان سب میں وہ حسیت کارفرما ہے جو عصرِ حاضر کے انسانی تجربات کی نمائندہ ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا کی غزل میں جگہ جگہ سماجی و سیاسی حوالوں کی لطیف جھلک دکھائی دیتی ہے، مگر وہ اسے خطیبانہ نہیں ہونے دیتے۔ ظلم، جبر، ناانصافی اور منافقت جیسے عصری مسائل ان کے اشعار میں تہذیبی اشاریت اور علامتی اظہار کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو ان کی غزل کو مضمون آفرینی تک محدود نہیں رہنے دیتے بلکہ ایک بامعنی احتجاج کا حامل بنا دیتے ہیں۔ اس قبیل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

نرگس پہ پڑی شبنم قطرہ نہیں دریا ہے
جس کا کبھی رک جانا آسان نہیں ہوتا

ارشادؔ نے جھیلی ہیں کچھ ایسی گزرگاہیں
جن راہوں پہ چل پڑنا آسان نہیں ہوتا

کربلا سے تھی مستعار حیات
ظالموں سے حساب میں گزری

جب فضائیں مہرباں کچھ بھی نہیں
دور تک یہ آسماں کچھ بھی نہیں
حق پرستی کربلا سے سیکھ لو
سامنے تیر و سناں کچھ بھی نہیں

پھر وہ مقام بھی قابلِ ذکر ہے جہاں شاعر اپنی فکری وابستگی کو کلاسیکی اساتذہ سے جوڑتا ہے۔ جس طرح کل کے بڑے شعرا کی فکری بندشیں اور لسانی نغمگی نے اردو غزل کو دو نمایاں دھارے دیے، اسی طرح مولانا ان دونوں کے اشتراک سے اپنے لیے ایک نیا راستہ تراشتے ہیں۔ ان کی غزل میں فکری پیچیدگی اور لسانی نرمی کا یہی امتزاج اُن کی شعری شناخت کا نمایاں وصف بن کر سامنے آتا ہے۔ گویا وہ

صدائے ساز کی فکری بالیدگی کو سوزِ گلو کی موسیقیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا نے اپنی غزل میں فلسفیانہ مباحث کو محض تجریدی سطح تک محدود نہیں رکھا بلکہ جزء لایتجزی اور اس نوع کی دیگر فلسفیانہ موشگافیوں کو فکری بالیدگی کے ساتھ شعری پیکر عطا کیا ہے۔ وہ دقیق اور مجرد تصورات کو ایسے محسوساتی اور تجرباتی پیرائے میں ڈھالتے ہیں کہ فلسفہ خشک استدلال کے بجائے زندہ احساس بن جاتا ہے۔ ان کے اشعار میں فکر اور جذبے کا یہ امتزاج قارئین کو غور و فکر پر آمادہ ہی نہیں کرتا بلکہ انھیں زندگی اور کائنات کے باطنی حقائق سے بھی روشناس کراتا ہے۔ اس طرح ان کی غزل فلسفے کی پیچیدگیوں کو جمالیاتی حسن اور معنوی وضاحت کے ساتھ قابلِ فہم بنا دیتی ہے۔ اس قبیل کی ایک غزل کے یہ اشعار دیکھیے ؎

میں ہوں وہ جز جسے لایتجزیٰ کہتے ہیں
کوئی قاتل مجھے دو نیم نہیں کرسکتا
صورِ جسم سے ممکن نہیں مفرد کی شناخت
ایسی صورت کوئی تقسیم نہیں کرسکتا
صورتِ نوع سے گر تم کو سہارا نہ ملے
پھر ہیولیٰ کی بھی تفہیم نہیں کرسکتا
لامکاں کے لیے حیّز بھی نہیں ہے ارشادؔ
پھر بھی اک گھر ہے جو تقسیم نہیں کرسکتا

مولانا ارشادؔ کی اصل فلسفیانہ بصیرت یہ ہے کہ وہ فلسفے کو نہ تو فقط ذہنی مشق بناتے ہیں اور نہ ہی اسے صوفیانہ ابہام میں تحلیل ہونے دیتے ہیں۔ ان کا شعور روایت اور معاصرت کے درمیان ایک مضبوط پل قائم کرتا ہے، جہاں حکمتِ قدیمہ، اسلامی مابعد الطبیعیات اور جدید فکری و فنی سوالات ایک دوسرے سے ہم کلام نظر آتے ہیں۔ وہ وجود، وحدت اور حقیقت جیسے دقیق تصورات کو کسی واعظانہ یا تعلیمی لہجے کے بغیر، نہایت وقار اور فکری اعتماد کے ساتھ برتتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری فلسفیانہ ہونے کے باوجود بوجھل نہیں ہوتی بلکہ قارئین کے اندر ذہنی بیداری اور سوال اٹھانے کی جرأت پیدا کرتی ہے۔

مندرجہ بالا اشعار اپنی فکری ساخت میں ایک منظم فلسفیانہ بیان ہیں۔ یہاں زبانِ شعر ایک ایسے ذہن کی ترجمان بن جاتی ہے جو منطقِ ارسطویی، مابعد الطبیعیات اور وجودی مباحث سے گہری واقفیت رکھتا ہے، مگر ان علوم کو درس گاہی اصطلاحات میں قید کرنے کے بجائے تخلیقی سطح پر برتتا ہے۔ غزلیہ اشعار کا آہنگ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر کے نزدیک وجود کوئی سادہ یا سطحی حقیقت

نہیں بلکہ ایسی کلیت ہے جو ہر طرح کی خارجی تحلیل اور جبری تقسیم سے ماورا ہے۔ یہ احساس کہ حقیقت کو توڑا نہیں جا سکتا، بلکہ وہ اپنی وحدت میں ہی معنی خیز ہے، جدید وجودی فکر اور قدیم حکیمانہ روایت دونوں سے بیک وقت مکالمہ قائم کرتا ہے۔

ان اشعار میں انسانی عقل کی حد بندی اور اس کی ناکامیوں کا ایک خاموش اعتراف بھی پوشیدہ ہے۔ شاعر کسی تصادم یا انکار کے بجائے نہایت سنجیدہ وقار کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ بعض حقیقتیں ایسی ہیں جو منطقی خانوں، تعریفی دائروں اور تصوراتی تقسیمات سے ہمیشہ بچ نکلتی ہیں۔ یہ رویہ فلسفے کی اس روایت سے ہم آہنگ ہے جو علم کو حصولِ معلومات نہیں بلکہ شعورِ تہذیب سمجھتی ہے۔ یہاں وحدت اور کلیت کا تصور کسی مجرد خیال کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ فکری حقیقت کے طور پر ابھرتا ہے، جس کے سامنے تحلیل، تجزیہ اور تقسیم جیسے اوزار بے اثر دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح یہ کلام جدید انسان کے اس کبر و نخوت کو بھی چیلنج کرتا ہے جو ہر شے کو قابو میں لانے کی خواہش رکھتا ہے۔

اگرچہ مولانا کی غزلیں کلاسیکی روایت کی زمین میں جڑی ہوئی شاخیں ہیں، لیکن ان کی نسوں میں وہی تازہ لہو دوڑتا ہے جو معاصر انسانی تجربے اور داخلی جدوجہد کا عطیہ ہے۔ یہ غزلیں روایت کا بوجھ نہیں اٹھاتیں بلکہ روایت کو نئے امکانات عطا کرتی ہیں۔ یہی ان کی اصل فنی قوت ہے اور ان کے کلام کی درخشاں شناخت بھی۔

مولانا کی رباعی گوئی ان کی فکری پختگی، شعری ریاضت اور ادبی بصیرت کی روشن دلیل ہے۔ رباعی جیسی مشکل اور نازک صنفِ سخن میں طبع آزمائی ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی، کیوں کہ اس میں نہ صرف اوزان و بحور کی باریکیوں پر گہری نظر درکار ہوتی ہے بلکہ کم الفاظ میں گہرے معانی سمیٹنے کی قدرت بھی ضروری ہوتی ہے۔ مولانا اس فن کے ایک قادرالکلام شاعر تھے جنھوں نے رباعی کی ہیئت، اس کے آہنگ اور اس کے فکری تقاضوں کو پوری طرح اپنی رباعیوں میں برتا۔ ان کی رباعیوں میں لفظوں کی نشست و برخاست نہایت متوازن اور بامعنی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رباعی کے فن پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ان کے یہاں فکر کی گہرائی، جذبے کی شدت اور بیان کی لطافت اس طرح یکجا ہو جاتی ہے کہ چار مصرعوں کی مختصر سی ساخت ایک وسیع معنوی کائنات میں بدل جاتی ہے۔

ان کی رباعیوں کا ایک اہم اور نمایاں پہلو واقعۂ کربلا سے ان کی گہری اثر پذیری ہے۔ کربلا اسلامی تاریخ کا وہ عظیم سانحہ ہے جس نے صدیوں سے اہلِ قلم اور اہلِ دل کو متاثر کیا ہے، اور مولانا ارشاد بھی اس روحانی اور فکری روایت سے پوری طرح وابستہ نظر آتے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں حضرت امام حسین کی

قربانی، صبر و استقامت اور حق و باطل کی کشمکش کا ذکر نہایت پر اثر اور دل نشیں انداز میں ملتا ہے۔ وہ کربلا کو ایک سانحہ کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے حریت، ایثار اور صداقت کی ابدی علامت کے طور پر برتتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیوں میں کربلا کی یاد ایک زندہ شعور کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور قاری کے دل میں حق پسندی اور ظلم کے خلاف مزاحمت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

شبیر ہے میزانِ وفا کا معیار
ہر دور میں زندہ ہے اسی کا کردار
کٹ جائے گا سر، جھک نہیں سکتا ہرگز
باطل کے مقابل ہے وہ مثلِ کہسار

اس کے ساتھ مولانا کی رباعی گوئی میں زبان و بیان کی شستگی اور فصاحت بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کی رباعیات میں سادگی اور تاثیر کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ الفاظ نہایت سلیقے سے برتے گئے ہیں اور تشبیہات و استعارات میں فطری تازگی محسوس ہوتی ہے۔ وہ مشکل مضامین کو بھی نہایت سہل اور دل نشیں انداز میں بیان کر دیتے ہیں، جس سے ان کی رباعیاں نہ صرف فکری طور پر متاثر کن ہو جاتی ہیں بلکہ ادبی حسن سے بھی مالا مال دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی رباعیوں میں جذبۂ عقیدت، اخلاقی پیغام اور فکری بصیرت ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ قاری کو ایک دیرپا روحانی اور ادبی تاثر ملتا ہے۔

اردو میں حمدیہ شاعری کو نہایت مقدس اور باوقار صنف کی حیثیت حاصل ہے، جس میں شعرا اپنے دل سے اٹھنے والی عقیدت، ایمان و ایقان اور جذبۂ خلوص کو لفظوں کا پیراہن عطا کرتے ہیں۔ اس صنف میں خدائے وحدہ لاشریک کی کبریائی، اس کے اوصافِ جمیلہ اور اسمائے مبارکہ اس طرح اشعار کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں کہ شعر فی اظہار کے ساتھ قلبی وابستگی اور روحانی سرشاری کا آئینہ بن جاتا ہے۔ اردو شعرا نے حمد گوئی کے ذریعے ثنا و تحمید کے ایسے نقوش قائم کیے جو شعری جمالیات کے ساتھ ادبی سرمایہ بھی قرار پائے۔ اس صنف کو مولانا نے شعوری طور پر اپنایا اور فکری و فنی کاوشوں سے رنگ برنگے گل بوٹے کھلائے جو اس فن سے ان کی ذہنی وابستگی اور اس میں مہارت کا ثبوت ہیں۔ حمد گوئی کے فن کے حوالے سے فراغ روہوی رقم طراز ہیں:

> ''لامکاں کی لامحدود ذات اگرچہ کسی تعریف کی محتاج نہیں پھر بھی قدرت کے تمام مظاہر کے علاوہ اشرف المخلوقات نے بھی حمد بیانی کو اپنی زندگی کے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ آدم سے لے کر اولاد آدم تک عظمت خداوندی کے گیت گنگنائے جا رہے ہیں۔ شعرا نے بھی

رب کی ودیعت کردہ ہنر مندی کے ذریعہ حمد کے کینوس کو وسیع کرنا فرض عین سمجھا اور اس طرح شاعری کے حوالے سے صنف حمد ظہور میں آئی۔''[۲]

مولانا ارشاد کی حمدیہ شاعری کلاسیکی شعریات کے اس تصور سے ہم آہنگ ہے جس میں عشقِ حقیقی کو تمام شعری تجربات کی اساس سمجھا جاتا ہے۔ ان کی حمدوں میں خداوند کائنات کی عظمت، ربوبیت اور بے نیازی کا بیان عقیدت مندانہ انداز میں ملتا ہے۔ بندش کی چستی، الفاظ کی دروبست، اسلوب کی پاکیزگی اور معنی کی تہ داری ان کی حمدوں کو شعریت بخشتی ہیں۔ ان کے یہاں استعارہ حقیقت کی نقل نہیں بلکہ معنی کی نئی صورت گری کرتا ہے، جس کے ذریعے شاعر عبدیت کے احساس کو ہمہ گیر تجربے میں ڈھال دیتا ہے۔

مولانا نے حمد گوئی کے کینوس کو وسیع کیا۔ انھوں نے اپنے ایمان کی حرارت اور قلبی عقیدت کو شعری سانچے میں ڈھال کر خدائے عزوجل کی کبریائی، اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ کو نہایت وقار اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مولانا کی حمد گوئی میں الفاظ اظہار کا وسیلہ ہی نہیں بنتے بلکہ بندگی، خصوع وخشوع اور روحانی وابستگی کے ترجمان بن کر وہ تاثیر پیدا کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والے پر جذب کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اس طرح ان کی حمدیہ شاعری ادبی سرمائے میں ایک خوشگوار اور معتبر اضافہ بن جاتی ہے۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ حمد گوئی میں فکری وفنی لحاظ سے بڑی گنجائش ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حمد کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے فراغ روہوی مزید لکھتے ہیں:

''حمد گوئی کی راہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ کسی بندش یا شرط کا سامنا کرنا پڑتا ہے نہ کوئی مشکل آڑے آتی ہے اور نہ بہکنے کا کوئی خدشہ لاحق رہتا ہے۔ یہ راہ تمام حدود وقیود سے آزاد ہے اور آزاد فضاؤں میں مبالغہ آرائی تو کیا غلو بھی ناقابل گرفت ہوا کرتا ہے۔''[۳]

مولانا ارشاد حمد کہتے وقت فنی تقاضوں کو پوری طرح پیش نظر رکھتے ہیں اور رب العزت کی حمد وثنا اس انداز میں کرتے ہیں کہ اس کی ذات وصفات کے ساتھ اس کی بزرگی، عظمت اور جاہ وجلال قارئین کے ذہن ودماغ پر دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ بایں ہمہ مولانا کی حمدیہ شاعری اردو شعرا کی اس روایت سے مربوط ہے جس میں فارسی و ایرانی شعری نمونوں سے استفادے کی صورت ملتی ہے لیکن فقط استفادے کی حد تک۔ ان کے خلاقانہ ذہن نے اس صنف کو ذاتی تجربے، فکری بالیدگی اور سچے جذبے کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک منفرد رنگ عطا کیا ہے۔ سادگیٔ بیان، اخلاصِ نیت اور شائستگیٔ فکر ان کی حمد گوئی کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی ایک حمد کے یہ اشعار دیکھیے ؎

کلیم طور کے جلوے کا تار ختم نہ ہو یہ نورِ ارض و سما کا وقار ختم نہ ہو

وجود واجبِ ذاتی کی ذات کے صدقے وجوبِ غیر کا بھی اضطرار ختم نہ ہو
کہاں ہو معرفتِ حق دلیلِ لمّی سے تحیّر بصرِ نور بار ختم نہ ہو
شناخت اس کی ہے ممکن دلیلِ اِنّی سے اثر کے ساتھ موثر کا پیار ختم نہ ہو
جہانِ زیست کو بخشی ہے اس نے شادابی خزاں کے ڈر سے چمن کی بہار ختم نہ ہو
صفات اس کی ہماری طرح تعالیٰ اللہ! وہ عینِ ذات ہے یہ اعتبار ختم نہ ہو
بس ایک ذرّہ ہے ارشادؔ اس کی خلقت کا یہ مہر و ماہ کا سب کاروبار ختم نہ ہو

وہ حمدیہ شاعری میں حسنِ کلام اور فنی شعور کو متوازن انداز میں برتتے ہیں۔ ان کی حمدوں میں الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب و ترکیب سے وہ موسیقیت اور جمالیاتی رچاؤ پیدا ہوجاتا ہے جو حمدیہ شاعری کی روح ہے۔ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں سر نیاز جھکانے کا جو جذبہ ان کے یہاں ملتا ہے، وہ صرف عقیدت کی حد تک نہیں بلکہ اس روحانی سفر کا ترجمان ہے جو مخلوق کو خالق تک پہنچاتا ہے۔ ان کی حمدوں میں دل کو مرکزِ شعور قرار دے کر روحانی انسلاکات سے جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ قارئین کا دامن دل کھینچتی ہے۔ استعارات و علامات کی معنویت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کے جذبات و احساسات سے پھوٹتی ہے۔ ان کے نزدیک دل ایسا آئینہ ہے جو خدا کی تجلیات کا مرکز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بار بار اس قرب الٰہی کا ذکر ملتا ہے جو انسان کے لیے حقیقی دولت اور دائمی سکون کا سرچشمہ ہے۔

ان کی حمدوں میں بارگاہِ الٰہی کے سامنے عجز و نیاز کا جو احساس ہے، وہ ان کے ہر شعر میں ایک نرم مگر اثر انگیز دھڑکن کی صورت موجود ہے۔ ان کے نزدیک انسان اپنے ظاہری وجود میں کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، لیکن دل کی دنیا میں اللہ کی معرفت اسے اس مقام تک لے جاتی ہے جہاں خوف، امید، رجا، محبت اور توکل ایک نئی ترکیب میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کی حمد کا مرکزی پیغام یہی ہے کہ خدا کی قربت ہی زندگی کی اصل کامیابی ہے اور اسی سے انسان کو اطمینان ملتا ہے جو کسی دنیوی خوشی سے نہیں حاصل ہوسکتا۔

مولانا کی حمدیہ شاعری عقیدت، عرفان، تاثیر اور فنی حسن کا وہ حسین امتزاج رکھتی ہے جو ان کے ایمانی شعور اور شعری بصیرت دونوں کی آئینہ دار ہے۔ ان کے اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی ذات ہر لمحہ انسان کے دل کے قریب ہے، اور اسی قرب کو پہچان کر انسان اپنی حقیقت بھی جان لیتا ہے اور اپنی منزل بھی۔ مولانا کی حمد گوئی اسی روحانی شعور کی مسلسل یاددہانی ہے۔

مولانا ارشاد کی مناجات میں فرد اور کائنات کے مابین ایک باطنی مکالمہ قائم ہے۔ یہ مناجات تقدیر پر ایمان، انسانی عجز اور نیاز مندی کے اس شعور کی پیداوار ہیں جو ہماری کلاسیکی شعری روایت کا بنیادی جوہر

ہے۔ یہاں معنی کم اور کیفیت زیادہ ہے، شاعر اپنے باطن کی شکستگی اور امید کو اس سادگی سے بیان کرتا ہے کہ قاری جذباتی سطح پر اس تجربے میں شریک ہو جاتا ہے۔

مولانا کی مناجات گوئی بھی اردو کی اس پاکیزہ روایت کی توسیع ہے جس میں بندۂ عاجز اپنے ربِ کریم کے حضور سراپا نیاز بن کر دستِ دعا دراز کرتا ہے۔ ان کی مناجات میں حمد و ثنا کے ساتھ عبدیت کا گہرا شعور نمایاں ہے۔ وہ خداوند عالم کو قوت و اقتدار کے مظہر کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اس کی رحمت، کرم اور بندہ پروری کو اپنے شعر کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے یہاں مناجات دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی فریاد ہے، جس میں اضطراب، امید اور یقین کی کیفیت ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں۔ مولانا کا اسلوب قاری کو اس مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں انسان اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے ربِ ذوالجلال کی رحمت پر کامل اعتماد کرتا نظر آتا ہے۔ ایک مناجات کے چند اشعار دیکھیے جو عصر حاضر کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی اضطراب کے بہترین آئینہ دار ہیں۔

ستم کو صبر سے مسکاں بنادے — بہت دشوار ہے آساں بنادے
جہاں پر ظلم کا دریا ہو جاری — خدایا! تو ہمیں طوفاں بنادے
چمن میں ہر طرف پھیلی ہو خوش بو — ہمیں ایسا گل و ریحاں بنادے
دہکتے ہوں جو انگارے جنوں کے — اسے تو عقل کا گلداں بنادے
زمانے بھر میں امن و آشتی ہو — محبت کا یہ ہندُستاں بنادے

ان کی مناجات گوئی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے حقیقی مسائل اور باطنی کرب کو نہایت سادگی اور اخلاص کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ بندے اور خدا کے رشتے کو فکری موشگافیوں کے بجائے قلبی وابستگی کے ذریعے واضح کرتے ہیں، جہاں دعا، التجا اور توکل ایک دوسرے کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کی مناجات میں خشوع و خضوع کا وہ رنگ جھلکتا ہے جو قاری کے دل میں عبادت کا ذوق اور دعا کی لذت پیدا کر دیتا ہے۔

دراصل مولانا کی مناجاتیہ شاعری ان کی روحانی وابستگی، خدا شناسی اور قلبی اخلاص کا وہ آئینہ ہے جس میں ان کے ایمانی شعور کی پوری جھلک نمایاں ہے۔ ان کی حمدیہ و مناجاتیہ شاعری کا بنیادی سرچشمہ ایک ایسا عارفانہ احساس ہے جس میں خالق حقیقی کی عظمت، قدرت، جلال اور کمال کا اعتراف نہایت سادگی مگر بے پایاں تاثیر کے ساتھ ملتا ہے۔ مولانا کے نزدیک خدا کا ذکر دل کی دنیا کو روشن کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حمد میں الوہیت کی وہ ہمہ گیر روشنی محسوس ہوتی ہے جو زمانے اور وقت کی قیدو بند سے

آزاد اور مکان کی حدود سے مبرا ہے۔ ان کا لہجہ نہ صرف ایک مومن کی عاجزی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس عرفانی تجربے کی گواہی دیتا ہے جس سے وہ ہر لمحہ دوچار رہتے ہیں۔ ان کی حمد و مناجات میں خدا کی عظمت کے بیان کے ساتھ انسان کی بے بسی اور محدودیت کا احساس بھی نمایاں ہے، اور یہی امتزاج ان کے حمدیہ اور مناجاتیہ اشعار کی روحِ رواں ہے۔

مولانا ارشاد کی نعتیہ شاعری میں عشقِ رسولؐ کا بیان کلاسیکی غزل کی جمالیات سے ہم آہنگ ہے۔ وہ نعت میں بھی ہیئت، زبان اور بندش کے ان اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں جو اعلیٰ درجے کی شاعری کے متقاضی ہیں۔ ان کے یہاں حضور اکرم کی ذاتِ اقدس ایک تاریخی موضوع نہیں بلکہ نور، مرکزِ معنی اور کائناتی صداقت کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ معنی کی کثرت، استعارے کی رمزیت اور اسلوب کی شائستگی ان کی نعتوں کو فقط عقیدت تک محدود نہیں رہنے دیتے بلکہ انھیں جمالیاتی حسن اور ادبی وقار بھی عطا کرتے ہیں۔

نعتیہ شاعری کے باب میں مولانا کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے یہاں زبان و بیان کی صحت فنی ضرورتوں کو پورا بھی کرتی ہے اور ساتھ ہی عشقِ رسول کی باطنی کیفیت سے ہم آہنگ ہو کر اخلاقی و روحانی ذمہ داری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہ نعت کو صرف بیانِ اوصاف کا عمل نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایسی مقدس واردات مانتے ہیں جس میں شاعر کا باطن، اس کی نیت اور اس کا شعری شعور سب یکجا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نعتیہ اشعار میں جذبے کی صداقت اور احساس کی حرارت نمایاں ہے، مگر یہ حرارت کہیں بے محابا نہیں ہوتی۔ عشق یہاں اظہار کو شدت ضرور عطا کرتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ادب اور توقیر کی وہ حدیں بھی قائم رہتی ہیں جو نعتیہ شاعری کا جوہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کے کلام میں زبان شائستہ، ترکیبیں عمدہ اور اسلوب سنجیدہ ہے، کہیں بھی ایسی لغزش نظر نہیں آتی جو عقیدت کو مبالغے یا بے احتیاطی کی طرف لے جائے۔ نعتیہ شاعری کے فکری و فنی تقاضوں کے حوالے سے سید وحید اشرف کچھوچھوی لکھتے ہیں:

> ''شاعری میں زبان و بیان کے پہلوؤں پر نظر رکھنا اور درست شعر کہنا ضروری ہے۔ لیکن شعر کو محاسن کا حامل بنانے کے لیے محض اتنا کافی نہیں ہے۔ نعتیہ شاعری میں اگر شاعر عشق رسول میں ڈوبا ہوا ہو تو اس کے کلام میں جو قوت و تاثیر اور جذبہ کی صداقت نمایاں ہوگی وہ محض بیانیہ شاعری میں ممکن نہیں۔ عشق کی کیفیت اس کو لغزشوں سے بھی محفوظ رکھ سکتی ہے کیوں کہ یہاں عشق خود معلم ادب ہوگا اور یہ عشق اس بارگاہ کی عظمت کو فراموش نہ ہونے دے گا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاعر میں یہ کیفیت ہر وقت ہو۔ اس لیے نعت لکھنے میں ہر

وقت اپنے حدود کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔''[۴]

مولانا نعت گوئی میں حدود و قیود کے شعوری التزام کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ عشق کی کیفیت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی، اس لیے نعت کہتے وقت فقط وجدانی بہاؤ پر اعتماد کرنا کافی نہیں۔ ان کے یہاں شعری ضبط، فکری احتیاط اور دینی شعور ایک دوسرے کی معاونت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی توازن ان کی نعتیہ شاعری کو بیانیہ یا رسمی اظہار سے بلند کر کے ایک معتبر اور موثر شعری تجربہ بنا دیتا ہے۔ اس طرح مولانا ارشاد کی نعت صداقتِ عشق، پاسداریٔ ادب اور پختگیٔ فن کا حسین امتزاج بن جاتی ہے، جہاں شاعر نہ صرف اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ بارگاہِ رسالت کی عظمت کا امین بھی بن جاتا ہے۔ جذبہ اور فرطِ مسرت سے بھرپور ایک نعت سے لطف اٹھائیے ؎

وہ روحِ تزکیہ و پیکرِ صدق و صفا آئے — پئے کردار سازی دہر میں خیر الوریٰ آئے
دُرِ یکتا کی مدحت میں مرے اشعار موتی ہیں — کہ ہے قرطاس پر اک کہکشاں، بدرالدجیٰ آئے
یہ نعتِ مصطفیٰ ہے ذات کی منزل خدا جانے — یہ نازک مرحلہ طے ہوگا جب معجز نما آئے
زمیں کیا عرش پر بھی جشن برپا ہے پئے مدحت — ''دو عالم میں مسرت ہے حبیبِ کبریا آئے''
کلیم طور ہی جانیں ترے نعلین کی منزل — خدا نے ان سے فاخلع کہہ دیا تو پیادہ پا آئے
کلامِ رب ہوا محبوب سے اک خاص لہجے میں — خدا ہی جانے وہ منزل جہاں پر مصطفیٰ آئے
مریضِ عشقِ احمد ہوں فقیری ہے مری دولت — مسیحا بن کے رہزن پاس میرے بارہا آئے

ان کی نعتیہ شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے جذبۂ عقیدت کو جذباتی وابستگی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ کے برمحل اور بامعنی استعمال سے مدلل اور مستحکم بنا دیتے ہیں۔ آیات و احادیث ان کی نعتوں میں حوالہ ہی نہیں بنتیں بلکہ شعری استدلال کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس طرح ان کی نعتیہ شاعری قلب کو سرشاریِ ایمان سے منور کرتی ہے اور ذہن کو استدلال کی روشنی سے آسودہ، یہاں تک کہ قاری مطالعے کے وقت خود کو عقیدت کی لطافت اور فکری استحکام کے ایک حسین، متوازن اور معنویت سے بھرپور سنگم پر محسوس کرتا ہے۔

ان کے سخن کی جولانگاہ کا سب سے پاکیزہ جوہر دراصل ان کے نعتیہ اشعار ہیں جن میں رسالت مآب سے ان کی قلبی شیفتگی، روحانی وابستگی اور مدحت کا سرشار ذوق پوری شدت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ مولانا کی شعری تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا شعری مزاج ابتدا ہی سے عقیدتِ رسول اور اہل بیت رسول کی محبت سے لبریز رہا ہے۔ ان کے یہاں یہ رجحان ایک فنی رویے کے ساتھ باطنی

واردات کا مستقل سلسلہ ہے جس نے آہستہ آہستہ ان کے پورے شعری وجود کو اپنی نورانی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی فکر، ان کا ذوق، ان کی زبان، ان کی تشبیہات واستعارات اور جذبات و احساسات سب ایک ہی مرکز سے توانائی حاصل کرتے ہیں اور وہ ہے عشق رسول وآل رسول۔

مولانا نے نعت کو صناعی، بندش یا تخیل کی جولانگاہ کے بجائے سچائی، روحانی بالیدگی اور باطنی صداقت کا آئینہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتوں میں جذباتی وارفتگی اور فکری اعتدال دونوں یکجا نظر آتے ہیں۔ روایتی نعتیہ شاعری میں اکثر تخیل کی بلند پروازی اور مدح کی غیر محتاط شدت موضوع کو مشکل بنا دیتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ عرفیؔ شیرازی نے اسے تلوار کی دھار پر چلنے کا فن قرار دیا ہے۔ وہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

عرفی مشتاب این رہ نعمت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را[۵]

مولانا نے بھی حدادب کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے جذبے کو نکھارا اور تخیل کو قرآن وسنت کی روشنی میں پرواز اور اڑان دی۔ ان کی نعتیں سوز وگداز بھی رکھتی ہیں، مودبانہ انکسار بھی۔ نیز دل کی تہ میں اتری ہوئی محبت کی وہ حرارت بھی جو ایک سچے شاعر کا سرمایۂ حیات ہوتی ہے۔ ان کی ایک نعت کے چند اشعار دیکھیے جو جذبے کی سرشاری اور والہانہ پن سے مملو ہیں۔ ان کی قرأت سے آپ بھی اپنے مشام جاں کو معطر کیجیے ؎

عرش سے فرش پہ دیوانے چلے آتے ہیں — شمع جلتی ہے تو پروانے چلے آتے ہیں
آ گیا آمنہ کی گود میں اک پارۂ نور — عرش والے بھی ضیا پانے چلے آتے ہیں
ہے زلیخائے جہاں چہرۂ انور پہ نثار — فخر یوسف ترے دیوانے چلے آتے ہیں
میکدہ ہوگیا روشن ترے مے خواروں سے — خود بخود ہاتھوں میں پیمانے چلے آتے ہیں
نور سے گل ہوا آتش کدۂ فارس بھی — دیکھنے جلوے کو انجانے چلے آتے ہیں
آبِ رخ دیکھ کے کیوں خشک ہے بحر ساوہ — کفر بے آب ہے بتلانے چلے آتے ہیں
کون کیا جانے گا لولاک کی منزل ارشادؔ — بزم افلاک سے فرزانے چلے آتے ہیں

مولانا ارشاد کے نعتیہ اشعار میں ایک نمایاں پہلو مدحِ رسالت کے تقدس اور ادبی تخلیق کے حسن کی ہم آہنگی ہے۔ وہ مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہیں مگر تشبیہات واستعارات کی لطافت سے مضمون کو جمالیاتی رفعت ضرور عطا کرتے ہیں۔ یوں ان کی نعتیہ شاعری نہ سادگی کی مثال ہے نہ تخیل پردازی کا

نمونہ، بلکہ ان دونوں کے اندر سے اٹھنے والی ایک معتدل، متوازن اور پاکیزہ آواز ہے جو دلوں کا اپنا اسیر بناتی چلی جاتی ہے۔

اگر امیر مینائی کی نعتوں میں سادگی کے ساتھ جذب وشوق کا عالم ہے اور محسن کاکوروی کے یہاں جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور فن کی گھن گرج ہے، تو مولانا کے یہاں دونوں کی صالح قدریں ایک نئے توازن کے ساتھ جمع ہوتی ہیں۔ وہ امیر کی طرح نعتیہ سرمائے سے سرشار بھی ہیں اور محسن کی طرح جذباتی وابستگی کے اسیر بھی، مگر دونوں سے مختلف ایسا نعتیہ اسلوب قائم کرتے ہیں جو نہ صرف ایمانی احساس کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ اردو نعت کی موجودہ روایت کو استحکام بھی عطا کرتا ہے۔

ان کے نعتیہ اشعار سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا دل کی گہرائیوں میں اترے ہوئے جذبات نے الفاظ بن کر اپنی راہیں خود چن لی ہوں۔ ان کی نعتوں میں وہ سوز ہے جو صدیوں سے نعت کی روایت کا خاصہ رہا ہے، اور وہ روشنی ہے جو ایمان وایقان اور عشق کی جڑوں میں پیوست رہ کر شاعر کی تخلیقی فضا کو روشن ومنور کرتی ہے۔ ان کے بعض اشعار میں یہ تڑپ صاف محسوس ہوتی ہے کہ شاعر دنیا کو بے وقعت سمجھتا ہے، اور مدینہ طیبہ کی نکہت بیز فضا ہی اس کی زندگی کا حاصل اور آخرت کا سرمایۂ کل محسوس ہوتی ہیں۔ ایک نعت کے یہ اشعار دیکھیے ؎

عشق خیر البشر اگر لکھنا ان کی معراج کا سفر لکھنا
قاب قوسین ہو کہ او ادنیٰ اُدنُ مِنّی کے باب پر لکھنا
آپ تو نور ہیں حقیقت میں اور پیکر میں ہیں بشر لکھنا
نور سے کل جہاں منور ہے ان کی آمد کا ہے اثر لکھنا
جس سے عاجز جہاں ہے اس کی ثنا چاہتا ہے یہ بے خبر لکھنا
نعت ہے یہ کوئی غزل تو نہیں ہے یہ خنجر کی دھار پر لکھنا
کلمہ پڑھتے ہیں ہاتھ پر کنکر جھکتے قدموں میں ہیں شجر لکھنا
ایک انگشت کے اشارے سے ہوتا دو نیم ہے قمر لکھنا
آدمی کیا ہے تابع فرماں ہیں قدم بوس جانور لکھنا

مولانا ارشاد کی نعتیہ شاعری کا ایک نمایاں اور قابلِ توجہ وصف یہ ہے کہ اس میں قرآنی آیات و تلمیحات اور تشبیہات واستعارات نہایت فطری ربط اور فنی توازن کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ نعت کے تقدس اور نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی اسالیب واشارات کو محض تزئین کلام کے طور پر نہیں، بلکہ

معنوی استحکام اور فکری گہرائی کے وسیلے کے طور پر برتتے ہیں۔ ان کے یہاں تشبیہات و استعارات نہ تو تصنع کا شکار ہوتے ہیں اور نہ ہی قاری کے ذہن پر بوجھ بنتے ہیں، بلکہ سادگی کے ساتھ معنی کی نئی جہات اور نئے دریچے وا کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نعتیں فکری بالیدگی کے باوجود سہل ممتنع کا حسن رکھتی ہیں اور قاری کو ذہنی گرہ میں الجھانے کے بجائے وجدانی سرشاری عطا کرتی ہیں، جو ان کے گہرے دینی شعور اور پختہ ادبی ذوق کی غماز ہیں۔

مولانا ارشاد کی نعت گوئی مجموعی طور پر بلندیٔ تخیل، جذبۂ عقیدت اور فنی شعور کے حسین امتزاج کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ تشبیہ، استعارہ اور تلمیح جیسے کلاسیکی وسائل بیان کو نہایت اعتدال اور سلیقے سے برتتے ہیں، جس سے نعت کا تقدس بھی برقرار رہتا ہے اور فنی جمال بھی مجروح نہیں ہوتا۔ ان کی نعتوں میں عقیدت غلو سے منزہ، زبان شائستہ، لہجہ منکسرانہ اور اسلوب متوازن ہے۔ اس طرح مولانا ارشاد کی نعت گوئی روایت کی پاس داری اور شخصی انفرادیت کے امتزاج سے ایک ایسی شعری جہت اختیار کرتی ہے جو فکری اعتبار سے مضبوط بھی ہے اور فنی سطح پر مکمل بھی۔

مولانا ارشاد حسین ایک بہترین منقبت گو شاعر بھی ہے۔ ان کی منقبت نگاری میں شخصیت پرستی کے بجائے صفات اور اقدار کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ ائمہ طاہرین اور اہل بیت رسول سے وابستہ دیگر شخصیات کی منقبت میں ان اوصاف کو اجاگر کرتے ہیں جو انسان کو اخلاقی اور روحانی بلندی عطا کرتے ہیں۔ اس صنف میں بھی وہ شعریات کے بنیادی اصولوں جیسے لفظیات، معنیات اور اسلوبیات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ منقبت میں تقدیر، تسلیم و رضا اور روحانی وابستگی کا تصور ان کے کلام کو ایک وسیع تہذیبی تناظر عطا کرتا ہے، جہاں فرد سے زیادہ کردار اور ذات سے زیادہ صفات اہمیت رکھتی ہیں۔

ان کی منقبت گوئی ان کے عمیق روحانی ذوق، تاریخ اسلام کے مطالعے اور سیرتِ ائمہ کے ساتھ والہانہ تعلق کی درخشاں مثال ہے۔ ان کے مناقب کا بنیادی سرچشمہ وہ قلبی روشنی ہے جو ان کی تربیت، مشاہدے اور مذہبی مطالعے سے پھوٹی۔ مولانا نہ صرف روایتی معنوں میں اہلِ بیت اطہار کے مدّاح تھے بلکہ وہ ان کے مقام و مرتبے کو تاریخی، دینی اور فکری تناظر میں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی منقبتیں جذباتیت کا شکار نہیں ہوتیں بلکہ عشق و معرفت کا نمونہ قرار پاتی ہیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی موضوعاتی، منقبتی اور رثائی شاعری کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''موضوعاتی، منقبتی اور رثائی شاعری اپنے موضوع کی پابندی کے احاطے میں تخلیق کار کا امتحان ہوتی ہے۔ شاعر کی فطرت اور اس کے تخلیقی تقاضے حدود و قیود کے کبھی پابند نہیں

ہوتے۔ وہ آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں کسی طائر پر بستہ کی طرح پرواز کی محدودیت ان کی مجبوری نہیں ہوتی لیکن ان سب حقیقتوں کے باوجود مذہبی اصناف سخن کی وادی میں سفر کرنے والے شعرا کے پاؤں میں ایک زنجیر ضرور پڑ جاتی ہے۔ اب یہ ان کا کمالِ فن اور شعری بصیرت ہے کہ وہ پابند ہونے کے باوجود افق تا افق پرواز خیال سے روشنی کے خطوط کھینچتے رہیں۔''[٦]

مندرجہ بالا تصور کی روشنی میں مولانا ارشاد حسین کی منقبت گوئی کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ انھوں نے مذہبی اصناف کی فکری و اعتقادی حدود کو تخلیقی رکاوٹ نہیں بننے دیا بلکہ انھیں اپنی شعری بصیرت کے ذریعے امکانات میں بدل دیا۔ منقبت جیسی پابند صنف میں، جہاں موضوع کی تقدیس تخلیقی آزادی پر ایک فطری قدغن عائد کرتی ہے، مولانا ارشاد نے فکری گہرائی، تہذیبی شعور اور اسلوبی توازن کے ساتھ اپنے تخلیقی جوہر کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ ان کی منقبتوں میں عقیدت کہیں تکرارِ مضامین نہیں بنتی بلکہ تاریخی شعور، اخلاقی اقدار اور روحانی معنویت کے امتزاج سے ایک باوقار فکری فضا قائم ہو جاتی ہے۔ وہ تقدیسِ موضوع کا کامل احترام کرتے ہوئے خیال کی پرواز کو افق تا افق وسعت دیتے ہیں اور یوں پابندی کے حصار میں بھی تخلیقی روشنی کے ایسے خطوط کھینچتے ہیں جو قاری کے ذوقِ جمال اور ادراکِ معنی دونوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے مولانا ارشاد کی منقبت گوئی کمالِ فن اور شعری آگہی کی ایک روشن مثال ہے، جہاں زنجیرِ پابندی نہیں بلکہ تخلیق کی تہذیب بن کر نمودار ہوتی ہے۔

مولانا کے یہاں اہلِ بیت کا ذکر موروثی عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ شعوری وابستگی کا بیان ہے جو انسان کے باطنی جہان کو منور اور ایمان کو مستحکم کرتا ہے۔ ان کی منقبتوں میں عقیدت و احترام کے ساتھ محققانہ نظر بھی جھلکتی ہے جس کے باعث ان کی منقبتیں زیادہ فکر انگیز، وقار آمیز اور اعتبار سے بھرپور بن گئی ہیں۔ ایک منقبت کے چند اشعار کی قرأت کیجیے۔

حرم میں جب بتوں کو توڑنے سرکارؐ آئے ہیں
علی بھی زیبِ دوشِ احمد مختار آئے ہیں
قضیہ حل نہ ہو تو خود ہلاکت سے بچانے کو
علی کے پاس دوڑے صاحبِ دستار آئے ہیں
کبھی خطرہ ہوا اسلام کو دیں کی سپر بن کر

علی ہی شہسوارِ مرکبِ کردار آئے ہیں
جو چادر تان کر سوئے ہیں تلواروں کے سائے میں
پیمبر کی حفاظت کے ضمانت دار آئے ہیں
مبارز جب طلب کرتا تھا کلِّ کفر خندق میں
مقابل کلِّ ایماں بر سرِ پیکار آئے ہیں
اگر ارشادؔ تجھ کو حوصلہ ہے دار کا کہہ دو
محبّانِ علی میں میثمِ تمّار آئے ہیں

مولانا کی منقبت گوئی کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اہلِ بیت کے فضائل کو روایتی تکرار کے بجائے ایک فکری نظام کے تحت پیش کرتے ہیں۔ان کے یہاں علی کی شجاعت ہو یا فاطمہ کی طہارت، حسن کی متانت ہو یا حسین کی شہادت، سب کا بیان نہایت جاندار اسلوب میں ہوا ہے۔مولانا ان کے اوصاف کو نہ صرف بیان کرتے ہیں بلکہ ان کی اخلاقی معنویت کو قارئین کے دل تک پہنچاتے ہیں تاکہ اہلِ بیت کی سیرت پر انسان گام زن ہو کر اپنی زندگی کا راستہ بھی متعین کر سکے۔ان کے اشعار میں اہلِ بیت کے مقام کو قرآن وحدیث کے آئینے میں سمجھنے کا رجحان نمایاں ہے۔یہی آفاقیت ان کی منقبتوں کو مذہبی ادب کا معتبر حصہ بناتی ہے اور انھیں عقیدت سے بلند کر کے اخلاقی، روحانی اور ادبی بیانیہ بناتی ہے۔جناب فاطمہ کی شان میں کہی گئی ایک منقبت کے یہ اشعار دیکھیے ؎

دیکھ کر جنت کے اوپر اختیارِ فاطمہ — کل خواتین بہشتی ہیں نثارِ فاطمہ
گھر پہ رضوانِ جناں خیاط بن کر آ گیا — صدق کی تصدیق ہے یا اقتدارِ فاطمہ
نذر مانی تین روزوں کی خدا کے واسطے — دہر کا سورہ ہوا نازل بکارِ فاطمہ
مرسلِ اعظم کھڑے ہو جاتے ہیں تعظیم کو — منصبِ جزوِ رسالت ہے وقارِ فاطمہ
راہبوں کی ہار تھی پر نور چہروں کے سبب — صورتِ ''ابنائنا'' ہیں شاہکارِ فاطمہ
حشر میں کیا منھ دکھائے گا رسولِ پاک کو — وہ سقی جس نے کیا در سے فشارِ فاطمہ
درحقیقت طعنۂ ابتر کا ہے بن کر جواب — آئی گلزارِ خدیجہ میں بہارِ فاطمہ
پنجتن جب آتے ہیں ارشادؔ چادر کے تلے — آیتِ تطہیر بنتی ہے حصارِ فاطمہ

فنی اعتبار سے مولانا کی منقبت گوئی ان کی قادرالکلامی اور زبان و بیان پر ان کی دسترس کی غماز ہے۔وہ منقبت کو وہی تقدس، روانی اور اثر بخشتے ہیں جو حمد اور نعت میں نظر آتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس صنف

کے جذباتی و روحانی رنگ کو بھی عمدگی سے برتتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں نرمی اور صلابت، دونوں ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ نرمی اس عقیدت کے باعث ہے جو دل سے پھوٹتی ہے، اور صلابت اس تاریخی صداقت کی وجہ سے جو اہلِ بیت کے کردار سے وابستہ ہے۔ علامتیں، استعارات اور قرآنی آیات و تلمیحات ایک خاص لطافت کے ساتھ جزوِ منقبت بنتی ہیں اور یہی ان کا فنی امتیاز بھی ہے۔

مولانا ارشاد نے سلام گوئی میں بھی فن کارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کے سلام رثائی شاعری کے اس فکری و جذباتی اثاثے سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہیں جس میں کربلا ایک تاریخی واقعہ کے طور پر نہیں بلکہ حق و باطل کا ابدی استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کے سلاموں میں غم، وفاداری اور حق پسندی کا بیان شور انگیزی کے بجائے کیفیت آمیز پیرائے میں ہوا ہے۔ یہاں تصورِ حیات میں ظلم کے مقابلے میں صبر، استقامت اور اخلاقی برتری کو نمایاں کیا گیا ہے، جو کلاسیکی شعری شعور کی بنیادی اقدار میں شامل ہیں۔

مولانا کی سلام گوئی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعۂ کربلا کو رزم گاہِ حق و باطل قرار دیتے ہیں۔ ان کے سلاموں میں امام حسین، اہلِ بیت اور اصحاب و انصار کی قربانی چند افراد کی جانباری اور جاں نثاری نہیں، بلکہ حق و صداقت کی ابدی جدوجہد کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں بیان میں خطیبانہ جوش کے بجائے سنجیدگی اور معنوی وقار غالب ہے۔ وہ ایسے کو شور انگیزی کے بجائے کیفیت آفرینی کے ذریعے قاری کے دل میں اتارتے ہیں، جس سے سلام کی تاثیر مزید دیرپا ہو جاتی ہے۔

ان کے سلاموں کا ایک اہم فنی وصف ان کی زبان و بیان کی کیفیت ہے۔ وہ غم اور عقیدت جیسے شدید جذبات کو بھی لفظی اعتدال، موزونیت اور بندش کی چستی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہی اعتدال ان کے کلام کو مبالغے، سطحی جذباتیت اور وقتی اثر سے محفوظ رکھتا ہے۔ ان کے سلاموں میں اس قدر روانی ہے کہ اشعار بہ آوازِ بلند پڑھنے پر بھی کہیں کوئی لفظی رکاوٹ یا معنوی انسداد محسوس نہیں ہوتا۔ اسلوب کی یہی شائستگی ان کے سلاموں کو عصری رثائی شاعری میں خاص مقام عطا کرتی ہے۔

تصورِ حیات کے اعتبار سے مولانا ارشاد کی سلام گوئی صبر، رضا اور تقدیر کے اس شعور سے منسلک ہے جو اسلامی و مشرقی روایت کا بنیادی جوہر ہے۔ ان کے سلاموں میں شہادت کو حیاتِ جاوداں کا استعارہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ فرد کا دکھ اجتماعی یادداشت میں ڈھل کر ایک اخلاقی پیغام بن جاتا ہے، جس میں ظلم کے مقابلے میں حق کی فتح اور قربانی کی معنویت نمایاں ہوتی ہے۔ اس طرح مولانا کی سلام گوئی مذہبی عقیدت تک محدود نہیں رہتی بلکہ ایک بامقصد، تہذیبی و فکری شعری روایت کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ ایک سلام کے چند اشعار۔

جب ہوئی ہیں دین میں بے دینیاں دیں علی کے لال نے قربانیاں
تشنہ لب فرزندِ ساقی ہوگیا ختم پانی کی ہوئیں سب شوخیاں
کربلا میں خون پانی ہوگیا اور پانی کی ہوئی قیمت گراں
پانی پانی ہوگئی نہر فرات ہائے پیاسی ہیں پیمبر زادیاں
سر پٹکتا تھا جو پانی گھاٹ پر مضطرب تھا شرم سے بے ایں و آں

مذکورہ اشعار کی روشنی میں دیکھا جائے تو مولانا کی سلام گوئی رسمی رثائی شاعری سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے ساتھ عصری حسیت کی بھی آئینہ دار ہے۔ان کے سلام میں کربلا کا ذکر کسی محدود بیانیے تک مقید نہیں رہتا بلکہ وہ اسے اسلامی تہذیب، انسانی ضمیر اور اخلاقی اقدار کے ایک جامع استعارے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔سلام کے لیے غزل کا فارم اختیار کرنا ان کے فنی انتخاب کی دلیل ہے، کیوں کہ غزل کی رمزیت، اختصار اور لطافت ان کے داخلی سوز اور فکری کرب کو بہتر طور پر سمو لیتی ہے۔مولانا سلام میں براہِ راست منظر نگاری کے بجائے قاری کے باطن کو مخاطب کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں کربلا ایک زندہ، متحرک اور ابدی حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔

مزید یہ کہ مولانا کی سلام گوئی میں منظر کشی کا انداز روایتی رثائی شاعری سے قدرے مختلف ہے۔وہ واقعات کو بیان کرنے کے ساتھ ان کے پس منظر میں کارفرما اخلاقی و روحانی اقدار کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شہادت کا تصور باطل کے خلاف مسلسل جدوجہد، حق پسندی اور انسانی وقار کی علامت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے سلام میں جزئیات کی بھرمار نہیں، بلکہ ایک ایسی فضا قائم ہے جو قاری کو خود غور و فکر کرنے اور محسوس کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

مولانا کی قطعہ نگاری میں اختصار کے اندر معنی کی وسعت نمایاں ہے۔قطعہ چوں کہ فوری تاثر، اہم نکتہ یا اخلاقی اشارے کی صنف ہے، اس لیے وہ یہاں بندش کی چستی اور لفظی کفایت کو خاص اہتمام سے برتتے ہیں۔ان کے قطعات میں مضمون اور معنی کے فرق کا شعوری استعمال ملتا ہے، جہاں ایک مختصر کلام کئی فکری پہلو سمیٹ لیتا ہے۔یہی معنوی تہ داری ان کے قطعات کو وقتی اظہار کے بجائے پائیدار ادبی حیثیت عطا کرتی ہے۔

مولانا کی قصیدہ گوئی اور سہرا گوئی بھی ان کی فکری و فنی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔قصیدہ گوئی میں وہ تاریخی شعور، دینی احساس اور تہذیبی وقار کو اس طرح مربوط فکری ڈھانچے میں سمو دیتے ہیں، جس سے ان کے فنی استحکام کا پتہ چلتا ہے۔اسی طرح سہرا گوئی میں مولانا کا ذوقِ جمال، سماجی روایت اور دعائیہ احساس

اس دل نشیں سادگی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں کہ خوشی کے اس موقع کو بھی وہ پاکیزگی اور تہذیبی شائستگی سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ شعری جہات بھی ان کے فنی کمال کی آئینہ دار ہیں۔

مولانا ارشاد حسین کی تعزیتی نظمیں غم کے بیان میں ضبط، وقار اور تہذیبی شعور کی مثال پیش کرتی ہیں۔ وہ جذباتی شدت کے بجائے صبر، تقدیر اور حیات وممات کے فلسفیانہ شعور کو سامنے رکھتے ہیں۔ ان نظموں میں فرد کا رنج وغم اجتماعی تجربے میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو کلاسیکی تصورِ کائنات کا بنیادی وصف ہے۔ الفاظ کی مناسبت، اسلوب کی سنجیدگی اور معنی کی تہ داری ان تعزیتی نظموں کو رسمی اظہار سے بلند کر کے بامعنی شعری اسلوب میں ڈھال دیتی ہیں۔

مولانا کی تعزیتی شاعری ان کے باطنی شعور، تجربے کی گہرائی اور دینی و اخلاقی حساسیت کا روشن ثبوت ہے۔ ان کی تعزیتی نظمیں کسی سانحے یا کسی عزیز کے انتقال پر رسمی افسوس کا اظہار نہیں بلکہ انسانی دکھ درد کی تہ تک اتر کر سخن کے ذریعے تسلی، تشفی اور حکمت کے دریچے کھولتی ہیں۔ ان کا تخلیقی مزاج رنج والم کو خام جذبات کی صورت میں بیان کرنے کے بجائے اسے بالاتر روحانی تناظر میں دیکھتا ہے، جہاں موت فنا نہیں بلکہ آغازِ حیات، اور جدائی ایک ایسے وصال کی تمہید ہے جس کا وعدہ ربّ العالمین نے کیا ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں غم کے ساتھ ایک عجیب سی راحت، درد کے ساتھ ایک درمانی کیفیت اور آنسوؤں کے ساتھ تقدیرِ الٰہی پر کامل رضا کی خوشبو ملتی ہے۔ ان کا اسلوب نہ جذباتی ہے اور نہ ہی غلو سے مملو بلکہ ایک متوازن، سنجیدہ اور وقار آشنا لہجے میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی کی وفات پر انھوں نے جو تعزیتی نظم لکھی وہ اس صنف میں ان کی قادرالکلامی کا روشن ثبوت ہے ؎

جہانِ علم و ادب کا وقار ٹوٹ گیا — شعور و فکر کے پھولوں کا ہار ٹوٹ گیا
زمانہ کیوں نہ ہو بے نور ان کی رحلت سے — جہانِ دید کی آنکھوں کا تار ٹوٹ گیا
خزاں سے لگتی ہے ہر شے شکستگی کا شکار — چمن میں تھا کوئی جانِ بہار، ٹوٹ گیا
وہ کامیاب و مظفر تھا اپنی دنیا میں — سخن کے شہر کا محکم حصار ٹوٹ گیا
اسی کے دم سے غزل کا تھا مے کدہ روشن — یہ کیا ہوا کہ وہ جامِ شرار ٹوٹ گیا
کدھر گیا جسے نظریں تلاش کرتی ہیں — ادب کا سلسلۂ مشکبار ٹوٹ گیا
فلک سے اُس کی نہ دیکھی گئی حسین ادا — کہ سوزِ برق سے سازِ ہزار ٹوٹ گیا
کبھی جو دیتا تھا فن کی بلندیوں سے صدا — وہ نقدِ شعر کا روشن منار ٹوٹ گیا

ان کی تعزیتی نظموں کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ قارئین کے دل میں غم کی آگ بھڑکانے کے بجائے

اسے سکون وصبر کی طرف مائل کرتی ہیں۔ وہ سانحے کو ایک حادثہ سمجھ کر اس پر بین نہیں کرتے، بلکہ اسے انسانی زندگی کے اس دائمی اصول سے جوڑ دیتے ہیں کہ دنیا دارالعمل ہے جب کہ آخرت دارالمکافات، اور موت ایک الٰہی حقیقت، جس سے فرار ممکن نہیں۔ ان کی تعزیتی نظموں میں مرحومین کی صفاتِ حسنہ کا تذکرہ ایسے انداز میں ملتا ہے جو زندہ لوگوں کے لیے آئینہ بھی ہے اور نصیحت بھی۔ ان کی زبان میں سلاست ہے، لیکن وہ سادگی بے مایہ نہیں بلکہ نکھری ہوئی روحانی و ادبی رفعت لیے ہوئے ہے۔ ان کی تعزیتی نظموں میں آپ کو قرآن کے مفاہیم، حدیث کے اشارات اور صوفیانہ حکمت کی جھلکیاں ملتی ہیں جو ان کی تعزیتی شاعری کو اختصاص وانفراد بخشتی ہیں۔

مولانا کی تعزیتی نظموں کی ایک اور نمایاں خوبی ان کی پیکر تراشی ہے۔ وہ مرحوم کی زندگی کے روشن لمحوں اور اس کی شخصیت کی مختلف جہتوں، اس کے اخلاق وعادات اور اس کے جانے سے پیدا ہونے والے خلا کو یوں بیان کرتے ہیں جیسے قاری کسی منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ ایسی نظموں میں استعارات کی لطافت، تشبیہات کی خوشبو اور بیان کی ایسی اطمینان بخش روانی ہے جو غم کے موضوع کو بھی فن کے اعلیٰ درجے تک لے جاتی ہے۔ یہی وہ جمالیات ہے جو مولانا کی تعزیتی شاعری کو فکری وتخلیقی سطح پر ادبیت بخشتی ہے۔

غرض مولانا ارشاد کی شاعری اعتدال وتوازن کی حامل ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات واستعارات خیال کی تفہیم اور جذبے کی تہ داری کو روشن کرتے ہیں۔ فطرت، زندگی اور تجربات ومشاہدات سے ماخوذ علامتیں ان کے شعری مزاج کو سنجیدگی عطا کرتی ہیں۔ ان کے یہاں اشعار میں جذبات کی ترسیل نہ تو شوریدگی کا شکار ہوتی ہے اور نہ ہی تصنع کی آمیزش سے بوجھل، بلکہ ایک متوازن، شفاف اور سلیقہ مند اسلوب میں قارئین کو اپنی گرفت میں لیتی چلی جاتی ہے۔ یہی توازن ان کی شاعری کو انفراد واختصاص عطا کرتا ہے۔

مزید برآں مولانا کے شعری اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت زبان وبیان کی سادگی ہے، جو ان کے فکری خلوص اور فنی شعور کی آئینہ دار ہے۔ وہ سہل اور رواں الفاظ میں عمیق معانی سمیٹنے کا ہنر رکھتے ہیں، جس کے باعث ان کی شاعری عام قارئین کے ساتھ سنجیدہ قارئین کے لیے بھی یکساں طور پر قابلِ فہم بن جاتی ہے۔ ان کے یہاں لفظ ومعنی کا رشتہ فطری ہے اور اظہار میں ایسی شائستگی پائی جاتی ہے جو قاری کو فکری ارتکاز کے ساتھ قلبی سکون بھی عطا کرتی ہے۔

مولانا کی شاعری کا حقیقی جوہر بالخصوص ان کی غزلوں اور منقبتوں میں پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہی وہ اصناف ہیں جہاں ان کا فکری تشخص، روحانی وابستگی اور فنی انفرادیت باہم شیر وشکر ہو کر منفرد تخلیقی فضا قائم کرتی ہیں۔ غزل میں ان کا تخلیقی رویہ جذبات کے اظہار تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ

داخلی کرب، عرفانی شعور اور لطیف احساسات ایک ایسی سادگی اور خلوص کے ساتھ جلوہ نما ہوتے ہیں کہ قاری خود کو شاعر کے باطن سے براہِ راست ہم کلام محسوس کرتا ہے۔

درحقیقت غزل اور منقبت مولانا ارشاد حسین کی شاعری کے وہ دو بنیادی ستون ہیں جن پر ان کی شاعرانہ شناخت استوار ہے۔ یہی اصناف ان کی فکری بلندی، لسانی شائستگی اور جذباتی صداقت کی حقیقی ترجمان ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی شاعری کی معنویت اور تخلیقیت کا اصل اظہار انہی دو اصناف میں پوری طرح نمایاں اور مستحکم صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ پہچان اور پرکھ، آل احمد سرور، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۴۱

۲۔ حمد کا عالمی انتخاب، مرتب: فراغ روہوی، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ، ۲۰۱۹ء، ص ۷

۳۔ ایضاً، ص ۸

۴۔ اردو زبان میں نعت گوئی کا فن اور تجلیات، سید وحید اشرف کچھوچھوی، ارباب حلقۂ ذکر، بڑودہ، ۲۰۰۱ء، ص ۳۰

۵۔ قصائدِ عرفی، محمد جمال الدین عرفی شیرازی، مطبع قیومی، کان پور، ۱۹۰۴ء، ص ۵

۶۔ احوال واقعی: مشمولہ: لب کوثر، کوثر نقوی، حیات اکیڈمی، فیڈرل بی ایریا، کراچی، سنہ ندارد، ص ۱۶۔۱۷

☆☆☆

ڈاکٹر محمد شاہنواز عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ملت کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 9471611654

مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی ایک باوقار عالمِ دین، مخلص معلم اور صاحبِ ذوق شاعر تھے جن کی زندگی علمِ دین، تدریس اور عشقِ رسولؐ سے عبارت تھی۔ ان کی پیدائش ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ضلع مئو (اتر پردیش) کے موضع پورہ معروف میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ باب العلم مبارک پور اور پھر جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے اپنے وقت کے نامور علما سے کسبِ فیض کیا اور فقہ، ادب اور معقولات میں نمایاں مہارت حاصل کی۔

ان کی عملی زندگی علم و عمل کے حسین امتزاج کی مثال تھی۔ وہ نہ صرف ایک عالم دین تھے بلکہ اپنے علم کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والے باکردار انسان بھی تھے۔ تدریس کے میدان میں انھوں نے طلبہ کی علمی تربیت کے ساتھ اخلاقی و روحانی تربیت پر بھی خاص توجہ دی، جس کے نتیجے میں ان کے شاگرد آج مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کا ادبی ذوق بھی نہایت بلند تھا۔ انھوں نے حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی اور قطعہ جیسی شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی شاعری میں دینی عقیدت، روحانیت، تصوف اور انسانی ہمدردی کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ بالخصوص نعتیہ شاعری میں ان کے اشعار سادگی، خلوص اور اثر آفرینی کا حسین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات، روحانی واردات اور عصری مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری فکری وسعت، اخلاقی پیغام اور روحانی تاثیر کا خوب صورت امتزاج پیش کرتی ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین معروفی، دینی و تدریسی خدمات، نعتیہ شاعری، تصوف، اردو غزل، اخلاقی اقدار، روحانیت، عشقِ رسولؐ، اصلاحِ معاشرہ۔

علم و ادب کی دنیا میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے کبھی ملاقات بھلے نہ ہوئی ہو مگر غائبانہ تعارف ایک ایسا تاثر چھوڑ جاتا ہے جو وقت گزرنے کے باوجود ماند نہیں پڑتا۔ مولانا ارشاد حسین معروفی بھی ایسی ہی باوقار اور باعلم شخصیت کے مالک تھے جن سے میں کبھی ملا تو نہیں تاہم ادبی رسائل و جرائد بالخصوص ▪ 'فیضانِ ادب' میں ان کے متعلق کچھ مضامین پڑھنے کے بعد ان کی علمی و ادبی خدمات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ دربھنگہ میں مقیم اور میرے ہم منصب ان کے لائق و فائق فرزند ڈاکٹر فیضان حیدر سے ذاتی گفتگو کے دوران ان کی سیرت اور ان کے علمی و ادبی شوق و ذوق نیز ان کی دینی و تدریسی خدمات کے احوال سننے کے بعد میرے دل میں ان کے لیے ایک خاص احترام پیدا ہوا اور ان سے عقیدت بھی۔ اپریل ۲۰۲۵ء کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ میں ایک ضروری کام سے سی۔ ایم کالج گیا تو جذبہ گفت و شنید کے ایک پرندے نے نغمہ سرائی کی کہ جب آیا ہوں تو ڈاکٹر فیضان حیدر سے کیوں نہ ملاقات کر لیا جائے۔ لہٰذا قدم خود بخود ان کے شعبہ کی جانب بڑھ گئے۔ لیکن افسوس وہ موجود نہیں تھے۔ صدرِ شعبہ ڈاکٹر محمد خالد انجم عثمانی نے بتایا کہ وہ اپنے آبائی گھر گئے ہیں۔ کیوں کہ ان کے والد صاحب کی طبیعت اچانک بہت ہی ناساز ہو گئی ہے۔ غالباً تیسرے روز ڈاکٹر محمد خالد انجم عثمانی کے ذریعہ ہی یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فیضان حیدر سایہ پدری سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر دل کو دھکا لگا۔ ان کے والد بزرگوار کی وفات کے بعد قریب ایک سال کی مدت میں کئی مرتبہ ان کے تعلق سے گفتگو ہوئی۔ ادھر دو روز قبل ہی مرحوم کے احوال و کوائف پر مبنی ایک مختصر مگر جامع کتابچہ اور ان کے منتخب شعری کلام کو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ سنجیدہ اور باوقار شخصیت، مشہور و معروف علما کے شاگرد، خود ایک جید عالم، شفیق استاد، امام و خطیب اور ایک عمدہ شاعر کو الفاظ کے توسط سے بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ خیال آیا کہ جس شخص نے ایک سعادت مند شاگرد کی حیثیت سے اپنے اساتذہ کا نام روشن کیا ہے، جس نے دینی و تدریسی خدمات میں اپنی زندگی گزاری ہے اور جس شخص نے اتنی عمدہ شاعری کی ہے، یہ حق بنتا ہے کہ ان کی خدمات کو سپردِ قلم کیا جائے تاکہ سند رہے کہ مولانا ارشاد حسین معروفی ایسے اہلِ علم و قلم میں سے ایک تھے جنھوں نے بیک وقت دینی خدمات اور ادبی ذوق کو فروغ دیا۔ بلاشبہہ مولانا ایک باعمل عالمِ دین، مخلص معلم کے علاوہ ممتاز شاعر تھے۔ ان کی زندگی علم دین، تدریس، عشق رسول اور عشق آلِ رسول سے عبارت تھی۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی پیدائش ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں موضع پورہ معروف، ضلع مئو، اتر پردیش میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے میں حاصل کی۔ بعد ازاں مدرسہ باب العلم مبارک پور میں داخلہ لیا اور اسی مدرسہ سے مولوی کی سند حاصل کی۔ پھر جامعہ ناظمیہ، لکھنؤ نے نہ صرف ان کی سیرت میں نکھار پیدا کیا بلکہ اپنے وقت کے مشہور و معروف جید علما میں شمار ہونے والے مولانا مفتی سید احمد علی، مولانا محمد حسین نجفی، مولانا سید مرتضیٰ نقوی کے علاوہ دوسرے علما سے فیض حاصل کیا اور دینی علوم، فقہ، اصول فقہ، ادب اور معقولات میں گہری دسترس حاصل کی۔ ان اساتذہ کی علمی تربیت نے انھیں ایک باوقار عالم اور صاحب نظر شاعر بنا دیا۔ مولوی، عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضل معقولات اور فاضل دینیات جیسی باوقار اسناد کی حصول یابی اور ان کی شاعری اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی عملی زندگی میں وہ سارے جوہر نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں جو ایک مرد مومن کی شان ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی آئینہ صفت رہی۔ دنیا کے لہو ولعب سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ رزق حلال کی جستجو میں سرگرداں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مدرسہ ناصریہ جون پور اور مدرسہ باب العلم مبارک پور سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کے اس فیصلے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی پاکیزہ اور منزہ شخصیت کے تئیں کس قدر محتاط تھے۔

ارشادؔ دل نے صبر کی حد بھی عبور کی
لیکن کسی کے سامنے شکوہ نہیں کیا

مولانا ارشاد حسین معروفی کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف علم اور عمل کا حسین امتزاج تھا۔ وہ صرف ایک عالمِ دین نہیں تھے بلکہ اپنے علم کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والے باکردار انسان بھی تھے۔ ان کی زندگی اس حقیقت کی عملی مثال تھی کہ حقیقی علم وہی ہے جو انسان کے کردار اور عمل میں نظر آئے۔ اسی لیے ان کی مجلس اور درس گاہ میں صرف علمی گفتگو ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ طلبہ ان کی زندگی کے انداز سے بھی بہت کچھ سیکھتے تھے۔ ان کی سادگی، اخلاص اور دینی وابستگی طلبہ کے لیے ایک عملی نمونہ تھی۔ ان کا تدریسی انداز محض کتابی معلومات تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ تعلیم کو عملی تربیت اور اخلاقی اصلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے طلبہ کو صرف درسی مواد نہیں پڑھاتے تھے بلکہ انھیں زندگی کے اصول اور دینی اقدار بھی سکھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد صرف علم حاصل کرنے والے طالب علم نہیں بلکہ کردار اور عمل کے اعتبار سے بھی نمایاں افراد بن کر سامنے آئے۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد آج مختلف شعبے میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہے اور اپنے استاد کی علمی عظمت اور اخلاقی تربیت کو فخر کے ساتھ یاد کرتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا

ہے کہ مولانا کی اصل میراث ان کے وہ شاگرد ہیں جو آج بھی ان کے علم و عمل کے چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عالم دین اور شفیق استاد کی عظمت کی معراج ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو ان کا ادبی ذوق اور شاعرانہ صلاحیت بھی ہے۔ وہ اردو زبان و ادب سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور شاعری کو اپنے احساسات اور افکار کے اظہار کا ذریعہ بناتے تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کی نمایاں شعری اصناف حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی اور قطعہ جیسی اہم صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنے فکری نکات کو مختلف اسالیب میں پیش کیا۔ ان متنوع اصناف کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی مترشّح ہوتی ہے کہ موضوعاتی اعتبار سے ان کی شاعری محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ اس میں فکری گہرائی اور روحانی احساسات بھی موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس انداز اور جس رویے کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ دلوں کو کھینچتا ہے۔ جسم میں ایک حرارت محسوس ہوتی ہے، اور ذہن غور و فکر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمانے کے نشیب و فراز کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور اقدارِ حیات کے رموز و نکات پر وہ شاعرانہ انداز میں ایک بلیغ گفتگو کر رہے ہیں۔ صوفیانہ رنگ اور زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کی جھلک ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر فیضان حیدر:

> ''والد کی شاعری ان کے باطنی جذبات و احساسات کی ترجمان تھی۔ ان کے اشعار میں مذہبی احساسات، اخلاقی اقدار اور انسانی ہمدردی کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ نعتیہ اور منقبتی شاعری میں ایک مخصوص روحانی کیف پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے اشعار سادہ، مترنم اور پر اثر ہوتے تھے جو سننے والے کو فرحت و انبساط عطا کرتے تھے۔''

گویا مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری مصنوعی اظہار یا محض لفظی صنعت گری کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک ایسے دل کی آواز ہے جو دینی عقیدت، انسانی درد اور روحانی واردات سے سرشار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں خلوص، سادگی اور تاثیر کا ایسا امتزاج نظر آتا ہے جو قاری اور سامع دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی میں عقیدت، محبت اور ادب سے بھرپور یہ شعر دیکھیے ؎

آساں نہیں توصیف رقم کرنا مرے آقا کی ارشادؔ
جب خونِ جگر کو صرف کرو تب نعت بنائی جاتی ہے
ارشادؔ رب کہ رحمۃٌ للعالمین ہے

مرکز ہے جس کا قلب شفا کے نزول کا

یہ دونوں اشعار نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت کا پر خلوص بیانیہ ہیں۔ روحانی سوز سے بھرپور اس شعر میں خون جگر کے استعارہ نے شعر میں روح پھونک دی ہے۔ واضح رہے کہ کسی بھی بڑی تخلیق کی بنیاد دل کی گہرائیوں میں اٹھنے والی سچی تڑپ ہوتی ہے۔ جب شاعر اپنے تجربات، درد، فکر اور جذبے کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے تو وہ کیفیت 'خونِ جگر' طلب کرتی ہے۔ یعنی داخلی درد اور سوز کے علاوہ دل کی گہرائی سے پیدا ہونے والا وہ احساس جو بحر بیکراں ہوتا ہے۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کے نعتیہ کلام میں خون جگر کی شدّت انتہا کو پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عشق رسول سے عقیدت کے اظہار کے لیے یہ واجب بھی ہے۔

مریض عشق احمد ہوں فقیری ہے مری دولت
مسیحا بن کے رہزن پاس میرے بارہا آئے

اور یہ شعر بھی دیکھیے۔

وہ روح تزکیہ و پیکر صدق صفا آئے
پئے کردار سازی دہر میں خیرالوریٰ آئے
دریکتا کی مدحت میں مرے اشعار موتی ہیں
کہ ہے قرطاس پر اک کہکشاں بدرالدجی آئے

ان اشعار کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کی روحانی وابستگی، اخلاصِ عقیدت اور صوفیانہ فکر نمایاں طور پر جلوہ گر ہیں۔ انھوں نے نہایت سادہ مگر موثر انداز میں یہ پیغام دیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وثناوہی شخص صحیح طور پر کر سکتا ہے جس کے دل میں سچا عشق اور روحانی سوز موجود ہو۔ یہی کیفیت نعتیہ شاعری کو تاثیر اور روحانیت عطا کرتی ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی غزلیہ شاعری بھی فن اور فکر کے اعتبار سے اس قول کی تشریح کرتی ہے کہ ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔'' میرا ماننا ہے کہ غزل کی شاعری ارادتاً نہیں کی جا سکتی۔ یہ تخیل کے لہروں سے وجود میں آتی ہے۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کی غزلیہ شاعری میں ان لہروں کی بلند آہنگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے تخیل کی لہروں کی بلند آہنگی کی اول خصوصیت یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ ایسی روداد کی طرح محسوس ہوتی ہے جیسے کوئی شخص پس دیوار بیٹھ کر اپنی باتیں سنا رہا ہو۔

سوچا کہ جان دے دوں محبت کے نام پر مرکر بھی گر سکون نہ آئے تو کیا کروں
مار دیتا جو ہمیں زیر قفس اچھا تھا بال و پر توڑ کے صیاد نے آزاد کیا
عکس تیرا جو نظر آتا ہے آئینے میں مضطرب ہو کے میں سیماب کو تڑپاؤں گا

مولانا ارشاد حسین معروفی چوں کہ ایک جید عالمِ دین اور پیشے سے استاد تھے، اس لیے ان کی شاعری میں دینی رموز و نکات اور صوفیانہ افکار کی جھلک نمایاں طور پر ملتی ہے۔ ان کے بہت سے اشعار روحانیت اور عرفانی مضامین سے مزین ہیں۔ ان کے صوفیانہ اشعار میں عشق الٰہی، ذکر و فکر، ریاضت اور روحانی سفر جیسے تصوف کے بنیادی عناصر علامتی اور استعاراتی انداز میں بڑے توازن کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر صوفیانہ روایت میں ذکر الٰہی کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے ذاکر کو ایک ایسی قوت حاصل ہوتی ہے جو اس کی تنہائی اور باطنی اضطراب کو ختم کر کے اسے ایک روحانی سکون دیتی ہے۔ اس صوفیانہ روایت کو مولانا ارشاد حسین معروفی نے نہایت سلیس انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً ؎

کیوں بھلا ڈستیں مجھے تنہائیاں
ساتھ تیری یاد کا لشکر جو تھا
ظلمتیں کافور ہوکر رہ گئیں
پاس میرے نور کا پیکر جو تھا

مجنوں اور فرہاد اردو شاعری کے معروف عشقیہ استعارے ہیں۔ لیکن تصوف یعنی عشق حقیقی کے بیان میں شعرا اسے شدید عشق، ریاضت اور جاں نثاری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس روایت کو مولانا نے بھی بہت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے ؎

تھی کبھی بے خبری اور کبھی کوہ کنی
اس نے ہم کو کبھی مجنوں کبھی فرہاد کیا
سوزش عشق سے جو شمع کو جلتے دیکھا
آرزو جلنے کی پیدا ہوئی پروانے میں

اس طرح کے اور بھی اشعار ہیں جن میں تصوف کے رموز و نکات کو مولانا نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں صوفیانہ شاعری محض رسمی مذہبی اظہار نہیں ہے بلکہ ایک باطنی تجربے کی ترجمان ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری ایک پاکیزہ احساس کے ساتھ دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ ایک نکتہ اور قابل غور ہے کہ تصوف میں روحانی کیفیت کے اظہار کے لیے موزوں الفاظ اگر استعمال نہ کیے جائیں تو وہ چیستاں

بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آخر شاعر کہنا کیا چاہتا ہے۔ اس مشکل اور دشوار مرحلے کو مولانا ارشاد حسین معروفی اردو اور فارسی کے معروف استعارے، علامتیں اور تلمیحات کا استعمال کرتے ہوئے آسانی سے طے کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی صوفیانہ شاعری سادگی کے ساتھ تصوف کی لطافت اور فکری گہرائی کا خوب صورت نمونہ پیش کرتی ہے اور قاری کو غور و فکر کی طرف مائل کرتی ہے۔

ارشاد حسین معروفی کے یہاں اگر ایک طرف صوفیانہ مستی اور فقر کی دنیا آباد دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف عصری مسائل کے مضامین بھی بڑی خوب صورتی سے ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ ایک شاعر اپنے زمانے کا نباض ہوتا ہے۔ جس زمانے سے مولانا ارشاد حسین معروفی کا واسطہ رہا اس میں انسان جدید مشینی دور کی گہما گہمی میں ایک گم شدہ ہندسہ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں ؎

ارشادؔ نے جھیلی ہے کچھ ایسی گزرگاہیں
جن راہوں پہ چل پڑنا آسان نہیں ہوتا

یہاں مشکلات سے بھری زندگی صرف ایک شاعر کا المیہ نہیں ہے بلکہ انسان اور انسانیت کا مسئلہ ہے۔ اس شعر میں معاصر زندگی کی تلخیاں جس انداز سے جھانکتی نظر آتی ہیں اس بات پر دال ہے کہ مولانا ارشاد حسین معروفی معاصر زندگی سے بیگانہ محض نہیں بلکہ آزار میں مبتلا ہونے کے باوجود جو عرق انھوں نے کشید کیا ہے، وہ دراصل زندگی اور اس کی اقدار کا محاسبہ پیش کرتا ہے ؎

جب آ گئی قسمت میں ناکامی و محرومی
تو اس کو بھلا دینا آسان نہیں ہوتا
کانٹوں کا سفر ہم نے طے کر تو لیا لیکن
زخموں کا مگر بھرنا آسان نہیں ہوتا

مجموعی طور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری محض تصوف یا مذہبی مضامین تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی وہ اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے اشعار میں اخلاقی اقدار، انسانی ہمدردی اور اصلاحِ معاشرہ کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری پیغام بھی رکھتی ہے، جو قاری کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ اسے سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔

☆☆☆

سلطان آزاد
پنولین، پٹنہ، رابطہ نمبر:8789934730

علم و ادب کا نیّر تاباں: ارشاد حسین معروفی

تلخیص:
مولانا ارشاد حسین معروفی ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو موضع پورہ معروف، ضلع مئو (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ نسبتاً ایک غیر معروف خانوادے میں پیدا ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی علمی قابلیت اور تدریسی خدمات کے ذریعے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے علاقے کو بھی علمی شناخت عطا کی۔ انھوں نے جامعہ ناظمیہ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب اور دیگر متعدد دینی و ادبی اسناد حاصل کیں اور عربی، فارسی اور اردو علوم میں گہری مہارت حاصل کی۔
مولانا ایک کامیاب معلم اور مربی کی حیثیت سے تقریباً پانچ دہائیوں تک درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کی تدریسی خصوصیت صرف نصابی تعلیم تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ طلبہ کی ذہنی و اخلاقی تربیت کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی تربیت کا اثر ان کے شاگردوں کے ساتھ ان کے صاحبزادگان میں بھی نمایاں ہے، جو مختلف علمی و ادبی میدانوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔
مولانا ارشاد حسین معروفی ایک باوقار عالم کے ساتھ صاحبِ طرز شاعر اور ادیب بھی تھے۔ انھوں نے دینی و ادبی موضوعات پر کئی اہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں فلسفۂ توحید، افادیتِ نماز، افادیتِ روزہ اور بلاغتِ قرآن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری میں حمد، نعت، سلام اور غزل سبھی اصناف شامل ہیں۔ خاص طور پر ان کی نعتیہ شاعری میں عشقِ رسولؐ، فکری پاکیزگی اور جمالیاتی حسن نمایاں نظر آتا ہے، جب کہ غزلوں میں زندگی کے تجربات، سماجی مسائل اور اخلاقی اقدار کی عکاسی ملتی ہے۔
۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا، مگر ان کی علمی و ادبی خدمات، کتابوں اور شاگردوں کی صورت میں روشن چراغ کی طرح آج بھی زندہ ہیں اور آئندہ نسلوں کو رہنمائی فراہم کرتی رہیں گی۔

کلیدی الفاظ:
مولانا ارشاد حسین معروفی، سوانح حیات، درس و تدریس، دینی و ادبی خدمات، نعتیہ شاعری، غزلیہ شاعری، اسلامی و ادبی تصانیف، علمی تربیت۔

باوقار شخصیتیں بالخصوص علم و ادب اور درس و تدریس سے تعلق کی شمعِ حیات اگر چہ ایک معینہ وقت پورا کرنے کے بعد بہ ظاہر تو گُل ہو جاتی ہیں لیکن اس شمعِ علم و ادب سے مختلف شمعیں روشن ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی باوقار علم و ادب اور درس و تدریس سے تعلق رکھنے والی شخصیت جو بہ یک وقت مدبر، معلم، مدرس، بزم تدریس ادب و ادبیات کے ماہر، شاعر و ادیب حضرت مولانا ارشاد حسین معروفی ہیں۔ حضرت مولانا ارشاد حسین معروفی کی مختصر سوانح اس طرح ہے:

''جناب ارشاد حسین ابن محمد شمس الدین، ابن محمد سلیمان کربلائی کی پیدائش ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو موضع پورہ معروف مئو (یوپی) کے ایک غیر معروف خانوادہ میں ہوئی۔ مگر اپنے علم و فضل کی بنا پر خود بھی معروف ہوئے اور اپنے آبائی موضع کو بھی علم و معرفت سے معروف بنا دیا۔''

اپنے تعلیمی سفر میں جامعہ ناظمیہ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضل معقولات، فاضل دینیات اور ممتاز الافضل کی اسناد حاصل کیں۔ علاوہ ازیں صرف و نحو، منطق و فلسفہ، عروض و بلاغت، فقہ و اصول، کلام و تفسیر، حدیث و رجال میں کافی حد تک نبوغ اور مہارت رکھتے تھے۔ تصریح الافلاک کے دانائے روزگار، ادبیات اردو کے علاوہ عربی و فارسی میں یگانہ عصر، فنون لطیفہ اور شعر و شاعری میں خاصی دسترس رکھتے تھے۔ ارشاد حسین معروفی بحیثیت مدرس و معلم کافی مشہور و معروف رہے۔ ان کے درس و تدریس کی خوش اسلوبی کا ذکر ان کے صاحبزادے ڈاکٹر فیضان حیدر اپنے تجربے کی بنا پر اس طرح کرتے ہیں:

''میں چھٹی کلاس میں جب پہلی بار باقاعدہ طور پر ان کے درس میں شریک ہوا تو علم کے ساتھ ان کے لہجے کی مٹھاس اور زبان کی سادگی دل کو چھو گئی۔ وہ محض پڑھاتے نہیں تھے بلکہ قلوب و اذہان کو سنوارتے اور علم کو عملی صورت میں اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔'' (بحوالہ: 'پھول مرجھا گیا، خوش بو کا سفر جاری ہے'، ڈاکٹر فیضان حیدر، مشمولہ: آہ! استاذ الاساتذہ، ترتیب و تدوین از طرف شعبۂ نشر و اشاعت، جامعہ حیدریہ مدینۃ العلوم، خیر آباد، مئو، یو۔پی، ۲۰۲۵ء)

حقیقت یہ ہے کہ اصل استاذ صرف درس نہیں دیتا بلکہ اپنے طلبہ کی ذہنی تربیت بھی کرتا ہے جس کی بنا پر وہ طلبہ وطالبات اپنے وقت میں ماہر علم وادب ہوجاتے ہیں اور اس کی شروعات ہر مدرس ومعلم اپنے گھر سے کرتا ہے جس کی کامیاب مثال ان کے تین صاحبزدگان ہیں۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر ذیشان حیدر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے لکھنؤ کیمپس میں فارسی زبان وادب کے استاذ اور کئی کتابوں کے مصنف ومولف ہیں۔ دوسرے صاحبزادے سلمان حیدر جو سرکاری اسکول میں مدرس ہیں جب کہ چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر فیضان حیدرسی۔ ایم کالج، دربھنگہ میں فارسی کے استاذ اور رسالہ سہ ماہی فیضان ادب (مئو) کے مدیر اور کئی علمی وادبی کتابوں کے مصنف ومولف ہیں۔ مولانا نے نہ صرف صاحبزادوں کی تعلیم وتربیت کی اور ان کو کامیاب بنایا بلکہ اپنی دو صاحبزادیوں کو بھی علم وادب سے آراستہ کیا۔ اس طرح ان کے شاگردوں کی فہرست طولانی ہے جو ہر زمانے میں شمع کی طرح روشن اور تابناک رہے گی۔

مولانا ارشاد حسین بہ ذات خود ادیب وشاعر بھی ہیں۔ دینی خدمات میں درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف میں بھی دلچسپی رہی جس کے باعث کئی کتابیں مثلاً فلسفۂ توحید، افادیت نماز، افادیت روزہ اور علوم القرآن جیسی علمی ودینی تصنیفات پیش کیں۔ دینی مضامین کے علاوہ علمی وادبی مضامین مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔ خصوصی طور پر 'امام خمینی کی شاعری میں عشق وعرفان' کے عنوانات سے بارہ قسطوں میں مضامین لکھے جن میں سے کچھ مضامین رسالہ فیضان ادب (مئو) کے گزشتہ شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ بیسیوں کتابوں پر تقاریظ لکھیں اور کئی علمی ومذہبی مضامین لکھے جو مختلف دینی رسائل جیسے الواعظ، اصلاح، تنظیم المکاتب وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کے ترجمے کا کام بھی شروع کیا تھا جو نامکمل رہ گیا۔ مختصر یہ کہ مولانا ارشاد حسین ممتاز عالم دین کے ساتھ بہ اخلاق، اپنی شرافت، سادگی، اخلاص اور متانت کی وجہ سے تمام لوگوں میں محترم سمجھے جاتے تھے۔ ان کی مذہبی اور تدریسی خدمات کا دائرہ کم وبیش پانچ دہائیوں پر محیط ہے۔ ان کے بیشتر شاگرد ملک کے تمام علاقوں میں علم وادب کی شمعیں روشن کیے ہوئے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین ایک اہم شاعر بھی رہے ہیں۔ ان کے صاحبزادوں کی اطلاع کے مطابق انھوں نے تقریباً سو غزلیں، بیس کے آس پاس حمد ونعت اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں منقبت وسلام بھی کہے ہیں۔ جن میں کچھ غزلیں اور نعت شریف رسالہ فیضان ادب، مئو کے گزشتہ شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا ارشاد حسین کی نعتیہ شاعری پر اظہار خیال سے قبل، نعت شریف کے متعلق چند سطور عرض ہے کہ 'نعت' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مدح، ثنا، تعریف وتوصیف ہیں۔ یہ صنف حضور اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کی مدح اور تعریف کی مظہر ہے۔ گویا اس صنف یا ہیئت میں سرورِ کائناتؐ کے شمائل، فضائل، خصائل، احوال وکوائف اور معراج کے واقعات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا ارشاد حسین کی نعتیہ شاعری کا مطالعہ کریں تو معنی آفرینی اور عشق کی لالہ کاری دونوں کی بہاریں ایک ساتھ ملتی ہیں۔ انھوں نے طہارتِ فکر کو جمالیاتی عشق اور جمالیاتی عشق کو طہارتِ فکر سے الگ ہونے نہیں دیا۔ آپ کی نعتیہ شاعری میں پُرشکوہ زبان، قوتِ تخیل، استعارہ کی ندرت، خوب صورت تشبیہات، صداقت کی بہار اور پاکیزہ جذبے کا اظہار بدرجہ اتم موجود ہے۔ گویا ایک خوش فکر اور خوش نوا فقیر کی حیثیت سے انھوں نے نعتیہ شاعری پر ایک خوش گوار اثرات مرتب کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ان کے چند نعتیہ اشعار ؎

جو نعت پاک کا دنیا میں کام کرتے ہیں — وہ پُر شرابِ محبت سے جام کرتے ہیں
کسی چمن کی طرف سے اگر گزر ہو جائے — درخت آپ کو جھک کر سلام کرتے ہیں
ہے کلمہ گویوں میں شامل جماد بھی ارشادؔ — نبیؐ کے ہاتھ پہ پتھر کلام کرتے ہیں

یہ نعتیہ اشعار اپنی سادگی، سلاست اور جذبۂ عقیدت کی بدولت نہایت دل نشیں اور اثر انگیز محسوس ہوتے ہیں، جن میں محبت رسولؐ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہی جذبہ پورے کلام میں روحانی فضا قائم رکھتا ہے۔ شاعر نے نہایت رواں اور فطری انداز میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو نہ صرف آسانی سے سمجھ میں آتے ہیں بلکہ دل پر براہِ راست اثر بھی ڈالتے ہیں، جس سے کلام میں ایک خاص کشش اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے، اس کے ساتھ اشعار میں خوب صورت پیکر تراشی (Imagery) بھی موجود ہے جو قاری کے ذہن میں روحانیت سے بھرپور مناظر ابھارتی ہے اور کلام کو فقط الفاظ کا مجموعہ نہیں رہنے دیتی بلکہ ایک محسوس کی جانے والی کیفیت میں بدل دیتی ہے۔ مزید برآں شاعر کا حسنِ تخیل اس بات میں نمایاں ہے کہ وہ عام اشیا اور مظاہر کو بھی ایک غیر معمولی معنویت اور تقدس عطا کرتا ہے، جس سے کلام میں جدت اور تازگی پیدا ہوتی ہے، زبان کی سادگی کے باوجود معنویت اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر اپنے فن پر مکمل عبور رکھتا ہے اور کم الفاظ میں زیادہ اثر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اشعار نہ صرف فنی اعتبار سے مضبوط ہیں بلکہ اپنے اندر ایسی روحانی تاثیر بھی رکھتے ہیں جو قارئین کے دل میں احترام، محبت اور عقیدت کے جذبات کو مزید مضبوط کر دیتی ہے۔ اسی طرح یہ اشعار دیکھیے ؎

عشق خیرالبشر اگر لکھنا — ان کی معراج کا سفر لکھنا
جس سے عاجز جہاں ہے اس کی ثنا ..... چاہتا ہے یہ بے خبر لکھنا

ترقیات سے سمجھو مسافتِ معراج وہ ایک پل میں فلک سے زمیں پہ آتا ہے
کیے ہیں ایک اشارے میں چاند کے ٹکڑے کلام پاک میں یہ صاف صاف لکھا ہے
لعاب ڈال دیا جب کنویں میں آقا نے یہ معجزہ ہے کہ شفاف آب نکلا ہے
خدا کا حکم نہ جب تک اسے ملے ارشادؔ ..... مرا رسولؐ کہاں کچھ کلام کرتا ہے

نور خدا بھی، مطلعِ انوار بھی یہی ..... دنیا میں ہر طرف ہے اجالا رسولؐ کا
آ گیا آمنہ کی گود میں اک پارۂ نور ..... عرش والے بھی ضیا پانے چلے آتے ہیں
سر خم کرو تعظیم سے، اکڑو نہ یہاں پر یہ سوچ کے آؤ کہ پیمبر کی گلی ہے

مندرجہ بالا اشعار اپنی تمام تر فکری وسعتوں، فنّی نفاستوں اور ادبی لطافتوں کے ساتھ ذہن و روح کو کیفیت عشق سے یکبارگی متاثر کرتے ہیں۔ یہ ان کی صلاحیتوں کے غماز ہیں۔

'سلام' اردو کی رثائی شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔ رثائی ادب میں سلام کی ہیئت غزل کی طرح ہے اور سلام میں اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کے علاوہ رسول اکرمؐ، ائمہ کرام، اہل بیت اطہار کے حالات و واقعات پر بھی اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ عموماً سلام میں رثائیت کا اظہار، اظہار عقیدت ہے۔ مولانا ارشاد حسین معروفی نے بھی اپنی رثائیت کا اظہار بشکلِ سلام پیش کیا ہے۔ مجھے ان کا صرف ایک سلام مطبوعہ 'فیضاب ادب'، اپریل تا دسمبر ۲۰۱۸ سے ملا ہے۔ اسی کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں ؎

کیسے لکھوں حالِ دل اس مادرِ دلگیر کا جس کا بچہ بن گیا رن میں نشانہ تیر کا
جیسا تھا مرنے کا جذبہ ہر جوان و پیر کا اس سے کچھ کم تھا نہ ہرگز ولولہ بے شیر کا
اک صحابی سن کے بولے کیا قیامت آ گئی باپ کے لہجے میں خطبہ زینبؑ دلگیر کا
مدحتِ آلِ پیمبر میں اٹھاتا ہے قلم باغِ جنت ہے صلہ ارشادؔ کی تحریر کا

اردو میں غزلیہ شاعری اپنی فکری و معنوی اصالت کے باعث ہمیشہ ممتاز اور سرفراز رہی ہے۔ غزل کا ہر شعر معنوی وحدت کا مظہر ہوتا ہے۔ بشرطیکہ معنویت یا شعریت کے اصولِ تخلیقیہ سے ہم رشتگی رکھتا ہو۔ ارشاد حسین نے بھی غزلیہ شاعری میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ خوب خوب طبع آزمائی کی۔ انھوں نے غزلیہ شاعری عام شاعروں کی طرح نہیں کی بلکہ بامقصد شاعری کی ہے۔ زندگی کو احساس کی شدت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بخوبی واقف ہیں کہ غزلیہ شاعری احساس کی شدت کا اظہار ہے۔ یہی احساس الفاظ کا انتخاب، ترکیب الفاظ کا حُسن پیدا کرتا ہے اور کلام کو موثر بناتا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری اس تناظر میں اسی

گہرے مشاہدے کی عکاسی کرتی ہے، جس کے اظہار کے لیے وہ کبھی اشارات و کنایات کی زبان استعمال کرتے ہیں اور کبھی تشبیہات و استعارات کی۔ کبھی مفہوم واضح اور عیاں ہوتا ہے تو کبھی پنہاں اور تہ دار۔ ان کی شاعری میں تنوع کی کثرت ہے۔ مختصر یہ کہ وہ خوش گو، خوش فکر اور نئے لہجے اور نئی آواز کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں کلاسیکی پاسداری کے ساتھ جدّت طرازی بھی ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کی غزلیہ شاعری کے چند اشعار ؎

جرأتوں کے قافلے آگے بڑھے میں رکا تھا، میل کا پتھر جو تھا
ظلمتیں کافور ہوکر رہ گئیں پاس میرے نور کا پیکر جو تھا

.....

جب مشکلیں پڑتی ہیں مایوس نہیں ہوتے شب بھر تری یادوں کے ہم دیپ جلاتے ہیں
ارشادؔ نے جو چھوڑے ہیں نقش زمانے میں ہر طالب منزل کو وہ راہ دکھاتے ہیں

.....

کیسا ہے حالات کا ظلم و ستم مصلحت میں کھوگئیں نزدیکیاں

.....

نہیں خاموش استقرارِ گریہ پگھلتا ہے ابھی کہسارِ گریہ
ترے قطرات جو آنکھوں سے ٹپکے جواہر ہیں کہ ہیں شہکارِ گریہ
جب آنکھیں ڈبڈبا اٹھی ہیں ارشادؔ سمندر ہیں کہ گوہر بارِ گریہ

.....

کچھ درد محبت کا، کچھ خوف زمانے کا اوسان بجا رکھنا آسان نہیں ہوتا
جب آگئی قسمت میں ناکامی و محرومی تو اس کو بھلا دینا آسان نہیں ہوتا

.....

احسن الخلوق جب کوئی نہ ہو پھر تو یہ سارا جہاں کچھ بھی نہیں
چاہے وہ نمرود ہو شداد ہو اب کہیں ان کا نشاں کچھ بھی نہیں
حق پرستی کربلا سے سیکھ لو سامنے تیر و سناں کچھ بھی نہیں

اب جناب والا کی ایک مکمل غزل ملاحظہ ہو جو درحقیقت ان کی 'آپ بیتی' یا خودنوشت سمجھیں جو انھوں نے صفحہ قرطاس میں بشکل غزل پیش کی ہے۔ وہ ان کی پوری زندگی کا عکس ہے، جس میں ان کے تجربات و مشاہدات کے ساتھ دوسروں کے لیے راہ نمائی بھی ہے ؎

نوجوانی کتاب میں گزری شکرِ رب ہے ثواب میں گزری
درس سے عشق تھا زمانے میں کچھ نہ کلفت شباب میں گزری

وقت ایسا بھی آ گیا مجھ پر زندگی تھی عذاب میں گزری
چھوٹے بچوں سے جب ملی فرصت تب وہ اونچے نصاب میں گزری
کتنے نکتوں میں درس کی ساعت بس سوال و جواب میں گزری
جب بھی اٹھا مطالعے کے لیے تیری صورت کتاب میں گزری
لمحہ لمحہ تلاشِ آب میں تھا عمر ساری سراب میں گزری
زندگی تھی کہ اک کہانی تھی محفل شیخ و شاب میں گزری
اب جو بیدار ہوں تو کیا حاصل زندگی جب کہ خواب میں گزری
کربلا سے تھی مستعار حیات ظالموں سے حساب میں گزری
یاد چھوڑی جو نسل نو کے لیے وہ قیامت کے باب میں گزری
عمرِ آخر بھی تیری اے ارشادؔ خوب درسِ کتاب میں گزری

مندرجہ بالا اشعارِ غزلیہ سے ظاہر ہے کہ ان میں تنوع بھی ہے اور تخیل بھی۔ یہ سماجی زندگی سے متعلق شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں اور عصری مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے وقت کے مسائل کو جس انداز سے موضوعِ سخن بنایا وہ ان ہی کا حصہ ہے اور انھوں نے جس ہنرمندی سے پیش کیا، جس سے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ قاری ان کی شاعری میں غزل کے فن کو بھی دیکھتا ہے اور وقت کے تقاضوں کو بھی۔

اگرچہ مولانا ارشاد حسین معروفی ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو اس دنیائے فانی سے نکل کر حقیقی مالک سے جا ملے۔ گویا ایک علم و ادب کا نیّر تاباں ہم لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا، مگر جو علم و ادب کی شمع انھوں نے روشن کی تھی وہ ان کے شاگردوں میں آج بھی روشن ہے اور انشاء اللہ آگے بھی چراغ در چراغ جلانے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہناز انجم
پنجاب ایجوکیشن، کریکولم، ٹریننگ اینڈ اسسمنٹ اتھارٹی، ایچ/۹، اسلام آباد، رابطہ نمبر: +923315982145

مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری

(حمد، نعت اور غزل کا فکری و فنی مطالعہ)

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری اپنی دینی، تہذیبی اور لسانی روایت سے گہرے ربط کی حامل ہے، تاہم وہ صرف تقلید پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ روایت کے اندر رہتے ہوئے نئے اظہاری امکانات کی جستجو کرتے ہیں۔ حمدیہ شاعری میں اُن کا اسلوب جذباتی وابستگی کے ساتھ ساتھ علمِ کلام اور فلسفیانہ مباحث کو شعری قالب میں ڈھال کر ایک معرفتی جہت پیدا کرتا ہے۔ آپ قرآنی تلمیحات، نور کے استعارے اور کائناتی مظاہر کے ذریعے سے قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ نعتیہ شاعری میں کلاسیکی علامات جیسے شمع و پروانہ اور مے و پیمانہ کو تخلیقی انداز میں برت کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کو مرکزِ کشش و نور کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لسانی سطح پر آپ کی شاعری میں عربی و فارسی کے اثرات نمایاں ہیں۔ کم مستعمل الفاظ اور نئی تراکیب کے ذریعے اپنے اُسلوب کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ غزل میں اُن کے یہاں داخلی کرب، یاد، نور اور گریہ جیسے موضوعات کو جمالیاتی اور فکری سطح پر اِس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ رُوحانی تجربے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری میں فکر، جذبے اور فن کا ایک متوازن اِمتزاج موجود ہے، جو نہ صرف روایت کی پاس داری کرتا ہے بلکہ عہدِ حاضر کے تناظر میں نئی معنویت بھی پیدا کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین معروفی، حمد، نعت، غزل، فکری و فنی مطالعہ، علمِ کلام، قرآنی تلمیحات، کلاسیکی استعارات، لسانی تجربہ، روایت و جدّت، نور کا استعارہ، جمالیاتی شعور۔

مولانا ارشاد حسین معروفی ۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پورہ معروف ضلع مئو (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔آپ کا تعلق اپنی تہذیبی رِوایت کے ساتھ ساتھ دینی روایت سے بھی بہت مضبوط ہے۔ترجمہ، تفسیر اور تاریخ کے مختلف فکری کوچوں کی خاک چھاننے کے باوجود آپ نے تخلیق شعر اور حمد ونعت کی وادی میں بھی بخوبی قدم رکھا۔

آپ نے جو علمی وادبی سرمایہ چھوڑا ہے، اُس میں غزلیں، حمدیں، نعتیں اور مناقب کے علاوہ امام خمینی کی شاعری میں عشق وعرفان کے نام سے مضمون کی بارہ قسطیں بھی شامل ہیں۔اِن میں سے کچھ قسطیں سہ ماہی 'فیضانِ ادب' کے گزشتہ شماروں چھپ چکی ہیں۔

مولانا ارشاد حسین کی شاعری کا ایک انتخاب 'فیضان ادب' میں شائع ہوگا جس کا مسودہ میرے پیش نظر ہے۔اِس انتخاب کے شروع میں حمدیہ ونعتیہ کلام نیز مناجات نے مجھے خاصا متوجہ کیا۔گزشتہ نصف صدی میں نعتیہ شاعری نے جس وسعت، رنگارنگی اور فنی تنوع کا مشاہدہ کیا ہے، اُس نے اِس صنف کو نہایت زرخیز بنا دیا ہے۔مختلف شعرا نے کلاسیکی استعاروں، نئی بحور اور متنوع ردیفوں اور قوافی کے ذریعے سے ثنائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو نئے آہنگ عطا کیے، مگر اِس وسعت کے ساتھ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جہاں مضامین کی تکرار اور اِظہار کی یکسانی کا احساس اُبھرنے لگا۔ایسے میں ارشاد حسین معروفی کی آواز نسیمِ تازہ کے جھونکے کی مانند محسوس ہوتی ہے، جو روایت کے احترام کے ساتھ نئے اظہاری امکانات کی جستجو کرتی نظر آتی ہے۔مولانا کی حمدیہ شاعری کا سب سے نمایاں وصف اُس کی فکری گہرائی اور موضوعاتی تنوع ہے۔وہ جذباتی وارفتگی اور دُعا ومناجات پر اکتفا کرنے کے بجائے حمد کو ایک معرفتی اور فلسفیانہ تجربہ بنا دیتے ہیں۔حمد کے یہ اشعار دیکھیے ؎

کلیمِ طور کے جلوے کا تار ختم نہ ہو
یہ نورِ ارض و سما کا وقار ختم نہ ہو
وجود واجبِ ذاتی کی ذات کے صدقے
وجوبِ غیر کا بھی اضطرار ختم نہ ہو
شناخت اس کی ہے ممکن دلیل اِنّی سے
اثر کے ساتھ موثّر کا پیار ختم نہ ہو
بس ایک ذرہ ہے ارشادؔ اس کی خلقت کا
یہ مہرو ماہ کا سب کاروبار ختم نہ ہو ا ؎

پہلے شعر میں واقعۂ طور کی تلمیح نورِ الٰہی کے تسلسل کی علامت بن جاتی ہے، جب کہ دوسرے شعر میں 'وجودِ واجب ذاتی'، 'وجوبِ غیر' اور 'دلیلِ اِنّی' جیسی اصطلاحات کے ذریعے وہ علمِ کلام کے دقیق مباحث کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے اپنی انفرادیت ثابت کرتے ہیں۔ اِس طرح ثنائے باری تعالیٰ کے ساتھ ادراکِ ذاتِ باری تعالیٰ کی جستجو شعر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مزید برآں 'خلقتِ ارض و سما' اور 'روز و شب کا اختلاف' جیسے مضامین قرآنی اُسلوبِ استفہامیہ کی بازگشت ہیں۔ یہ قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ یوں مولانا ارشاد حسین معروفی روایت، تلمیح اور فکری تازگی کو ایک ایسے توازن میں ڈھالتے ہیں جو کم ہی شعرا کے ہاں نظر آتا ہے۔ نعتیہ شاعری میں بھی ارشاد حسین معروفی کا اُسلوب اسی طرح وارفتگی اور شعور کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے ؎

عرش سے فرش پہ دیوانے چلے آتے ہیں
شمع جلتی ہے تو پروانے چلے آتے ہیں ۲؎

مُندرجۂ بالا شعر میں شمع و پروانہ کی کلاسیکی تمثیل کو ایک نئے تناظر میں برت کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذات کو مرکزِ نور اور مرکزِ کشش بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح ؎

آ گیا آمنہ کی گود میں اک پارۂ نور
عرش والے بھی ضیا پانے چلے آتے ہیں ۳؎

میں ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو نور کے استعارے میں پیش کر کے حدیثی روایت کی طرف لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآنی و تاریخی تلمیحات، یوسف و زلیخا، واقعۂ معراج، مباہلہ اور معجزاتِ نبوی کو شاعر نے اس مہارت سے شعری ساخت میں جذب کیا ہے کہ وہ معنوی وسعت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ آپ کے ہاں نور، شمع، پروانہ اور مے و پیمانہ جیسے استعارے روایت سے جڑے ہوئے ضرور ہیں، مگر اُن کا استعمال تخلیقی ہے، تقلیدی نہیں۔ مولانا ارشاد حسین معروفی چوں کہ عربی و فارسی پر گہری نگاہ اور دست رس رکھتے تھے، اِس لیے لسانی سطح پر بھی اُن کی شاعری میں اِن زبانوں کے کچھ الفاظ بالکل نئے انداز سے برتے ہوئے ملتے ہیں۔ مثالیں دیکھیے ؎

کرتا ہوں تذکرہ میں صداقت کے پھول کا
کس کو بھلا پسند ہے کانٹا ببول کا
چہرے پہ خاک اُڑتی ہے، حالت خراب ہے
کیوں ذکر ہو رہا ہے ابھی خم کی دھول کا

ذکرِ نبیؐ سے ہم کو بھی معراج مل گئی
شہرت میں کچھ گزر نہیں، ہرگز خمول کا ۴؎

اِن اشعار میں مولانا ارشاد حسین معروفی کی لسانی جرأت اور تخلیقی ندرت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ 'خم کی دھول' جیسی ترکیب ایک طرف کلاسیکی تہذیبی فضا (مے کدہ، خم) کی طرف اشارہ کرتی ہے تو دُوسری طرف اسے ایک نئے معنوی تناظر میں برت کر شاعر نے تہذیبی استعارے کو تازہ دلالت عطا کی ہے۔ اسی طرح 'خمول' جیسے نسبتاً کم مستعمل لفظ کو شعری پیکر میں اِس سلیقے سے شامل کرنا آپ کے علمی ذوق اور لسانی شعور کی پختگی کا ثبوت ہے۔ یہ تجربات اِس بات کی دلیل ہیں کہ آپ روایت سے وابستہ رہتے ہوئے بھی اظہار کے نئے در وا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس انتخاب میں غزلوں کا سرمایہ بھی موجود ہے۔ میدان غزل میں آ کر ارشاد حسین معروفی کی شاعری ایک اور جہت اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں داخلی کرب، جمالیاتی احساس اور فکری شعور باہم ایک ہو جاتے ہیں۔ مثالیں دیکھیے ؎

کیوں بھلا ڈستیں مجھے تنہائیاں ساتھ تیری یاد کا لشکر جو تھا
ظلمتیں کافور ہو کر رہ گئیں پاس میرے نور کا پیکر جو تھا ۵؎

اِن اشعار میں 'یاد' کو ایک فعال اور محافظ قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ 'لشکر' اور 'نور کا پیکر' جیسے استعارے داخلی کرب کو رُوحانی توانائی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اِس اُسلوب میں ہمیں روایت کی جھلک ملتی ہے، جہاں درد اور آگہی ایک دُوسرے میں تحلیل ہو کر نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔ اِسی طرح آنکھوں سے متعلق اشعار میں مولانا ارشاد معروفی کی تصویری اور حسی قوتِ اظہار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے ؎

خونِ دل کی طرح نمایاں ہے
سرخ ڈوروں کا تار آنکھوں میں
صرف مژگاں کے اک اشارے پر
ہو گیا دل شکار آنکھوں میں ۶؎

یہاں آنکھ، کائناتِ جذب و اثر کا مرکز بن کر کس قدر اہم مقام پا جاتی ہے۔ 'سرخ ڈوروں' کو 'خونِ دل' سے تشبیہ دینا اور 'مژگاں' کو شکار کا وسیلہ بنانا ایک باریک اور بلیغ فنی شعور کی علامت ہے۔ مولانا اِس میں ایک جدید حسّی شدت بھی شامل کرتے نظر آتے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کے یہاں گریہ کے مضمون کے حامل اشعار بھی ملتے ہیں۔ اِن اشعار میں شاعر اپنے داخلی تجربے کو ایک تخلیقی اور جمالیاتی سطح پر لے آتا ہے۔ مُندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

ترے قطرات جو آنکھوں سے ٹپکے جواہر ہیں کہ ہیں شہکارِ گریہ
جب آنکھیں ڈبڈبا اٹھی ہیں ارشادؔ سمندر ہیں کہ گوہر بار گریہ ؎

یہاں گریہ ایک جذباتی عمل بھی ہے اور ایک قیمتی اور تخلیقی جوہر بھی، آنسوؤں کو 'جواہر' اور 'سمندر' سے تشبیہ دینا اِس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کے نزدیک دُکھ ایک ایسی قوت ہے جو فن میں ڈھل کر قدر و قیمت اختیار کر لیتی ہے۔ حمد ہو یا نعت، مناجات ہوں یا غزل، مولانا ارشاد معروفی کی تخلیقی کائنات میں فکر، جذبہ اور فن ایک دُوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جلوہ گر ہوتے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین معروفی نے اپنی دینی، تہذیبی اور لسانی روایت سے ایک توانا اور زندہ رشتہ قائم رکھا ہے۔ عہدِ حاضر کی اِنحرافی فضا میں وہ خود رِوایت کی علامت بن کر اُبھرتے ہیں۔ آپ کی شاعری خواہ حمد ہو، نعت ہو، مناجات ہوں یا غزل، اِس امر کی روشن دلیل ہے کہ آپ نے فن اور پیغام کے تقاضوں کو نہایت قرینے اور خوش اُسلوبی سے برتا ہے۔ یہاں عقیدت، فکر اور جمالیات ایک دُوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں نہ تو فن کی نزاکت پر حرف آتا ہے اور نہ ہی حمد و نعت کا تقدس متاثر ہوتا ہے۔ یوں آپ کا کلام ایک ایسی خوش بو کی مانند ہے جو روایت کی مٹی سے اُٹھتی ہے، مگر اپنے عہد کی فضا کو بھی معطر کر دیتی ہے اور قاری کو احساس دلاتی ہے کہ سچی شاعری وہی ہے جو اپنے ماضی سے منسلک ہو اور حال کے دِل میں اُتر جائے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ سہ ماہی 'فیضانِ ادب'، اپریل تا ستمبر ۲۰۲۶ء، ادارۂ تحقیقات اُردُو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو یو، پی، ص ۴۳۲

۲۔ ایضاً، ص ۴۳۷ ۳۔ ایضاً، ص ۴۳۸
۴۔ ایضاً، ص ۴۳۶ ۵۔ ایضاً، ص ۴۴۷
۶۔ ایضاً، ص ۴۵۵ ۷۔ ایضاً، ص ۴۶۸

☆☆☆

مولانا مرغوب عالم
سمندپور، اعظم گڑھ، رابطہ نمبر: 8127062172

مولانا ارشاد حسین معروفی کا اسلوبِ تدریس اور شاعری

تلخیص:

استاذ العلاّم مولانا ارشاد حسین معروفی ان ممتاز شخصیات میں شامل تھے جنھوں نے علم کو فقط ذاتی سرمایہ نہیں بنایا بلکہ وہ علم کو طلبہ تک منتقل کرنے کا اعلیٰ فن بھی جانتے تھے۔ انھوں نے منصبِ تدریس کو ایک مقدس ذمہ داری سمجھ کر ادا کیا اور طلبہ کی علمی وفکری تربیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔

استادِ محترم علومِ عربیہ خصوصاً نحو، صرف، معانی و بیان، بلاغت اور عربی ادب وغیرہ میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ منطق، فلسفہ، تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے علوم میں بھی ان کا گہرا مطالعہ تھا۔ ان کی غیر معمولی یادداشت اور علمی وسعت نے انھیں ایک ممتاز عالم بنایا، لیکن ان کی اصل عظمت اسلوبِ تدریس میں تھی۔ وہ مشکل علمی مباحث کو نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کرتے تھے اور اپنی گفتگو کو ادبی مثالوں اور اشعار سے مزین کر دیتے تھے۔

ان کی تدریس میں سوال و جواب کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، جس سے طلبہ کی علمی وفکری صلاحیتوں کو جِلا ملتی تھی۔ وہ ذہین اور کمزور دونوں طرح کے طلبہ کو ساتھ لے کر چلتے اور ہر طالب علم کے اندر اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ سادہ طرزِ زندگی، قناعت، ہمدردی اور اخلاص ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ استادِ محترم ایک حساس شاعر بھی تھے جن کی شاعری میں فکری بالیدگی، جذباتی صداقت اور زبان کی نفاست پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں زندگی کے تجربات، روحانی احساسات اور معلمانہ بصیرت کی جھلک ملتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی زندگی تعلیم وتربیت اور خدمتِ خلق کی روشن مثال ہے اور ان کی علمی میراث آج بھی ان کے شاگردوں کے ذریعے زندہ ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین معروفی، اسلوبِ تدریس، دینی تعلیم و تربیت، علومِ عربیہ، طلبہ کی ذہن سازی، سادہ زیستی اور اخلاقی اقدار، معلم اور شاگرد کا تعلق، شاعری۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہر عالم معلّمِ کامل نہیں ہوتا۔ بعض افراد اپنی ذات میں علم و دانش کا ایسا خزانہ ہوتے ہیں کہ ان کے سینے میں معلومات کا سمندر موجزن ہوتا ہے، مگر ان کے اندر وہ صلاحیت نہیں ہوتی جو دوسروں کو باصلاحیت بنا سکے۔ وہ اپنے علم کی روشنی میں خود تو چراغ کی مانند روشن رہتے ہیں، مگر اس روشنی کو دوسروں کے دلوں تک منتقل کرنے کا ہنر ان کے پاس نہیں ہوتا۔ ایسے اہلِ علم اپنی ذات کی حد تک اگرچہ مفید ہوتے ہیں، لیکن قوم اور سماج کی تعمیر و ترقی میں ان کا کردار محدود رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک حقیقی استاد وہ ہے جو محض معلومات کا ذخیرہ نہ ہو بلکہ ذہنوں کا معمار ہو، جو اپنے علم کو سینے میں محفوظ رکھنے کے بجائے اسے دوسروں تک منتقل کرنے کا سلیقہ جانتا ہو اور اپنے شاگردوں کی فکری و علمی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا فن جانتا ہو۔

اس معیار پر اگر اساتذہ کی شخصیات کو پرکھا جائے تو استاذ العلّام مولانا ارشاد حسین معروفی کا نام ان معدودے چند اساتذہ میں شامل نظر آتا ہے جنھوں نے تدریس کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔ وہ صرف مسندِ تدریس پر بیٹھ کر درسی کتابوں کی تشریح کرنے والے استاد نہیں تھے بلکہ ذہن ساز اور معمار بھی تھے۔ ان کی شخصیت علم و دانش، فضل و کمال، تعلیم و تربیت اور اخلاق و معارف کا حسین مرقع تھی۔ ان کے درس میں علم کی روشنی بھی تھی اور تربیت کی حرارت بھی، فکر کی گہرائی بھی تھی اور اسلوبِ بیان کی دل کشی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی شخصیت نے نہ صرف اپنے عہد کے طلبہ کو متاثر کیا بلکہ ایک ایسا علمی سلسلہ قائم کیا جو آج بھی ان کے شاگردوں کے ذریعے جاری ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کو علومِ عربیہ میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ عربی گرامر، نحو، صرف، معانی و بیان، عروض و بلاغت اور عربی ادب میں ان کا مقام نہایت بلند تھا۔ ان علوم کی باریکیوں اور پیچیدگیوں پر انھیں کامل عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ منطق و فلسفہ، طب و حکمت، تفسیر و کلام، قرآن و حدیث اور فقہ و اصول جیسے علوم میں بھی انھیں قابلِ رشک مہارت حاصل تھی۔ علومِ متداولہ کی اصطلاحات اور بنیادی قواعد ان کے ذہن میں اس قدر مستحضر رہتے کہ اکثر ان کی وضاحت کے لیے کتاب کھولنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ مدرسہ بورڈ اور درسیات سے متعلق ایسی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس کے مضامین ان کے حافظے میں محفوظ نہ ہوں۔ ان کی یادداشت غیر معمولی تھی اور علمی مباحث کے دوران وہ بآسانی مختلف حوالوں اور اصطلاحات کو بیان کر دیتے تھے۔

ان کی عظمت کا اصل راز صرف علم کے وسیع ذخیرے میں نہیں بلکہ اس علم کو منتقل کرنے کے غیر معمولی فن میں پوشیدہ تھا۔ تدریس کے میدان میں ان کو اپنے ہم عصروں پر نمایاں برتری حاصل تھی۔ مشکل عبارت کو سلجھانے اور ادق مطالب کو آسان بنانے کا جو ملکہ ان کے پاس تھا وہ بہت کم اساتذہ میں پایا جاتا ہے۔ وہ پیچیدہ علمی مسائل کو نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کرتے تھے۔ ان کی تدریسی زبان شستہ، رواں اور آراستہ ہوتی تھی۔ نحوی اور صرفی باریکیوں کو وہ اس قدر سہل اور واضح انداز میں بیان کرتے کہ طالب علم کو مشکل سے مشکل مسئلہ بھی آسان محسوس ہونے لگتا۔

ان کے اسلوبِ تدریس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ خشک علمی گفتگو پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی گفتگو کو ادبی لطافتوں سے مزین کر دیتے تھے۔ موقع و محل کے مطابق اشعار سنانا، مناسب مثالیں پیش کرنا اور ادبی صنعتوں کے ذریعے مفہوم کو واضح کرنا ان کا خاص وطیرہ تھا۔ تشبیہ، استعارہ، لف ونشر مرتب وغیر مرتب، مراعاۃ النظیر اور صنعتِ طباق جیسی ادبی اصطلاحات کو وہ اس مہارت سے استعمال کرتے کہ طالب علم نہ صرف مسئلہ سمجھ لیتا بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتا۔

مولانا کے اندر ترسیلِ مطالب کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ تدریس کا مقصد صرف کتاب کا متن پڑھا دینا نہیں بلکہ طالب علم کے ذہن کو بیدار کرنا اور اس کے اندر فکری شعور پیدا کرنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تدریس میں سوال و جواب کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ طلبہ سے ایسے سوالات کرتے جن میں اختصار اور تفصیل دونوں کی گنجائش ہوتی تاکہ ہر طالب علم اپنی استعداد کے مطابق جواب دے سکے۔ ان کے سوال کرنے کا انداز نہایت حکیمانہ ہوتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ سوال کے اندر ہی جواب کا اشارہ موجود ہوتا، گویا وہ سوال کے ذریعے طالب علم کی ذہنی صلاحیت کو بھی آزما لیتے اور اس کی رہنمائی بھی کر دیتے۔

ان کی تدریس کی ایک اور اہم خوبی یہ تھی کہ وہ ہر سطح کے طالب علم کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ ذہین طلبہ ان کے سوالات اور مباحث میں فکری وسعت کے مواقع پاتے جب کہ کمزور طلبہ ان کی رہنمائی سے اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کا حوصلہ حاصل کرتے۔ وہ کبھی کسی طالب علم کو احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کا مقصد صرف ذہین طلبہ کو آگے بڑھانا نہیں بلکہ ہر طالب علم کے اندر اعتماد پیدا کرنا تھا۔ وہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے اور انھیں یہ احساس دلاتے کہ علم کا دروازہ ہر سنجیدہ اور محنتی طالب علم کے لیے کھلا ہے۔

مولانا بطور ممتحن بھی غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔ انھیں مدرسہ بورڈ کے امتحانی نظام اور سوالات کے انداز سے گہری واقفیت تھی۔ اکثر وہ طلبہ کو چند سوالات بطور 'گیس' بتا دیا کرتے اور حیرت کی بات یہ ہوتی

کہ ان میں سے کئی سوالات واقعی امتحان میں آ جاتے۔ لیکن ان کی اس پیش بینی کا مقصد صرف امتحان میں کامیابی دلانا نہیں تھا بلکہ طلبہ کو آخری مرحلے میں حوصلہ شکنی اور ذہنی دباؤ سے بچانا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طالب علم امتحان کے میدان میں اعتماد کے ساتھ داخل ہو اور اپنی صلاحیت کے مطابق بہتر کارکردگی دکھائے۔

ان کی شخصیت کی ایک نمایاں خصوصیت سادہ زیستی تھی۔ رہن سہن میں اعتدال، مال و دولت سے بے نیازی اور شکر و قناعت ان کی طبیعت کا حصہ تھے۔ دنیاوی آسائشوں کی طرف ان کی کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ وہ اپنی ضروریات کو محدود رکھتے اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے۔ دوسروں کے دکھ درد میں انھیں اپنا درد محسوس ہوتا۔ ان کی حساس طبیعت کا اندازہ ان کے ایک شعر سے بخوبی ہوتا ہے ؎

ارشادؔ جب بھی سنتا ہے پُر درد واقعہ
کیوں اس کو اپنے درد کی ہی داستاں لگے

ان کی مجلس میں تکلف نہیں ہوتا تھا مگر وقار ضرور ہوتا تھا۔ وہ سادگی میں حسن اور کم میں زیادہ دیکھنے کے عادی تھے۔ ان کا طرزِ زندگی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کی عظمت کا تعلق ٹھاٹ باٹ اور ساز و سامان سے نہیں بلکہ حسنِ عمل اور پاکیزہ کردار سے ہوتا ہے۔

ان کی تدریسی خدمات کا اثر اس حقیقت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علما، مدرسین اور افاضل کی ایک بڑی تعداد ان کے حلقۂ درس سے وابستہ رہی۔ ان کے شاگرد آج دنیا کے مختلف گوشوں میں دینی، علمی اور تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے بہت سے تلامذہ آج خود نمایاں اساتذہ کی صف میں شامل ہیں۔ اس طرح مولانا کی علمی میراث صرف کتابوں میں نہیں بلکہ اپنے شاگردوں کی شکل میں زندہ و تابندہ ہے۔

مولانا معروفیؒ کی شخصیت کا ایک اور دل کش پہلو ان کی شاعرانہ طبیعت تھی۔ وہ ایک لطیف حس رکھنے والے شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں فکر کی گہرائی، جذبے کی حرارت اور زبان کی نفاست نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں جذباتی اظہار کے ساتھ فکری معنویت بھی پائی جاتی ہے۔ شوکتِ الفاظ، حسنِ تراکیب، سلاست و روانی اور ندرتِ تشبیہ ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کے اشعار میں حسنِ تعلیل اور فکری لطافت کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کتابوں کی رفاقت اور مطالعے کی صحبت میں گزرا۔ وہ ان بزرگ اساتذہ کی روایت کے امین تھے جن کی زندگیاں طلبہ پروری اور علم کی شمع روشن کرنے میں صرف ہوئیں۔ وہ ہمیشہ طلبہ کو مطالعہ و مباحثہ کی تلقین کرتے اور ان کی علمی و روحانی ترقی کے لیے فکرمند رہتے۔

ان سے ملاقات کرنے والوں پر ان کی شخصیت کا گہرا اثر پڑتا تھا۔ ان کی گفتگو میں نصیحت آمیز

حکمت اور ان کی خاموشی میں سبق آموز معنویت ہوتی تھی۔ اسی طرح الفاظ میں تاثیر اور اندازِ گفتگو میں وقار نمایاں تھا۔ ان کی مجلس میں بیٹھنا گویا کسی روحانی چشمے کے کنارے چند لمحے گزارنے کے مترادف ہوتا جہاں دل کی پیاس بجھتی اور ذہن کو تازگی حاصل ہوتی۔

الغرض استادِ محترم کی شخصیت ایک ایسے مثالی استاد کی تصویر پیش کرتی ہے جس نے اپنی پوری زندگی علم کی خدمت اور طلبہ کی تربیت میں صرف کردی۔ ان کی تدریس صرف درسی نصاب تک محدود نہ تھی بلکہ ایک زندہ علمی روایت کی صورت میں دلوں میں اترتی تھی۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کے اندر تحقیق کا شوق، مطالعے کا ذوق اور خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کیا۔

آج اگرچہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں، لیکن ان کی علمی خدمات، تدریس اور تربیتی اثرات آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی یادیں ان کے شاگردوں کے دلوں میں چراغ کی طرح روشن ہیں اور ان کی علمی وراثت آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس عظیم معلم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے، ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین۔

مولانا ارشاد حسین معروفی بنیادی طور پر ایک جلیل القدر معلم اور صاحبِ علم شخصیت تھے، لیکن ان کی شخصیت کا ایک نہایت دل کش پہلو ان کی شاعرانہ طبیعت بھی تھی۔ ان کی شاعری ایک صاحبِ علم ذہن کی فکری اور تجرباتی بصیرت کی ترجمان ہے۔ ان کے اشعار میں جہاں ایک حساس دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے وہیں ایک مفکر استاد کی حکمت بھی جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کے تلخ وشیریں تجربات، انسانی احساسات، روحانی واردات اور علمی وقار کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ذیل میں ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

ٹوٹ کر بکھرا ہوا گوہر جو تھا — مثلِ شیشہ پارۂ جوہر جو تھا
جرأتوں کے قافلے آگے بڑھے — میں رکا تھا، میل کا پتھر جو تھا
کیوں بھلا ڈستیں مجھے تنہائیاں — ساتھ تیری یاد کا لشکر جو تھا
ظلمتیں کافور ہوکر رہ گئیں — پاس میرے نور کا پیکر جو تھا
اٹھ گیا اس کا جنازہ دھوم سے — یہ ہزاروں طالبوں کا سر جو تھا
رک گئی ارشادؔ کی نبضِ حیات — سوگیا طلاب کا مصدر جو تھا

اس غزل کا پہلا شعر اپنی معنوی گہرائی اور علامتی حسن کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے ؎

ٹوٹ کر بکھرا ہوا گوہر جو تھا

مثلِ شیشہ پارہ جوہر جو تھا

یہ شعر انسانی شخصیت کی شکستگی اور اس کے باطن میں پوشیدہ قدر و قیمت کا ایک بلیغ استعارہ ہے۔ شاعر نے 'گوہر' اور 'شیشہ' کی تشبیہوں کے ذریعے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ بظاہر شکستہ اور بکھرا ہوا وجود بھی اپنے اندر قیمتی جوہر رکھتا ہے۔ اس شعر میں داخلی کرب اور وجودی تجربے کی ایک جھلک ملتی ہے جو انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کی نمائندگی کرتی ہے۔ الفاظ کی سادگی اور مفہوم کی وسعت اس شعر کو خاص تاثیر عطا کرتی ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر نے زندگی کے سفر کو ایک علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

جرأتوں کے قافلے آگے بڑھے
میں رکا تھا، میل کا پتھر جو تھا

یہ شعر بظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے مگر اس کے اندر ایک عمیق فکری جہت پوشیدہ ہے۔ شاعر اپنے آپ کو 'میل کا پتھر' قرار دیتا ہے، یعنی وہ ایسا رہنما ہے جو خود تو ایک جگہ ٹھہرا رہتا ہے لیکن دوسروں کے سفر کی سمت متعین کرتا ہے۔ اس شعر میں ایک معلم کی زندگی کا فلسفہ بڑی خوب صورتی سے بیان ہوا ہے۔ استاد خود شہرت و نمود کے قافلے میں شامل نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کو منزل کی طرف بڑھنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس شعر میں خود سپردگی، خدمتِ خلق اور رہنمائی کا جذبہ نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ تیسرے شعر میں یاد اور تنہائی کے موضوع کو نہایت لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے ؎

کیوں بھلا ڈستیں مجھے تنہائیاں
ساتھ تیری یاد کا لشکر جو تھا

یہ شعر انسانی جذبات کی لطافت اور محبت کی معنوی قوت کا آئینہ دار ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب محبوب یا عزیز کی یاد دل میں موجود ہو تو تنہائی انسان کو ڈس نہیں سکتی۔ یہاں 'یاد کا لشکر' ایک نہایت دل کش استعارہ ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یادیں انسان کے لیے ایک حفاظتی حصار بن جاتی ہیں۔ اس شعر میں احساس کی نرمی، زبان کی سلاست اور ترکیب کی ندرت نمایاں ہے۔ چوتھا شعر روشنی اور تاریکی کی علامتوں کے ذریعے امید اور یقین کا پیغام دیتا ہے ؎

ظلمتیں کافور ہو کر رہ گئیں
پاس میرے نور کا پیکر جو تھا

یہ شعر روحانی اور اخلاقی معنویت سے لبریز ہے۔ شاعر نے یہاں 'نور کے پیکر' کو ایسی قوت کے طور پر پیش کیا ہے جو ظلمتوں کو مٹا دیتی ہے۔ اس نور سے مراد علم، ایمان یا کسی عظیم شخصیت کی رہنمائی بھی ہو سکتی

ہے۔اس شعر میں صنعتِ تضاد (ظلمت اور نور) کا استعمال نہایت خوب صورتی سے کیا گیا ہے جس سے معنی کی تاثیر میں اضافہ ہوگیا ہے۔ پانچواں شعر ایک استاد کی عظمت اور اس کے شاگردوں کے ساتھ تعلق کی تصویر پیش کرتا ہے ۔

اٹھ گیا اس کا جنازہ دھوم سے
یہ ہزاروں طالبوں کا سر جو تھا

یہ شعر ایک عظیم معلم کے مقام و مرتبہ کا مرقع ہے۔شاعر نے استاد کو 'ہزاروں طالبوں کا سر' قرار دے کر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ایک استاد اپنے شاگردوں کے لیے رہنما اور سرپرست کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب ایسا استاد دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی وفات ایک فرد کا انتقال نہیں ہوتی بلکہ ایک پورے علمی قافلے کے لیے صدمہ بن جاتی ہے۔اس شعر میں استاد اور شاگرد کے تعلق کی معنوی عظمت کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔غزل کا مقطع بھی معنویت سے بھرپور ہے ۔

رک گئی ارشادؔ کی نبضِ حیات
سوگیا طلاب کا مصدر جو تھا

یہ شعر دراصل شاعر کی پوری زندگی اور اس کے علمی مقام کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔'طلاب کا مصدر' ایک نہایت بلیغ ترکیب ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ شاعر اپنی زندگی میں علم کا سرچشمہ اور طلبہ کے لیے فیض کا مرکز تھا۔ جب اس کی نبضِ حیات رک گئی تو گویا علم کا ایک چشمہ خاموش ہوگیا۔اس شعر میں سادگی کے باوجود تاثیر اور جذباتی شدت موجود ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مولانا ارشاد حسین معروفیؒ کی شاعری میں سادگی اور معنویت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ان کے اشعار میں تصنع یا لفظی بازی گری نہیں بلکہ فطری سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری ان کی علمی شخصیت کا عکس ہے جس میں تجربہ، احساس، حکمت اور جمالیات ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ان کے یہاں الفاظ کا انتخاب نہایت بامعنی ہوا ہے اور تراکیب میں ندرت موجود ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ارشاد حسین معروفی کی شاعری ان کی معلمانہ زندگی کا ادبی اظہار ہے۔ان کے اشعار میں علم کی روشنی، محبت کی حرارت اور تجربے کی سنجیدگی موجود ہے اور یہی ان کا مابہ الامتیاز ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مجاہد الاسلام
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، رابطہ نمبر: 9628845713

مولانا ارشاد حسین کی غزلیں

(دینی، اخلاقی اور جمالیاتی جہات)

تلخیص:

زیرِ نظر مضمون میں مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی کا جامع اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ان کی شاعری کی دینی، اخلاقی اور جمالیاتی جہات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اردو غزل آغاز سے ہی ایک ہمہ گیر صنف رہی ہے جس نے انسانی جذبات، فکری ارتقا اور تہذیبی شعور کو خوب صورتی سے سمیٹا ہے۔ اسی روایت کے تسلسل میں مولانا ارشاد حسین کی غزلیں منفرد مقام رکھتی ہیں، جو کلاسیکی رنگ کے ساتھ جدید فکری شعور سے بھی ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔

ان کی شاعری میں دینی بصیرت اور اخلاقی اقدار بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، جو اشعار کو محض جمالیاتی اظہار سے بلند کر کے ایک بامقصد فکری جہت عطا کرتی ہیں۔ عشق کے اظہار میں بھی ان کا انداز پاکیزہ، سنجیدہ اور روحانی ہے، جو ان کی غزلیہ شاعری کو جذباتی کیفیت کے بجائے ایک داخلی اور تطہیری تجربہ بنا دیتا ہے۔ زبان کی سادگی، بیان کی روانی اور جذبے کی صداقت ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں، جن کے باعث ان کا کلام قارئین کے دل میں براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔

ان کی غزلوں میں سماجی شعور، انسانی ہمدردی اور حق گوئی کا جذبہ بھی نمایاں ہے، جو انھیں اپنے عہد کا باشعور شاعر بناتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان کی شاعری میں بحر، قافیہ اور موسیقیت کا خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی ایک ہمہ جہت شعری سرمایہ ہے، جو فکری گہرائی، جمالیاتی حسن اور اخلاقی بیداری کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، اردو غزل، دینی شعور، اخلاقی اقدار، جمالیاتی حسن، فکری بصیرت، عشق حقیقی، سماجی شعور، شعری روایت۔

اردو شاعری کی روایت میں غزل کو ہمیشہ ایک امتیازی اور مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ صنف محض شعری اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ تہذیبی شعور، فکری ارتقا اور جمالیاتی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ صدیوں پر محیط اس روایت نے انسانی باطن کے نہایت لطیف اور پیچیدہ احساسات کو جس خوب صورتی اور سلیقے سے پیش کیا ہے، وہ اردو ادب کا قابلِ فخر سرمایہ ہے۔ غزل میں عشق و محبت کی نزاکتیں، ہجر و وصال کی کیفیات، دکھ اور کرب کی شدت، تصوف کی گہرائیاں اور اخلاقی فکر کی سنجیدگی ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہی ہمہ گیری اسے دیگر اصنافِ سخن سے ممتاز بناتی ہے۔

غزل کی یہ خصوصیت کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے، ایک الگ تجربہ اور ایک جداگانہ احساس کا حامل، مگر اس کے باوجود پوری غزل ایک خاص فضا، داخلی آہنگ اور جذباتی تسلسل قائم رکھتی ہے۔ یہی داخلی ربط اسے محض منتشر اشعار کا مجموعہ نہیں رہنے دیتا بلکہ ایک مربوط تخلیقی تجربہ بنا دیتا ہے۔ اسی وصف کے باعث غزل نہ صرف دل کو متاثر کرتی ہے بلکہ ذہن کو بھی متحرک کرتی ہے۔

ابتدائی ادوار میں غزل کا مرکزی حوالہ عشقِ مجازی رہا، جہاں محبوب کی بے نیازی اور عاشق کی بے قراری کے مضامین غالب تھے۔ کلاسیکی شعرا نے اس دائرے میں رہتے ہوئے انسانی جذبات کو انتہائی لطافت کے ساتھ برتا، مگر وقت کے ساتھ انسانی شعور میں وسعت آئی اور معاشرتی تبدیلیوں نے ادب کے رخ کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ غزل کے موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ جدید غزل نے روایت کو ترک کیے بغیر اسے نئے معانی اور نئے سیاق و سباق سے ہم آہنگ کیا۔ اب غزل میں فرد کی داخلی کشمکش، سماجی ناانصافیاں، فکری اضطراب، روحانی جستجو اور اخلاقی اقدار سبھی شامل ہو گئے ہیں۔ شاعر محض محبوب سے مکالمہ نہیں کرتا بلکہ اپنے عہد سے بھی گفتگو کرتا ہے، اور یہی جدید غزل کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

اسی ارتقائی سلسلے میں مولانا ارشاد حسین مرحوم کی غزل گوئی کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کا کلام اس بات کی واضح مثال ہے کہ روایت سے وابستگی کے باوجود کس طرح نئے فکری امکانات کو اپنے اندر سمویا جا سکتا ہے۔ انھوں نے غزل کو صرف جذباتی اظہار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے دینی بصیرت، اخلاقی شعور اور فکری بیداری کا وسیلہ بنایا۔ ان کے اشعار میں ایک طرف کلاسیکی روایت کی خوش بو ملتی ہے تو دوسری طرف عصرِ حاضر کی فکری جہتیں بھی نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔

مولانا ارشاد حسین مرحوم کی شخصیت بذاتِ خود ایک مکمل اور ہمہ جہت وجود کی آئینہ دار تھی۔ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ضلع مئو کے قصبہ پورہ معروف میں پیدا ہونے والے اس عالمِ دین نے ابتدائی ماحول ہی سے علم اور دین کی طرف میلان پایا۔ ان کے والد محمد شمس الدین کی تربیت نے ان کے کردار میں سنجیدگی، دیانت اور استقامت پیدا کی، جو بعد میں ان کی علمی و ادبی زندگی کی بنیاد بنی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی تعلیم و تربیت، دینی خدمات اور سماجی اصلاح کے لیے وقف کر دی۔ وہ محض ایک مدرس نہیں تھے بلکہ ایک مخلص رہنما اور حساس مفکر بھی تھے، جنھوں نے معاشرے کی فکری اور اخلاقی تعمیر کو اپنا مقصد بنایا۔

ان کی تصنیفی خدمات بھی نہایت اہم ہیں۔ 'فلسفۂ توحید' میں انھوں نے عقیدہ توحید کی معنویت کو واضح کیا، 'افادیتِ نماز' اور 'افادیتِ روزہ' میں عبادات کی روحانی اور عملی افادیت کو اجاگر کیا، جب کہ 'بلاغتِ قرآن' میں قرآنی اسلوب کی فصاحت اور تاثیر پر روشنی ڈالی۔ ان کے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے، جن سے ان کے وسیع مطالعہ، گہری بصیرت اور سنجیدہ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ادبی میدان میں وہ ایک صاحبِ طرز شاعر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، مگر غزل ان کی شناخت کا خاص حوالہ بن کر سامنے آئی۔ ان کی شاعری میں دینی جذبہ، اخلاقی قدریں اور انسانی احساسات اس خوب صورتی سے یکجا ہو جاتے ہیں کہ قاری نہ صرف لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ ایک فکری اور روحانی تاثیر بھی محسوس کرتا ہے۔ ان کے اشعار میں زبان کی روانی، بیان کی سادگی اور جذبے کی صداقت ایسی خصوصیات ہیں جو انھیں منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔

۱۴؍ اپریل ۲۰۲۵ء کو لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا اور اسی روز تدفین ان کے آبائی وطن پورہ معروف میں عمل میں آئی۔ ان کی وفات بلاشبہہ علمی اور ادبی دنیا کے لیے ایک نقصان تھی، مگر ان کا تخلیقی اور فکری سرمایہ آج بھی زندہ ہے۔ ان کی غزلیں نہ صرف ادبی ذوق کی تسکین کا ذریعہ ہیں بلکہ فکری رہنمائی اور اخلاقی بیداری کا بھی ایک موثر وسیلہ ہیں، اور یہی پہلو انھیں اردو غزل کے اہم شعرا کی صف میں نمایاں کرتا ہے۔

مولانا ارشاد حسین مرحوم کی غزلوں کا سنجیدہ اور باریک بیں مطالعہ اس حقیقت کو پوری طرح آشکار کرتا ہے کہ ان کا کلام محض روایتی غزل گوئی کا تسلسل نہیں بلکہ ایک ایسی فکری اور جمالیاتی کاوش ہے جس میں جذبے کی سچائی، فکر کی پختگی اور فن کی لطافت ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک منفرد شعری تجربہ تشکیل دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں وہ تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں جو ایک بڑے اور باوقار غزل گو کی شناخت بنتے ہیں، تاہم ان کا امتیاز اس بات میں ہے کہ وہ ان عناصر کو محض دہراتے نہیں، بلکہ انھیں اپنے مخصوص زاویہ نظر کے ساتھ برتتے ہیں۔

ان کے کلام میں دینی اور اخلاقی شعور ایک ایسی بنیادی قوت کے طور پر جلوہ گر ہوتا ہے جو ان کی شاعری کی سمت متعین کرتی ہے۔ وہ غزل کے روایتی سانچے میں رہتے ہوئے بھی اسے محض جذباتی یا عشقیہ اظہار تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے ایک بامقصد اور بامعنی وسیلہ بناتے ہیں۔ ان کے یہاں ایمان کی پختگی اور دینی اصول سے غیر متزلزل وابستگی صاف محسوس ہوتی ہے ۔

وہ بتوں کی کبھی تکریم نہیں کر سکتا
سنتِ رب میں جو ترمیم نہیں کر سکتا

یہ شعر نہ صرف ان کے عقیدے کی استواری کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اپنے فکری اور دینی موقف پر کسی قسم کی مصلحت کو قبول کرنے کے قائل نہیں۔ اسی تسلسل میں حق گوئی اور ظلم کے خلاف مزاحمت کا جذبہ بھی نمایاں ہوتا ہے ۔

جب بھی حق کے لیے آواز اٹھائی ہم نے
اس نے ہر بار انوکھا ستم ایجاد کیا

یہاں شاعر کی شخصیت ایک ایسے حساس اور باوقار فرد کی صورت میں ابھرتی ہے جو حالات کے جبر کے باوجود سچائی کا دامن نہیں چھوڑتا۔ عشق کے باب میں بھی ان کا انداز نہایت سنجیدہ اور باوقار ہے۔ وہ عشق کو محض جذباتی ہیجان یا سطحی واردات کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ اسے ایک گہری داخلی کیفیت اور وجودی تجربے کی صورت میں دیکھتے ہیں ۔

قیس کو دشت میں مرنا تھا مگر مر نہ سکا
اُس کا کہنا ہے کہ در پر ترے مر پاؤں گا

یہاں کلاسیکی استعارہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود ہے، مگر اس کے اندر ایک نئی داخلی شدت بھی شامل ہو گئی ہے۔ اسی طرح ۔

جو رگِ گردن سے ہے زیادہ قریب
عشق ہو ایسا تو سارے غم گئے

اس شعر میں عشق کو ایک ایسی ہمہ گیر قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسان کے وجود میں سرایت کر کے اس کی تمام داخلی کلفتوں کو ختم کر دیتی ہے۔ اس طرح ان کے یہاں عشق ایک تطہیری اور روحانی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کی زبان کی سادگی اور سلاست ان کے اسلوب کی ایک نہایت اہم خصوصیت ہے۔ وہ پیچیدہ تراکیب یا ثقیل الفاظ کے بجائے سہل اور رواں زبان کا استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے

ان کا کلام فوری طور پر قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔

تیغِ ابرو کا اشارہ ہو گیا نام تیرا کام میرا ہو گیا

اس شعر میں بیان کی سادگی کے باوجود جذبے کی شدت پوری طرح نمایاں ہے۔اسی طرح۔

رات بھر آنکھیں بچھی تھیں راہ میں وہ نہ آیا اور سویرا ہو گیا

یہاں ایک عام سا منظر ایک گہری داخلی کیفیت میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور یہی ان کے فن کی اصل خوبی ہے کہ وہ سادہ لفظوں میں پیچیدہ احساسات کو بیان کر دیتے ہیں۔فنی اعتبار سے بھی ان کی غزلیں پختہ شعری شعور کی آئینہ دار ہیں۔بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندی کے ساتھ ان کے کلام میں ایک فطری موسیقیت پائی جاتی ہے، جو اشعار کو نہ صرف خوش آہنگ بناتی ہے بلکہ ان کے اثر کو بھی بڑھا دیتی ہے۔

جب نسیمِ سحر چلے گل پر زیب دیتا ہے راگ بلبل پر

اس شعر میں صوتی ہم آہنگی اور لفظی ترتیب ایک دل کش ترنم پیدا کرتی ہے۔اسی طرح۔

مثلِ رنگِ بہار آنکھوں میں اتر آیا خمار آنکھوں میں
خونِ دل کی طرح نمایاں ہے سرخ ڈوروں کا تار آنکھوں میں

یہاں داخلی آہنگ اور تصویریت مل کر ایک جمالیاتی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ان کی شاعری میں سماجی شعور بھی پوری طرح موجود ہے۔وہ اپنے عہد کے مسائل، تضادات اور ناانصافیوں سے بے نیاز نہیں بلکہ انھیں اپنے اشعار میں سمیٹ کر ایک بامعنی اظہار عطا کرتے ہیں۔

یقیں ہے جہل کی ظلمت کا خاتمہ ہوگا جہاں میں علم کا سورج اگا رہا ہے کوئی

یہ شعر امید، روشنی اور فکری بیداری کا استعارہ بن جاتا ہے۔اس کے برعکس ایک اور شعر میں معاشرتی منافقت کو نہایت گہرائی سے بیان کیا گیا ہے۔

کسی کے لب پہ مسلسل دعا ہے بخشش کی گلے پہ ظلم کے خنجر چلا رہا ہے کوئی

یہاں تضاد اور طنز کے ذریعے ایک تلخ حقیقت کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کلاسیکی روایت سے ان کا رشتہ بھی مضبوط اور زندہ ہے، مگر وہ اسے محض تقلید کی سطح پر نہیں رکھتے بلکہ اس میں نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔

تھی کبھی بے خبری اور کبھی کوہ کنی اس نے ہم کو کبھی مجنوں کبھی فرہاد کیا

یہاں مجنوں اور فرہاد کے استعارے محض روایتی حوالہ نہیں بلکہ عشق کی مختلف کیفیات کی علامت بن

جاتے ہیں، جنھیں شاعر نے اپنے تجربے کے ساتھ ہم آہنگ کرلیا ہے۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود جو چیز ان کی شاعری کو سب سے زیادہ موثر بناتی ہے، وہ جذبات کی صداقت ہے۔ ان کے اشعار میں تصنع یا بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ملتا بلکہ ایک سچی اور بے ساختہ داخلی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

دل دہلنے لگے بے دردوں کے آخر ارشادؔ
دردمندوں نے عجب درد سے فریاد کیا

یہ شعر اجتماعی درد کی شدت کو پوری سچائی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اسی طرح۔

قطرۂ عشق تھا جو پلکوں پر چبھ گیا مثلِ خار آنکھوں میں

یہاں جذبے کی لطافت اور اس کی اذیت دونوں ایک ساتھ محسوس ہوتی ہیں، جو قاری پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔ ان تمام جہات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو یہ بات بلا تردد کہی جاسکتی ہے کہ مولانا ارشاد حسین مرحوم کی غزل گوئی ایک ہمہ جہت اور بامعنی شعری سرمایہ ہے۔ ان کے کلام میں دینی بصیرت، اخلاقی استحکام، عشق کی پاکیزگی، زبان کی سادگی، فن کی پختگی اور جذبات کی سچائی اس طرح ہم آہنگ ہوگئی ہیں کہ ان کی شاعری نہ صرف دل کو چھوتی ہے بلکہ ذہن کو بھی روشن کرتی ہے۔ یہی ہمہ گیری اور اثر آفرینی انھیں اردو غزل کے ایک منفرد اور قابلِ قدر شاعر کے طور پر مستحکم مقام عطا کرتی ہے۔

مولانا ارشاد حسین مرحوم کی غزل گوئی کے مجموعی مطالعے سے یہ حقیقت مزید نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان کا شعری سرمایہ محض کسی ایک جہت کا نمائندہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر جمالیاتی نظام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی شاعری میں جو داخلی ربط، معنوی تسلسل اور تہذیبی شعور ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے فن سے پوری طرح باخبر اور اپنے عہد کے تقاضوں سے آگاہ شاعر تھے۔ انھوں نے روایت کے سرمائے کو اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں نئی زندگی عطا کی، جس کے نتیجے میں ان کا کلام ایک ایسی تازگی اور اثر آفرینی کا حامل بن گیا جو دیرپا ہے۔

ان کے اشعار میں جو فکری توازن دکھائی دیتا ہے، وہ دراصل ان کی شخصیت کے اعتدال کا آئینہ دار ہے۔ وہ نہ تو جذبات کی رو میں بہہ کر مبالغہ آرائی کا شکار ہوتے ہیں اور نہ ہی خشک عقلیت کے باعث اپنے کلام کو بے تاثیر ہونے دیتے ہیں، بلکہ دونوں کے درمیان ایک ایسا اعتدال قائم رکھتے ہیں جو ان کی شاعری کو سنجیدگی اور دل کشی دونوں عطا کرتا ہے۔

ہے یہی خارقِ عادت ترے مجنوں کا مزاج
پتھروں سے کوئی تقدیم نہیں کر سکتا

اس شعر میں ایک طرف روایت کا تسلسل ہے تو دوسری طرف داخلی خودداری اور فکری وقار بھی نمایاں ہے، جو شاعر کے مزاج کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک اور اہم پہلو داخلی کرب اور انسانی تجربے کی گہرائی ہے، جو ذاتی سطح سے بلند ہو کر ایک وسیع انسانی تناظر اختیار کر لیتی ہے۔

ہجر کے درد نے پیہم ہمیں ناشاد کیا
وصل کی آرزو نے زیست کو برباد کیا

یہاں ذاتی دکھ درد ایک ایسے عمومی تجربے میں ڈھل جاتا ہے جس سے ہر حساس دل وابستگی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح۔

دل دہلنے لگے بے دردوں کے آخر ارشادؔ
درد مندوں نے عجب درد سے فریاد کیا

یہ شعر اجتماعی احساس اور انسانی ہمدردی کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے، جس میں فرد کا درد اجتماعی کرب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے یہاں منظر نگاری اور کیفیت آفرینی بھی نہایت دل کش انداز میں سامنے آتی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی منظر کو بھی ایک خاص شعری فضا میں ڈھال دیتے ہیں، جس سے قاری نہ صرف اس منظر کو دیکھتا ہے بلکہ اسے محسوس بھی کرتا ہے۔

رات بھر آنکھیں بچھی تھیں راہ میں وہ نہ آیا اور سویرا ہو گیا

یہاں انتظار کی کیفیت ایک مکمل منظر کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس میں وقت کی رفتار اور دل کی بے قراری دونوں شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک خاص طرح کی خودداری اور باطنی استغنا بھی محسوس ہوتا ہے، جو انھیں فقط ایک جذباتی شاعر کے بجائے ایک صاحبِ کردار اور صاحبِ نظر فن کار کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح۔

میں ہوں وہ جز جسے لایتجزیٰ کہتے ہیں کوئی قاتل مجھے دو نیم نہیں کر سکتا

یہاں شاعر کی داخلی قوت اور شخصیت کی مضبوطی ایک علامتی پیرائے میں ظاہر ہوتی ہے، جو اس کے فکری استحکام کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں انسانی نفسیات کی باریکیوں کو سمجھنے اور انھیں شعری پیکر میں ڈھالنے کی غیر معمولی صلاحیت بھی موجود ہے۔

قطرۂ عشق تھا جو پلکوں پر چبھ گیا مثلِ خار آنکھوں میں

یہ شعر اس بات کی عمدہ مثال ہے کہ وہ کس طرح ایک لطیف جذبے کو درد کی شدت کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں، اور ایک چھوٹی سی کیفیت کو بڑے تجربے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اگر ان کی مجموعی شعری

کائنات پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات بخوبی محسوس ہوتی ہے کہ ان کے یہاں زندگی کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ عشق، اخلاق، دین، سماج اور انسانی قدریں سب عناصر ان کے کلام میں الگ الگ نہیں بلکہ ایک مربوط فکری نظام کے طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی ربط ان کی شاعری کو محض وقتی یا سطحی اظہار سے بلند کر کے ایک بامعنی اور دیرپا ادبی تجربہ بنا دیتا ہے۔

ان کی غزلیں قاری کو محض لطف نہیں دیتیں بلکہ اسے سوچنے پر مجبور بھی کرتی ہیں۔ وہ ایک طرف دل کی دنیا کو مہمیز کرتی ہیں تو دوسری طرف ذہن کے دریچوں کو بھی وا کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں ایک ایسی تاثیر موجود ہے جو بیک وقت جمالیاتی تسکین اور فکری بیداری دونوں فراہم کرتی ہے۔ یہی دوہری تاثیر دراصل ان کے فن کی اصل قوّت ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ارشاد حسین مرحوم کی غزل گوئی اردو ادب میں ایک معتبر اضافہ ہے، جس میں روایت کی جڑیں بھی مضبوط ہیں اور جدّت کی شاخیں بھی سرسبز۔ ان کا کلام اس بات کی روشن مثال ہے کہ سچا فن وہی ہے جو دل کو چھوئے، ذہن کو روشن کرے اور انسان کو اپنے باطن سے آشنا کرے۔ یہی اوصاف انھیں ایک ایسے شاعر کے طور پر سامنے لاتے ہیں جن کی شاعری نہ صرف اپنے عہد میں اہم ہے بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی اپنی معنویت برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر سحر افروز
ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، جی ڈی کالج، بیگوسرائے، رابطہ نمبر: 9430244480

مولانا ارشادؔ کی غزلیہ شاعری

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی اردو کی شعری روایت کا ایک اہم اور معنی خیز اضافہ ہے، جس میں کلاسیکی ورثے اور جدید فکری شعور کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی غزل فقط عشق و محبت کے روایتی دائرے تک محدود نہیں رہتی بلکہ زندگی، کائنات، تقدیر، وجودی کرب اور روحانی جستجو جیسے وسیع موضوعات کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ ان کے یہاں غم ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے، مگر یہ غم محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری و شعوری تجربہ ہے۔ وہ غم کو انسانی شعور کی بیداری اور روحانی ارتقا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

مولانا ارشاد کی شاعری میں تنقیدی شعور کی پختگی نمایاں ہے، جس کے باعث ان کا کلام سوچے سمجھے فکری عمل کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں زبان و بیان کی شائستگی، استعاروں اور تشبیہوں کا برمحل استعمال اور پیکر تراشی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں زندگی کو ایک معمہ اور مسلسل کشمکش کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جب کہ موت کو کبھی نجات اور کبھی نئی آزمائش کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ عشق ان کے نزدیک روحانی بالیدگی کا ذریعہ ہے، نہ کہ محض ظاہری جذبہ۔

مجموعی طور پر مولانا ارشاد کی غزل فکری گہرائی، داخلی صداقت، روحانی آگہی اور تہذیبی وقار کی غماز ہے، جو اردو غزل کو نئی معنویت عطا کرتی ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، غزل گوئی، فکری شعور، داخلی کرب، تصورِ غم، روحانیت، پیکر تراشی، کلاسیکی روایت، جدید حسیت، عشقِ حقیقی، لسانی شائستگی، جمالیاتی تجربہ۔

غزل اردو شاعری کی وہ مقبول ترین اور موثر صنف ہے جس نے صدیوں کے فکری، جذباتی اور

تہذیبی تجربے کو اپنے مختصر مگر بلیغ پیرائے میں سمیٹ لیا ہے۔ ابتدا میں اس کا دائرہ زیادہ تر عشق و محبت اور وارداتِ قلبی تک محدود رہا، مگر وقت کے ساتھ اس نے انسانی زندگی کے وسیع تر مسائل، حیات و ممات، کائنات، تقدیر، تنہائی، وجودی کرب اور روحانی جستجو کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا۔ غزل کی اصل معنویت اسی میں ہے کہ وہ چند مصرعوں میں انسانی تجربے کی پوری کائنات سمو دیتی ہے۔ اس کی رمزیت، ایجاز، موسیقیت اور تہ داری اسے ایک فکری اور جمالیاتی تجربہ بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد کا شاعر اپنے زمانے کے دکھ درد، خواب اور سوالات کو غزل کے آئینے میں منعکس کرتا رہا ہے، اور غزل ہر دور میں نئے معنی اور نئی معنویت کے ساتھ زندہ و تابندہ رہی ہے۔

اس تناظر میں جب ہم مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل کی اسی ہمہ گیر معنویت کو اپنے فکری تجربے سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے یہاں غزل عشق کی سرگوشی یا روایتی سوز و گداز کا اظہار نہیں، بلکہ زندگی کے پیچیدہ سوالات سے ایک سنجیدہ مکالمہ ہے۔ انھوں نے غزل کی رمزیت اور ایجاز و اختصار کو برقرار رکھتے ہوئے اسے اپنے داخلی کرب، وجودی احساس اور روحانی جستجو کا وسیلہ بنایا۔ اس طرح ان کی شاعری غزل کی کلاسیکی روایت سے وابستہ رہتے ہوئے بھی ایک تازہ فکری جہت اختیار کر لیتی ہے۔ مولانا ارشاد کے یہاں غزل انسانی شعور کی گہرائیوں تک اترتی ہے اور رنج و غم کو جذباتی کیفیت کے بجائے افہام و تفہیم حیات میں ڈھال دیتی ہے، جس سے ان کی غزل اردو روایت میں معنی خیز اضافہ بن جاتی ہے۔ وہ ایک اچھے پارکھ اور تنقیدی شعور کے مالک تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زبان و بیان اور فکر و مواد بڑے نکھرے ہوئے انداز میں ان کی غزلوں کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے لکھا ہے:

> ''بعض لکھنے والوں کی تخلیق دوسروں سے اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ ان کا تنقیدی شعور زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے۔''[۱]

یہ بات کہ بعض اہلِ قلم کی تخلیق دوسروں کے مقابلے میں اس لیے زیادہ توانا اور اثر آفریں ہوتی ہے کہ ان کا تنقیدی شعور زیادہ پختہ اور بیدار ہوتا ہے، مولانا ارشاد کی غزل گوئی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ ان کی شاعری جذبات کا بے ساختہ بہاؤ نہیں بلکہ شعوری انتخاب اور فکری چھان بین کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے تجربات کو بغیر پرکھے لفظوں کے سپرد نہیں کرتے، بلکہ ہر خیال کو ایک باطن نگر نگاہ سے دیکھتے اور پھر اسے شعری قالب عطا کرتے ہیں۔ یہی تنقیدی شعور ان کے یہاں غم کو ذاتی آہ و فغاں بننے نہیں دیتا بلکہ اسے افہام و تفہیم حیات کا حصہ بنا دیتا ہے۔ وہ روایت سے بھی آگاہ ہیں اور اپنے عہد کے فکری تقاضوں سے

بھی باخبر، اس لیے ان کی غزل میں نہ اندھی تقلید ہے اور نہ سطحی جدت پسندی، بلکہ ایک متوازن، سنجیدہ اور خودآگاہ طرزِ اظہار ہے۔ ان کے اشعار میں خیال کی پختگی، جذبے کی تہذیب اور اسلوب کی شائستگی اسی بیدار تنقیدی شعور کا ثمرہ ہیں، جو ان کی شاعری کو عام سطح سے بلند کر کے ایک باوقار ادبی مقام عطا کرتی ہیں۔ اب ان کی ایک غزل کے یہ اشعار دیکھیے ۔

یہ عکس ہے کہ کوئی آئینہ ہے حیرت کا — دکھا رہا ہے تماشا وہ کیسی عبرت کا
یہ کس کے شوق کی وادی میں رکھ دیا ہے قدم — مہک رہا ہے ہر اک سو گلاب الفت کا
جو ظلم ڈھاتی ہیں مخمور نیم باز آنکھیں — ہے کس میں زور بیاں اس اثر کی کلفت کا
وہ زلف رخ سے ہٹالے تو صبح پھوٹ پڑے — بکھیر دے تو تصور ہو شام ظلمت کا
نہیں کی تیغ سے کاٹی ہے شہ رگِ باطل — خلاصہ ہے یہی حق کی زباں کی رفعت کا
سکوت موت کا چھایا ہے اُس جگہ ارشادؔ — جہاں تھا شور حکومت کی شان و شوکت کا

مولانا ارشاد کی غزل گوئی پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلے جس پہلو کی طرف ذہن متوجہ ہوتا ہے، وہ ان کے یہاں غم کا ہمہ گیر اور ہمہ جہت تصور ہے۔ ان کی شاعری جذباتی آہ وفغاں نہیں بلکہ ایک باقاعدہ فکری نظام رکھتی ہے۔ وہ غم کو کسی ایک خانے میں محدود نہیں کرتے، نہ اسے صرف محرومیٔ ذات کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی محض عشقیہ واردات کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں، بلکہ ان کے یہاں غم ایک فلسفہ، ایک تجربہ اور ایک داخلی شعور کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی غزل کو پڑھتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ شاعری داخلی کرب کی داستان ضرور ہے، مگر اس کے پس منظر میں حیات و کائنات کے متعلق ایک سنجیدہ اور مفکرانہ رویہ کارفرما ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> ''اردو کی پرانی شاعری موضوع، مواد اور اصناف شعر کے معاملے میں بڑی حد تک فارسی اور کسی حد تک عربی کی شعری روایت کو آگے بڑھانے کا اہم کردار ادا کرتی رہی۔ کم وبیش یہی حال تصورات شعر کا بھی ہے۔''[۲]

ابوالکلام قاسمی کے اس خیال کی روشنی میں کہ اردو کی قدیم شاعری نے موضوعات، مواد اور اصناف کے اعتبار سے فارسی اور کسی حد تک عربی روایت کو آگے بڑھایا اور شعری تصورات بھی اسی تہذیبی تسلسل کے آئینہ دار رہے، مولانا ارشاد کی غزل گوئی کو دیکھیں تو وہ اسی روایت کی امین نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں عشق، غم، فنا و بقا، تقدیر، انسان کی بے ثباتی اور کائنات کی معنویت جیسے مضامین کلاسیکی شعری سرمایہ سے مربوط ہیں، مگر وہ انھیں موروثی انداز میں نہیں برتتے، بلکہ اپنے ذاتی تجربے اور عہد کے شعور سے ہم آہنگ

کر دیتے ہیں۔ ان کی زبان میں فارسی کی شستگی، تراکیب کی لطافت اور تصوف کی ہلکی سی جھلک اسی تہذیبی ربط کی نشان دہی کرتی ہے، جب کہ فکری سطح پر وہ انسان اور حیات وممات کے مسائل کو اس حکیمانہ انداز سے برتتے ہیں جو مشرقی شعریات کی اساس ہے۔ اس طرح ان کی غزل ایک طرف قدیم روایت سے وابستگی کا ثبوت دیتی ہے تو دوسری طرف اس روایت کو نئے احساس اور تازہ معنویت کے ساتھ آگے بڑھانے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔

ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو پیکر تراشی اور مصوری خیال کرتے ہیں۔ پیکر تراشی ایک ایسا عمل ہے جس میں مختلف حسی کیفیات کا عمل دخل رہتا ہے۔ ان کے نزدیک شعر کہنا گویا ایک بے صورت احساس کو صورت عطا کرنا ہے، ایک مبہم کیفیت کو مجسم بنا دینا ہے۔ جس طرح سنگ تراش پتھر کے اندر پوشیدہ نقش کو دریافت کر کے اسے نمایاں کرتا ہے، اسی طرح مولانا ارشاد اپنے باطن میں موجزن جذبات، خیالات اور تجربات کو لفظوں کے ذریعے ایک پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس عمل میں مختلف حسی کیفیات، بصری، سمعی، لمسی اور کبھی کبھی ذوقی احساسات کا بھرپور عمل دخل نظر آتا ہے۔ چنانچہ صاحب آب حیات مولانا محمد حسین آزاد رقم طراز ہیں:

> ''شاعر گویا ایک مصور ہے لیکن نہ وہ مصور کہ اشتر، درخت اور پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے، بلکہ وہ ایسا مصور ہے جو تصویر صفحہ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینی فصاحت سے نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیا جن کی تصویر مصور سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔''[۳]

جب ہم مولانا کے اشعار کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اشعار میں پیکر تراشی یا تصویر کشی اس طرح سامنے آتی ہے کہ قاری صرف معنی نہیں پڑھتا بلکہ ایک کیفیت کو محسوس کرتا ہے، ایک فضا کو دیکھتا اور ایک صدا کو سنتا ہے۔ ان کے یہاں درد بیان نہیں رہ جاتا بلکہ ایک مجسم صورت اختیار کر لیتا ہے، تنہائی صرف تصور نہیں رہتی بلکہ سایہ بن کر ساتھ چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور امید یا یاس فقط الفاظ نہیں بلکہ رنگوں اور آہنگوں میں ڈھلی ہوئی کیفیات بن جاتی ہیں۔ یہی حسی اور جمالیاتی شعور ان کی غزل کو تصویریت اور پیکریت عطا کرتا ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں اس قدر احتیاط اور ہنرمندی سے کام لیتے ہیں کہ ہر لفظ اپنی جگہ ایک تراشیدہ سنگ کی طرح جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یوں ان کی شاعری فکری اظہار نہیں بلکہ ایک بصری و حسی تجربہ بن جاتی ہے، جہاں خیال رنگ اختیار کرتا ہے اور احساس شکل وصورت میں ڈھل کر قاری کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اب ان کے یہ اشعار دیکھیے ۔

زلفوں کی کوئی ناگن جب ڈس لے جھروکے سے
انسان کا پھر بچنا آسان نہیں ہوتا
کچھ درد محبت کا، کچھ خوف زمانے کا
اوسان بجا رکھنا آسان نہیں ہوتا
نرگس پہ پڑی شبنم قطرہ نہیں دریا ہے
جس کا کبھی رک جانا آسان نہیں ہوتا
دل کھول کے رونے سے تسکین تو ہوتی ہے
پھر اس کا سنبھل پانا آسان نہیں ہوتا

مولانا ارشاد کے نزدیک زندگی خود ایک سربستہ راز ہے۔ وہ حیات کو ایک ایسے معمہ کے طور پر دیکھتے ہیں جس کی گتھی سلجھانے کی کوشش میں انسان عمریں گزار دیتا ہے مگر حقیقت پھر بھی پردۂ خفا میں رہتی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی یہی معمائی کیفیت غزل کے سانچے میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ کبھی وہ زندگی کو خواب قرار دیتے ہیں، کبھی اسے فریبِ نظر کہتے ہیں اور کبھی ایک ایسی مسلسل کشمکش سے تعبیر کرتے ہیں جس میں انسان ہر لمحہ تحلیل ہوتا رہتا ہے۔ اس احساسِ زیاں میں مایوسی کا رنگ بھی ہے اور شعوری آگہی کا نور بھی۔

ان کے یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ زندگی سے بیزاری کا اظہار بھی کرتے ہیں اور اسی زندگی کو نعمت بھی سمجھتے ہیں۔ بظاہر یہ تضاد معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہی ان کے فکری نظام کی بنیاد ہے۔ وہ اس دنیا کو رنج والم کا گھر سمجھتے ہیں، مگر اسی رنج کو روح کی بالیدگی کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر غم نہ ہو تو شعور کی آنکھ نہیں کھلتی، دل کی زمین زرخیز نہیں بنتی اور انسان اپنی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے غم ان کے یہاں بوجھ نہیں بلکہ عطیہ ہے، ایسا عطیہ جو انسان کو اس کی اصل سے قریب کرتا ہے۔

غزل میں حیات وممات کا باہمی تعلق بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ موت کو نجات کا دروازہ سمجھتے ہیں اور اس سے خوفزدہ دکھائی نہیں دیتے۔ ان کے اشعار میں موت کی تمنا بھی ملتی ہے۔ یہ کیفیت دراصل ایک حساس دل کی کیفیت ہے جو دنیا کے غموں سے تنگ آ کر راحت کی تلاش میں ہے، مگر ساتھ ہی اس بات سے بھی آگاہ ہے کہ موت بھی ایک نئی آزمائش کا آغاز ہو سکتی ہے۔ ان کے یہاں غم کا اظہار یک رخی نہیں ہے۔ کبھی وہ غم کو سینے سے لگاتے ہیں، اس کا استقبال کرتے ہیں، اور کبھی اسی غم کی سختیوں کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ اس سے ان کی انسانی حقیقت نمایاں ہوتی ہے۔ وہ نہ تو مصنوعی صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ ہی خود ترسی میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کا لہجہ اعتدال اور صداقت سے بھرپور ہے۔

ٹوٹ کر بکھرا ہوا گوہر جو تھا مثلِ شیشہ پارۂ جوہر جو تھا
جرأتوں کے قافلے آگے بڑھے میں رکا تھا، میل کا پتھر جو تھا
کیوں بھلا ڈستیں مجھے تنہائیاں ساتھ تیری یاد کا لشکر جو تھا
ظلمتیں کافور ہوکر رہ گئیں پاس میرے نور کا پیکر جو تھا
اُٹھ گیا اس کا جنازہ دھوم سے یہ ہزاروں طالبوں کا سر جو تھا
رک گئی ارشادؔ کی نبضِ حیات سوگیا، طلاب کا مصدر جو تھا

مولانا کی غزل میں تغزل کی فراوانی بھی قابلِ ذکر ہے۔ان کے اشعار میں ایک لطیف موسیقیت، ایک نرم آہنگ اور ایک دل کش روانی پائی جاتی ہے۔زبان سادہ ہے مگر عامیانہ نہیں، شائستہ ہے مگر بناوٹی نہیں۔انھوں نے لکھنوی تہذیب کی نزاکت اور شستگی کو اپنے اسلوب میں سمولیا ہے، جس کے باعث ان کی غزل میں ایک خاص تہذیبی وقار پیدا ہوگیا ہے۔الفاظ کا انتخاب نہایت برمحل اور نپا تلا ہے۔وہ استعاروں اور تشبیہوں کو اس مہارت سے برتتے ہیں کہ معنی میں گہرائی بھی پیدا ہوجاتی ہے اور بیان میں حسن بھی۔

ان کے یہاں سوز و گداز کی کیفیت اس طرح جلوہ گر ہوتی ہے کہ قاری شعر کی قرأت نہیں کرتا بلکہ ایک مکمل منظر دیکھتا ہے۔ان کے اشعار میں دل کا اجڑنا، امیدوں کا ٹوٹنا، خوابوں کا بکھرنا اور روح کا تڑپنا سب کچھ مجسم صورت میں سامنے آجاتا ہے۔وہ داخلی کیفیات کو اس انداز میں لفظوں کا جامہ پہناتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے اپنے دل کا دروازہ کھول دیا ہو اور ہم اس کی دھڑکنیں سن رہے ہوں۔

اگرچہ ان کی شاعری کا مرکزی محور غم ہے، لیکن وہ صرف اسی موضوع تک محدود نہیں رہتے۔ان کے یہاں زندگی، کائنات، انسان، عشق، وقت اور تقدیر جیسے بڑے فلسفیانہ مسائل بھی زیرِ بحث آتے ہیں۔وہ ایک مفکر شاعر ہیں۔ان کا شعور جذباتی نہیں بلکہ حکیمانہ ہے۔وہ انسان کی حقیقت پر غور کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان ایک نازک اور عارضی وجود ہے، جو لمحوں میں بکھر سکتا ہے۔اس احساسِ ناپائیداری نے ان کی غزل میں ایک خاص سنجیدگی پیدا کردی ہے۔

کوئی نہیں جو تجھے درد کی دوا دے گا
اگر خلوص سے مانگو تو بس خدا دے گا
سکون چاہو تو گندی فضا سے دور رہو
وفا کے نام پہ ورنہ کوئی دغا دے گا
جو بیٹھو گے کبھی اک بار اس کی محفل میں

سلیقہ ہجر کا تم کو وہی سکھا دے گا
تمھارے غیر کو فرصت کہاں ستانے کی
جو زخم دے گا تجھے تیرا آشنا دے گا
بڑی مشقتوں سے بستیاں بسائی تھیں
خبر نہ تھی کوئی ظالم انھیں جلادے گا
عزیز ہے جو ترے دل کو زندگی ارشادؔ
تو حق پہ مرنے کا جذبہ اسے سکھادے گا

عشق کے باب میں بھی مولانا کا رویہ منفرد ہے۔ان کا عشق سطحی یا ظاہری حسن تک محدود نہیں۔وہ عشق کو روحانی ارتقا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک عشق دل کی تطہیر کا عمل ہے۔یہ وہ آگ ہے جو جلا بھی دیتی ہے اور روشنی بھی عطا کرتی ہے۔ان کی غزل میں عشق کا تصور تصوف اور حکیمانہ رنگ میں ڈھلا ہوا ہے۔ وہ عشق کو انسانی وجود کی تقویت قرار دیتے ہیں اور اسے حیات کی معنویت سے جوڑ دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے عشقیہ اشعار میں بھی فکری بالیدگی اور روحانی وقار ملتا ہے۔

مولانا کی شاعری میں ظرافت کا ہلکا سا پہلو بھی نظر آتا ہے۔اگرچہ وہ بنیادی طور پر ظرافت کے شاعر نہیں ہیں، مگر کہیں کہیں طنز اور لطیف مزاح کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ظرافت ان کے کلام کو یکسانیت سے بچاتی ہے اور قاری کو ایک لمحۂ تبسم عطا کرتی ہے۔وہ دنیا کی بے ثباتی اور انسانی خواہشات کی بے معنویت پر کبھی کبھی ہلکے طنزیہ انداز میں بھی روشنی ڈالتے ہیں، مگر اس طنز میں تلخی نہیں ہوتی بلکہ ایک سنجیدہ آگہی شامل ہوتی ہے۔

ان کے کلام میں کلاسیکی شعرا کے اثرات کا سراغ بھی ملتا ہے، مگر انھوں نے تقلید محض نہیں کی۔ انھوں نے قدیم روایت سے سوز و گداز، نزاکتِ خیال اور فلسفیانہ گہرائی کو اخذ کیا، مگر اسے اپنے ذاتی تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر ایک نیا رنگ دیا۔ان کی شاعری میں روایت و انفرادیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔وہ اپنے اسلاف کے سرمایۂ فن سے فیض یاب ضرور ہوئے، مگر اپنی شناخت قائم رکھنے میں کامیاب بھی رہے۔انھوں نے اپنی ذاتی واردات کو اجتماعی تجربے میں ڈھال دیا ہے۔ان کا دکھ صرف ان کا ذاتی دکھ نہیں رہتا، بلکہ وہ انسانی غم و الم کی علامت بن جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار ہر طبقہ کے قارئین کو اپنے قریب محسوس ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے کرب کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہ اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ان کی شاعری میں داخلی صداقت اور فکری دیانت نمایاں ہے۔ وہ کسی نظریاتی

لفاظی یا مصنوعی فلسفہ بگھارنے کے قائل نہیں۔ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اسے سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہی سادگی اور اخلاص ان کے کلام کو اثر انگیز بناتا ہے۔

وہ اپنے عہد کے ادبی رجحانات سے بھی باخبر تھے، مگر انھوں نے اندھا دھند کسی رجحان کی پیروی نہیں کی۔ انھوں نے اپنے لیے ایک مستقل راہ منتخب کی اور اسی پر استقامت کے ساتھ چلتے رہے۔ ان کی غزل میں قدیم تہذیب کی جھلک بھی ملتی ہے اور جدید حسیت کی آنچ بھی۔ وہ غزل کو محض عشرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے زندگی کی تفہیم کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی غزل میں جو درد ہے، وہ سطحی نہیں بلکہ تہ دار ہے۔ اس میں تجربے کی گہرائی اور احساس کی صداقت شامل ہے۔ انھوں نے غزل کو ایک نئے عرفانِ غم سے آشنا کیا اور دکھ کو ایک باوقار جمالیاتی تجربے میں بدل دیا۔

خلاصہ یہ کہ مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی داخلی کرب، فکری بالیدگی، روحانی آگہی اور لسانی لطافت کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے فانی کی طرح زندگی کو ایک معمہ سمجھا، مگر اس معمہ سے فرار اختیار نہیں کیا بلکہ اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ انھوں نے غم کو اپنایا، اس سے مکالمہ کیا اور اسے اپنے فن کا محور بنا دیا۔ ان کی شاعری میں سوز بھی ہے، شعور بھی، درد بھی ہے، درایت بھی، یاس بھی ہے، مگر اس یاس میں بھی ایک باوقار سنجیدگی موجود ہے۔ یہی خصوصیات انھیں اپنے عہد کے دیگر شعرا میں مستقل مقام عطا کرتی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ جدید ادب: منظر اور پس منظر، لطف الرحمان، ص ۸۱، بحوالہ: معاصر اردو غزل، مرتبہ: قمر رئیس، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۴ء

۲۔ مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی تعریف، ابوالکلام قاسمی، ص ۱۸۷

۳۔ آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص ۲۷

☆☆☆

ڈاکٹر شکیل احمد
ڈومن پورہ چنگی، مئوناتھ بھنجن، مئو، رابطہ نمبر: 9236722570

مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی اردو شعری روایت میں ایک باوقار اور بامعنی اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ بنیادی طور پر ایک عالمِ دین، مدرس اور صاحبِ علم شخصیت تھے جن کی زندگی علم، تدریس اور اخلاقی اقدار کے فروغ میں گزری۔ اسی علمی و دینی ماحول نے آپ کی شخصیت میں فکری سنجیدگی، زبان و بیان پر قدرت اور ادب سے گہری وابستگی پیدا کی، جس کے اثرات آپ کی غزلوں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ آپ پیشہ ور شاعر نہیں تھے اور نہ ہی کل وقتی طور پر شاعری سے وابستہ رہے، تاہم تدریسی اور علمی مصروفیات کے ساتھ شعر گوئی آپ کا ایک پاکیزہ اور بامقصد ذوق رہا جس میں صالح اقدار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

مولانا ارشاد حسین کی غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت زبان کی سادگی، شستگی اور محاورات کی صحت ہے۔ ان کے اشعار میں تصنع اور پیچیدگی کے بجائے سادہ مگر بامعنی اسلوب پایا جاتا ہے، جو کلاسیکی اردو غزل کی صحت مند روایت سے ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے محبت، ہجر و وصال، انسانی جذبات اور زندگی کے تجربات جیسے روایتی مضامین کو نہایت متوازن اور دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ تشبیہ و استعارہ کے برمحل استعمال سے ان کے اشعار میں دل کشی اور فکری لطافت پیدا ہوگئی ہے۔

ان کی شاعری میں عشق کی آزمائشوں، زندگی کے نشیب و فراز، صبر و شکر اور انسانی اقدار کی ترجمانی بھی نمایاں طور پر ملتی ہے۔ بعض اشعار میں ان کی عملی زندگی، تدریسی خدمات اور اخلاقی فکر کا عکس بھی جھلکتا ہے، جس کے باعث ان کی شاعری ایک سبق آموز اور فکری پیغام بھی بن جاتی ہے۔ اگرچہ ان کی غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں، تاہم فنی پختگی، معنوی گہرائی اور اختصار کی بدولت ان کی شاعری معیار کے

اعتبار سے نہایت وقیع اور قابلِ قدر ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، اردو غزل گوئی، دینی و ادبی روایت، کلاسیکی غزل، سادگیٔ زبان، محاورات کی صحت، معاملاتِ عشق، زندگی کے تجربات، فکری و فنی پختگی۔

اردو غزل گوئی کی صدیوں پر محیط روایت میں متعدد ایسے اہلِ علم اور علمائے دین کا نام بھی نمایاں طور پر ملتا ہے جنھوں نے اپنی دینی بصیرت اور علمی وقار کے ساتھ ساتھ شعری ذوق وشوق کو بھی جلا بخشی۔ ان ہی باوقار شخصیات میں مولانا ارشاد حسین کا نام بھی احترام کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ آپ کی شخصیت ایک ایسے عالمِ دین کی آئینہ دار تھی جس میں علمی وقار، دینی شعور اور ادبی ذوق کی حسین آمیزش پائی جاتی تھی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایک ایسے پاکیزہ اور علمی ماحول میں ہوئی جہاں علم و اخلاق کو بنیادی قدر کی حیثیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سازگار اور تربیتی فضا نے آپ کی شخصیت میں ایک مثالی طالب علم کے اوصاف پیدا کر دیئے تھے۔ سنجیدگی، مطالعے کا شوق، زبان و بیان پر قدرت اور فکر کی گہرائی جیسے اوصاف آپ کی طبیعت کا حصہ بن گئے تھے۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے آپ کو نہ صرف علمی میدان میں ممتاز کیا بلکہ آپ کے ادبی ذوق کی آبیاری بھی کی۔ اس طرح آپ کے اندر شعر و ادب کی لطافتوں کو سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔

تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد جب آپ نے تدریس کے مقدس پیشے کو اختیار کیا تو یہ محض ایک ملازمت نہ رہی بلکہ آپ کے لیے ایک مشن کی حیثیت اختیار کر گئی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک آپ اس عظیم خدمت سے وابستہ رہے اور اس دوران بے شمار طلبہ کی علمی و فکری تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ کی درس گاہ ایسی درس گاہ تھی جہاں طلبہ کو علم کے ساتھ ساتھ تہذیب، کردار اور فکری بالیدگی کی تربیت بھی حاصل ہوتی تھی۔ اسی تدریسی مصروفیت کے ساتھ آپ نے اردو زبان و ادب کی خدمت کو بھی اپنا فریضہ سمجھا اور حتی المقدور اس سلسلے کو جاری رکھا۔ آپ کی شعری کاوشیں اسی ادبی وابستگی کا روشن مظہر ہیں۔ اگرچہ مذہبی شاعری آپ کی طبیعت کے زیادہ قریب تھی اور اس میں آپ کے دینی شعور کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ آپ نے غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ آپ کی غزلیں اس بات کی دلیل ہیں کہ آپ نہ صرف دینی علوم میں گہری بصیرت رکھتے تھے بلکہ اردو کی شعری روایت کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

آپ کی ذہنی، فکری اور علمی تربیت کے اثرات آپ کی غزلوں میں نمایاں ہیں۔ روایت کی پاسداری کے ساتھ غزل کی قدیم روش پر چلنا آپ نے زیادہ پسند کیا۔ ترقی پسند ادبی نظریات اور شعری رویے سے قدرے فاصلہ کے ساتھ آپ کی غزل گوئی کا آہستہ خرام سفر جاری رہا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ روایتی شاعروں کی طرح نہ کل وقتی غزل گو تھے اور نہ ہی شعر گوئی آپ کی گھٹی میں پڑی تھی بلکہ اپنی تمام تر تدریسی، علمی اور منصبی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد شعر گوئی آپ کا ایسا شوق تھی جس میں صالح اقدار کو اولیت حاصل تھی۔ مذہبی شاعری کی متعدد اصناف کے ساتھ غزلیہ اشعار میں بھی یہ جھلک موجود ہے۔

مولانا ارشاد حسین کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے سب سے نمایاں خصوصیت جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کی زبان کی سادگی، شستگی اور محاورات کی صحت ہے۔ ان کے اشعار میں تکلف اور تصنع کا شائبہ نہیں ملتا بلکہ ایک صاف ستھری، رواں اور دل نشیں زبان کا استعمال نظر آتا ہے، جو کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کے فہم و ذوق کے بھی قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں الفاظ کی چمک دمک کے بجائے معنی کی شفافیت اور بیان کی سلاست زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی غزلوں میں اردو کے مروجہ محاورات اور روزمرہ کی برجستگی اس انداز سے برتی گئی ہے کہ شعر میں فطری روانی پیدا ہو جاتی ہے اور قاری بلا تکلف اس کے مفہوم تک پہنچ جاتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو مولانا ارشاد حسین کی غزل گوئی اردو کی اس صحت مند روایت کی یاد تازہ کرتی ہے جس میں زبان کی صفائی اور محاورے کی درستی کو بنیادی قدر سمجھا جاتا تھا۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ انھوں نے غزل کے روایتی مضامین جیسے محبت، وفا، ہجر و وصال، انسانی احساسات اور اخلاقی کیفیات وغیرہ کو نہایت متوازن اور دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں روایت کی پاسداری کے ساتھ اظہار کی شائستگی اور بیان کی دل آویزی بھی موجود ہے۔ وہ پیچیدہ استعارات یا غیر مانوس ترکیبوں کے بجائے سادہ مگر بامعنی اسلوب اختیار کرتے ہیں جس کے باعث ان کے اشعار میں خاص تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی خصوصیت آج کے قاری کے لیے بھی ان کی شاعری کو قابلِ توجہ بناتی ہے، کیوں کہ موجودہ عہد میں جہاں زبان کا سلیقہ بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے، وہیں اس نوع کی صاف، باوقار اور محاورہ بند شاعری ایک تازہ اور خوش گوار احساس پیدا کرتی ہے۔ اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

رنگوں کی تبدیلی ایک معمہ ہے زخم ہرا ہے لال دکھائی دیتا ہے
وہ سبز باغ دکھاتا رہا زمانے سے بچایا عزم نے مجھ کو فریب کھانے سے

زلف جو اس کی پریشاں ہوگئی اور بھی بادل گھنیرا ہوگیا
ہائے اب جاں بلب ہوا عاشق رحم آتا ہے اس تحمل پر
جب سے تم آنکھوں سے اوجھل ہوگئے زندگی میں رہ گئیں تنہائیاں
دل لگا ہے کہ دل لگی ہے یہاں کیا ہوا کیسی بے کلی ہے یہاں

آپ کی غزلوں میں معاملاتِ عشق کی نزاکتوں کے ساتھ لوازماتِ عشق کی جزئیات بھی قابلِ توجہ ہیں۔تشبیہ اور استعارے کے استعمال سے اشعار میں دل کشی اور قدرے شوخی بھی پیدا ہوگئی ہے۔روزمرہ کی دل نشیں زبان آپ کی غزل گوئی کو پرکشش اور قابلِ توجہ بناتی ہے، اس خوبی کی بدولت آپ کے اشعار قدرے انفرادیت کے حامل ہوجاتے ہیں، جس کی وجہ سے قاری ان اشعار میں اپنے جذبات کی ترجمانی محسوس کرتا ہے۔مشاہدہ وتخیل کے اوصاف بھی غزلیہ شاعری میں جلوہ گر ہوکر قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔

وہ زلف رخ سے ہٹالے تو صبح پھوٹ پڑے بکھیر دے تو تصور ہو شام ظلمت کا
میں بیٹھا تھا، ابھی گم ہوگیا ہوں کرشمہ ہے تری جادوگری کا
دلوں کی دھڑکنوں سے جو ہے واقف اسے آتا ہے فن شیشہ گری کا
کیوں بھلا ڈستیں مجھے تنہائیاں ساتھ تیری یاد کا لشکر جو تھا
کہتے ہیں عشق ہجر کی لذت کا نام ہے گر وصل ہاتھ آگیا، ارمان تو گیا
حسرتِ دید ہے مدت سے پسِ منظر شوق کاش وہ آکے گزر جائیں خیالوں کی طرح

منزلِ شوق کا ہر مرحلہ اہلِ عشق کے نزدیک مسلسل آزمائشوں اور کیفیاتی تجربوں کی ایک طویل اور صبر آزما مسافت ہوتا ہے۔عشق کی راہ میں پیش آنے والی یہ آزمائشیں بظاہر رنج والم اور صبر واستقامت کا تقاضا کرتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہی مراحل میں عاشق کو ایک ایسی لطیف اور روحانی لذت بھی نصیب ہوتی ہے جو اس کے جذبۂ محبت کو مزید مستحکم بنادیتی ہے۔کلاسیکی اردو غزل کی روایت میں اس تصور کو بڑی لطافت اور فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جہاں رنجِ عشق کو ایک طرح کی مسرتِ باطنی اور روحانی بالیدگی کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شاعر جب اس تجربۂ عشق کو لفظوں کے قالب میں ڈھالتا ہے تو اس کے اشعار میں جذبات کی گہرائی اور احساس کی شدت نمایاں ہوجاتی ہے۔

مولانا ارشاد حسین کی غزلوں میں بھی اس روایتی تصورِ عشق کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ عشق کی آزمائشوں کو فقط صبر آزما حالات کے طور پر پیش نہیں کرتے، بلکہ ان میں پوشیدہ کیف وسرور اور

باطنی سرشاری کو بھی نہایت دل نشیں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ان کے یہاں عشق کی تکلیفیں دراصل روح کی بالیدگی اور احساس کی پختگی کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ جب اس نوع کی کیفیت کو شعری پیکر عطا کیا جاتا ہے تو شاعر کی فکری وسعت اور فنی مہارت دونوں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔اس طرح ان کے اشعار میں ایک طرف روایتِ غزل کی پاسداری نظر آتی ہے تو دوسری طرف جذبۂ عشق کی وہ لطیف ترجمانی بھی ملتی ہے جو شاعری کو معنوی وقار اور فنی پختگی عطا کرتی ہے۔اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آتش عشق کی سوزش کا تقاضا ہے یہی
سینۂ سوختہ کو اور بھی بریاں کردوں

ان کی یادوں کے جل رہے ہیں چراغ
اب اندھیروں میں روشنی ہے یہاں

سوزش عشق سے جب شمع کو روتے دیکھا
آرزو جلنے کی پیدا ہوئی پروانے میں

ان اشعار کی سب سے نمایاں خوبی ان کا سوزِ دروں اور کیفیت جذب کی وہ شدت ہے، جو قاری کے قلب واحساس کو براہِ راست متاثر کرتی ہے۔شاعر نے عشق کے داخلی تجربے کو نہایت بلیغ اور اثر آفریں پیکر میں ڈھالا ہے، جہاں آتش، سینۂ سوختہ، چراغ، اندھیرا، شمع اور پروانہ جیسے کلاسیکی استعارے اپنی پوری معنوی وسعت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ان پیکروں کی باہمی رعایتِ لفظی اور معنوی ہم آہنگی کلام میں ایک فطری ربط اور جمالیاتی تسلسل پیدا کرتی ہے۔سادگی اور سلاستِ بیان کے باوجود اشعار میں تہ داری اور رمزیت بھی موجود ہے جو انھیں محض سطحی اظہار سے بلند کر کے فکری اور وجدانی سطح پر لے جاتی ہے۔ داخلیت کی شدت، جذبات کی صداقت اور تخیل کی شعلہ بیانی ان اشعار کو ایک خاص امتیاز عطا کرتی ہے، جب کہ کلاسیکی شعری روایت سے مضبوط وابستگی انھیں ایک مانوس مگر تازہ آہنگ عطا کرتی ہے۔

آپ کی غزلوں میں زندگی کے تجربات اور تلخ حقائق کا جو عکس ہے، اس میں غم زندگی اور غم ذات دونوں شامل ہیں۔کہیں غم وافسوس ہے اور کہیں صبر وشکر جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔آپ کے اشعار میں اس کی ترجمانی شعر کو درجہ کمال عطا کرتی ہے، زندگی کے نشیب وفراز کے سمجھنے کا شعور وحوصلہ عطا کرنے کے ساتھ زبان وبیان کی تازگی سے بھی نوازتی ہے۔کچھ شعر ذیل میں پیش کرتا ہوں ؎

ترے قطرات جو آنکھوں سے ٹپکے
جواہر ہیں کہ ہیں شہکارِ گریہ

مرا چراغ ہواؤں سے بجھ نہیں سکتا
تمام آندھیاں ہیں تھک گئی بجھانے سے
کیسا ہے حالات کا ظلم و ستم
مصلحت میں کھو گئیں نزدیکیاں

ان اشعار میں ایک سنجیدہ اور باعمل شخصیت کی زندگی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ مولانا ارشاد حسین کی شخصیت چوں کہ علم، تدریس، دینی وابستگی اور اخلاقی اقدار سے تشکیل پائی تھی، اس لیے ان کی شاعری میں بھی ان کے طرزِ حیات اور فکری رویّے کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے مشاہدات، تجربات اور زندگی کے نشیب و فراز کو شعری قالب میں ڈھال کر نہ صرف اپنے داخلی احساسات کی ترجمانی کی ہے بلکہ قاری کو بھی غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

ان اشعار کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں زندگی کے عام تجربات کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ صرف شاعر کی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ ایک وسیع تناظر اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں زندگی کی سادگی، محنت، صبر، قناعت اور اخلاقی استقامت جیسے اوصاف کی جھلک بھی ملتی ہے۔ اس طرح شاعر کے ذاتی مشاہدات و تجربات ایک عمومی پیغام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو عام انسانوں کے لیے بھی سبق آموز اور رہنمائی کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان اشعار میں زندگی کی حقیقتوں کو نہایت سادہ مگر موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کے باعث ان کی معنوی تاثیر اور افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ذیل میں اس نوعیت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

جرأتوں کے قافلے آگے بڑھے — میں رکا تھا، میل کا پتھر جو تھا
وہی ملزم وہی منصف یہ عجب ہے بیداد — ہو کے مجبور مگر داد طلب آتے ہیں
جکڑا ہو جو غربت کی زنجیروں میں — بچہ، کہنہ سال دکھائی دیتا ہے
اسے ہر چیز مل جائے گی جس کو — طلب کا حوصلہ پختہ رہے گا
جو خود استاد کو ہلکا سمجھ لے — وہ علم و فن سے بےگانہ رہے گا
عمر آخر بھی تری اے ارشادؔ — خوب درسِ کتاب میں گزری
نوجوانی کتاب میں گزری — شکرِ رب ہے ثواب میں گزری

مولانا ارشاد حسین کی غزلیں اپنی جامعیت، معنوی گہرائی اور فنی اختصار کے اعتبار سے خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ اگرچہ مقدار کے لحاظ سے ان کی غزلیہ شاعری بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن جو کچھ بھی

انھوں نے کہا ہے وہ فکر وفن کے اعتبار سے نہایت وقیع اور بامعنی ہے۔ ان کے اشعار میں لفظوں کی کفایت شعاری کے ساتھ معنی کی وسعت پائی جاتی ہے، جو ایک پختہ کار شاعر کی پہچان سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں غیر ضروری طوالت یا بیان کی بے جا پیچیدگی نہیں ملتی بلکہ ہر شعر اپنے اندر ایک مکمل کیفیت اور خیال سمیٹے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس طرح ان کی شاعری اس حقیقت کی غماز ہے کہ اصل اہمیت مقدار کی نہیں بلکہ معیار کی ہوتی ہے۔

ان کی غزلیہ شاعری میں جو تازگی، سادگی اور خلوصِ اظہار موجود ہے، وہ اسے دیر پا بناتا ہے۔ ان کے اشعار میں روایتِ غزل کی پاسداری کے ساتھ ایک سادہ مگر موثر طرزِ بیان ملتا ہے جو قاری کے دل و دماغ پر دیر تک اثر انداز رہتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کی شاعری کو وقتی نہیں بلکہ پائیدار بناتی ہے۔ بلاشبہہ ان کی مختصر مگر معیاری غزلیہ کاوشیں اردو شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لیے ہمیشہ دل کش رہیں گی اور ان کی معنوی تازگی اور فکری لطافت ان شاءاللہ مدتوں تک اہلِ ادب کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی۔

☆☆☆

ہادی سرمدی (ڈاکٹر ابوالکلام مسرور الہادی)
استاد شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ایم کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 9868636108

حضرت مولانا ارشادؔ: تغزل کے صید اور شعریت کے صیاد

تلخیص:
غزل ایک ہمہ گیر صنفِ سخن کے طور پر اپنی مخصوص شناخت رکھتی ہے جو ذات، حیات اور کائنات کے تمام تجربات و مشاہدات کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ مولانا ارشادؔ کی شاعری کو اسی وسیع تر شعری روایت کا تسلسل قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کی غزل میں داخلی کیفیات اور خارجی حقائق کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔
ان کے یہاں عشق، ہجر، وصال، درد، جنوں اور عرفان جیسے موضوعات نہایت فنی لطافت اور فکری بالیدگی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مضمون میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مولانا ارشادؔ کی شاعری میں انسانی جذبات کی شدت، رشتوں کی نزاکت اور وجودی تجربات کی صداقت نمایاں ہے۔ ان کے اشعار میں تصوف، اخلاقیات اور روحانی تجربات کی جھلک بھی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔
مضمون میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ان کی غزل محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ فکری بصیرت، سماجی شعور اور اخلاقی قدروں کی ترجمان ہے۔ عشق ان کے یہاں محض مجازی نہیں بلکہ عرفانی رنگ اختیار کرتا ہے جہاں انسان حقیقتِ کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔
مولانا ارشادؔ کی غزلیں قاری کو ایک ایسے فکری و جمالیاتی سفر پر لے جاتی ہیں جہاں ذات کی دریافت، کائنات کی تفہیم اور روحانی بالیدگی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج موجود ہے جو انھیں کلاسیکی اردو غزل کے ساتھ جدید اردو غزل کے معتبر شعرا میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ:

غزل، مولانا ارشادؔ، عشق، داخلی کیفیت، جمالیات، عرفان، انسانی جذبات، فکری بصیرت، شعری روایت، روحانیت، اخلاقیات، کائنات، سماجی شعور۔

غزل حدیث دل اور حدیث دلبری سے نکل کر ذات، حیات اور کائنات پر چھا گئی ہے۔ غزل نے اپنا کینوس اتنا وسیع کر لیا ہے کہ اب ارض وسما اور مکان ولامکاں بھی اس میں سمانے لگے ہیں۔ شاعری کی ایسی کوئی صنف نہیں جو جز بھی ہو اور کل بھی۔ غزل ہر خواب شکستہ کی تعبیر ہے۔ دشت امکان کی تفسیر ہے۔ سوختہ جسم وجاں کی ہمدرد ہے اور سوز نہاں کی چارہ گر۔ داخلیت غزل کی روح ہے اور خارجیت اس کا جسم۔ غزل باطنی کوائف کی ترجمان بھی ہے اور شاہد ومشہود کی پہچان بھی۔ عصری حسیت اور جمالیاتی کیفیت غزل کے رگ وپے میں دوڑتی ہے۔ دلفگاروں کی ابن امریم ہے، تو جاں نثاروں کی ہمدم۔ غزل عاشق ومعشوق کی پناہ گاہ ہے، محبوب ومحب کی ہمراہ ہے اور زیست کی شاہراہ بھی۔ غزل نین بھی ہے درس بھی، بے کلی بھی ہے اور چین بھی۔ یعنی انسانی جذبات، خیالات اور حسیات کی آماجگاہ ہے۔ ایسے میں کوئی بھی حساس ذہن اور دردمند دل غزل کی سحر انگیزی سے بچ نہیں سکتا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

حضرت مولانا ارشاد حسین بھی میرؔ کی طرح غزل کے اسیر ہوئے۔ ان کی طبیعت غزل کی جانب ایسی مائل ہوئی کہ غزل بھی ان کی قائل ہوگئی، اور افتادِ طبع ایسی کہ فطرت اور جبلت میں غزل سرایت کر گئی۔ قدرت نے ذوق وشوق بھی ایسا بخشا تھا کہ غزل دمساز ہوگئی اور وہ غزل کے ہمراز ہو گئے۔ دل بے تاب نے ان کی مشت خاک میں پناہ لے رکھی تھی۔ جب خاک سراپا کی کیفیت دل کی مانند ہوگئی تو بے چینیاں رگ وپے میں تحلیل ہوئیں اور پھر غزل میں منتقل ہو گئیں۔

ارشادؔ سارے درد جہاں کے سمیٹ کر
قدرت جو تیرا دل ہی بنائے تو کیا کروں

قدرت ہر انسان کو ہر شے سے نہیں نوازتی بلکہ جو جس کا اہل ہوتا ہے اسے ہی وہ ملکہ عطا کرتی ہے۔ ظرف اور ضبط کا مادہ جس میں جتنا پایا جاتا ہے درد والم کی اتنی ہی کمیت اور کیفیت اس کے حصے آتی ہے۔ جس کے اندر درد کو جذب کرنے کی طاقت اور اس کی حفاظت کی قوت ہوتی ہے اور رنج والم کی پاسداری اور پاسبانی کا جذبہ پایا جاتا ہے، اسے ہی امانت اور ضمانت کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے۔

سارے جہاں کے درد سمیٹ کر دل بنا دیا اور ارشاد صاحب دل بے تاب کے آگے سرنگوں ہوئے۔ امیرؔ مینائی بھی اسی دلِ مضطرب کا بیان یوں کرتے ہیں ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اقبالؔ اسی کیفیت کی ترجمانی یوں کرتے ہیں ؎

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اسی خیال کو نجمی نگینویؔ نے کچھ اس طرح سے باندھا ہے ؎

بے تابیاں سمیٹ کر سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

نجمیؔ کا شعر مولانا ارشاد کے شعر کو تقویت بخشتا ہے۔ شاعری اور انسانی حسیات و جذبات کا رشتہ ابتدائے آفرینش سے قائم ہے۔ ظاہر ہے اسی طرح کی کیفیت اور اسی قسم کی حالت سے انسان ہمیشہ دوچار ہوتا رہا ہے۔ کبھی اس حالت زار کا بیان ایک جیسا بھی ہوا ہے اور کبھی انداز بیان جداگانہ بھی رہا۔ جس طرح جس پہ گزری اس نے اسی پیرائے میں اظہار کیا۔ ظاہر ہے انسان مختلف ذہن و دل کا مالک ہوتا ہے اور اس کا اظہار بھی مختلف رنگ میں ہوتا ہے۔

غزل کو غزل بنانے کا فن جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ جو کرب انگیز لمحوں سے گزرتا ہے، جاں سوز مرحلوں کو سر کرتا ہے، غزل کے گیسو انھیں سے سنورتے ہیں۔ اس لیے اقبالؔ کہتے ہیں ؎

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

خون جگر کے بغیر نہ تخلیق بقائے دوام کو پہنچتی ہے نہ شاعری میں ساحری پیدا ہوتی ہے اور نہ غزل منصب دلبری پر فائز ہوتی ہے۔ ظاہر ہے غزل میں فکر کی گہرائی، گیرائی اور معانی آفرینی کو ملحوظ رکھنا غزل کی شریعت ہے اور تغزل و شعریت کو مجروح ہونے سے بھی بچا لے جانا معرفت۔ درجۂ اتم پانے میں خلوص اور صداقت کارفرما ہوا کرتے ہیں۔ سپردگی کا جذبہ اور بندگی کی شدت ہی دیوانگی عطا کرتی ہے۔ ذات و حیات کے اسرار و رموز جن پر عیاں ہوتے ہیں، اور وہ جب سراپا وجد میں آتا ہے تو تخلیق کمال کو پہنچتی ہے۔ شہر ذات کے دروازے جب کھلنے لگتے ہیں تو غزل پختہ اور توانا ہوتی ہے۔ آگہی جب جنوں سے نبرد آزما ہوتی ہے تو

غزل کا رنگ پکا ہوتا ہے۔ داخلیت خارجیت پر غالب آتی ہے تو غزل میں نور اترتا ہے۔ حیات کے تصورات اور کائنات کے نظریات کے مابین کشمکش ہوتی ہے تو غزل کو مقام سدرہ نصیب ہوتا ہے۔ صبح کاذب صبح صادق سے الجھتی ہے تو غزل بشارت کا پیغام لے کے آتی ہے۔

دلوں کی دھڑکنوں سے جو ہے واقف
اسے آتا ہے فن شیشہ گری کا

یہ شعر جذبات کی پاسداری اور نازک انسانی رشتوں کی آبداری کا استعارہ ہے۔ شاعر نے اس امر کی جانب توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی کہ رشتوں کا حقیقی نگہبان ہی دلوں کے نازک شیشے کو ٹوٹنے سے بچا سکتا ہے اور اس کی پاسبانی کر سکتا ہے۔ شکستہ دلوں کو جوڑ سکتا ہے۔ یہاں شیشہ گری سے مراد محض شیشہ بنانا نہیں، بلکہ دلوں کی کیفیت یعنی جذبات کا احترام، ان کی حفاظت کرنا اور حسن سلوک سے انھیں سنوارنا ہے۔ دلوں کی دھڑکن سے مراد ان کہے افسانے، پوشیدہ کرب، راز پنہاں اور نفسیاتی کیفیات ہیں۔ محبوب محب کے ان جذبوں کو سمجھ جائے جو بیان ہی نہیں ہوئے۔ وہی حقیقی عاشق یا حساس انسان ہے جو انسانی رشتوں کی نزاکت اور ضابطوں سے واقف ہو۔ یہ شعر انسانی نفسیات، ہمدردی اور باہمی تعلقات کی گہرائی کا مظہر ہے۔ جو اوروں کے دلوں سے آگاہ ہے وہی دھڑکنوں کے آداب سے آشنا ہے، وہی شکستہ دلوں کا چارہ گر بھی ہے وہی شیشہ گری کا حقیقی فن جانتا ہے۔ فن شیشہ گری یہاں استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے دلوں کی چارہ سازی، جذبوں کی مسیحائی، ہمدردی اور محبت کی کرم فرمائی۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ فن نفسیاتی بصیرت اور عمیق انسیت کا متقاضی ہے۔ یہ ایک نفیس انسانی کیفیت کو بیان کرتا ہے جہاں تعلقات نازک احساس اور ملایمت کے متمنی ہوا کرتے ہیں۔

شاعر نے نہایت لطیف خیال کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ ایک ایسے احساس کو شعری پیکر عطا کیا ہے، جسے ایک عاشق ہی بیان کر سکتا ہے۔ جو عشق کی پر خار راہوں سے گزرتا ہے، شیشہ گری کے فن سے وہی آگاہ ہوتا ہے۔ جو دریا کی موجوں، طغیانیوں اور تلاطم سے نبرد آزما ہوتا ہے، اسے ہی ڈوب کر دریا پار کرنے کی ادا آتی ہے۔ شیشہ گری کا فن نہایت نازک ترین اور پر خطر ہے۔ شیشہ کی فطرت میں نزاکت بھی اور صفت جراحت بھی ہے۔ ایک شیشہ گر کو آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ذرا سی چوک سے معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ احتیاط، ذوق جمال، کمال ضبط اور اعلیٰ ظرفی اس فن کے تقاضے ہیں۔ ذہن اور دل کی یکسوئی لازمی ہے۔ ہوش وخرد کا پاس ضروری ہے۔ حوصلہ، جاں نثاری کا جذبہ لازمی ہے۔ شاعر کی مراد یہ ہے کہ ایک سچا عاشق ہی مشکل ترین مرحلے کو سر کر سکتا ہے۔ یعنی دلوں کی دھڑکنوں سے جو واقف ہو۔ جو

ذہن و دل کے مابین امتیاز جانتا ہو، جو دونوں کی اہمیت اور افادیت کا علم رکھتا ہو، اس کے سامنے زندگی کے راز منکشف ہو جاتے ہیں۔ ظاہر و باطن کا فرق جن پر واضح ہو، انھیں ہی زندگی ہمراز بناتی ہے۔ مشکلوں کو آسان کرنے کے نسخے بھی ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ وہی آگ کو گلزار بھی کر سکتا ہے۔ جو دل عشق سے سرشار ہوتا ہے، دشت و بیاباں کو آباد بھی کر سکتا ہے۔ یہاں شیشہ گری کی علامت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جسے عشق حسین بناتا ہے وہی کائنات کو جمال بخشتا ہے۔

جنوں کی سیر کرتا رہ گیا وہ
جسے کچھ حوصلہ تھا آگہی کا
جنوں کی راہ پر کیوں چل پڑا ہے
کہیں پتھر نہ لگ جائے کسی کا

کشمکش، تصادم اور تذبذب نے شعر میں جدت پیدا کر دی ہے اور ندرت کا رنگ نکھر آیا ہے۔ اس شعر کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ جس انسان کے اندر علم و آگہی یعنی شعور پانے کا حوصلہ یا تڑپ ہوتی ہے، وہ اکثر دیوانگی اور جنوں کی کیفیت میں ہی کھو کر رہ جاتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ عقل اور جنوں دو الگ راستے ہیں، لیکن یہاں شاعر کہہ رہا ہے کہ سچی آگہی کی جستجو خود ایک جنوں ہے، جو انسان کو ایک لامتناہی سفر پر ڈال دیتی ہے۔

جن کا یہ ایمان ہے کہ زندگی ہوش و خرد کے سوا کچھ بھی نہیں، اور وہ جو عمر بھر اسی نظریے کے پابند رہتے ہیں۔ جو فقط منطق اور فلسفہ کو ہی تسلیم کرتے ہیں اور جنھیں لگتا ہے زیست صرف عقل کے مدار پر ہی گھومتی ہے، سائنس کے فلسفے پر ہی حیات اور کائنات کا نظام چلتا ہے، ہر شے کے پیچھے اسباب و علل کارفرما ہوا کرتے ہیں، یہ بات اپنی جگہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس حقیقت یہ بھی ہے کہ عقل سے پرے بھی زندگی ہے، جہاں شعور و ادراک بے بس و لاچار نظر آتے ہیں۔ دیوانگی کے آگے عقل حیران و پریشان ہو جاتی ہے۔ جب ذات اور حیات جنوں کے راستے سے گزرتی ہیں تب خرد کے پر جلنے لگتے ہیں۔ جنوں کی دنیا میں ہوش کے ہوش اڑے رہتے ہیں۔ عقل اور عشق، جنوں اور خرد کی معرکہ آرائی کوئی نئی نہیں ہے۔ ان کے مابین خانہ جنگی اور کشاکش ہمیشہ سے رہی ہے۔ اقبالؔ کے ہاں یہ کشمکش بارہا نظر آتی ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور

چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے
اقبالؔ

نرگس پہ پڑی شبنم قطرہ نہیں دریا ہے
جس کا کبھی رک جانا آسان نہیں ہوتا

مولانا ارشاد کا جذباتی اور استعاراتی شعر ہے جو عشق، درد اور جذبوں کی شدت کو بیان کرتا ہے۔ محبت یا کسی بھی جذبے کی ابتدا اگرچہ چھوٹی ہوتی ہے لیکن حالات اور اسباب وعلل سے رفتہ رفتہ اس میں شدت پیدا ہونے لگتی ہے۔ جیسے شبنم کے قطرے کی بساط کچھ بھی نہیں، لیکن جب وہ انتہا کو پہنچتا ہے تو ایک ایسے دریا کا روپ اختیار کر لیتا ہے جسے قابو میں لانا یا روکنا ممکن نہیں رہ پاتا۔ شبنم کے معمولی قطرے میں جب وجد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو وہ سیل رواں کا روپ دھار لیتا ہے۔ ''نرگس پہ پڑی شبنم'' یہ حسن، نفاست، لطافت اور محبت کی نازک ترین ابتدا کی علامت ہے۔ ''قطرہ نہیں دریا ہے'' جذبات کی شدت اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ قطرہ جو معمولی نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک دریا ہے، جس میں موجوں کی فوجیں صف بہ صف ہیں۔ ''جس کا کبھی رک جانا آسان نہیں ہوتا'' جب دریا کی معمولی لہریں سرکشی پہ اتر آتی ہیں تو طغیانی اور تلاطم سے دریا میں طوفان پیدا ہونے لگتا ہے اور حالات گرفت سے باہر ہو جاتے ہیں۔

یہ شعر محبت کی شدت، ہجر کا ناقابل بیان کرب، انسانی جذبوں کے وفور کا ترجمان ہے۔ اسی واردات قلبی کا ذکر غالب یوں کرتے ہیں ''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا'' مولانا کے ورثے میں شریعت، طریقت اور حقیقت بھی آئی۔ اسلاف نے معرفت حق کا درس دیا اور علم وحکمت کے سبق بھی پڑھائے۔ اس لیے درون ذات میں عشق حقیقی نے پناہ لے لی۔ تصوف نے سلوک کے مرحلوں سے روشناس کرایا، اور پھر ان کی طبیعت تصوف اور اصفیا کی راہ پر چل پڑی۔ انھوں نے درگاہوں اور آستانوں سے تبرکات کے خزانے پائے تو وجود وجد میں آ گیا۔ اکابرین، عمائدین اور بزرگان دین کے فیوض وبرکات نے ان کے باطن کو اس قدر روشن کیا کہ ذات اور کائنات کے پوشیدہ راز ان پر ظاہر ہو گئے۔ محبوب ومحب کے درمیان کے حجابات اٹھ گئے اور پھر پکار اٹھے ۔

ظلمتیں کافور ہوکر رہ گئیں پاس میرے نور کا پیکر جو تھا

یہ خوب صورت شعر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے محبت، عقیدت اور ان کی روحانی روشنی کا احاطہ کرتا ہے۔ شعر اس نکتہ کی جانب اشارہ کر رہا ہے کہ جب تک نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل رہا، کفر وگمراہی کی تاریکیاں کافور ہو گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن، ان کی سیرت مبارکہ اور

تعلیمات ہی نور کا پیکر ہیں۔ درون خانہ اسی نور سے منور ہے، جن کی موجودگی سے دل و دماغ پہ چھائے ہوئے اندھیرے دور ہو جاتے ہیں۔ یہ روشنی اسی عشق کا پرتو ہے، جس سے ظلمتیں کافور ہوئیں۔ یہاں ظلمتوں سے مراد وصال یار کے درمیان حائل تمام دشواریاں ہیں۔ کبھی نفس امارہ اور کبھی خواہش دنیا درمیان میں چلی آتی ہے۔ اس مشت خاکی کے تقاضے، کبھی بے ثباتی عالم کے مسائل، کبھی حرص و ہوس کی تباہ کاریاں، یہ سب وہ اندھیرے ہیں جو ایک عاشق کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں۔ سرکش تمنائیں اور خود سر آرزوئیں محبوب اور محب کے مابین دیوار کی مانند کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پیچیدگیوں اور الجھنوں میں ملوث رکھتی ہیں۔ نفس کا مارا ہوا انسان بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک ایسا نسخہ شاعر کے ہاتھ آ گیا ہے جو ان گمراہ کرنے والی مادیت کی کاٹ ہے۔ یار کی یاد، معشوق کا ذکر ہی ظلمتوں سے نجات دلا سکتا ہے، شرط بس اتنی ہے کہ عشق صادق ہو۔ شاعر نے ایک اور طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ایمان کی روشنی اگر پاس ہے تو کفر کے اندھیرے گمراہ نہ کر پائیں گے۔ معشوق حقیقی سے رشتۂ دائمی ہی سے اندھیروں کی چارہ سازی ممکن ہے۔ محبوب کی محبت ہی تمام ظلمتوں کا علاج ہے ۔

ساری دنیا کی ہدایت کے لیے لامکاں خود ہے مکاں کا آئینہ

یہ شعر بھی شاعر کی صوفیانہ اور عارفانہ رسائی کا حاصل ہے۔ یہ شعر اس بات کا شارح ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رسالت اور آپ کی آفاقی ہدایات تمام جہانوں کے لیے ہیں۔ وہ ہستی جو لامکاں سے تعلق رکھتی ہے، یعنی وہ ذات مقام قرب الٰہی، جہاں مکان کی قید نہیں سے نسبت رکھتی ہے۔ وہی دنیائے فانی جو مکان میں اللہ کی ذات، صفات اور نور کا حقیقی آئینہ دار اور مظہر ہے۔ ''لامکاں خود ہے مکاں کا آئینہ'' یہ تشبیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت اور نورانیت کے حسین امتزاج کو ظاہر کرتی ہے کہ آپ اس دنیوی مکان میں جلوہ گر ہو کر لامکانی حقیقت یعنی خدائی صفات کا عکس دکھا رہے ہیں۔ ساری دنیا کی ہدایت سے مراد یہ ہے کہ آپ کی لائی ہوئی تعلیمات، آپ کا نور مجسم جو سراج منیر ہے کسی ایک کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک تمام بنی نوع انسان کے لیے رشد و ہدایت کا منبع ہے۔ اس تناظر میں خالد تقشبندی کا شعر دیکھیں ۔

ہر زمانے کی آپ رحمت ہیں
ہر زمانہ مرے حضور کا ہے

.....

نکہت گل کی طرح چاک گریباں ہو کر
گلشن زیست سے میں دور نکل جاؤں گا

اس شعر کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ شاعر اپنی تلخیوں یا جنونِ عشق میں اس قدر بے حال ہے کہ وہ پھول کی کلی کے کھلنے کی طرح اپنا گریباں چاک کر کے اس دنیا یعنی گلشنِ زیست سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانا چاہتا ہے۔ جس طرح پھول کھلتے وقت اپنی کلی کی قبا، لباس چاک کر دیتا ہے، شاعر بھی اسی طرح اپنی بے خودی یا دنیا سے بے زاری کی حالت میں زندگی کے چمن سے رخصت ہو جانے کی بات کر رہا ہے۔ یہ شعر بھی ایک نئے جہان کا پتہ دیتا ہے، ایک نئے راز سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اس تلخ سچائی کی نشاندہی شاعر کی ہے کہ اس جہانِ فانی کا فنا ہونا طے ہے۔ نہایت لطیف خیال کو شعری روپ عطا کیا ہے۔ ایک عاشق کی مانند گریباں چاک کر کے حیاتِ فانی سے حیاتِ بقا کے سفر پر چل دیں گے ۔

لب جو ہلتے ہیں تو ہر درد کا ہوتا ہے علاج
کیسے ارشادؔ مسیحا کا وہ دم پاؤں گا

اس شعر میں شاعر محبوب کی باتوں کی تاثیر کو مسیحا کے معجزاتی دم سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کی شفا بخش صفت کو اجاگر کر رہا ہے۔ شاعر اس مشکل طلب تاثیر (دمِ مسیحا) کو پانے کی حسرت اور اپنے درد کے علاج کے لیے محبوب کی گفتگو کا منتظر ہے۔ اس میں معشوق کی کمال مسیحائی اور بے نیازی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ جو میرا معشوق ہے، اس کے دیدار سے ہر کس و ناکس جلا پاتا ہے، اور اس کے لب ہلنے سے یعنی بات کرنے سے ہر بیمار شفا پاتا ہے، لیکن ایک میں ہوں کہ اس نگاہِ ناز کی عنایات سے محروم ہوں۔ عاشق کی بے بسی اور بے کسی کا اظہار ہے۔ یہاں مولانا ارشاد نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ معشوق کی بارگاہِ نیاز میں حاضری کی تمنا ہر عاشق کی ہوتی ہے ۔

کہتے ہیں عشق ہجر کی لذت کا نام ہے
گر وصل ہاتھ آ گیا، ارمان تو گیا

یہ شعر عشق و محبت کے فلسفے کو بہت خوب صورتی سے بیان کرتا ہے کہ جدائی میں تڑپ، چاہت اور محبوب کو پانے کی بے قراری لذت دیتی ہے، جب کہ وصال کے بعد انتظار اور خواہش کے خاتمے سے عشق کا حقیقی جوش و جذبہ ماند پڑ جاتا ہے۔ کلاسیکی شعرا کے یہاں خیال کی یکسانیت معیوب تصور نہیں کی جاتی بلکہ اس سے خیال کا آفاقیت کا پتا چلتا ہے۔ ہر دور اور خیال، زمان و مکان کے بدلتے ہی اپنی معنویت بدل دیتا ہے، اور شاعر کا انداز بیان جدت اور ندرت پیدا کرتا ہے۔ عاشق جب تک ہجر میں ہوتا ہے محبوب کی یاد میں تڑپتا اور ہر لمحہ وصل کی تمنائیں کرتا ہے، اور جب وصال نصیب ہو جاتا ہے تو وہ بے تابی اور بے کلی ختم ہو جاتی ہے۔ ''وصل میں مرگ آرزو'' یعنی وصال میں خواہش کی موت کا تصور کلاسیکی شعرا کا خاصہ رہا ہے۔ یہ شعر

عشق کی نفسیات اور ہجر کی تڑپ کو وصل پر ترجیح دیتا ہے۔ عشق کا اصل حسن جدائی کی کیفیت، تڑپ اور محبوب کو پانے کی آرزو میں ہے۔ اگر محبوب مل جائے تو وہ تڑپ اور انتظار ختم ہو جاتا ہے، جس سے عشق کا سحر اور ارمان باقی نہیں رہتا۔ ہجر عاشق کو مسلسل محبوب کی یاد میں مست رکھتا ہے، جسے لذت طلب کہا گیا ہے۔ وصل کو اکثر آرزوؤں کی موت سمجھا جاتا ہے کیوں کہ ملاقات کے بعد جدائی والی بے قراری نہیں رہتی۔ عاشق دل کے غلام ہوتے ہیں اور وصل کی باتیں کر کے ہجر کو کم نہیں کرنا چاہتے۔

عشق میں وصل کی آرزو ایک فطری کیفیت ہے کہ ہجر کی لذت عشق کی آگ کو تیز تر کر دیتی ہے۔ تڑپنا مرغ بسمل کی طرح عاشق کو زندگی بخشتا ہے۔ اس لیے وصل میں وہ مزہ نہیں جو ہجر میں ہے۔ وصل کے ہوتے ہی تمنائیں کافور ہو جایا کرتی ہیں۔ یعنی عشق کے کمال تک پہنچنے میں ہجر کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہاں اسی خیال کو جون ایلیا نے کچھ اس طرح باندھا ہے۔

جان لیوا تھیں خواہشیں ورنہ
وصل سے انتظار اچھا تھا

میر تقی میرؔ کا خیال دیکھیے۔

وصل میں رنگ اڑ گیا میرا کیا جدائی کو منھ دکھاؤں گا
سوچا تھا ایک ساتھ چلے عمر کا سفر الفاظ رہ گئے مگر عنوان تو گیا

ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھانے والے فقط لفاظی کے عادی ہو گئے ہیں۔ نظریۂ مادیت اور غرض پرستی نے رشتوں کو پامال کر رکھا ہے۔ جفا کاری نے خلوص و محبت پر کاری ضرب لگائی ہے اور مکر و فن کا یہ زہر نظام زندگی میں اس درجہ پھیل گیا ہے کہ روحانیت مادی طاقتوں کی اسیر ہو کر رہ گئی۔ فریب اسی مادیت کی پیداوار ہے۔ سود و زیاں کی کارگزاری نے وفا کا دامن تار تار کر دیا ہے۔ اخلاص، اقدار انسانی رشتوں کی بنیاد ہوا کرتی ہے، اور یہی صفات اخلاقی حسن کا مرکز ہیں جو اخوت، انسیت اور اپنائیت کی ضامن ہوتی ہیں۔ یہ بے لوث جذبات، اعتماد، عزت و احترام اور تہذیب و ثقافت کو جنم دیتے ہیں۔ رواداری اور بردباری کو مستحکم کرتے ہیں، جب کہ محبت آگ کو پانی بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مادیت کے نظریئے نے فسق و فجور کو ہوا دی اور پھر اخلاقیات کا شیرازہ بکھر گیا۔ انسانیت اور صحت مند اخلاقی قواعد و ضوابط کی دھجیاں اڑ گئیں۔ عہد و پیمان خاک ہو کر رہ گئے۔ مفاد پرستی اور خود غرضی نے زیست کے ڈھانچے کو منہدم کر دیا۔ وعدہ، وفا، خلوص، ایمان، انصاف، مساوات محبت جیسے تمام تصورات کھوکھلے نظر آتے ہیں۔ کلام جذبات سے خالی ہیں اور احساس سے عاری بھی۔ لفظ بے جان ہیں اور معنی بے معنی ہو گئے ہیں۔

ارشادؔ گر عمل میں ریا کا ہے شائبہ شرکِ خفی سے آپ کا ایمان تو گیا

شرک خفی یعنی پوشیدہ شرک سے مراد نیت اور دل میں چھپا ہوا شرک۔ جہاں انسان نیک عمل خالص اللہ کے لیے کرنے کے بجائے دکھاوے، تشہیر اور ستائش کی خواہش کے لیے کرتا ہے۔ یہ ریاکاری کی ایک شکل ہے جو کسی بھی عمل کو برباد کر دیتی ہے اور اسے شرک اصغر شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ظاہری بت پرستی نہیں بلکہ دل کا شرک ہے جو سنگین اور مہلک گناہ ہے۔ یہ عمل ایمان کی روح کے خلاف ہے۔

یہاں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ عمل میں خشوع وخضوع اور عاجزی کے صفات نہ ہوں تو وہ صرف خارجی پیکر ہو کر رہ جاتا ہے۔ فعل حقیقی ہو یا مجازی، اخلاص اس کی شرط اول ہے۔ ریا کا شائبہ بندگی یا دیوانگی کو کافور کر دیتا ہے۔ ریا اگر کسی بھی حال وقال میں سرایت کر جائے تو مضر ہے۔

مار دیتا جو ہمیں زیر قفس اچھا تھا بال و پر توڑ کے صیاد نے آزاد کیا

پرندے کی بے بسی ولا چاری، اور شکاری کے سفاکانہ مظالم کا بیان ہے، جہاں آزادی کے باوجود پر اڑان بھرنے سے قاصر ہیں۔ صیاد نے بال و پر توڑ کر اسے پرواز کے قابل نہیں چھوڑا۔ رہائی کا پروانہ پرندے کے ہاتھ سونپ دیا۔ لیکن پرندے کی حالت یہ ہے کہ وہ صرف پرواز کی تمنا ہی کر سکتا ہے، اور ایسی آزادی غلامی سے بھی بری ہے۔ قیدی پرندے کی نفسیات اور ظالم کی سفاکی کو اس شعر میں برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شبیر ساجد مہروی نے بھی اسی خیال کو کچھ اس طرح باندھا ہے۔

پر مرے کاٹ کے صیاد نے ارشاد کیا لے قفس کھول دیا، جا تجھے آزاد کیا
اپنی زلفوں کا بنا کر مجھے قیدی اس نے پھر یہ ارشاد کیا، جا تجھے آزاد کیا

حسن کی ستم شعاری اور عشق کی ناز برداری ازل سے ابد تک کی کہانی ہے۔ عاشق کا شیوہ بھی یہی ہے اور اس کا نصب العین بھی یہی۔ عاشق اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ عشق میں جور وستم بھی پنہاں ہیں اور اس آزمائش سے گزر کر ہی قلب کو سکون اور روح کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ بے دادگر نے ایسی آزادی بخشی کہ اس کی رہائی سے بہتر تو قفس کی موت تھی۔ صیاد نے قفس سے آزاد کر کے کھلی فضا میں چھوڑ تو دیا لیکن پرواز کے پنکھ نہ رہے۔ یعنی صیاد مجھے آزاد کر کے مجھے مجبور ومقہور دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی حکومت قائم رہے اور میری محکومیت کی معیاد دراز ہو۔ خود مختاری کی باگ ڈور وہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ شاعر نے اس رہائی کی صعوبتوں سے مرجانے کو ترجیح دیا ہے۔

اب بھی عاشق معشوق کے تئیں مثبت خیال رکھتا ہے۔ اس کی ناز برداری کا عالم یہ ہے کہ شاید میرے بغیر صیاد کا وجود بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کی سلطنت ہی منہدم ہو جائے۔ میری محکومیت ہی اس کی

حاکمیت کی دلیل ہے۔صیاد جان سے مارنا بھی نہیں چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ستم کے سلسلے یوں ہی چلتے رہیں۔اس لیے صیاد نے صرف بال و پر ہی توڑے ہیں۔وہ چاہتا تو زندگی بھی لے سکتا تھا لیکن میرے وجود کے ختم ہوتے ہی اس کی کہانی بھی ختم ہو جائے گی۔میرا وجود اس کی بقا کی ضمانت ہے۔شاعر زیرِ قفس ہی جان دینا چاہتا ہے، وہ اس صیاد کے ہاتھوں ہی مرنا چاہتا ہے۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ صیاد نے مارا نہیں اور تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔مرغ بسمل کی سی کیفیت عاشق کی قسمت ہے۔میری بے کلی اور بے چینی ہی معشوق کی تسکین کا سامان ہے۔

تھی کبھی بے خبری اور کبھی کوہ کنی اس نے ہم کو کبھی مجنوں کبھی فرہاد کیا

عشق نے کبھی دنیا سے بے خبر یعنی مست رکھا تو کبھی کوہ کنی پر مامور کیا۔عشق نے ہمیں کبھی مجنوں یعنی دیوانگی بخشی تو کبھی کوہ کنی کی بیڑیاں عطا کیں۔ہم فرہاد اور قیس سے پکارے جاتے تھے، اب مجنوں اور کوہ کن کے لقب سے نوازے گئے۔اس عشق نے ہمیں کیا کیا نہ روپ دکھائے۔یہ عشق کے مرحلے نہایت جان لیوا ہوا کرتے ہیں۔ایک عاشق کی قسمت میں چین و قرار نہیں ہوتا۔یہ تلمیح کا شعر ہے۔شاعر نے اپنی کیفیت کو مجنوں اور فرہاد سے مثال دی ہے۔یعنی اس نے میری حالت ایسی کر دی ہے کہ کبھی بے خبری یعنی بے خودی سی حالت ہو جاتی ہے، اور کبھی کوہ کنی یعنی فرہاد کی حالت ہو جاتی ہے۔زمانے والوں کا جور و جبر مجھ پر ایسا ہوتا رہا ہے کہ میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔اس کی ستم شعاری اور جفا کاری نے مجھ پر وہ ظلم ڈھائے کہ میری حالت مجنوں اور فرہاد کی طرح ہو گئی۔اسی لیے تو جگر نے کہا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

.....

لذت ہجر نے وہ کیف دیا ہے مجھ کو درد دنیا کو بھی نذر غم جاناں کردوں

یہ شعر، جو عشق میں جدائی کی شدت اور اس سے حاصل ہونے والے کیف کو بیان کرتا ہے۔عام طور پر کلاسیکی اردو شاعری میں محبت کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔یہ شعر غم جاناں کو غم دنیا پر ترجیح دینے کا عکاس ہے۔''لذت ہجر نے وہ کیف دیا ہے مجھ کو'' کا تصور عشق میں جدائی کی تکلیف کو روحانی لذت اور خود آگاہی میں بدلنے کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔یہ شعر عاشق کی اس حالت مست کی عکاسی کرتا ہے جہاں ہجر کا دکھ، درد کے بجائے خوشی اور تسکین دیتا ہے۔فرقت کے مزے نے مجھے ایسے سرور اور لطف سے نوازا ہے۔اس سے مراد وہ عجیب کیفیت ہے جب محبوب سے دور رہ کر بھی اس کی یاد اور درد میں ایک خاص خمار یا نشہ محسوس ہو۔جہاں انسان درد جدائی کو محسوس کرنے کے باوجود اس میں کھو جاتا ہے''درد دنیا کو نذر غم جاناں کرنا'' دنیاوی

دکھوں، پریشانیوں اور مصائب کو محبوب کے غم کے سامنے قربان کر دینا ہیچ سمجھنا ہے۔ فرقت نے کیف و مستی کی وہ دنیا آباد کی ہے کہ اب وصل کی تمنا جاتی رہی ؎

سوزشِ عشق سے جب شمع کو روتے دیکھا آرزو جلنے کی پیدا ہوئی پروانے میں

اس خیال نے شمع اور پروانے کی روایتی داستان عشق کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے، جہاں شمع کی سوزش یعنی تڑپ اور جلن کو دیکھ کر پروانے میں بھی جلنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ یہ عشق حقیقی یا مجازی میں بے قراری اور تڑپ کا استعارہ ہے، جہاں محبوب کی تکلیف عاشق کو اپنی جان نثار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ عشق کی سوزش مطلب شمع کا جلنا اس کے درد عشق کی علامت ہے۔ پروانے کی آرزو سے مراد پروانہ خود کو شمع کے عشق میں فنا کرنا چاہتا ہے۔ جب پروانے نے دیکھا کہ شمع محبت کی آگ میں پگھل رہی ہے۔ تو اس کے دل میں بھی وہی درد اور تڑپ پیدا ہوئی، وہ بھی شمع کی طرح جل کر فنا ہونے کی آرزو کرنے لگا، جو عشق کی انتہا ہے۔ عشق میں ملنے والی تکلیف اور بے کلی عاشق کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔ شمع کا پگھلنا اور دھوئیں کا نکلنا آہ و بکا کی علامت ہے ؎

جس کو پینے کا سلیقہ نہیں آتا ارشادؔ وہ پلانے کے لیے بیٹھے ہیں میخانے میں

یہ ایک مشہور شعر ہے جو اکثر طنزیہ یا اصلاحی انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جن لوگوں کو خود علم یا صلاحیت نہیں، وہ دوسروں کو سکھانے یا رہنمائی کرنے کے لیے بیٹھ گئے ہیں۔ یہ شعر ایسے افراد کی نشاندہی کرتا ہے جو نااہل ہوتے ہوئے بھی منصب ہدایت پر فائز ہیں یا جنھیں خود کسی چیز کی سمجھ بوجھ نہیں لیکن وہ دوسروں کو مشورے دے رہے ہیں۔ یہ شعر ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے جہاں حقیقی مستحقین محروم ہوں اور نااہل افراد مسند اقتدار یا اہم عہدوں پر فائز ہوں۔ اسی طرح ؎

فراز عشق کی منزل کو کوئی کیا جانے جہاں پہ عقل کی پرواز کی رسائی نہیں

یہ عشق کی اس انتہا کو بیان کرتا ہے جہاں منطق اور عقل جواب دے جاتی ہے اور صرف جذبات و واردات قلبی باقی رہتی ہیں۔ یہ ایک جذباتی کیفیت ہے جو مادی دنیا کی حدود سے ماورا ہے۔ جہاں عقل کی رسائی نہیں۔ اس شعر کے اہم نکات یہ ہیں کہ عشق کا مقام، عشق ایک ایسی منزل ہے جو عقل و شعور سے بالاتر ہے۔ عقل کی محدودیت، جہاں عقل جواب دے دیتی ہے، وہیں سے عشق کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جذباتی کیفیت: یہ وہ مقام ہے جہاں صرف عشق کی حکمرانی ہوتی ہے، نہ کہ دنیاوی فہم کی ؎

ہوا سے کہہ دو کہ اوقات میں رہے اپنی ابھی چراغ محبت جلا رہا ہے کوئی

یہ ایک بھرپور اعتماد اور حوصلے کا شعر ہے، جو چیلنجز کے سامنے ڈٹ جانے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس

خوب صورت شعر میں عشق کے اعتماد اور ارادے کی مضبوطی کی کیا ہی خوب عکاسی کی گئی ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے کہ جب انسان کے دل میں سچی محبت یا کسی بلند مقصد کا جذبہ ہو تو وہ دنیا کی مخالفت اور نامساعد حالات کی پروا نہیں کرتا۔ یہ شعر دیکھیے ؎

جب بھی حق کے لیے آواز اٹھائی ہم نے اس نے ہر بار انوکھا ستم ایجاد کیا

یہ شعر مزاحمت اور احتجاج کی عکاسی کرتا ہے۔ حق گوئی کے لیے بلند کی جانے والی آواز کے خلاف سر پھری طاقتیں ہمیشہ سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اس شعر میں شاعر حکمران وقت یا جابر طبقے کے رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب بھی سچائی اور انصاف کی بات کی گئی، ستم شعار طبقے نے نئے نئے طریقوں اور حربوں سے ہم پر ظلم اور استبداد کیے۔ اسی طرح کہتے ہیں ؎

لرزش میں ہے لو، ہم تو شمع شب آخر ہیں بجھتے ہیں تو عالم کو پرنور بناتے ہیں

اس شعر کا مفہوم بہت گہرا اور حوصلہ مندانہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ ہماری زندگی چراغِ سحر کی مانند ہے، شمع بجھنے کے قریب ہے، لیکن ہم ہار ماننے یا افسردہ ہونے کے بجائے اپنی آخری سانسوں تک دنیا کو روشنی اور فیض پہنچاتے رہے گے۔ یہ ایسے جرأت مندانہ خاتمے کی عکاسی ہے جہاں انسان مٹ کر بھی دوسروں کے لیے روشنی چھوڑ جاتا ہے۔ تاکہ چراغوں کا سلسلہ یوں ہی قائم ودائم رہے اور تاریکیوں سے نبرد آزما ہوتا رہے۔ یہ شعر اپنی قربانی، مقصدیت اور فنا ہو کر بقا پانے کے فلسفے کو بہت خوب صورتی سے بیان کرتا ہے۔ یہ زندگی کے آخری لمحات میں بھی اوروں کے لیے اجالے کا ذریعہ بننے اور ظلمت کو مٹانے کا عزم ظاہر کرتا ہے۔ کلیدی نکات شعر کے یہ ہیں 'شمع شب آخر' ایسی زندگی جو اپنے انجام کے قریب ہے'۔ لرزش میں ہے' لو زندگی فنا ہونے کے قریب پہنچ چکی ہے۔ 'عالم کو پرنور بنانا' روشنی اور تابنا کی کی وراثت چھوڑ جانا۔ یعنی ایسی روشنی، ایسی رمق چھوڑ جانا تاکہ دنیا روشنی سے محروم نہ رہے۔

یہ شعر احمد فراز کے مشہور شعر ''شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا/ اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے'' کے جذبے سے مماثلت رکھتا ہے، جو تاریکی کی شکایت کرنے کے بجائے روشن خیالی اور جدوجہد پر زور دیتا ہے۔ ظلم و جبر و استبداد کے خلاف ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

چاہے وہ نمرود ہو شدّاد ہو اب کہیں ان کا نشاں کچھ بھی نہیں

یہ شعر انسانی تاریخ کے ان طاقتور اور مغرور بادشاہوں کی نشاندہی کرتا ہے کہ جنھوں نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اپنی جنت تعمیر کی لیکن اب ان کے نام ونمود تک باقی نہیں۔ وقت اور موت نے ان کی عظیم الشان سلطنت، ان کے تخت وتاج کو بھی تاراج کر دیا جس کی بنیاد پر ظلم و بربریت قائم ودائم تھی۔ آج ان کی باقیات

تک باقی نہیں، جب کہ حق اور سچائی کا پرچم تمام مظالم کے باوجود باقی رہتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور تکبر کا ختم ہو جانا فنا کی دلیل ہے۔ نمرود اور شدّاد جیسے مغرور اور سرکش بادشاہ، جنھیں اپنی طاقت پر بہت زعم تھا، وہ سب خاک ہو گئے۔ 'نمرود و شداد کا' غرور اور ان کی خودسری انھیں ہی لے کر ڈوب گئی۔ 'نیرنگ جہاں' یعنی دنیا کی حقیقت ایک دھوکہ ہے اور اس جہاں کا رنگ و روپ عارضی ہے۔ اس کے فریب میں آنا خسارے کا سودا ہے۔

حق پرستی کربلا سے سیکھ لو سامنے تیر و سناں کچھ بھی نہیں
کربلا سے تھی مستعار حیات ظالموں سے حساب میں گزری

واقعہ کربلا جبر و استبداد کے خلاف استقامت کی دلیل ہے۔ کربلا حق و باطل کی علامت ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کردار ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔ ان کا طرز عمل، نظریہ حیات ہماری رہنمائی کا استعارہ ہے۔ درس کربلا یہ سکھاتا ہے کہ مظلوم اور ظالم کی جنگ میں مظلوم کی جانب سے کھڑا ہونا سنت حسین ہے۔ شاعر واقعہ کربلا کی روشنی میں ایک مرد مومن اور بلند کردار شخصیت کی زندگی کو پیش کر کے حق پرستی کی ترغیب دیتا ہے۔ 'کربلا سے تھی مستعار حیات' کربلا یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے جو زندگی ادھار لی گئی وہی کامران ٹھہری۔ یعنی حیات فانی نے کربلا سے بقا پائی۔ ''ظالموں سے حساب میں گزری'' زندگی کا ہر لمحہ ظالموں، جابروں اور مطلق العنانوں کے خلاف جہاد میں گزرا۔ حق کی پرچم کشائی اور دست باطل کی بیعت سے انکار میں گزری۔ حق پرستوں کی جماعت کی سرخروئی زیست کا مقصد رہا۔ کربلا کے اصول و ضوابط کو اپنا مطمح نظر جانا۔ باطل کے سامنے سر نہ جھکایا بلکہ حسینیت کے راستے پر چلتے ہوئے گزار دی۔

کتنے مہر و ماہ اس میں دفن ہیں یہ زمیں ہے آسماں کا آئینہ

زمین صرف خاک نہیں کرتی بلکہ مہر و ماہ کو پناہ بھی دیتی ہے۔ زمین ایسی ہی نایاب شخصیات کا خزانہ ہے۔ زمین کی وسعت قلبی اور کشادگی نے کتنی ہی آسماں ہستیوں کو اپنے اندر سما لیا ہے، اس میں مدفون عظیم شخصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ زمین عظیم انسانی خزانوں کا گہوارہ ہے۔ یعنی یہ خاک معمولی نہیں ہے بلکہ اپنے سینے میں بے شمار چمکتے ستارے چھپائے ہوئے ہے۔ یہ مصرعہ قابل غور ہے کہ جس طرح آسمان چاند، سورج اور ستاروں سے آباد ہے ''یہ زمیں ہے آسماں کا آئینہ'' یہ زمین بھی بے شمار چاند سورج اور لاتعداد ستاروں سے آباد ہے، اور نہ جانے کتنے مہر و ماہ قیامت تک اس زمین کی گود میں پناہ لیں گے اور زمین قدر و منزلت میں آسمان سے گراں قدر ہو جائے گی۔ غالب کا یہ شعر بھی اسی خیال کا غماز ہے ۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ زمین صرف ایک مقبرہ نہیں ہے بلکہ لاکھوں حسین اور چاند سورج جیسے لوگوں کی داستانوں کا آئینہ ہے۔ دنیا میں جتنے بھی خوب صورت لوگ فوت ہوئے زمین اور خوب صورت ہوگئی۔ زمین بے شمار حسین وجمیل اور معزز، مکرم اور عظیم ہستیوں کی پناہ گاہ ہے۔ زمین ان کے لیے آرام گاہ ہے۔ جب قیامت کے دن یہ سب قبروں سے اٹھیں گے تو ایک حیران کن منظر ہوگا۔ زمین کی تاریخ، اس کے رازوں کی آئینہ داری ہے۔ مضطرؔ خیرآبادی کا شعر بھی اسی بات کا گواہ ہے۔

ہزاروں حسن والے اس زمیں میں دفن ہیں مضطرؔ
قیامت ہوگی جب یہ سب کے سب مدفن سے نکلیں گے

مولانا کی غزلیں داخلی کیفیات اور خارجی معاملات کا آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے مقتضائے بشری، میلانات عصری، نفسیات، جمالیات، سماجی شعور و ادراک، دامن چاک، جذبۂ بے باک، ذہنی وقلبی کشاکش کو غزل کے سانچے میں ایسا ڈھالا اور فکر وفن کا ایسا نایاب امتزاج پیش کیا کہ غزل کا حسن دوبالا ہوگیا۔ یہ فن کاری ان کی فصاحت و بلاغت کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنی بالغ نظری اور شاعرانہ فہم وفراست سے وہ کمال پیدا کیے جن سے ان کی شاعرانہ شناخت استحکام کو پہنچی۔ ان کی غزلوں میں انسانی فطرت، عشق کی جبلت، حسن کی نزاکت، وصال کی شدت اور ہجر کی لذت پنہاں ہے۔ حیات کے نشیب وفراز اور محبوب کا انداز کریمانہ بے ثباتی عالم اور بقا وفنا کا تصور، غزل کے اشعار میں خوب صورتی سے ڈھلا ہے۔ دنیا کی ستم شعاری، فصل گل کی ناز برداری اور دل ناداں کی ہوشیاری غزل کے خمیر میں ایسے محلول ہوئی کہ غزل ظاہر و باطن سے درخشاں ہوگئی۔ غزل نے افکار ونظریات کو اپنے سانچے میں اس طرح اتارا کہ ذات وکائنات کے افق روشن ہوگئے اور چار سو قوس قزح کے رنگ بکھر گئے۔

مجموعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ غزل ان کے باطن میں سرایت کر گئی۔ وہ فنافی الغزل ہوئے تو غزل نے بقائے دوام سے نوازا۔ حالاں کہ ہر ایک کی یہی خواہش ہوا کرتی ہے کہ شاعری اسے بھی آب حیات عطا کرے لیکن شاعری یہ مقام ہر ایک کو عطا نہیں کرتی۔ یہ منصب سب کے حصے نہیں آتا۔ یہ تبھی ممکن ہے جب سپردگی مقام بندگی کو پہنچ جائے۔ اس مضمون میں مولانا کی غزلوں کا مکمل احاطہ ممکن نہیں ہے۔ قاری اور سامع کا ذہن ودل جس قدر ذات، حیات اور کائنات کے اسرار ورموز سے آگاہ ہوگا، غزلیں ان پر اتنی ہی زیادہ منکشف ہوتی جائیں گی۔ اعلیٰ شعری تخلیقات کا کمال یہی ہے کہ زمان ومکان کے بدلتے ہی اس کی عصری معنویت اور آفاقیت کے باب کھلتے جاتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عشرت ناہید
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، رابطہ نمبر: 9598987727

جرأت اظہار کا شاعر: ارشاد حسین

تلخیص:

غزل اپنی ہمہ گیر حیثیت، اختصار پسندی اور جذباتی وسعت کی بنا پر ہر دور میں اردو شعرا کا موثر ذریعۂ اظہار رہی ہے۔ مولانا ارشاد حسین کا شمار بھی انہی شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے سادہ، رواں اور اثر انگیز زبان کے ذریعے غزل میں اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا اور منفرد شناخت قائم کی۔

ارشاد حسین کی غزل گوئی کا نمایاں وصف سادگی، خلوص اور جذبے کی صداقت ہے۔ وہ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب سے گریز کرتے ہوئے عام فہم انداز میں اپنے تجربات و مشاہدات کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں محبت، ہجر، وصال، امید اور محرومی جیسے جذبات نہایت شدت اور دل کشی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت محض رومانوی جذبہ نہیں بلکہ ایک وسیع انسانی قدر ہے۔

ان کی شاعری میں سماجی شعور بھی بھرپور انداز میں موجود ہے۔ وہ اپنے عہد کے مسائل، ناانصافیوں اور انسانی دکھ درد کو جرأت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے اشعار نہ صرف فرد کی داخلی کیفیات بلکہ اجتماعی زندگی کے مسائل کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں امید، حوصلہ اور اخلاقی اقدار کا پیغام بھی موجود ہے۔

فنی اعتبار سے ارشاد حسین بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندی کے ساتھ تازہ اور نادر خیالات پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت اور جدید حسیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، جو انھیں اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز بناتا ہے۔

کلیدی الفاظ:

اردو غزل، ارشاد حسین، سادگیٔ بیان، جذباتی صداقت، سماجی شعور، محبت، ہجر و وصال، جدید حسیت،

کلاسیکی روایت، فنی مہارت، امید و حوصلہ۔

اردو شاعری کی روایت پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو صنف غزل اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہر شاعر کے کلام میں موجود ملتی ہے، غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جس نے ہر دور اور زمانے کا ساتھ دیا ہے، جس کی بڑی وجہ یہی رہی ہے کہ اس میں ہر طرح کے موضوعات کو دو مصرعوں میں پیش کر دینے کی صفت موجود ہے۔ چاہے وہ کلاسیکی شاعری ہو، ترقی پسند یا پھر جدید دور کے موضوعات ہوں ہر طرح کے جذبات و احساسات کی ترجمانی اس صنف میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اردو غزل اپنے اختصار، لطافت اور گہرے جذباتی اظہار کے باعث بھی ہمیشہ مقبول رہی ہے اور ہر دور میں شعرا نے اپنے اسلوب اور فکر سے اس کے دامن کو وسعت عطا کی ہے۔ انہی شعرا میں ارشاد حسین کا نام بھی قابلِ ذکر ہے جو اردو شاعری میں روایتی اور جدید شاعری کے درمیان اپنی مستحکم شناخت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ارشاد حسین نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، نوحہ، سلام، رباعی، نظم اور غزل سبھی اصناف ان کے کلام کا حصہ ہیں، لیکن انھوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے بطور خاص غزل کو ہی وسیلہ بنایا ہے۔

اردو غزل کو انھوں نے جو آہنگ، سادگی اور روانی عطا کی ہے وہ ان کا خاص وصف قرار پاتا ہے۔ ان کی غزل گوئی میں فکری گہرائی، سادہ مگر موثر زبان اور جذبوں کی صداقت نمایاں طور پر نظر آتی ہے ؎

جیسے ہی حکم ہجر ملا مان تو گیا دیوانگی کے درد و الم جان تو گیا
ہم نے کتنی سخت دیں قربانیاں پھر بھی باقی ہیں تو ہیں حیرانیاں

ارشاد حسین مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب سے گریز کرتے ہیں اور اپنی بات عام فہم اور دل نشیں انداز میں بیان کر دیتے ہیں، زبان کی سادگی قاری کو متاثر کرتی ہے اور اس کے دل کی صدا بن جاتی ہے۔ ان کے یہاں روزمرہ زندگی کے تجربات اور انسانی احساسات فطری انداز میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ بیان ہوتے ہیں جس کی وجہ سے غزلوں میں تصنع کے بجائے خلوص محسوس ہوتا ہے ؎

جس قدر ان کو بھلاتے ہیں وہ یاد آتے ہیں
صبح کو، شام کو، راتوں کو وہ یاد آتے ہیں

ان کی غزل گوئی میں محبت اور انسانی رشتوں کا بیان بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ محبت کو صرف رومانوی جذبہ نہیں بلکہ ایک وسیع انسانی قدر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں محبت کے ساتھ جدائی، انتظار، امید اور محرومی جیسے جذبات بھی بڑی شدت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس طرح ان کی غزل دل کی

مختلف کیفیات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔

ہجر کے درد نے پیہم ہمیں ناشاد کیا وصل کی آرزو نے زیست کو برباد کیا
دل نے بھی آج ضبط کا وعدہ نہیں کیا غم کو، مگر کسی پہ بھی افشا نہیں کیا

ارشاد حسین کی غزلوں میں سماجی شعور اور اجتماعی زندگی کے موضوعات کو بڑی خوبی سے برتا گیا ہے۔ وہ زندگی کے متعدد پہلوؤں پر غور و فکر کرتے ہیں پھر نئے زاویہ نظر اور فکر کے ساتھ شعری پیرہن عطا کرتے ہیں۔ عہد جدید کے مسائل و معاملات کو وسیع مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، پھر انفرادی تجربات کے پیمانے پر جانچتے ہیں، نتیجتاً جو تاثرات در آتے ہیں انھیں اپنی غزلوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں حساسیت زیادہ نظر آتی ہے اور شعر قاری کے دل کی آواز بن جاتے ہیں۔

راہ حق سے بھٹک رہا ہے بشر کیسی ارشادؔ رہبری ہے یہاں

اپنے عہد کے مسائل، ملک کے سیاسی، سماجی حالات ان کے دل کو درد سے بھر دیتے ہیں۔ وہ عوام کی تکلیفوں پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ ان کے اشعار درد کی تصویر بن جاتے ہیں اور انھیں آفاقیت عطا کرتے ہیں۔

تنکوں کو چن کے ایک نشیمن بنایا تھا اس کو بھی کوئی برق جلائے تو کیا کروں
بڑی مشقتوں سے بستیاں بسائی تھیں خبر نہ تھی کوئی ظالم انھیں جلا دے گا

وہ زندگی کی تلخ سچائیوں کو بڑی جرأت کے ساتھ پیش کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

نفرتیں بک رہی ہیں دنیا میں اب کہاں مہر و دوستی ہے یہاں

یا یہ شعر دیکھیے۔

امیر شہر کو کیا اس کا غم ہے اگر مفلس کوئی بھوکا رہے گا

یہ اشعار اپنے اندر معنی کی گہری وسعتیں رکھتے ہیں اور اپنے عہد کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے عہد کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہے اور شاعری کے ذریعے بیان کرنے میں کوشاں ہے۔

حالات کی ستم ظریفیاں انھیں درد کی شدت سے ہمکنار تو کرتی ہیں، وہ اداس بھی ہوتے ہیں لیکن مایوس نہیں ہوتے، وہ ظلم اور جبر کے باوجود اپنی قوت پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں کو بھی اس کا احساس دلاتے ہیں کہ مایوسی تو کفر ہے، ہمیں اپنی طاقت کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ وہ حوصلہ پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ظلم وستم کی دہر میں چلتی ہیں آندھیاں جلتی رہے جو شمع برابر ہم ہی تو ہیں
تاباں صفت نگینوں کا جوہر ہم ہی تو ہیں ظلمت میں روشنی کا مقدر ہم ہی تو ہیں

اس طرح کے اشعار قاری کو معاشرتی مسائل، انسانی ناانصافیوں اور زمانے کے ظلم کے خلاف سپر ڈالنے کے بجائے اپنی قوتوں کی پہچان کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اور انسان کو اخلاقی قدروں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی غزل صرف جذباتی اظہار تک محدود نہیں رہتی بلکہ فکری پیغام بھی دیتی ہے۔

ارشاد حسین کی غزلوں میں فن کی جولانیاں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ خیال کی تازگی کو بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندی کے ساتھ کہنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ سادہ سی تشبیہات و استعارات سے وہ شعر کے حسن کو بڑھا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے، ان کی غزلوں میں کلاسیکیت اور جدیدیت دونوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ارشاد حسین کی غزل گوئی اردو شاعری کی روایت کا خوب صورت ارتقا ہے، جس میں سادگی، خلوص، جذبات کی سچائی اور سماجی شعور ایک ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔

ارشاد حسین کی غزلوں کا بنیادی وصف سادگی اور اثر انگیزی ہے۔ وہ مشکل اور ثقیل الفاظ کے بجائے سادہ اور رواں زبان استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی شاعری قاری کے دل پر براہِ راست اثر ڈالتی ہے۔ ان کے اشعار میں جذبے کی سچائی اور اظہار کی صفائی نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی اور دیر تک ذہن پر اثر چھوڑتی ہیں۔

غزل انسانی جذبات، عشق و محبت، ہجر و وصال اور زندگی کے مختلف تجربات کے اظہار کا بہترین ذریعہ رہی ہے۔ ان کے نزدیک فن میں اگر سوز دل شامل نہ کیا جائے تو فن پارہ محض الفاظ کا ذخیرہ بن جائے گا، تخلیق کے لیے خلوص، سادگی اور سچے جذبات کا ہونا لازمی ہے۔

ترے لب کے تبسم کا ہے صدقہ کلی کو مسکرانا آ گیا ہے
بادِ نسیم خوب چلی تھی کہ اک گلاب خوش بو لٹا رہا تھا، تری یاد آ گئی

ان کی غزل گوئی میں عشق و محبت کا موضوع مرکزی حیثیت رکھتا ہے، مگر یہ عشق محض رومانوی نہیں بلکہ انسانی اقدار سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے اشعار میں محبت کے ساتھ وفا، جدائی، انتظار اور امید کی کیفیات بھی بڑی دل کشی کے ساتھ بیان ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک شعر میں انسانی جذبات کی گہرائی اس طرح نمایاں ہوتی ہے۔

دل کے زخموں کو چھپانے کی ادا بھی سیکھو زندگی ہنس کے گزارو تو مزا آتا ہے

اس شعر میں شاعر نے زندگی کی تلخیوں کے باوجود حوصلہ اور امید کا پیغام دیا ہے۔ یہی مثبت رویہ ان

کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ارشاد حسین کی غزلوں میں سماجی شعور بھی نمایاں ہے۔وہ اپنے اشعار کے ذریعے معاشرے کی ناہمواریوں اور انسانی مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ان کے یہاں صرف ذاتی جذبات کا بیان نہیں بلکہ اجتماعی احساس بھی ملتا ہے۔بعض ناقدین کے مطابق ارشاد حسین کی شاعری میں اخلاقی اور روحانی پہلو بھی موجود ہے، جو ان کے مذہبی اور فکری پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ان کی غزلوں میں انسان کو سچائی، صبر اور اعلیٰ اقدار کی طرف مائل کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے ۔

ارشادؔ سارے درد جہاں کے سمیٹ کر قدرت جو ترا دل ہی بنائے تو کیا کروں

ارشاد حسین کے یہاں قدرت کی کاریگری اور زمانے کے غم کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اسی خیال کو ہم حیدر دہلوی کے یہاں کچھ اس انداز میں پاتے ہیں ۔

اک دل پہ ختم قدرت تخلیق ہوگئی سب کچھ بنا دیا جو مرا دل بنا دیا

اسی ردیف پر جگر مرادآبادی نے گرہ اس طرح لگائی ہے ۔

بیتابیاں سمیٹ کر سارے جہان کی جب کچھ نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

فنی اعتبار سے بھی ارشاد حسین کی غزلیں قابلِ توجہ ہیں۔وہ بحر، قافیہ اور ردیف کی پابندی کے ساتھ ساتھ خیال کی تازگی کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ان کے یہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال سادہ مگر موثر انداز میں ہوتا ہے۔ان کی غزلوں میں کلاسیکی روایت کی جھلک بھی ملتی ہے اور جدید احساسات بھی نمایاں ہیں۔یہی امتزاج ان کی شاعری کو منفرد بناتا ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ارشاد حسین کی غزل گوئی اردو غزل کی خوب صورت روایت کا تسلسل ہے، جس میں قاری غزل میں مسائل حیات ہی سے روبہ رو نہیں ہوتا بلکہ اپنے عہد کے حالات کی نوعیت سے بھی آگاہ ہوتا ہے، جنھیں پیش کرنے کے لیے ارشاد حسین نئے فکری پیکر تخلیق کرتے ہیں، نئی علامتیں لاتے ہیں اور غزل کو بدلتے عہد کا آئینہ بنا دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں سادگی، گہرائی، جذبات کی صداقت اور سماجی شعور کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ان کی شاعری بلاشبہہ کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔ان کی شاعری کی یہی خصوصیات انھیں اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز کرتی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر اکبر علی
اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، رابطہ نمبر: 6307369930

نکہت رباعی

رباعیات کے آئینے میں مولانا ارشاد حسین کی حق گوئی

تلخیص:

یہ مضمون رباعی کی صنفی و فنی خصوصیات کے تعارف سے آغاز کرتے ہوئے مولانا ارشاد حسین کی رباعیات کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔ ابتدا میں رباعی کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اس کے اوزان، بحرِ ہزج سے تعلق، اور خصی و غیر خصی رباعی کی وضاحت کی گئی ہے۔ ساتھ ہی رباعی کے تاریخی ارتقا کو دکن سے لے کر دہلی و لکھنؤ کے دبستانوں تک بیان کیا گیا ہے، جہاں قلی قطب شاہ، شاہ حاتم، میر، سودا، انیس و دبیر، حالی، اکبرالہ آبادی، فراق اور جوش جیسے شعرا کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مضمون کا مرکزی حصہ مولانا ارشاد حسین کی رباعیات کے فکری و موضوعاتی تجزیے پر مشتمل ہے۔ مصنف کے مطابق مولانا کی شاعری کسی مخصوص اِزم کی پابند نہیں، لیکن ان کی رباعیوں میں ترقی پسند رجحانات نمایاں نظر آتے ہیں، خصوصاً سماجی ناانصافی، غربت، اور سیاسی بے حسی پر ان کی بے باک تنقید ان کی حق گوئی کا مظہر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اصلاحِ معاشرہ، اخلاقی اقدار، انسانی ہمدردی اور حوصلہ افزائی جیسے موضوعات کو بھی موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔

مولانا کی رباعیوں میں واقعاتِ کربلا کو بطور استعارہ استعمال کر کے حق و باطل کی کشمکش، صبر، قربانی اور حق گوئی کے آفاقی پیغام کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں زبان کی سلاست، فکر کی وسعت اور جذبات کی صداقت نمایاں ہے۔ مولانا ارشاد حسین کی رباعیات فنی پختگی اور فکری گہرائی کا حسین امتزاج پیش کرتی ہیں اور اردو رباعی کی روایت میں اہم اضافہ ہیں۔

کلیدی الفاظ:

رباعی، مولانا ارشاد حسین، حق گوئی، بحرِ ہزج، خصی و غیر خصی رباعی، ترقی پسند رجحانات، اخلاقیات،

کربلا، اردو شاعری، سماجی مسائل۔

.....

رباعی عربی کے زبان کے لفظ 'ربع' سے مشتق ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ یوں تو ابتدائی دور میں رباعی، دوبیتی، ترانہ اور چہار مصراعی وغیرہ ناموں سے موسوم رہی۔ رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے جس کے پہلے اور دوسرے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اگر شاعر نے ردیف کا اہتمام بھی کیا تو ہم ردیف بھی ہوتے ہوئے تیسرا مصرع غزل کے دوسرے اشعار کے پہلے مصرع کی طرح قافیہ و ردیف کی قید سے آزاد ہوتا ہے لیکن چوتھے مصرعے میں بھی جب اس کی پابندی کی جاتی ہے تو ایسی رباعی کو شعری اصطلاح میں 'خصی' کہا جاتا ہے۔ خصی رباعیاں ہی زیادہ مستعمل ہیں۔ قدیم زمانے میں زیادہ تر رباعی گو شعرا چاروں مصرعے ہم قافیہ و ردیف کہتے تھے ایسی رباعیوں کو 'غیر خصی' کہا جاتا ہے۔ دور حاضر میں غیر خصی رباعیاں کم ہی کہی جاتی ہیں۔ اردو کی نئی بستی امریکہ میں مقیم خادم اردو احمد مامون غیر خصی رباعیاں کہنے والوں میں ایک اہم نام ہیں۔ ان کا غیر خصی رباعیوں کا مجموعہ 'گفتار' ۲۰۲۴ء میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

رباعی کے لیے بحر ہزج مخصوص ہے۔ اس کے تسکین اوسط کے عمل کے ذریعہ ۲۴/ اوزان حاصل کیے جاتے ہیں اور رباعی اِنہی ۲۴/ اوزان میں سے کسی ایک یا زیادہ سے زیادہ چار اوزان میں کہی جاتی ہے۔ عروض کے ماہرین کے مطابق کسی ایک رباعی کا ہر مصرع الگ الگ وزن میں ہوسکتا ہے۔ اس اعتبار سے رباعی کا ہر مصرع بحر ہزج کے حاصل شدہ کسی بھی وزن میں ہوسکتا ہے۔ اس کا وزن 'لاحول ولا قوۃ الا باللہ' سے بھی ماخوذ ہے لیکن اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ 'لاحول ولا قوۃ الا باللہ' بھی بحر ہزج کے ۲۴/ اوزان میں سے ایک وزن ہے۔

رباعی کی تعریف جو علمائے ادب نے متعین کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پہلے مصرع میں شاعر اپنے خیالات و نظریات کو متعارف کراتا ہے، دوسرے مصرع میں اس کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ تیسرا مصرع در حقیقت پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع کے درمیان ربط پیدا کرنے کا کام کرتا ہے، جب کہ رباعی کا چوتھا مصرع حاصل کلام ہوتا ہے، اس میں شاعر اپنی استادی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ غزل کی ہی طرح رباعی کے لیے موضوعات کی قید نہیں ہے۔ رباعی گوئی کے ابتدائی دور میں رباعیوں کا دامن صوفیانہ اور عاشقانہ موضوعات تک ہی محدود تھا لیکن زمانے کی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ ہی موضوعات میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور رباعیاں فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کے اظہار کے ساتھ ہی متفرق تجربات کی پناہ گاہ بھی بننے لگیں۔ رباعی کے تعلق سے اگر یہ کہا جائے کہ کوئی بھی ایسا خیال، کوئی بھی جذبہ یا فکر نہیں جس کا بیان تخلیقی سطح پر اس میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اردو شمالی ہند میں ضرور پیدا ہوئی لیکن دکنی شعرا اور ادیبوں نے نظم و نثر کی جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ دیگر اصناف کی طرح رباعی گوئی کی اولیت کا سہرا بھی اہل دکن کے ہی سر جاتا ہے اور قلی قطب شاہ کو پہلا رباعی گو شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ قلی قطب شاہ کے ہم عصروں میں ملا وجہی کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے باضابطہ طور پر رباعیاں نہیں کہیں بلکہ غزل کی طرح چند رباعیاں کہہ دیں۔ دکنی شعرا میں غواصیؔ، علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ، نصرتی، ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ اہم رباعی گو شعرا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں شاہ حاتم کو پہلا رباعی گو شاعر قرار دیا جاتا ہے، ان کی ایک مشہور رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

یک ذرّہ نہ کبھو کام آئی مجھ کو
دولت مندوں کی آشنائی مجھ کو
گو فائدہ اُن سے ہو نہ ہو حاتم ہوں
یکساں ہے شاہی و گدائی مجھ کو

شمالی ہند میں ایسے بے شمار شعرا ہیں جنھوں نے چند رباعیاں کہیں، صرف رباعی گوئی کے تاریخی ارتقا میں بطور اہم کڑی اُن کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ میر تقی میر، خواجہ میر درد، محمد رفیع سودا، میر حسن، حسرت دہلوی، غمگین، بہادر علی وحشت، عبدالحئ تاباں، حسن اللہ میاں اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ شعرا نے نہ صرف رباعی گوئی کی روایت کو پروان چڑھایا بلکہ موضوعات کے تنوع سے بھی اس صنف سخن کا دامن وسیع کیا۔ جب دبستان دہلی کی بساط اُلٹ گئی تو دبستان لکھنؤ کی رونق بڑھی۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں دہلوی شعرا کی آمد بڑھنے لگی، انشا، مصحفی، جرأت، رنگین اور خلیق وغیرہ نے بھی رباعیاں کہیں۔ دبستان لکھنؤ بلکہ صنف رباعی گوئی کا سب سے زرّیں دور انیس اور دبیر کا تھا۔ ان دونوں صاحبان کمال نے اردو مراثی کو بام عروج پر پہنچایا اور مجالس عزائے حسین میں پڑھے جانے والے مراثی کی تمہید کے طور پر رباعی کی جانب توجہ دی اور اس صنف کو ترقی سے ہمکنار کیا۔ ان دونوں شاعروں نے رباعی کو پند و نصیحت کے ساتھ ساتھ واقعات کربلا اور ان کے متعلقات کو بھی اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی رباعیوں میں وہ سارے موضوعات ملتے ہیں جنھیں فارسی شعرا نے اپنی رباعیوں میں جگہ دی۔

دہلی میں اردو شاعری کا چراغ نقل مکانی کی آندھی تھمنے کے بعد ایک بار پھر غالب و مومن نے روشن کیا۔ ان شعرا نے اردو رباعیوں کو اپنی فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ غالب نے یوں تو بہت زیادہ رباعیاں نہیں کہیں لیکن ان کی رباعیوں میں غمِ روزگار کو موضوع بنایا گیا۔ محمد ابراہیم ذوق نے بھی بہت اچھی رباعیاں کہی ہیں، ان کے یہاں موضوعات کا تنوع تو نہیں ملتا لیکن روزمرہ اور محاورے کے برجستہ استعمال

میں لطف پیدا کر دیا۔ حکیم مومن خاں مومن نے کثرت سے رباعیاں کہی ہیں۔ اُن کی رباعیوں میں نازک خیالی اور معاملہ بندی کا جادو سر چڑھ کر بولتا دکھائی دیتا ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنی رباعیوں کو کربلا کے واقعات سے جوڑ کر خالص مذہبی رنگ عطا کیا لیکن بڑھتے مغربی رجحانات کی اثر آفرینی نے خواجہ الطاف حسین حالی کے ہاتھوں اصلاحی رنگ غالب رنگ قرار دیا جانے لگا۔ حالی کی ہی طرح اکبر الہ آبادی نے بھی اصلاحی و اخلاقی موضوعات کو رباعی میں اپنے مخصوص لہجے اور طنز کی نشتریت کے ساتھ پیش کیا جس سے اُن کی رباعیوں میں تیکھا پن پیدا ہو گیا۔ حالی و اکبر کی آواز میں آواز ملا کر چلنے والوں میں ایک اہم نام اسماعیل میرٹھی کا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے علاوہ امیر مینائی، میر مہدی مجروح، داغ دہلوی اور عزیز لکھنوی وغیرہ نے بھی رباعی کو ذریعہ اظہار بنایا۔

رباعی کا موضوع کے اعتبار سے عروج کا دوسرا دور فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جوش کی رباعیاں موضوع کے اعتبار سے عمر خیام سے قریب ہیں جن میں تصوف، فلسفہ، رموز ذات، اسرار حقیقت، عرفان ذات، شراب اور شباب کا برملا اظہار ہوا جب کہ فراق کی رباعیاں ہندوستانی ثقافت اور معاشرت کی عکاس ہیں۔ فراق و جوش کے علاوہ فانی بدایونی، سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم، جگت موہن لال رواں، برج نرائن چکبست، عبدالباری آسی، یگانہ چنگیزی، امجد حیدر آبادی اور جاں نثار اختر وغیرہ نے بھی رباعیوں کے حوالے سے اپنی شاعری کا لوہا منوایا۔

دور حاضر میں رباعی کے حوالے سے فرید پربتی، فراغ روہوی، ظفر مرادآبادی، قمر سنبھلی، عادل اسیر دہلوی اور عادل حیات وغیرہ قابل ذکر ہیں جنھوں نے اردو رباعی کے سفر کو تقویت بخشی اور موضوعاتی تنوع بھی بخشا۔ موجودہ دور میں رباعی گو شعرا میں سب سے اہم نام پروفیسر عباس رضا نیر جلال پوری کا ہے۔ ابھی حال ہی میں ان کی رباعیات کا دیوان 'چہار باغ' منظر عام پر آیا ہے جو کہ پانچ دواوین پر مشتمل ہے۔ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اور شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے باہمی اشتراک سے ۲۴ و ۲۵ مارچ، ۲۰۲۶ء کو دو روزہ 'رباعی کے عصری منظر نامہ' پر عالمی سمینار کا انعقاد ہو چکا ہے۔ اس عالمی سمینار میں پروفیسر عباس رضا نیر کی رباعی گوئی، سمینار کا کلیدی موضوع رہی۔ خاکسار نے بھی عباس رضا نیر کے 'چہار باغ' پر اظہار خیال کیا تھا۔

رباعی گو شعرا کے تذکرے میں ایک اہم نام نقی نقوی کا بھی ہے جو کہ اعلیٰ سرکاری عہدیدار تھے اور بہترین خطیب، ذاکر مجلس امام حسینؑ تھے۔ آپ کا رباعیات پر مشتمل شعری مجموعہ 'حقیقت و مجاز' ۱۹۸۰ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر شرف قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نقی نقوی کی چند رباعیاں بطور نمونہ پیش کی جائیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ وہ کس پائے کے شاعر تھے۔

مَحبسِ عارفین ہے دنیا کب کسی کی معین ہے دنیا
پھر بھی ہر دل اِسی کا شیدا ہے کیا فریبِ حسین ہے دنیا
چاند بے نور ہوا جاتا ہے حُسن کافور ہوا جاتا ہے
پڑ گیا عکس کہیں سے اُن کا آئینہ چور ہوا جاتا ہے
افکار کے جھگڑے کہیں جذبوں کے جھمیلے دنیا نے سجائے ہیں عجب شوق کے میلے
سب اہلِ خرد ہو گئے مشغول تماشا دیوانہ کھڑا رہ گیا بیچارہ اکیلے

رباعی کے تعلق سے یہ تمہیدی گفتگو دراصل مولانا ارشاد حسین مرحوم کی رباعی گوئی کے جائزہ سے متعلق ہے۔ مولانا ارشاد حسین جہاں ممتاز عالم دین تھے وہیں شاعرانہ جذبات سے مملو، دھڑکتا ہوا دل بھی رکھتے تھے۔ مولانا موصوف کے فرزند ڈاکٹر ذیشان حیدر ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ فارسی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق مولانا ارشاد حسین ۱۸/اکتوبر، ۱۹۴۹ء کو پورہ معروف، ضلع مئو، یوپی میں محمد شمس الدین بن محمد سلیمان کربلائی کے گھر پیدا ہوئے اور ۷۶ برس کی عمر میں ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو انھوں نے دارِفانی کو خیر باد کہا۔ مولانا عالم باعمل تھے، جس کا ثبوت فہم وفراست اور علم دینی و دنیاوی سے آراستہ اُن کی اولاد ہیں۔ مولانا ارشاد حسین کی یادگار کتابوں میں 'فلسفہ توحید'، 'افادیتِ نماز'، 'افادیتِ روزہ' اور 'بلاغتِ قرآن' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اِن کتب کے علاوہ مختلف رسائل وجرائد میں علمی وادبی اور دینی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ عالم کے ساتھ ساتھ وہ زبردست فطری شاعر تھے۔ اُنھوں نے حمد، نعت، منقبت، غزل، سہرا اور رباعیاں کہی ہیں۔ میری گفتگو کا موضوع مولانا ارشاد حسین کی رباعیاں ہیں۔ جیسا کہ علمائے ادب نے اردو رباعیوں کے چند اہم موضوعات مثلاً فلسفیانہ اور فکری آگہی، تصوف اور عرفان، اخلاقیات اور پند ونصائح، معاشرتی اور سیاسی مسائل، عشق ومحبت (مجازی وحقیقی) اور مسائل زمانہ پر طنز وتمسخر وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ زیادہ تر رباعی گو شعرا نے اپنی رباعیوں میں مذکورہ موضوعات ومسائل کو جگہ دی ہے۔ مذکورہ بالا موضوع ومسائل کی روشنی میں مولانا ارشاد حسین کی رباعیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

مولانا ارشاد حسین کی شاعری کو کسی اِزم کے زیر اثر قرار دینا دراصل اُن کے ساتھ ناانصافی ہوگی، لیکن جب ہم اُن کی رباعیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو نگاہ خود بخود رُک جاتی ہے اور دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ یہ تو ترقی پسند شاعری کا سرمایہ ہے۔ میں بطور مثال اِس قبیل کی چند رباعیاں پیش کر رہا ہوں فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آیا یہ ترقی پسند شعری ادب کا حصہ ہے یا نہیں۔

بستی میں دھواں آنکھ میں پانی کی طرح پھیلاؤ ہے غربت کا کہانی کی طرح
چپ رہ کے گزر جاؤں یہ ممکن تو نہیں جلتا ہوں میں خود شمع فغانی کی طرح
ہر سمت عجب شورِ قیامت کیوں ہے انصاف بھی اب قیدِ سیاست کیوں ہے
کل تک جو چراغوں کی حفاظت میں تھی اب آج ہوا میں یہ شرارت کیوں ہے

مذکورہ بالا دونوں رباعیوں کے تیور سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ خیالات کسی ترقی پسند شاعر کے نہیں بلکہ عالم دین کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سماج کے ناگفتنی حالات پر لب کشائی ہی ترقی پسندی ہے اور اپنے لبوں کو مصلحت کی چاشنی میں سی لینا ہی موقع پرستی اور مصلحت پسندی ہے۔ مولانا ارشاد حسین اپنی حق گوئی اور بے باکی کے سبب ترقی پسند نظریات کے حامل افراد کے درمیان بھی مقبول ہوں گے۔

ترقی پسندی صرف حالات کو آئینہ دکھانے کا نام نہیں ہے بلکہ عزمِ جواں کے ساتھ حالات کو سازگار بنانے کا بھی نام ہے۔ مولانا ارشاد صاحب نے جہاں حالات کی خرابیوں کو اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا وہیں انھوں نے حالات کو اپنے موافق کرنے کا لوگوں کے دلوں میں جوش وجذبہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں دو رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

دل تھا جو کبھی مہر و وفا کا گھر تھا ہر شخص یہاں آئینۂ منظر تھا
اب خود ہی حوادث میں گھرا بیٹھا ہے یہ شہر کبھی امن کا اِک پیکر تھا
سڑکوں پہ ہے لوگوں کی قطارِ غربت ہر سمت ہے موجود شعارِ غربت
بہرے جو ہیں مسند نشیں ایوانوں میں سن سکتے نہیں حالِ زارِ غربت

رباعی میں پند و نصیحت کا دفتر ہر دور کے شعرا کے یہاں ملتا ہے، کیوں کہ اخلاقیات ایک بہتر زمانے کی گارنٹی ہے۔ جب اخلاقی قدروں میں بگاڑ ہوگا تو انسانی معاشرہ زوال پذیر ہوگا۔ مولانا ارشاد صاحب کا تو اخلاقیات خاص میدان ہے۔ اُنھوں نے انسانی معاشرے کو اخلاقیات کا درس دیا ہے، ہر چیز کی زیادتی انسانی قدروں کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ اِس سے اخلاق میں گراوٹ اور مزاج میں خودغرضی پیدا ہوتی ہے۔ مغربی مفکر مارک ٹوئن (Mark Twin) کا قول ہے جو ایک عالمی سچائی بن گیا ہے کہ کسی چیز کی زیادتی بری ہوتی ہے۔ (Excess of everything is bad) اب اس قول کی روشنی میں ذیل کی رباعیوں کی اثر پذیری دیکھیے۔

مت دو اسے اتنی بھی فراوانی دوست بڑھ جائے نہ سر پر کہیں نادانی دوست
دولت کی ہوا جب بھی چلی ہے سر پر اُڑ جاتا ہے پھر عقل کا بھی پانی دوست

شاعر کی دعا اور اُس کا عزم و حوصلہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

چہرے پہ تھکن، آنکھ میں اندوہ بہت سینے میں مگر حوصلۂ کوہ بہت
مفلس کی دعاؤں کو نہ سمجھو کم تر ان ہاتھوں میں پوشیدہ ہے شکوہ بہت

دنیا کی حقیقت بھی مولانا ارشاد صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

جو وقت ملا اُس کو غنیمت سمجھو ہر سانس کو سرمایۂ رحمت سمجھو
دنیا کی یہ رونق ہے فقط اک لمحہ کل خاک میں ملنا ہے، حقیقت سمجھو

مولانا ارشاد حسین کی رباعیوں میں سب سے توانا آواز وہ ہے جن کا تعلق واقعاتِ کربلا سے ہے۔ کربلا کا بنیادی پیغام حق و انصاف کے لیے باطل اور ظالم قوتوں سے ٹکرا جانا ہے۔ سچائی کے راستے میں کسی قسم کی مصلحت گوارا نہیں اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا، صبر و رضا اور عزت نفس کی حفاظت، قربانیٔ امام حسین کا عظیم پیغام ہے۔ کربلا کا موضوع اب صرف مراثی کا ہی مضمون نہیں بلکہ غزلوں میں بھی بطور شعری استعارہ بہت ہی جاندار اور موثر طریقے سے استعمال ہو رہا ہے۔ کربلا کا پیغام مذہبی حدود کو توڑ کر عالم انسانیت کی ضرورت اور طاقت بن گیا ہے۔ کربلا کا پیغام ہر خاص و عام کو سنانے والی چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

مقتل کی صداؤں کو دباتے کیوں ہو پیغامِ شہادت کو بھلاتے کیوں ہو
اک قطرۂ خوں جس نے بدل دی تقدیر اس راز کو لوگوں سے چھپاتے کیوں ہو
ہر دور میں اک کربلا باقی ہے ابھی ہر دل میں کوئی نینوا باقی ہے ابھی
باطل کے محل لاکھ سجا لو تم لوگ اہلِ حق کا حوصلہ باقی ہے ابھی

آخر میں ایک رباعی شیرِ خدا، حیدرِ کرار، مولائے متقیان حضرت علیؑ کی وِلا کے تعلق سے پیش کر کے اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔

ہر ضرب میں اخلاص کی خوشبو ہے علی ہر صبر میں تسلیم کا جادو ہے علی
محراب میں سجدہ ہو کہ میدانِ جہاد ہر روپ میں بس حق کا ترازو ہے علی

مختصر طور پر جب ہم مولانا ارشاد حسین کی رباعیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کے خیال کی وسعت، زبان کی چاشنی، جذبات کی صداقت اور شاعرانہ فن کاری ہمارے دل و دماغ کو متاثر بھی کرتی ہے اور مسحور بھی کرتی ہے۔ اُن کی رباعیوں میں اشعار کی موسیقی کی جھنکار سنائی دیتی ہے، اس کی خاص وجہ بحور و قوافی پر اُن کی مضبوط گرفت ہے۔ مولانا کی رباعیاں ہر حال میں حسبِ حال معلوم ہوتی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر زیبا پروین
استاد شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ایم کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 9608057223

مولانا ارشاد حسین: بحیثیت رباعی گو

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی اردو کے ان ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے رباعی جیسی مشکل اور نازک صنف میں اپنی فنی مہارت اور فکری گہرائی کا بھرپور اظہار کیا۔ اگرچہ اردو ادب میں رباعی کو غزل جیسی عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی، تاہم یہ صنف ہمیشہ علمی و فنی معیار اِستادی کی علامت رہی ہے۔ مولانا کی رباعیات تعداد میں کم ہونے کے باوجود اپنے اندر فکری پختگی، جذباتی شدت اور زبان و بیان کی سادگی و تاثیر کا حسین امتزاج رکھتی ہیں۔

ان کی رباعیوں میں زندگی کی ناپائیداری، اخلاقی اقدار، انسانی درد، سماجی ناہمواریاں اور وقت کی بے ثباتی جیسے موضوعات نہایت دل نشیں انداز میں پیش ہوئے ہیں۔ وہ کم الفاظ میں گہرے معانی سمیٹنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں خودی، بے خودی، نئی نسل کی بے راہ روی، سماجی انتشار اور انسانی کرب کا احساس نمایاں ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی رباعیات میں واقعۂ کربلا کی اثر پذیری، حضرت امام حسین کی قربانی اور حق و باطل کی کشمکش بھی نہایت موثر انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

مولانا کی زبان سادہ مگر بامعنی ہے، جس میں تشبیہات و استعارات کی تازگی اور فکری لطافت نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ بھی جھلکتا ہے، جہاں دل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مجموعی طور پر ان کی رباعیات مختصر ہونے کے باوجود معنوی وسعت، فکری بصیرت اور ادبی حسن سے بھرپور ہیں اور انھیں ایک قادرالکلام رباعی گو شاعر کے طور پر نمایاں کرتی ہیں۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، رباعی، اردو شاعری، فکری پختگی، سادگی و تاثیر، کربلا، انسانی کرب، صوفیانہ

اردو ادب کی تاریخ میں رباعی کو اگرچہ غزل کی طرح عوامی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی مگر اردو شاعری میں مختصر لیکن پر اثر صنف سخن ہے جو ہر عہد کے شعرا کی فنی مہارت کی عکاس، فکری بلندی کی مظہر اور فن شعر پر کامل دستگاہ کی ضامن ہوا کرتی ہے۔ یہ صنف اپنی فکری گہرائی، فنی تکلفات اور مخصوص ہیئت کی وجہ سے ہر عہد کے شعرا کے لیے معیار استادی سمجھی جاتی رہی ہے۔

صنف رباعی نہ صرف فنی بصیرت کا تقاضا کرتی ہے بلکہ علمی شعور اور شعری وجدان کا بھی آئینہ ہوتی ہے۔ یہ صنف خواص میں ہمیشہ بلند مقام پر فائز رہی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ رباعی علمی سطح تک ہی شعرا کو مرغوب رہی اور غزل کی طرح عمومی طور پر شعری رویوں کا حصہ نہ بن سکی۔ پھر بھی کلاسیکی عہد سے لے کر جدید عہد تک اکثر شاعروں کی یہاں رباعیات کے عمدہ نمونے ملتے ہیں جو اس صنف کی قدر و قیمت کے مظہر ہیں۔

مولانا ارشاد حسین ان استاد شعرا میں شامل ہیں جن کی رباعیات نہ صرف ان کی منفرد شعری پہچان قائم کرتی ہیں بلکہ ان کے علم و فکر کی گرائی کو بھی عیاں کرتی ہیں۔ مولانا ارشاد حسین معروفی ایک ہمہ جہت دینی اور ادبی شخصیت تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی تدریس، تبلیغ اور تربیت نسل نو کے لیے وقف کردی۔ ان کی شخصیت میں درویش صفت انسان کا وقار، سنجیدہ شاعر کا لطیف جمالیاتی ذوق نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں جہاں ایک طرف دین کی روشنی ہے وہیں دوسری طرف احساسات کی نرمی، جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی شائستگی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔

انتخاب کلام ارشاد کی ورق گردانی سے یہ علم ہوا کہ ان کی شعری کائنات کافی وسعت رکھتی ہے۔ ان کے یہاں شعری اظہار کے لیے مختلف اصناف کو وسیلہ بنایا گیا ہے، لیکن ان کا کثیر شعری سرمایہ غزلوں پر ہی مشتمل ہے۔ غزل کے علاوہ حمد، نعت، مناجات، منقبت، قطعہ، نظم اور رباعی ان کے شعری کمالات اور فنی نکات سے آگاہی کے اہم حوالے ہیں۔ ان کی شاعری میں فرد سے زیادہ انسانیت، ذات سے زیادہ کائنات اور لفظ سے زیادہ معنی کی اہمیت ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کے یہاں رباعیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس انتخاب میں محض ۴۰/ رباعیاں شامل ہیں۔ ان رباعیوں کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ رباعیاں مختلف روایتی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ رباعیاں ان کی فکری پختگی کی روشن دلیل ہیں۔ ان رباعیوں میں کلاسیکی شعری عناصر کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے علمی، عرفانی رجحانات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے

رباعی کو نہ صرف فنی مشکلات کے ساتھ برتا ہے بلکہ اس میں فکری لطافت، جذبے کی شدت اور فنی محاسن کو نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ رباعی جیسی مشکل اور نازک صنفِ سخن میں طبع آزمائی ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں گہری نظر اور کم الفاظ میں گہرے معنی سمیٹنے کی قدرت بھی ضروری ہوتی ہے۔ مولانا اس فن کے ایک قادر الکلام شاعر تھے، جنھوں نے رباعی کی ہیئت اور اس کے فکری تقاضوں کو پوری طرح اپنی رباعیوں میں برتا ہے۔ ان کی رباعیوں میں لفظوں کی آمد و رفت نہایت متوازن اور بامعنی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رباعی کے فن پر مکمل مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر کی گہرائی، جذبے کی شدت اور بیان کی لطافت اس طرح یکجا ہو جاتی ہے کہ چار مصرعوں کی مختصر ساخت ایک وسیع معنی میں بدل جاتی ہے۔ ان کی اس قبیل کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے۔

جو وقت ملا اُس کو غنیمت سمجھو ہر سانس کو سرمایۂ رحمت سمجھو
دنیا کی یہ رونق ہے فقط اک لمحہ کل خاک میں ملنا ہے، حقیقت سمجھو

رہتی نہیں طاقت نہ جوانی باقی تا عمر نہ شوخی نہ روانی باقی
سب رنگ اتر جاتے ہیں وقت آنے پر رہتی ہے فقط نیک نشانی باقی

ہر شخص نہیں درد کا ہمراز یہاں ہر آن نہیں کھلتا ہے اخلاص یہاں
کچھ لوگ تو آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں احساس کی صورت میں بھی اغراض یہاں

رباعی کی زبان سادہ ہے مگر اس میں جن اشیا کا ذکر کیا گیا ہے وہ روزمرہ کے تجربات کا حصہ تو ہیں ہی انھیں علامتی معنوں میں بھی برتا گیا ہے، جو بلاشبہہ ان کی زبان پر گرفت کا نتیجہ ہے۔ یہ رباعی فکری لطافت، زبان و بیان کی چابک دستی اور فن کا ایسا امتزاج ہیں جو ان کی فنی مہارت کو روشن کرتی ہیں۔ ان کی یہ رباعیاں ایک عام مگر نہایت پر اثر حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔

ان کے یہاں خودی اور بے خودی جیسے دقیق مضامین بھی نئے زاویوں کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ خودی کو روحانی وقار تصور کرتے ہیں۔ نئی نسل کی گمراہی، تن آسانیاں، معاشرتی ٹکراؤ، سماجی مسائل کا انھیں شدید احساس تھا۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

طوفان سے آنکھیں نہ چرا بیٹھیں ہم
سچائی کی مشعل نہ بجھا بیٹھیں ہم
زنجیر اگر پاؤں میں آ بھی جائے
پرواز کا جذبہ نہ مٹا بیٹھیں ہم

ٹھکرا کے زمانے نے جنھیں چھوڑ دیا
حالات کی آندھی نے جنھیں موڑ دیا
وہ لوگ الٹ دیتے ہیں تختِ شاہی
جن ہاتھوں کو کل وقت نے تھا توڑ دیا

ان کی رباعیوں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بول چال کی زبان کو ایسے سلیقے سے استعمال کیا ہے کہ مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور وہ دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ نرم لہجے نے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ ان کا کلام جادو کا اثر رکھتا ہے جس سے اردو کا دامن وسیع ہوا۔ سماج کے تمام مسائل کو انھوں نے اپنی شاعری میں پیش کیا۔ حقیقت، سادگی اور ہندوستانیت کی چھاپ ان کی رباعی میں بھی نظر آتی ہے۔ مظلوم طبقہ کے مسائل، عوام کی غربت، انسانی جذبات، علم کی اہمیت اور وقت کے تقاضوں کو سمجھا، انسانیت کے درد کو اپنے دل سے محسوس کیا اور روزمرہ کی زندگی کے تلخ تجربات سے اپنے فن کی آبیاری کی۔

بستی میں دھواں آنکھ میں پانی کی طرح — پھیلاؤ ہے غربت کا کہانی کی طرح
چپ رہ کے گزر جاؤں یہ ممکن تو نہیں — جلتا ہوں میں خود شمع فغانی کی طرح
ہر سمت عجب شورِ قیامت کیوں ہے — انصاف بھی اب قیدِ سیاست کیوں ہے
کل تک جو چراغوں کی حفاظت میں تھی — اب آج ہوا میں یہ شرارت کیوں ہے

مولانا ارشاد حسین معروفی کثیر الجہت شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کے یہاں صوفیانہ خیالات کی حامل رباعیاں بھی موجود ہیں۔ حالاں کہ وہ کوئی صوفی نہیں تھے، لیکن صوفیانہ خیالات وتصورات کو شعری پیکر میں ڈھالنا شعرا کی روایت رہی ہے، لہٰذا انھوں نے بھی اسی روایت کے تحت صوفیانہ رباعی کہی ہے۔ ان کے تمام صوفیانہ خیالات وتصورات کا مرکز ومحور دل ہی ہے۔ مولانا بھی دل کی عظمت کے احساس سے لبریز نظر آتے ہیں۔

جو ٹوٹ کے بکھرا وہی تعمیر ہوا — ہر زخم مرے واسطے تنویر ہوا
اک لمحۂ ادراک سے عقدہ یہ کھلا — پردہ جو تھا ہستی کا وہ تعبیر ہوا
اے قومِ محمدؐ یہ گھڑی ہے دشوار — ہر سمت سے شبیر پہ باطل کا ہے وار
پانی بھی میسر نہیں ان کو لوگوں — دریا بھی کھڑا دیکھ رہا ہے بےزار
مقتل کی صداؤں کو دباتے کیوں ہو — پیغامِ شہادت کو بھلاتے کیوں ہو
اک قطرۂ خوں جس نے بدل دی تقدیر — اس راز کو لوگوں سے چھپاتے کیوں ہو

ان کی رباعیوں کا ایک اہم اور نمایاں پہلو واقعہ کربلا سے ان کی گہری اثر پذیری ہے۔ ان کی رباعیوں میں حضرت امام حسین کی قربانی، صبر، حق و باطل کی کشمکش نہایت پر اثر انداز میں ملتی ہے۔

ہر دور میں اک کربلا باقی ہے ابھی ہر دل میں کوئی نینوا باقی ہے ابھی
باطل کے محل لاکھ سجا لو تم لوگ اہلِ حق کا حوصلہ باقی ہے ابھی
شمشیر کے سائے میں اذاں بولی تھی ریتوں پہ بھی تکبیرِ جواں بولی تھی
سوچو تو ذرا دشتِ بلا کی مٹی انسان کے لہجے میں کہاں بولی تھی

مولانا کی رباعیات میں سادگی اور تاثیر کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ الفاظ نہایت سلیقے سے برتے گئے ہیں اور تشبیہات و استعارات میں فطری تازگی محسوس ہوتی ہے۔ وہ مشکل مضامین کو بھی نہایت سہل اور دل نشیں انداز میں بیان کر دیتے ہیں جس سے ان کی رباعیات نہ صرف فکری طور پر متاثر کن ہو جاتی ہیں بلکہ ادبی حسن سے بھی مالا مال دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی رباعیوں میں جذبہ عقیدت، اخلاقی پیغام اور فکری بصیرت ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ دیر پا روحانی اور ادبی تاثر ملتا ہے۔

مشکل میں پکارو تو سہارا ہے علی ڈوبی ہوئی کشتی کا کنارا ہے علی
عدل اس کا ہے دستورِ حیاتِ عالم انصاف کی دنیا کا ستارا ہے علی
دشمن کے لیے برقِ گراں بار علی مومن کے لیے سایۂ دیوار علی
علم و عمل و حلم کا پیکر ایسا ہر دور میں ہے حق کا علمدار علی

مولانا الفاظ کے انتخاب میں اس قدر احتیاط اور ہنرمندی سے کام لیتے ہیں کہ ہر لفظ اپنی جگہ ایک تراشیدہ سنگ کی طرح جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی رباعی بندش کی چستی کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے اشعار میں الفاظ کا انتخاب اس درجہ محتاط اور مناسب ہوتا ہے کہ نہ کوئی لفظ زائد محسوس ہوتا ہے نہ ہی کہیں کوئی معنوی خلا پیدا ہوتا ہے۔ بہت سی رباعی معنوی سادگی کے باوجود قاری کو جذباتی گرفت میں لے لیتی ہیں۔

خیال کی پختگی، جذبے کی صداقت اور اسلوب کی شائستگی ان کی شاعری کو عام سطح سے بلند کر کے ایک ادبی مقام عطا کرتی ہیں۔ وہ روح کو چھو لینے والی سادگی کے ساتھ ایسا سماں باندھ دیتے ہیں جو قاری کو غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کے یہاں فکر و پیغام، نئی نسل کی بے بسی، انسانی کرب اور کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی سمیٹنے کی کیفیت موجود ہے۔ ان کا شعری سرمایہ بظاہر مختصر ہے مگر معنویت و کیفیت سے بھرپور ہے۔ اصل میں ان کی شاعری زندگی کے پیچیدہ سوالات سے ایک سنجیدہ مکالمہ ہے۔

مولانا کسی خاص گروہ، خاص جماعت اور خاص قوم کے شاعر نہ تھے، بلکہ یہ اپنے دل و دماغ

اور اپنے تاثرات و احساسات کے باعث کائنات انسانیت کے شاعر تھے۔ حالاں کہ ان کی رباعیاں تعداد میں کم ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر وہ رباعی گوئی کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیتے تو بہت ممکن ہے شعری سطح پر ان کی شناخت ایک ممتاز رباعی گو کی حیثیت سے ہوتی اور رباعی کا دامن اعلیٰ نمونوں سے مالا مال ہو جاتا۔ وہ کہتے ہیں ؎

محنت کی کمائی بھی لٹی جاتی ہے
امید کی بھی شمع بجھی جاتی ہے
یہ کیسا نظامِ زر و زور و تزویر
انسان کی قیمت بھی گھٹی جاتی ہے

مولانا ارشاد کی رباعیات اپنے اندر وہ فکری وقار، شعری لطافت اور معنوی گہرائی سمیٹے ہوئے ہیں جو کسی بھی بڑے شاعر کی پہچان ہوتی ہیں۔ انھوں نے نہایت مختصر صنف میں زندگی کے وسیع تجربات، انسانی احساسات اور کائناتی حقائق کو اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ قاری چند مصرعوں میں ایک مکمل فکری کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ان کی رباعیوں میں نہ تصنع ہے نہ تکلف، بلکہ ایک سادہ، سچی اور اثر انگیز آواز ہے جو دل سے نکل کر دل میں اترتی ہے۔ یہی وصف ان کے کلام کو محض ادبی اظہار نہیں بلکہ ایک زندہ تجربہ بنا دیتا ہے۔

مولانا کی رباعیات کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ روایت اور جدت کے سنگم پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی شعری اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے عہد کے مسائل، انسانی کرب، معاشرتی تضادات اور اخلاقی زوال کو نہایت سنجیدگی سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کے یہاں کربلا کی علامت ہو یا انسانی ضمیر کی بیداری، ہر موضوع ایک فکری ذمہ داری کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری محض جذبات کی ترجمان نہیں بلکہ شعور کی رہنمائی بھی کرتی ہے، جو قاری کو سوچنے، سمجھنے اور اپنے باطن سے مکالمہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

اگرچہ ان کی رباعیوں کی تعداد زیادہ نہیں، لیکن ان کی معنوی وسعت اور فنی پختگی اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ارشاد حسین معروفی نے رباعی جیسے دقیق فن میں اپنی صلاحیتوں کا جو مظاہرہ کیا ہے، وہ انھیں اردو کے معتبر رباعی گو شعرا کی صف میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔ ان کا کلام آنے والی نسلوں کے لیے نہ صرف ادبی سرمایہ ہے بلکہ فکری و اخلاقی رہنمائی کا بھی ایک روشن چراغ ہے، جو وقت کے ساتھ اپنی اہمیت میں مزید اضافہ کرتا رہے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد خالد انجم عثمانی
صدر شعبۂ اردو و فارسی، سی ایم کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 7033822281

نکہت تصوف

آفاقِ تصوف کا نغمہ سرا: ارشادؔ معروفی

تلخیص:

یہ مضمون مولانا ارشاد حسین کی شخصیت، علمی خدمات اور خصوصاً ان کی صوفیانہ شاعری کا جامع تعارف پیش کرتا ہے۔ مولانا ارشاد ایک ہمہ جہت عالم، مصلح اور صاحبِ فکر و نظر شخصیت تھے جن کی زندگی علم، عمل اور روحانیت کا حسین امتزاج تھی۔ ان کی مختصر ملاقات کے تاثرات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف ایک مدبر انسان تھے بلکہ عملی زندگی کے رہنما اصولوں سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔

ان کی شاعری میں تصوف کے بنیادی عناصر جیسے عشقِ حقیقی، فنا فی اللہ، انسان دوستی، خود شناسی اور دنیا کی بے ثباتی نمایاں طور پر جلوہ گر ہیں۔ ان کے اشعار میں مذہب کی پاسداری، حق و باطل کی کشمکش اور علم کی اہمیت کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ قرآن و اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنی فکر کو پیش کرتے ہیں، جس سے ان کے کلام میں فکری گہرائی اور معنوی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

مولانا ارشاد کی غزلوں میں کلاسیکی روایت کی جھلک کے ساتھ جدید شعور بھی ملتا ہے۔ ان کے یہاں عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ انسانی جذبات، حسن و عشق اور کائناتی حقائق کو انھوں نے نہایت دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری میں نعتیہ عناصر، عشقِ رسول اور روحانی واردات کی عکاسی بھی نمایاں ہے۔ ان کا کلام جذباتی اظہار کے ساتھ ایک فکری و روحانی جستجو کا آئینہ ہے، جو قاری کو ایک باطنی سفر پر آمادہ کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین، تصوف، صوفیانہ شاعری، عشقِ حقیقی، فنا فی اللہ، انسان دوستی، کلاسیکی روایت، غزل، عشقِ رسول، روحانیت، فکری شعور، اسلامی تعلیمات، باطنی کائنات، ادبی خدمات۔

دنیا میں جتنے بھی افراد تشریف لائے ان میں کچھ شخصیات ایسی ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ کا کام کرتی ہیں۔ ان ہی شخصیتوں میں ایک شخصیت مولانا ارشاد علیہ الرحمہ کی ہے جن کا پورا نام مولانا ارشاد حسین ہے۔ جائے پیدائش پورہ معروف، ضلع مئو، اتر پردیش ہے۔ وہ مورخہ ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو دار فانی میں تشریف لائے اور ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کے والد کا نام محمد شمس الدین تھا جن کی فہم وفراست نے انھیں ایک اچھا عالم بنا دیا۔ ارشاد کی وسعت علمی کا دائرہ بے حد وسیع اور کثیر الجہات ہے۔ وہ بیک وقت کئی فنون کے ماہر، مصلح اور تصوف کے علمبر دار کے طور پر ممتاز ہیں۔ ان کے دائرہ علمی کا احاطہ کرنے کی کوشش ایک مقالے کے ذریعے ممکن نہیں، لیکن اس مضمون کے ذریعے راقم الحروف کے ساتھ گزرے ہوئے چند اوقاف ولمحات کی عکاسی کی کوشش کی گئی ہے، جس کا اثر ناچیز کی عملی زندگی پر ہوا ہے۔

مولانا ارشاد سے میری پہلی وآخری ملاقات شعبۂ اردو وفارسی، سی۔ایم کالج دربھنگہ میں ہوئی۔ وہ اپنے پسر خرد فیضان حیدر اور اپنے پوتے محمد ریحان کے ساتھ گھومنے آئے تھے۔ یہ ملاقات یوں تو غیر رسمی تھی اور اس کی جانکاری بھی نہیں تھی، مگر ان چند لمحوں نے ایک وسیع، موثر اور دیر پا نقش چھوڑے۔ اس دوران انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران ہونے والے واقعات واسباب وعلل پر گفتگو کی، جس میں زندگی کے تجربات کی عکاسی، نیز دفتری کاموں کے رہنما اصول، معاصرین کے درمیان مسائل پر گفتگو اور کن کن چیزوں سے احتیاط برتا جائے اور کون سی تدابیر اپنائی جائیں جن سے دفتری کام سہل اور سودمند ثابت ہوں۔ یہی وہ رہنما اصول تھے جن پر وہ آدھے گھنٹے تک بات چیت کرتے رہے۔ انھوں نے شعبہ کو دیکھا اور اپنا تاثر پیش کیا اور جاتے ہوئے نیک دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوئے۔ اس دوران انھوں نے شعبہ کی علمی سرگرمیوں کو دیکھا اور جن پر ان کی رائے تھی کہ یہ شعبہ کافی متحرک ہے۔ انھوں نے اپنے بیش بہا تجربوں سے بتایا کہ زندہ قومیں کیا کرتی ہیں، تاکہ ان کی آنے والی نسلیں فیض یاب ہوسکیں اور دنیا کے قائم رہنے تک ادارے کا نام روشن کرسکیں۔ ان بیش بہا مشوروں کے ساتھ ان کی ایک بات ہم سبھی ساتھیوں کو سمجھ میں آئی، جو بقول جگرؔ

طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

ان کی زندگی بھی مسلسل کوششوں اور کاوشوں کا استعارہ ہے جس سے آنے والی نسلیں مستفید ہوتی رہیں گی۔ ان سے ملاقات سے اندازہ ہوا کہ ان کے تین صاحبزادوں میں سے دو سے ذاتی طور پر واقف

ہوں، بڑے بیٹے ذیشان حیدر اور چھوٹے فیضان حیدر پر ان کے فیضانِ علم کا پرتو صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ ذیشان حیدر تو مانو لکھنؤ کیمپس میں ملازمت سے وابستہ ہیں لیکن میری ملاقات جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہے جہاں وہ عمیر منظر و دیگر احباب مثلاً خورشید بھائی اور اسلامک اسٹڈیز کے طلبا کے ساتھ ہوتی تھی۔ یہ سبھی میری طالب علمی کے دوران کے ساتھیوں میں سے ہیں جن سے ملاقات جامعہ ملیہ کے ذریعہ منعقد ریفریشر کورس میں ہوئی۔ اس کے بعد میر تقی میر سمینار میں بھی ان کی علمی لیاقت کو جاننے کا موقع ملا اور میرے ساتھ طلبا بھی مستفید ہوئے۔ فیضان تو میرے ساتھ ہی شعبہ سے وابستہ ہیں لہٰذا ان کے بارے میں کچھ لکھنا مضمون کے منافی ہے، لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ علمی کاموں کی مصروفیت اور مسلسل ادبی کاموں کے لیے سرگرم عمل کسی انسان کو دیکھنا ہو تو انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا اگر کسی کو محاسبہ کرنا ہو تو وہ 'فیضانِ ادب' کے مدیر بھی ہیں، اس کے ذریعے ان کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ میں نے ان دونوں کے ذریعے اس سانچے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس میں مولانا ارشاد کی شخصیت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کس قدر قابل اور لائق ولی عہد چھوڑا، جو ان کے علمی کارناموں کو آگے بڑھانے کی مسلسل کوششیں کر رہیں ہیں۔ ان کی تربیت ہی ہے کہ خمیر خاکی کندن بن گیا اور بقول اقبالؔ ؎

وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

ابھی تک تو ان کی ذاتی زندگی کا عکس تھا، اب ان کے علمی کارناموں کا ذکر ضروری ہے جن میں انھوں نے ادبی، مذہبی اور سماجی خدمات کا دریا بہایا ہے۔ ان کے علمی ورثے میں تبلیغ دین، علم فقہ، رشد و ہدایت، تعلیم و تعلّم اور ادبی نوعیت کے مضامین شامل ہیں۔ لیکن میرے مقالے کا موضوع تصوفانہ کلام ہے تو میں ان کے تبحر علمی میں غوطے لگا کر صوفیانہ کلام کو نکالنے کی کوشش کروں گا جس سے قارئین مستفید ہو سکیں۔ صوفیانہ کلام یا صوفیانہ شاعری کا مرکز و محور عشقِ حقیقی، فنا فی اللہ، خود شناسی، اللہ کی مخلوق سے محبت اور دنیا کی بے ثباتی وغیرہ ہے۔ مولانا ارشاد کی غزلوں میں دین و بے دینی اور حق و باطل کی کشمکش صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں مذہب ایک اعلیٰ پایہ کے احکام الٰہی ہیں جن کی پیروی ہر کس و ناکس پر ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

وہ بتوں کی کبھی تکریم نہیں کر سکتا
سنتِ رب میں جو ترمیم نہیں کر سکتا
ہے یہی خارقِ عادت ترے مجنوں کا مزاج

پتھروں سے کوئی تقدیم نہیں کرسکتا

ان کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی تہذیب وتمدن کی شناخت میں اعلیٰ مدارج تک پہنچے ہوئے تھے۔ وہ مکان و لامکاں کے تصور سے آشنا، دیدہ ور شخصیت تھے۔ وہ انسان کی ظاہری و باطنی شناخت کے رہنما اصول کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمدردی وصوفیانہ جذبے کی بھرمار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے انسان جو ایک دوسرے کی مدد نہیں کرسکتے وہ انسانیت کی روح کو نہیں سمجھ سکتے۔ ارشادؔ قرآن کی روشنی میں غزلیں لکھتے ہیں جو ان کے مذہبی رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جس طرح حق آنے کے ساتھ ہی باطل پناہ مانگنے لگتا ہے، اسی طرح علم کی ضیا جہل کا صفایا کردیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

صورت نوع سے گر تم کو سہارا نہ ملے — پھر ہیولیٰ کی بھی تفہیم نہیں کرسکتا
لامکاں کے لیے حیّز بھی نہیں ہے ارشادؔ — پھر بھی اک گھر ہے جو تقسیم نہیں کرسکتا

.....

جہاں پر علم کا چرچا رہے گا — ہمیشہ جہل کو صدمہ رہے گا
خموشی کو بھی گویائی بنادے — ترا احساس گر زندہ رہے گا
جو خود استاد کو ہلکا سمجھ لے — وہ علم و فن سے بے گانہ رہے گا

ان کی غزلوں میں انسان اور انسانیت کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی قوت متخیلہ میں غضب کی آندھی اور بانکپن ہے۔ وہ اپنی غزلوں کے ذریعہ قاری کو حیرت زدہ اور تعجب میں ڈال دیتے ہیں اور استفہامیہ انداز بیان میں اقبال وغالب کے روبرو نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

یہ عکس ہے کہ کوئی آئینہ ہے حیرت کا — دکھا رہا ہے تماشا وہ کیسی عبرت کا
یہ کس کے شوق کی وادی میں رکھ دیا ہے قدم — مہک رہا ہے ہر اک سو گلاب الفت کا

شاعر کو انسانی ذات اور لمس واشارے نیز معصوم جذبات کو برتنے کا ہنر معلوم ہے۔ بعض اہل دانش کا خیال ہے کہ عشق مجازی دراصل عشق حقیقی تک پہنچنے کا زینہ ہے تو ارشاد اس فن میں بھی ماہر ہیں ان کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے نباض ہیں اور وقت کے تھپیڑوں اور اپنے تجربات کی روشنی میں جو کچھ سیکھا ہے اسے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ہر عمر کے لوگوں کے جذبات کی آئینہ دار ہے ؎

جو ظلم ڈھاتی ہیں مخمور نیم باز آنکھیں — ہے کس میں زور بیاں اس اثر کی کلفت کا
وہ زلف رخ سے ہٹالے تو صبح پھوٹ پڑے — بکھیر دے تو تصور ہو شام ظلمت کا

نہیں کی تیغ سے کاٹی ہے شہ رگ باطل خلاصہ ہے یہی حق کی زباں کی رفعت کا

.....

زلفوں کی کوئی ناگن جب ڈس لے جھروکے سے انسان کا پھر بچنا آسان نہیں ہوتا
نرگس یہ پڑی شبنم قطرہ نہیں دریا ہے جس کا کبھی رک جانا آسان نہیں ہوتا
دل کھول کے رونے سے تسکین تو ہوتی ہے پھر اس کا سنبھل پانا آسان نہیں ہوتا

ارشاد کی شاعری میں ایک طرف بادشاہوں کے جاہ وحشم کا بیان ملتا ہے تو دوسری طرف ان کی بربادی کا ذکر بھی عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے۔ جس طرح میر نے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسو کا سر پر غرور تھا

تو اسی موضوع کو نئے انداز سے ارشاد لکھتے ہیں ؎

سکوت موت کا چھایا ہے اس جگہ ارشادؔ
جہاں تھا شور حکومت کی شان و شوکت کا

ان کی شاعری میں کلاسیکی انداز نمایاں ہے، جس میں وہ اکابرین کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بزرگوں کی روح ان میں داخل ہوگئی ہے۔ وہ دنیا کے بننے اور دلوں کے دھڑکنے کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصائب دنیا کی نئی تعبیر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ذات ہی ہے جس کو دونوں عالم کی چیزوں کی ہیئت معلوم ہے اور وہ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں سنتا اور جانتا ہے۔ وہی ذات دنیا کے بننے کے عمل سے واقف ہے کیوں کہ یہ کام اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ فن شیشہ گری ؎

نہ کر اب تذکرہ خندہ لبی کا بھروسہ کیا کسی کی زندگی کا
دلوں کی دھڑکنوں سے جو ہے واقف اسے آتا ہے فن شیشہ گری کا
جنوں کی سیر کرتا رہ گیا وہ جسے کچھ حوصلہ تھا آگہی کا
ستم کے قافلے نکلے ہیں ارشادؔ اشارہ ہے یہ طوفان خفی کا

ارشاد کی غزلوں کے محبوب موضوعات میں انسانی پیکر خاص طور پر نبی کی صفات کاملہ اور بنی آدم کے مٹی سے بننے کے بعد بھی نوری کوائف میں ڈھلنے اور شیطانی صفات سے وابستہ لوگوں سے کیا

مناسبت ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ حور اور پری میں کیا کوئی موازنہ کرسکتا ہے۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے اسی طرح ثانی الذکر چیز بھی ناممکن ہے۔ یہ ایک خوب صورت اشارہ ہے جو ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ ان کی دلی خواہش ہے کہ اگر مجھے وہ طاقت ملے کہ میں دنیا میں باطل کا خاتمہ کردوں، تو ایک ہی جھٹکے میں ظلم و جبر اور گمراہی کا خاتمہ ہوجائے ؎

یہ پیکر نور کا اور وہ ہے ناری تقابل حور سے کیا ہو پری کا
اگر ارشادؔ کو مل جائے طاقت صفایا ہو ضلال و گمرہی کا

شاعر کو دنیا کے مکر و فریب، حیلہ و بہانہ، کبر و ریا کاری کی فضا معلوم ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس دورخی دنیا میں اگر سکون سے جینا چاہتے ہیں تو برائیوں سے دور رہنا سیکھو، ورنہ یہ منفی چیزیں ایک دلدل کی طرح ہیں جو کوئی بھی اس میں گیا وہ اندر ہی جاتا چلا جائے گا۔ اس غم دنیا سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شیلے نے کہا تھا کہ ''ہمارے شیریں ترین نغمے غم انگیز خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔'' تو ان کی شاعری میں بھی افسردہ خیالات کی بھرمار ہے، جو ان کی شاعری کی معراج ہے ؎

سکون چاہو تو گندی فضا سے دور رہو وفا کے نام پہ ورنہ کوئی دغا دے گا
جو بیٹھو گے کبھی اک بار اس کی محفل میں سلیقہ ہجر کا تم کو وہی سکھا دے گا
تمھارے غیر کو فرصت کہاں ستانے کی جو زخم دے گا تجھے تیرا آشنا دے گا
بڑی مشقتوں سے بستیاں بسائی تھیں خبر نہ تھی کوئی ظالم انھیں جلادے گا

ارشاد کی شاعری میں عشق الٰہی و عشق رسول جابجا نظر آتا ہے۔ وہ اس محبت کا ذکر کرتے وقت تلمیحات سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے لیے نئی تعبیرات وضع کرتے ہیں۔ گویا ان کی شاعری غم والم کی داستان ہے جو ہجر و کیف کی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ ان کا تخیل کائنات و ممات کے رشتے کو نئی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

کیا عجب ناخن تقدیر کے ہاتھوں اسے دوست میں ترے گیسوئے پیچاں کو پریشاں کردوں
آتش عشق کی سوزش کا تقاضا ہے یہی سینۂ سوختہ کو اور بھی بریاں کردوں
لذتِ ہجر نے وہ کیف دیا ہے مجھ کو دردِ دنیا کو بھی نذرِ غمِ جاناں کردوں
نقش بر آب، ہوائے نفس و نارِ غرور ایک ٹھوکر میں انھیں خاک بداماں کردوں

ارشادؔ کی شاعری میں عشق رسول ہر جا دکھائی دیتا ہے اور ان کا محبوب موضوع بھی یہی ہے۔ وہ نعتیہ غزل کی روایت کے پاسدار بھی ہیں۔ انھوں نے اس غزل میں اللہ کے رسول اور ان کے رشتے کو اتنی

دور بینی سے جوڑا ہے کہ پورا نقشہ قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ ''اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ'' تو ارشاد کی شاعری حق و باطل کی جنگ کی آئینہ دار ہے۔ اس میں منظر نگاری، عقل و عشق کی حدیں، معراج کا واقعہ، تلمیحات یوسف، حسن کی نئی تعبیر و تفہیم، الغرض وہ سبھی چیزیں موجود ہیں جو ارشاد کو ایک کامل شاعر کا درجہ دیتی ہیں، بس قاری فہم و فراست سے ان موتیوں کو تلاش کرے۔

جو حسن حق ہے کہاں اس کی کبریائی نہیں ازل سے تا ابد کیا عشق کی خدائی نہیں
فراز عشق کی منزل کو کوئی کیا جانے جہاں پہ عقل کی پرواز کی رسائی نہیں
زنان مصر سے پوچھے کوئی کرشمۂ حسن کٹی ہیں انگلیاں، احساس نارسائی نہیں
سنا زلیخا نے یوسف سے حسن ختم رسل جوان ہوگئی، تنویر دیکھ پائی نہیں

مولانا ارشاد کی غزلیں درحقیقت ان کی مکمل حیات اور باطنی کائنات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے کلام میں انسانی جذبات کی پوری دنیا اپنی گوناگوں صورتوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ سوز و ساز کی لطافت، درد و داغ کی گہرائی، اور روح و عرفان کی روشنی ان کے اشعار میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہیں کہ قاری کو ایک روحانی کیف کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز، حیات و ممات کے اسرار، اور انسان کے باطنی تجربات ایک مربوط اور پُراثر اسلوب میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں محض جذبات کی ترجمان نہیں بلکہ ایک صاحبِ شعور انسان کی فکری و روحانی جستجو کی نمائندہ بھی ہیں، جن میں انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی نہایت دل نشیں انداز میں ملتی ہے۔

اسی طرح مولانا ارشاد کے کلام میں زندگی کی جدوجہد، کوشش و کاوش اور کامیابی و کامرانی کے مختلف رنگ بھی نمایاں ہیں۔ ان کے اشعار میں عقل و دانش اور تفکر و تخیل کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ دین و دنیا کے توازن کا شعور بھی واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی زبان نہایت شستہ، دل آویز اور اثر آفریں ہے، جس میں بیان کی لطافت اور معنی کی گہرائی بیک وقت جلوہ گر ہے۔ تشبیہات، استعارات اور دل کش تلمیحات کے حسین امتزاج نے ان کی شاعری کو ایک منفرد فنی وقار عطا کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی غزلیں محض لفظوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایسے حساس دل اور بیدار ذہن کی صدائیں ہیں جو زندگی، محبت، معرفت اور انسانی تجربات کی مختلف جہتوں کو نہایت خوب صورتی اور تاثیر کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

☆☆☆

علی اصغر الحید ری
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، رابطہ نمبر: 9968616032

بازگشت معانی

مولانا ارشاد معروفی کی ترجمہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

(دوازدہ بند محتشم کے حوالے سے)

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی ہمہ جہت علمی شخصیت کے حامل تھے جن کی فکر میں فلسفہ، عرفان، فقہ اور ادب کا گہرا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی ترجمہ نگاری فقط لسانی عمل نہیں بلکہ ایک فکری و تہذیبی ذمہ داری کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں وہ 'معنی کی امانت' کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔

ترجمہ دراصل تہذیبوں اور فکری روایتوں کے درمیان ایک مکالمہ ہے، اور ایک کامیاب مترجم وہی ہوتا ہے جو متن کی روح، اسلوب اور جذباتی فضا کو نئی زبان میں برقرار رکھ سکے۔ مولانا معروفی نے دوازدہ بند کے ترجمے میں ان ہی اصول کی پاسداری کرتے ہوئے اصل فارسی متن کی حزنیہ کیفیت، استعاراتی نظام اور کائناتی غم کی فضا کو اردو میں نہایت کامیابی سے منتقل کیا ہے۔

ان کے ترجمے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ لفظی ترجمے کے بجائے فکری و جمالیاتی وفاداری کو ترجیح دیتے ہیں، جس کے باعث ان کا ترجمہ ایک تخلیقی بازآفرینی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مقالے میں دیگر مترجمین کے تراجم سے تقابلی جائزہ لے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مولانا معروفی کا ترجمہ معنوی شفافیت، اسلوبی توازن اور استعاراتی صحت کے اعتبار سے زیادہ مکمل اور موثر ہے۔

مولانا کی ترجمہ نگاری اردو میں معیاری حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اصل متن کی روح، اس کے اسلوب اور جذباتی کیفیت کو پوری دیانت کے ساتھ اردو میں منتقل کرتے ہیں۔ ان کے تراجم میں نہ صرف معنوی صحت پائی جاتی ہے بلکہ زبان کی سلاست اور ادبی حسن بھی برقرار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ترجمہ پڑھتے ہوئے قارئین کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے ایک مکمل اور جاندار تخلیق

محسوس کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین معروفی، ترجمہ نگاری، دوازدہ بند، محتشم کاشانی، مرثیہ، فارسی ادب، اردو ترجمہ، استعاراتی نظام، فکری دیانت، جمالیاتی وفاداری۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی شخصیت اپنی جامعیت، علمی گہرائی اور فکری تنوع کے اعتبار سے عصر حاضر میں ایک غیر معمولی علمی پیکر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی ذات بیک وقت کئی جہات علم وفکر کی حامل تھی اور یہی ہمہ گیر وسعت انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔ وہ ان اہل علم میں سے تھے جن کے یہاں علم محض معلومات کا انبار نہیں بلکہ ایک زندہ شعور، ایک فکری بصیرت اور ایک روحانی واردات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت میں تدریس، تفکر، تحقیق، تفقہ، ادب، عرفان اور فلسفہ اس طرح باہم مربوط دکھائی دیتے ہیں کہ کسی ایک جہت کو دوسری سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ تفلسف اور عرفان کے بحر بے کنار کے ایسے ماہر شناور تھے جنھوں نے محض متون کے مطالعے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان علوم کی روح تک رسائی حاصل کی تھی۔ فلسفیانہ مباحث کی نزاکتیں، عرفانی اشارات کی تہ داری اور فکری مسائل کی پیچیدگیاں، ان کے سامنے اس طرح منکشف تھیں جیسے ایک صاحب نظر کے سامنے آئینہ روشن ہو۔ ان کی گفتگو میں فلسفے کی استدلالی قوت بھی ہوتی تھی اور عرفان کی باطنی حرارت بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خشک عقلیت کے اسیر نہ تھے اور نہ محض وجدانی واردات کے داعی بلکہ عقل وعرفان کے درمیان ایک متوازن اور عمیق ربط کے قائل تھے۔

اسی طرح تفقہ فی الدین میں بھی انھیں ایک بلند علمی مقام حاصل تھا۔ فقہی مباحث میں ان کی نظر محض تقلیدی یا روایتی نہ تھی بلکہ وہ اصولی بصیرت اور اجتہادی شان کے حامل تھے۔ نظری اور فکری مسائل میں ان کے یہاں ایک خاص فکری استقلال دکھائی دیتا تھا۔ وہ مسائل کو محض منقولات کی سطح پر نہیں دیکھتے تھے بلکہ ان کے پس منظر، علت، حکمت اور فکری بنیادوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی گفتگو اور تحریر میں ایک اجتہادی وقار محسوس ہوتا تھا وہ بھی ایسا وقار جو گہرے مطالعے، وسیع مشاہدے اور مسلسل فکری ریاضت کے بغیر ممکن نہیں۔

ادبی اعتبار سے بھی مولانا معروفی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ زبان و بیان پر ان کی قدرت، لفظوں کے باہمی تناسب کا شعور، تعبیرات کی جمالیاتی ترتیب اور معانی کی تہ داریوں سے ان کی شناسائی

انھیں ایک ممتاز ادیب اور صاحب طرز نثر نگار کے مقام پر فائز کرتی ہے۔ وہ محض زبان استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ لفظوں میں روح پھونک دیتے تھے۔ ان کی تحریر میں علمی متانت بھی ہوتی تھی اور ادبی لطافت بھی۔ وہ کلاسیکی ادبی روایت کے امین بھی تھے اور جدید فکری اسالیب سے بھی پوری طرح آشنا تھے۔ بیان واقعہ ہے کہ مولانا ارشاد معروفی نے جس میدان علم میں قدم رکھا اس میں غیر معمولی مہارت، عمیق بصیرت اور بے نظیر دسترسی حاصل کی۔ وہ سطحی مطالعے یا محدود فکری دائرے کے آدمی نہیں تھے بلکہ ہر فن میں اس کی گہرائی تک اترنے اور اس کے بنیادی اصول و مبادی کو سمجھنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ گویا علم ان کے لیے ایک خارجی کسب نہیں بلکہ ان کی طبیعت کا حصہ تھا۔ یہ جوہر ان کی سرشت میں اس طرح رچا بسا ہوا تھا کہ علم و فکر ان کی گفتگو، ان کی تحریر، ان کے طرزِ استدلال حتیٰ کہ ان کی خاموشی تک سے جھلکتا تھا۔

ان کی فکری جولانیوں کا ایک نہایت اہم اور قابل ذکر میدان ترجمہ نگاری ہے۔ انھوں نے عربی و فارسی کے متعدد علمی، ادبی اور فکری شہ پاروں کو اردو زبان میں منتقل کیا اور ان کے تراجم اپنی علمی اصالت، فنی پختگی اور 'حرمت متن' کی پاسداری کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے یہاں ترجمہ محض ایک لسانی عمل نہیں بلکہ ایک فکری اور تہذیبی ذمہ داری کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی متن کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے نہ صرف اس کے ظاہری مفہوم کو محفوظ رکھتے ہیں بلکہ اس کی داخلی روح، اسلوبی فضا، تہذیبی پس منظر اور جذباتی آہنگ کو بھی پوری دیانت داری کے ساتھ برقرار رکھتے ہیں۔

درحقیقت ترجمہ نگاری محض الفاظ کے رد و بدل یا لغوی مطابقت کا نام نہیں بلکہ یہ تہذیبوں، زبانوں اور فکری روایتوں کے درمیان ایک زندہ اور متحرک مکالمہ ہے۔ یہ ایسا پُل ہے جس پر چل کر ایک زبان کا قاری دوسری زبان کی روح، اس کے فکری مزاج اور اس کے تہذیبی شعور تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ مترجم اگر محض الفاظ کی سطح پر اکتفا کرے تو متن اپنی تاثیر اور معنوی حرارت کھو دیتا ہے لیکن جب مترجم اصل متن کی روح سے ہم آہنگ ہو کر اسے نئی زبان میں ڈھالتا ہے تو ترجمہ ایک نئی تخلیقی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی لیے ترجمہ نگاری اپنی حقیقت میں صرف لسانی مہارت کا تقاضا نہیں کرتی بلکہ اس کے لیے فکری بالیدگی، تہذیبی شعور، ادبی ذوق اور جمالیاتی حس کی گہری تربیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ مترجم کو صرف دو زبانوں پر عبور کافی نہیں بلکہ اسے ان زبانوں کے تہذیبی رشتے، فکری پس منظر اور اسلوبی روایتوں سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ وہ جتنا زیادہ اصل متن کے تہذیبی اور فکری سیاق کو سمجھتا ہے اتنا ہی کامیاب انداز میں اسے نئی زبان میں منتقل کر پاتا ہے۔ مولانا معروفی کی ترجمہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ متن کی 'روح' کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہر زبان اپنے اندر ایک مخصوص

آہنگ، ایک جداگانہ احساس اور ایک تہذیبی نظام رکھتی ہے۔ اسی لیے وہ لفظ بہ لفظ ترجمے کے قائل نہ تھے بلکہ 'معنی کی امانت' کو اصل میں ترجیح دیتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک کامیاب ترجمہ وہی ہے جو اصل متن کی فکری و جمالیاتی تاثیر کو نئی زبان میں بھی زندہ رکھ سکے۔

اسی تناظر میں دیکھا جائے تو مترجم دراصل دو دنیاؤں کے درمیان ایک خاموش سفیر ہوتا ہے۔ وہ صرف الفاظ کی منتقلی نہیں کرتا بلکہ احساسات، افکار، استعارات، علامتوں اور تہذیبی لطافتوں کو ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتقل کرتا ہے۔ یہ کام اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب مترجم خود بھی صاحب ذوق، صاحب شعور اور صاحب نظر ہو۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کی شخصیت ان تمام اوصاف کی حامل تھی۔ اسی لیے ان کے تراجم محض 'ترجمے' محسوس نہیں ہوتے بلکہ ایک فکری اور ادبی بازآفرینی کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔

مولانا ارشاد معروفی کئی زبان پہ اجتہادی تسلط رکھتے تھے۔ خاص طور سے عربی اور فارسی زبان، ان کی تدریسی زبان بھی تھی اور ان دونوں زبان کا ادب عالیہ ان کا محور اشتیاق بھی تھا۔

ان کی شخصیت اس حقیقت کی آئینہ دار تھی کہ ترجمہ نگاری صرف لسانی مہارت کا نام نہیں بلکہ ایک فکری عمل ہے جس کے لیے زبانوں کے اندرونی نظام، ان کے اسالیب اور ان کے تہذیبی پس منظر سے گہری واقفیت ضروری ہے۔ عربی و فارسی جیسی زبانوں پر ان کا اجتہادی تسلط اس بات کی دلیل تھا کہ وہ محض الفاظ کے معنی نہیں جانتے تھے بلکہ ان کے پیچھے کارفرما فکری اور ادبی روایت سے بھی پوری طرح آشنا تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کسی متن کی تشریح یا ترجمہ کرتے تو اس میں محض معلومات کی ترسیل نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک فکری روشنی بھی شامل ہوتی تھی جو سننے والے کے ذہن کو منور کر دیتی تھی۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ 'اجتہادی تسلط' کا مفہوم صرف مہارت نہیں بلکہ تخلیقی قدرت بھی ہے۔ ایسا شخص زبان کو محض استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر نئے معنی پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ مولانا کی یہی خصوصیت انھیں ایک عام مترجم سے ممتاز کرتی تھی۔ وہ جب عربی یا فارسی کے کسی دقیق متن کو اردو میں بیان کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا وہ محض ترجمہ نہیں کر رہے بلکہ ایک نئے متن کی تخلیق کر رہے ہیں۔ ایسی تخلیق جو اصل کی روح سے ہم آہنگ بھی ہوتی اور اردو کے ذوق سے بھی قریب تر۔ ادبِ عالیہ سے ان کی وابستگی نے ان کے ترجماتی شعور کو مزید گہرائی عطا کی تھی۔ کیوں کہ ادب وہ میدان ہے جہاں زبان اپنی اعلیٰ ترین صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہاں لفظ صرف معنی نہیں دیتے بلکہ ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں، ایک فضا قائم کرتے ہیں، ایک خاص احساس کو جنم دیتے ہیں۔ ایسے میں مترجم کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف معنی کو سمجھے بلکہ اس کیفیت کو بھی محسوس کرے۔ مولانا ارشاد معروفی کی شخصیت اس معیار پر پوری اترتی تھی۔ ان کے اندر وہ

حساسیت موجود تھی جو ایک ادبی متن کی روح تک رسائی حاصل کر سکتی ہے، اور پھر اسے ایک نئی زبان میں اسی تاثیر کے ساتھ منتقل کر سکتی ہے۔

ترجمہ نگاری کی دنیا میں ایسے افراد بہت کم ہوتے ہیں جو زبانوں کے درمیان محض پل نہ بنائیں بلکہ ایک نئی فکری دنیا کی تشکیل کریں۔ مولانا ارشاد معروفی اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تدریسی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ وہ طلبہ کو صرف زبان نہیں سکھاتے تھے بلکہ زبان کے ذریعے فکر کی تشکیل بھی کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ سوچنے کا ایک انداز بھی ہے، اور جب ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو دراصل ایک اندازِ فکر کو دوسرے اندازِ فکر سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ اسی تناظر میں دیکھا جائے تو ترجمہ نگاری ایک تخلیقی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ یہ ذمہ داری اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مترجم نہ صرف اصل متن کے ساتھ دیانت دار ہو بلکہ ہدفی زبان کے ساتھ بھی انصاف کرے۔ اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون سا لفظ، کون سا جملہ، اور کون سا اسلوب اس معنی کو بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے جو اصل متن میں موجود ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں عقل کی باریکی اور دل کی حساسیت دونوں درکار ہوتی ہیں۔ مولانا ارشاد معروفی کی علمی زندگی اس حقیقت کی عملی تفسیر تھی۔ ان کی زبان دانی، ان کا ادبی ذوق، اور ان کا تدریسی اسلوب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ ترجمہ نگاری کے اس اعلیٰ معیار سے بخوبی واقف تھے۔ وہ زبان کو صرف سیکھتے یا سکھاتے نہیں تھے بلکہ اسے جیتے تھے، اسے محسوس کرتے تھے، اور اسی احساس کو دوسروں تک منتقل کرتے تھے۔

فارسی ادب کی تاریخ میں مرثیہ نگاری ایک نہایت اہم اور باوقار صنفِ سخن کے طور پر سامنے آتی ہے جس نے نہ صرف مذہبی و روحانی جذبات کی ترجمانی کی بلکہ فنی و ادبی سطح پر بھی اپنی ایک مستقل شناخت قائم کی۔ اس روایت میں متعدد شعرا نے اپنے اپنے انداز میں اہلِ بیتؑ کے مصائب و آلام کو منظوم کیا۔ مولانا جلال الدین رومی نے رثائیہ میں فکری نقوش کو زیادہ ابھارا ہے اور اسی فکری رجحان کا غلبہ ہمیں بیدل دہلوی کے عاشورائی مرثیے میں بھی نظر آتا ہے۔ بہر حال بعض تخلیقات ایسی ہیں جو اپنے فنی کمال، تاثیر اور تہذیبی رسوخ کے اعتبار سے امتیازی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ انہی میں ایک نمایاں مثال کمال الدین علی محتشم کاشانی (دسویں صدی ہجری) کا شہرۂ آفاق مرثیہ دوازدہ بند ہے، جو ترکیب بند کی ہیئت میں تخلیق کیا گیا اور رفتہ رفتہ فارسی مرثیہ نگاری کا معیار و میزان بن گیا۔ مرثیہ نگاری کی فارسی روایت کا سراغ ابتدائی ادوار سے ہی ملتا ہے۔ کسائی مروزی سے لے کر مقبل کاشانی اور ملا خطا شوشتری تک ایک مسلسل اور زرخیز شعری سلسلہ قائم نظر آتا ہے جس میں اظہارِ عقیدت کے ساتھ ساتھ فنی تجربات اور اسلوبی تنوع بھی ملتا ہے۔

تاہم اس پوری روایت میں کمال الدین علی محتشم کاشانی کا مقام نہایت ممتاز اور بلند ہے۔ ان کا مرثیہ دوازدہ بند اپنی ساختیاتی ہم آہنگی، جذباتی شدت اور سادگیِ بیان کے باعث نہ صرف اپنے عہد میں مقبول ہوا بلکہ بعد کے ادوار میں بھی مرثیہ نگاری کے لیے ایک معیار کی حیثیت اختیار کر گیا۔

محتشم کاشانی کے اس مرثیے کی مقبولیت کا ایک اہم سبب اس کا وہ داخلی توازن ہے جس میں فنی پختگی اور جذباتی سچائی باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔ اس میں نہ مبالغہ آرائی کی افراط ہے اور نہ اظہار کی سطحیت؛ بلکہ ایک ایسی متوازن کیفیت ہے جو قاری یا سامع کو براہِ راست متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوازدہ بند نہ صرف فارسی ادب میں بلکہ برصغیر کی مذہبی و ادبی روایت میں بھی ایک زندہ اور فعال متن کے طور پر موجود رہا ہے۔ ایسے میں جب اس نوعیت کے ایک کلاسیکی اور حساس متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ عمل محض ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ایک تخلیقی اور فکری چیلنج کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا ارشاد حسین معروفی کی خدمات خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ اگرچہ انھوں نے فارسی ادب کے متعدد اہم منثور و منظوم شہ پاروں کو اردو قالب میں منتقل کیا، تاہم دوازدہ بندِ محتشم کا ان کا ترجمہ ان کے مجموعۂ تراجم میں ایک نمایاں اور منفرد ادبی مقام رکھتا ہے۔

مولانا معروفی کے ترجمے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے محض الفاظ کی سطح پر نقل و انتقال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اصل متن کی روح، اس کی جذباتی فضا اور اس کے اسلوبی حسن کو بھی اردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے ترجمے میں ایک طرف اصل متن کی وفاداری ملحوظ رہتی ہے تو دوسری طرف اردو زبان کی سلاست اور ادبی روایت سے ہم آہنگی بھی برقرار رہتی ہے۔ یوں ان کا یہ کام ایک ایسے 'تخلیقی ترجمے' کی مثال بن جاتا ہے جس میں اصل اور ترجمہ کے درمیان ایک بامعنی توازن قائم ہوتا ہے۔ مزید برآں مولانا معروفی کی لسانی مہارت خصوصاً عربی و فارسی پر ان کا اجتہادی تسلط اس ترجمے میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ وہ نہ صرف متن کے ظاہری مفہوم سے آگاہ ہیں بلکہ اس کے تہذیبی، فکری اور ادبی پس منظر کو بھی گہرائی سے سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ترجمہ محض ایک لسانی عمل نہیں بلکہ ایک فکری و جمالیاتی بازآفرینی محسوس ہوتا ہے۔

محتشم کا مرثیہ فارسی مرثیہ نگاری کی اس بلند ترین شعری روایت کی نمائندگی کرتا ہے جس میں رثائیہ سوز، فکری رفعت اور کائناتی احساسِ غم ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ مرثیہ محض ایک شخصی یا تاریخی نوحہ نہیں رہتا بلکہ ایک ہمہ گیر اور آفاقی تجربہ بن جاتا ہے۔ کمال الدین علی محتشم کاشانی نے دوازدہ بند کے ابتدائی ابیات میں جس حزنیہ فضا اور رثائیہ کیفیت کی تخلیق کی ہے وہ فارسی مرثیہ نگاری میں اپنی

مثال آپ ہے۔ ان اشعار میں واقعۂ کربلا کو کسی محدود تاریخی سانحے کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسی کائناتی قیامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کے اثرات زمین سے عرش تک محسوس کیے جا رہے ہیں۔ مرثیے کا آغاز ہی سوالیہ لہجے سے ہوتا ہے ؎

باز این چہ شورش است کہ در خلق عالم است
باز این چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است

یہاں شاعر دراصل ایک معلوم حقیقت کو استفہامیہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ بظاہر وہ سوال کر رہا ہے، لیکن حقیقت میں یہ سوال نہیں بلکہ شدتِ حیرت، وسعتِ غم اور عظمتِ سانحہ کا شعری اظہار ہے۔ اس اسلوب کی خاص بات یہ ہے کہ شاعر مخاطَب کو محض اطلاع نہیں دیتا بلکہ اسے اس غم میں شریک کر لیتا ہے۔ گویا وہ کہہ رہا ہے کہ یہ ایسا حادثہ نہیں جس سے کوئی بے خبر ہو، اس کی خبر تو عالمِ ہستی کے ذرّے ذرّے کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'شورش'، 'نوحہ'، 'عزا' اور 'ماتم' جیسے الفاظ پورے ماحول پر ایک اجتماعی اور ہمہ گیر غم کی فضا قائم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ؎

باز این چہ رستخیز عظیم است کز زمین
بی نفخ صور خاستہ تا عرش اعظم است

اس شعر میں شاعر نے واقعۂ کربلا کو 'رستخیزِ عظیم' سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں 'رستخیز' صرف قیامت کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ایک ایسی ہولناک کیفیت کی علامت بن گیا ہے جس نے پوری کائنات کو اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ 'بی نفخِ صور' کی ترکیب نہایت بلیغ ہے۔ یعنی بغیر اسرافیل کے صور پھونکے ہی ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اس تعبیر کے ذریعے محتشم نے یہ واضح کیا ہے کہ شہادتِ امام حسینؑ کوئی معمولی حادثہ نہیں بلکہ ایک ایسا سانحہ ہے جس نے نظامِ ہستی کو لرزا کر رکھ دیا۔ اسی حزنیہ کیفیت کو شاعر مزید وسعت دیتے ہوئے کہتا ہے:

گویا طلوع می‌کند از مغرب آفتاب
کاشوب در تمامی ذرّات عالم است

یہاں 'مغرب سے آفتاب کا طلوع' ایک غیر فطری اور قیامت خیز منظر کی علامت ہے۔ شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ کربلا کا حادثہ فطرت کے معمولات کو بھی الٹ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ 'ذرات عالم' کی ترکیب اس غم کے کائناتی اور ہمہ گیر ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گویا صرف انسان ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے اس ماتم میں شریک ہے۔

محتشم کا کمال یہ ہے کہ وہ مرثیے کو محض جذباتی بیان تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس میں مذہبی تقدس اور روحانی رفعت بھی شامل کر دیتے ہیں۔

در بارگاہ قدس کہ جای ملال نیست
سرہای قدسیان ہمہ بر زانوی غم است

یہ شعر اپنی معنوی گہرائی کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ 'بارگاہِ قدس' ایک ایسی مقدس فضا کی علامت ہے جہاں عام طور پر رنج و ملال کا تصور نہیں کیا جاتا مگر شاعر کہتا ہے کہ وہاں بھی فرشتے اور مقدس ہستیاں غم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ 'سر بر زانوی غم' رکھنا ایک نہایت بصری اور اثر انگیز پیکر تراشی ہے، جو حزنیہ کیفیت کو انتہائی شدت کے ساتھ نمایاں کرتی ہے۔ اسی تسلسل میں شاعر کہتا ہے۔

جن و ملک بر آدمیان نوحہ می کنند
گویا عزای اشرف اولاد آدم است

یہ شعر مرثیے کے آفاقی تصور کو مزید مستحکم کرتا ہے۔ یہاں صرف انسان نہیں بلکہ جنّات اور ملائکہ بھی نوحہ کناں ہیں۔ 'اشرف اولادِ آدم' کی ترکیب امام حسینؑ کے مقام و مرتبہ کو انتہائی عقیدت اور تقدیس کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس طرح شاعر واقعہ کربلا کو محض ایک تاریخی معرکہ نہیں بلکہ انسانیت کے سب سے عظیم المیے کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ پھر بیت میں۔

خورشید آسمان و زمین، نور مشرقین
پروردۂ کنار رسول خدا حسین

امام حسین کی شخصیت کو ایسی استعاراتی عظمت عطا کی گئی ہے جس میں نور، آفتاب اور رسالت کی تمام نسبتیں یکجا ہو جاتی ہیں۔ 'خورشیدِ آسمان و زمین' اور 'نورِ مشرقین' جیسی تراکیب نہ صرف امام حسینؑ کے روحانی مقام کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ اس سانحے کی شدت کو بھی بڑھا دیتی ہیں کیوں کہ جب ایسی عظیم ہستی مظلومانہ طور پر شہید ہو تو کائنات کا غمگین ہو جانا ایک فطری امر محسوس ہوتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ محتشم کاشانی نے ان اشعار میں رثائیہ ادب کو محض گریہ و ماتم کی سطح تک نہیں رکھا بلکہ اسے بلند کر کے ایک ایسی فکری، روحانی اور جمالیاتی سطح پر پہنچا دیا ہے جہاں غم ایک کائناتی تجربے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سوالیہ اسلوب، استعاراتی زبان، قیامت خیز علامات اور کائناتی پیکر تراشی کے ذریعے انھوں نے ایک ایسی حزنیہ فضا تخلیق کی ہے جو قاری کے احساسات کو براہِ راست متاثر کرتی ہے اور اسے اس عظیم سانحے کے روحانی اور انسانی پہلوؤں سے گہرے طور پر وابستہ کر دیتی ہے۔

مولانا ارشاد معروفی کی ترجمہ نگاری ان کی غیر معمولی لسانی بصیرت، ادبی ذوق اور فنی مہارت کا روشن ثبوت ہے۔ وہ محض ایک مترجم نہیں بلکہ لفظوں کی تہ داریوں، ان کے صوتی آہنگ، معنوی ارتعاش اور داخلی تحرک سے گہری آشنائی رکھنے والے صاحب نظر ادیب تھے۔ زبان ان کے یہاں محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک جمالیاتی نظام کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب کسی کلاسیکی متن کو اردو میں منتقل کرتے ہیں تو اصل متن کی فکری روح، جذباتی فضا اور استعاراتی نظام کو پوری دیانت اور ہنرمندی کے ساتھ برقرار رکھتے ہیں۔ کمال الدین علی محتشم کاشانی کے شہرۂ آفاق مرثیہ دوازدہ بند کا مولانا معروفی کے ہاتھوں اردو قالب میں منتقل ہونا دراصل ایک ادبی اور فکری باز آفرینی کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس مرثیے کا ترجمہ کرتے ہوئے محض 'مطلب رسانی' پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہر بند میں موجود حزنیہ کیفیت، استعاراتی فضا، صوتی آہنگ اور جذباتی ارتعاش کو بھی پوری شدت کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ ان کے ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اصل متن کی تاثیر کو 'اظہار مطلب کی سہولت' پر قربان نہیں کرتے۔ عموماً ترجمہ نگاری میں یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ مترجم سادگی یا روانی کے شوق اور چکر میں متن کے شعری اور جمالیاتی عناصر کو کمزور کر دے مگر مولانا معروفی نے اس مرحلے پر غیر معمولی احتیاط اور فنی شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔

ان کے ترجمے میں دوازدہ بند کا استعاراتی نظام اپنی پوری معنوی اور جذباتی توانائی کے ساتھ برقرار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر 'رستخیز'، 'آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا'، 'قدسیوں کا سر بزانو ہونا' اور 'جن و ملک کا نوحہ کرنا' جیسی علامتیں صرف لفظی سطح پر منتقل نہیں ہوئیں بلکہ ان کی داخلی کیفیت اور روحانی تاثیر بھی اردو زبان میں پوری شفافیت کے ساتھ منعکس ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ قاری ترجمہ پڑھتے ہوئے یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ کسی 'منقولہ متن' سے سابقہ رکھتا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اصل مرثیہ اردو ہی میں تخلیق ہوا ہو۔ بندِ اوّل کے ترجمے میں مولانا معروفی کی فنی بصیرت اور لسانی شعور نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ دیکھیے کہ وہ محتشم کے سوالیہ اور حیرت انگیز لہجے کو کس خوب صورتی کے ساتھ اردو میں منتقل کرتے ہیں:

''یہ کیسی فریاد و فغاں، کیسی عزا اور کیسا نوحہ و ماتم ہے جو مخلوقات میں برپا ہے؟''

یہاں 'شورش'، 'نوحہ'، 'عزا' اور 'ماتم' کی اصل فارسی فضا اردو میں بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ 'مخلوقات میں برپا ہے' کی ترکیب اس غم کی آفاقیت کو نمایاں کرتی ہے اور اسی کائناتی کیفیت کو زندہ رکھتی ہے جو اصل متن کی روح ہے۔ اسی طرح تیسرے اور چوتھے بند کے ترجمے میں:

''یہ تاریک صبح کہاں سے نکل آئی.....''

''گویا مغرب سے آفتاب طلوع ہوگیا ہے.....''

جیسی تراکیب نہ صرف اصل متن کے استعاراتی حسن کو محفوظ رکھتی ہیں بلکہ اردو زبان میں بھی ایک قیامت خیز اور حزنیہ منظر نامہ تشکیل دیتی ہیں۔'تاریک صبح' اپنی ذات میں ایک متضاد ترکیب (Paradox) ہے جو سانحہ کربلا کے غیر معمولی اور فطرت شکن ہونے کو نہایت بلیغ انداز میں ظاہر کرتی ہے۔ بند کی بیت میں امام حسینؑ کے تعارف کے لیے جو مترنم اور عقیدت آمیز فضا پیدا کی گئی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے:

''ہاں وہ آسمان و زمین کے آفتاب، شرق و غرب کے نور، رسول خدا کی آغوش کے پروردہ حسین ہیں۔''

یہاں 'خورشید آسمان و زمین' اور 'نور مشرقین' جیسی استعاراتی تراکیب کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے مولانا معروفی نے نہ صرف اصل متن کی عظمت کو محفوظ رکھا ہے بلکہ اردو زبان کے اپنے شعری وقار کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ اب مکمل ترجمہ ملاحظہ کریں:

۱- یہ کیسی فریاد و فغاں، کیسی عزا اور کیسا نوحہ و ماتم ہے جو مخلوقات میں برپا ہے؟

۲- یہ کیسی قیامت عظمیٰ ہے جو حضرت اسرافیل کے صور پھونکے بغیر زمین سے عرش اعظم تک مچی ہوئی ہے؟

۳- یہ تاریک صبح کہاں سے نکل آئی جس کے باعث دنیا اور مخلوق کے سارے کام ٹھپ پڑ گئے ہیں۔

۴- گویا مغرب سے آفتاب طلوع ہوگیا ہے جس کی وجہ سے دنیا کے تمام ذرات میں انتشار ہے۔

۵- یہ عام قیامت جس کا نام محرم ہے اگر میں اسے قیامت دنیا سے تعبیر کروں تو غلط نہ ہوگا۔

۶- رب کی مقدس بارگاہ جو رنج و غم سے عاری ہے وہاں بھی تمام قدسیوں کے سر، غم کی وجہ سے زانو پر جھکے ہوئے ہیں۔

۷۔ جن و ملک آدمیوں پر نوحہ کر رہے ہیں گویا یہ اولاد آدم کے شریف ترین انسان کی عزا ہے۔

۸- ہاں وہ آسمان و زمین کے آفتاب، شرق و غرب کے نور، رسول خدا کی آغوش کے پروردہ حسین ہیں۔ (ترجمہ دوازدہ بند، فیضان ادب، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۹ء، ص ۱۷۱۔ ۱۷۲)

دوازدہ بند کا مولانا ارشاد حسین معروفی کا ترجمہ اردو دنیا میں اس متن کا پہلا ترجمہ نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی اس مرثیے کو اردو قالب میں منتقل کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے۔ چنانچہ رضا لائبریری سے ۲۰۱۴ء میں دوازدہ بند کا ایک اردو ترجمہ شائع ہوا تھا جس کے مترجم حکیم سید محمد ریاض الدین حسین ہمدانی

تھے۔ ساتھ میں ڈاکٹر بلرام شکلا کا منظوم ہندی ترجمہ بھی ہے۔ اگرچہ اردو ترجمہ اپنی جگہ ایک اہم علمی اور ادبی کاوش ضرور ہے کیوں کہ کلاسیکی فارسی مراثی کو اردو قارئین تک منتقل کرنا بجائے خود ایک دشوار اور قابلِ قدر عمل ہے تاہم فنی اور لسانی اعتبار سے اس ترجمے میں بعض ایسے نقائص اور ابہامات موجود ہیں جو اصل متن کی معنوی شفافیت اور فکری تسلسل کو متاثر کرتے ہیں۔ ترجمہ نگاری میں سب سے بنیادی اور نازک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ مترجم اصل متن کے ظاہری مفہوم کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی فضا، استعاراتی نظام اور مصنف کی منشا کو کس حد تک محفوظ رکھ پاتا ہے۔ اگر مترجم محض الفاظ کے سطحی مفہوم پر اکتفا کرے تو متن کی اصل روح مجروح ہو جاتی ہے اور اگر وہ اصل عبارت کے نحوی اور معنوی روابط کو نظر انداز کر دے تو ترجمہ ابہام و اغلاق اور بعض اوقات معنوی انحراف کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی مسئلہ مذکورہ ترجمے میں بعض مقامات پر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے جہاں عبارت کی ساخت اور معنی کے باہمی تعلق کو پوری طرح برقرار نہیں رکھا جا سکا۔ مثال کے طور پر دوازدہ بند کے بند سوم کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

نگرفت دست دہر گلابی بہ غیر اشک
زآن گل کہ شد شگفتہ بہ بستان کربلا

اس شعر میں 'دست دہر' ایک نہایت معنی خیز اور استعاراتی ترکیب ہے جو زمانے کے ظلم، گردشِ ایام اور تقدیر کے سفاک رویّے کی علامت ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ کربلا کے گلستان میں جو بھی پھول کھلا، زمانے کے ہاتھ نے اس سے آنسوؤں کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا یعنی اس گلستان کے تمام پھول ظلم، مصیبت اور خون و اشک کی نذر ہو گئے۔ یہاں 'دست دہر' پورے شعر کا معنوی مرکز ہے اور اسی کے ذریعے شاعر نے کربلا کے المیے کو زمانے کی بے رحمی کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اب اگر اس شعر کا یہ ترجمہ دیکھا جائے:

''کربلا کے چمن میں جو بھی گل کھلا وہ پھول بغیر آنسوؤں کے نہ رہا۔'' (دوازدہ بند محتشم کاشانی: اردو ترجمہ حکیم سید محمد ریاض الدین ہمدانی، رضا لائبریری، رام پور، ۲۰۱۴ء، ص ۴۱)

تو محسوس ہوتا ہے کہ اصل متن کی معنوی جہت پوری طرح منتقل نہیں ہو سکی۔ اس ترجمے میں 'دست دہر' کی استعاراتی قوت حذف ہو گئی ہے، جس کے نتیجے میں شعر کا وہ داخلی ربط اور فکری عمق کمزور پڑ جاتا ہے جو اصل فارسی متن میں موجود ہے۔ مزید یہ کہ اس ترجمے سے ایسا تاثر ابھرتا ہے گویا خود پھول آنسو بہا رہے ہوں جب کہ شاعر کا اصل مقصود زمانے کی سنگ دلی اور اس کے ظلم کی تصویر کشی ہے۔ اس کے برعکس مولانا ارشاد معروفی کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

''کربلا کے چمن میں جو بھی پھول کھلا وہ پھول زمانے کے ہاتھوں، بغیر آنسو کے نہ رہا۔''

یہ ترجمہ اپنی معنوی صحت، اسلوبی شفافیت اور فکری وفاداری کے اعتبار سے اصل متن کے کہیں زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ مولانا معروفی نے 'دست دہر' کو 'زمانے کے ہاتھوں' کی صورت میں منتقل کر کے نہ صرف شعر کی استعاراتی فضا کو محفوظ رکھا ہے بلکہ شاعر کی اصل منشا کو بھی پوری وضاحت کے ساتھ اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک بڑے مترجم کی فنی بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بعض الفاظ صرف لغوی معنی نہیں رکھتے بلکہ پورے متن کی معنوی ساخت اور جذباتی فضا انہی پر قائم ہوتی ہے۔

یہ مثال اس حقیقت کو نہایت واضح انداز میں سامنے لاتی ہے کہ ترجمہ نگاری صرف زبان دانی کا مسئلہ نہیں بلکہ فکری دیانت، ادبی شعور اور متن کی تہ در تہ معنویت سے آگاہی کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ ایک کامیاب مترجم وہی ہوتا ہے جو اصل مصنف کی منشا، اس کے اسلوب، اس کی علامتوں اور اس کے فکری تناظر کو نئی زبان میں اس طرح منتقل کرے کہ نہ متن کی روح مجروح ہو اور نہ اس کی جمالیاتی تاثیر کم ہو۔ مولانا ارشاد معروفی کے ترجمے کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے دوازدہ بند کے ترجمے میں اصل متن کی روح، اس کے استعاراتی نظام اور اس کے حزنیہ آہنگ کو پوری دیانت اور فنی مہارت کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر عابد حسین حیدری
صدر شعبۂ اردو، ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج، سنبھل، رابطہ نمبر: 9411097150

آئینۂ نقد و نظر

مشرقی شعریات کا تنقیدی محاسبہ اور مولانا ارشاد حسین

تلخیص:

مولانا ارشاد حسین معروفی مشرقی اتر پردیش کی زرخیز بستی پورہ معروف سے تعلق رکھتے تھے اور عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب پر گہری دسترس رکھتے تھے۔ وہ درسِ نظامی کے ممتاز استاد ہونے کے ساتھ ایک سنجیدہ قلم کار، مترجم اور نقاد بھی تھے۔ ان کی تدریسی شخصیت کا امتیاز یہ تھا کہ وہ اپنے شاگردوں سے دوستانہ اور شفقت آمیز تعلق رکھتے تھے اور ان کی اخلاقی و علمی تربیت کو اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ ان کے سینکڑوں شاگرد برصغیر کے مختلف علاقوں میں تدریس، خطابت اور تبلیغ دین کے میدان میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا ارشاد حسین معروفی نے عربی و فارسی ادبیات کے ساتھ مشرقی شعریات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس مطالعے کو اپنی تحریروں اور تراجم کے ذریعے عام کیا۔ ان کے اہم علمی کارناموں میں فارسی کے معروف ادبی متون کے تراجم شامل ہیں جن میں محتشم کاشانی کا 'دوازدہ بند'، سعدی کی 'کریما'، 'صد پند لقمان' اور خاقانی کا 'ایوان مدائن' کے تراجم قابل ذکر ہیں۔ ان تراجم کی نمایاں خصوصیت سلاست، روانی اور مناسب لفظیات کا استعمال ہے جس سے اصل متن کی روح برقرار رہتی ہے۔

اس مضمون میں خاص طور پر مولانا ارشاد حسین کے کئی قسطوں پر مبنی مقالہ 'امام خمینی کی شاعری میں عشق و عرفان' کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس سے ان کی تنقیدی بصیرت اور فارسی شعریات پر گہری گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے تصوف، عرفان، علامت اور تشبیہات و استعارات کے تناظر میں امام خمینی کی شاعری کی مختلف جہات کو واضح کیا ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی ایک ممتاز مدرس ہونے کے ساتھ باریک بین نقاد اور کامیاب مترجم بھی تھے

جنھوں نے مشرقی شعریات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

کلیدی الفاظ:

مولانا ارشاد حسین معروفی، مشرقی شعریات، فارسی ادب، ترجمہ نگاری، امام خمینی کی شاعری، عشق و عرفان، محتشم کاشانی، ایوان مدائن، اردو تنقید، فیضانِ ادب۔

مولانا ارشاد حسین معروفی ہمارے ان باقیات الصالحات میں تھے جن کی شخصیت کسی ایک خوبی میں محدود نہیں تھی بلکہ ان کی خوبیاں ایک بحر ناکنار کے مانند تھیں جن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جو لوگ مولانا ارشاد حسین معروفی کے شاگرد ہیں وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ مولانا کے درس و تدریس کا طریقہ کار دوسرے درس نظامی کے اساتذہ سے منفرد تھا۔ وہ مسند درس پر جب بیٹھتے تو ان کا رویہ اپنے شاگردوں سے دوستانہ ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کا شاگرد ان کے درس سے مطمئن ہو جاتا۔ ان کی اخلاقیات اور طریقہ تدریس ایک ایسا خوشنما سنگم تھا جس کی غواصی نے آج برصغیر میں بہت سے ایسے اساتذہ، قلم کار اور خطبا کو جنم دیا جنھوں نے علوم اہل بیت کے ناشرین کے طور پر اہم خدمات انجام دی ہیں۔ مولانا ارشاد حسین معروفی کے ہزاروں شاگردوں کا وجود اس بات کا گواہ ہے کہ ان کے شاگردوں میں ایسے علما بھی مسند درس کی زینت ہیں جنھیں مولانا نے زبردستی گھر سے پکڑ کر تعلیم کا راہی بنا دیا۔ اس لیے کہ ان کا اپنے شاگردوں سے رشتہ صرف درس گاہ کے کمرے تک نہیں ہوتا بلکہ ان کا وہ رشتہ شاگرد کے ساتھ ساتھ باپ بیٹے کا سا ہوتا تھا جس کی اخلاقی، سماجی اور شعوری تربیت اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اسے بخوبی نبھاتے بھی تھے۔

راقم الحروف مولانا ارشاد حسین معروفی کا باقاعدہ ویسا شاگرد نہیں ہے جس نے ان کے مدرسے میں داخلہ لے کر ان سے درس حاصل کیا ہو، لیکن عربی ادبیات کی دو کتابوں متنبی اور حماسہ کے درس کی سعادت حاصل ہے اور آج بھی استاد محترم کا طریقۂ درس میری نظروں میں گردش کرتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسے مدرس تھے جو ادبیات کی شعریات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ موصوف عربی، فارسی اشعار کے ترجمے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا تجزیاتی ذہن ان اشعار کی تفہیم و تشریح سے نئے مباحث کے در وا کرتا رہتا تھا۔

مولانا ارشاد حسین معروفی ضلع مئو کی علمی و ادبی بستی پورہ معروف کے رہنے والے تھے جو میرے اجداد کا وطن ہے۔ بعد میں راقم الحروف کے پردادا عابد حسین ابن فیض اللہ میاں نے اپنی سسرال کو پا گنج ضلع مئو میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ پورہ معروف کے محلہ بلوہ پر میرے خاندان کے علما و افاضل میں مولانا مظہر حسین معروفی، مولانا محمد حسن معروفی، مولانا منظر حسین معروفی، مولانا رضوان المعروفی اور مولانا عقیل

عباس معروفی اور دیگر علما وخطبا نے اپنے علمی کارناموں سے پوری دنیا میں نام پیدا کیا ہے، لیکن پورہ معروف کے میرے دو ایسے اساتذہ ہیں جنھیں درس و تدریس کے حوالے فوقیت حاصل ہے، اور ان دونوں نے عالمی سطح پر اپنے قلم کا لوہا منوایا ہے۔ ان میں پہلا نام مولانا محمد عثمان معروفی (سابق مدرس مدرسہ جامع العلوم کوپا گنج) جو بعد میں مظاہر العلوم سہارن پور میں نہ صرف مدرس رہے بلکہ وہاں کے رسالے 'مظاہر علوم' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ موصوف کئی درجن کتابوں کے مولف ومصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ اور تاریخ گوئی کے فن میں ماہر تھے۔ دوسری شخصیت جنھیں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ قلم و قرطاس سے خصوصی تعلق رہا وہ استاد گرامی مولانا ارشاد حسین معروفی کی ذات والاصفات تھی۔ میرے علم میں بہت سے ایسے نامور افراد کی کتابیں ہیں جن کی تصحیح کا کام مولانا نے کیا تھا۔ مشرقی اتر پردیش کے مدرسہ باب العلم مبارک پور، مدرسہ ناصریہ جون پور میں انھوں نے درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی اتر پردیش کے زیادہ تر علما اور خطبا ان کے شاگرد ہیں۔ خطۂ اودھ سے فیض آباد، جلال پور امبیڈکر نگر کے قصبات اور گاؤں کے بھی زیادہ تر علما ان کے شاگردوں میں ہیں جو نجف، قم اور سیریا میں تعلیم حاصل کر کے تبلیغ دین میں مصروف ہیں۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ جن طلبا میں وہ لکھنے کی صلاحیت محسوس کرتے انھیں وہ اس فن کے رموز سے واقف کراتے۔ اس لیے کہ مولانا کا مطالعہ عربی، فارسی اور اردو ادبیات کا بہت زبردست تھا۔

ادبیات سے عشق کے سبب مولانا چاہتے تھے کہ کوئی ایسا رسالہ ہو جو مشرقی اتر پردیش کے قلم کاروں کی تحریروں کو شائع کرتا رہے اور ان کی اسی سوچ نے ان کے لائق وفائق فرزند ڈاکٹر فیضان حیدر کو 'فیضان ادب' نکالنے پر مجبور کیا۔ آج یہ رسالہ اپنی گوناگوں صفات کے تحت برصغیر کے تحقیقی جرائد میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس رسالے نے بہت سے تاریخی نمبر بھی شائع کیے ہیں جن سے اس کے ادبی، سماجی، ثقافتی اور فکری نہج کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس رسالے میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی ادبیات پر مشتمل مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح مشرقی اتر پردیش سے شائع ہونے والا یہ رسالہ 'معارف' (اعظم گڑھ) کے بعد ادبی منظرنامے پر اپنی انفرادی شناخت قائم کر چکا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا ارشاد حسین معروفی درس نظامی کے استاد تھے۔ منطق اور ادبیات عربی ان کا خاص میدان تھا اور اس طرح انھوں نے عربی و فارسی ادبیات کا خاصا مطالعہ کر کے اس کا فیض اپنے شاگردوں تک پہنچایا، لیکن وہ ایک ہر دل عزیز استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلجھے ہوئے قلم کار بھی تھے۔ ان کی تحریریں اور شاعری طالب علمی کے زمانے سے ہی 'الواعظ' لکھنؤ اور

'الجواد' بنارس میں شائع ہونے لگی تھیں۔لیکن ان کی تحریریں راقم الحروف نے باقاعدہ سنجیدگی کے ساتھ اس وقت پڑھیں جب 'فیضانِ ادب' میں فارسی اور اردو ادبیات پر مشتمل ان کے مضامین اور ترجمے متواتر شائع ہونے لگے۔ان تحریروں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ مولانا صرف ایک مضمون نگار ہی نہیں ایک اچھے مترجم بھی تھے۔اس حوالے سے انھوں نے جو ترجمے کیے ان میں کمال الدین علی محتشم کاشانی کا 'دوازدہ بند'، سعدی کی 'کریما'، 'صد پند لقمان' اور 'ایون مدائن' از خاقانی کے تراجم اہمیت کے حامل ہیں۔ادبیات فارسی میں 'دوازدہ بند' فارسی کی رثائی شاعری میں بہت ہی مقبول و معروف ہے جس کے بہت سے ترجمے بھی ہوئے اور سینکڑوں اردو شعرا نے اس کی تضمین کے ساتھ ساتھ مخمس اور مسدس کا حصہ بھی بنایا ہے۔مولانا ارشاد حسین نے جہاں 'دوازدہ بند' کا خوب صورت اردو ترجمہ کیا وہیں اس کا معلوماتی مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں محتشم کاشانی کی سوانح کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی خصوصیات اور ان کے امتیازات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

فارسی کے اہم شعرا میں فردوسی، خاقانی، سعدی، رومی، اور حافظ جیسے شعرا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزارا لیکن محتشم کاشانی نے اپنی زندگی سیر و سیاحت میں نہیں گزاری بلکہ ان کا سفر خراسان اور عتبات عالیات کی زیارات تک محدود تھا۔ان کی اس امتیازی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا ارشاد حسین معروفی لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے سیر و سیاحت میں زیادہ وقت نہیں گزارا۔کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے خراسان اور عتبات عالیات کا سفر کیا تھا جس کی روداد ان کے بعض قصیدوں میں بھی ملتی ہے۔''[۱]

مولانا ارشاد حسین محتشم کی شہرت کا سبب 'دوازدہ بند' کو قرار دیتے ہیں، لیکن اس شاہکار کے علاوہ دیگر کارناموں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں نثر لکھنے پر بھی عبور حاصل تھا:

> ''محتشم کی شہرت کا دارومدار یہی دوازدہ بند ہے جو ترکیب بند کے قالب میں ہے۔وہ بہترین نثر لکھنے پر بھی قادر تھے جس کی مثال ان کی کتابیں 'رسالہ جلالیہ' اور 'نقل عشاق' ہیں۔یہ بالکل 'گلستاں' کی طرز پر نثر و نظم پر مشتمل ہیں۔تاریخ گوئی میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ان کے دیوان میں ان کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے دیوان میں غزلیں، قصیدے، مرثیے، مثنوی، رباعیاں اور قطعات سب کچھ موجود ہے۔''[۲]

محتشم کے حوالے سے مولانا ارشاد حسین نے لکھا ہے کہ محتشم کا زمانہ سبک ہندی کے عروج کا زمانہ تھا لیکن انھوں نے اپنی غزلوں میں سبک عراقی اور قصیدوں میں سبک خراسانی کی پیروی کی ہے۔'دوازدہ بند'

کو انھوں نے سبکِ عراقی کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے 'دوازدہ بند' کی تصنیف کا پس منظر بھی بیان کیا ہے، جس میں حضرت علی علیہ السلام نے انھیں خواب میں آ کر مرثیہ لکھنے کا حکم دیا اور امام زمانہ نے اس ترکیب بند کے مصرع اول: ''ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال'' کا دوسرا مصرع: ''او دردل است و ہیچ دلی نیست بی ملال'' عنایت کیا تھا۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کا خیال ہے کہ اردو کے رثائی ادب کی طرح فارسی میں رثائی ادب کی توانا روایت نہیں ملتی لیکن وہ 'دوازدہ بند' کو فارسی کے رثائی ادب کا ایک شاہکار تسلیم کرتے ہوئے اس کی فنی پختگی کے بھی قائل ہیں۔ ساتھ ہی اس کے بینیہ آہنگ کے قدرداں ہیں:

> ''فارسی میں اردو کی طرح رثائی ادب کی کوئی توانا تاریخ نہیں ملتی۔ ہاں واقعہ کربلا ایک ایسا سانحہ ہے جس نے ہر دور میں شعرا و ادبا کو متاثر کیا ہے۔ لیکن چوں کہ فارسی میں مرثیے کی کوئی ہیئت متعین نہیں ہے، اس لیے شعرا نے مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند غرض جس صورت میں چاہا مرثیہ کہا ہے۔ جب ہم اس ترکیب بند کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک ایک لفظ متاثر کرتا ہے۔ الفاظ کی ترتیب و ترکیب اور نشست و برخاست ہم کو اپنی گرفت میں لیتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری روح کانپ اٹھتی ہے، بدن تھرانے لگتا ہے۔ ہم پر ایک عجیب رقت طاری ہو جاتی ہے، جو بیان سے باہر ہے۔''[۳]

مولانا ارشاد حسین معروفی نے صحیح لکھا ہے کہ'' فارسی میں مرثیے کی کوئی ہیئت متعین نہیں ہے۔'' چوں کہ اردو شاعری میں زیادہ تر اصناف میں فارسی کا اتباع کیا گیا ہے، اس لیے اس ابتدائی دور میں ہیئت میں بوقلمونی نظر آتی ہے۔ لیکن سوداؔ نے متعدد ہیئتوں میں تجربے کے بعد مسدس کو سب سے کارآمد ہیئت قرار دیا اور ان کے بعد خلیق و ضمیر و فصیح و دلگیر نے اس پر خصوصی توجہ دی اور انیس و دبیر نے مسدس کی ہیئت میں اردو مرثیے کو وہ رفعت و بلندی عطا کی کہ اردو مرثیے کی شناخت مسدس کی ہیئت بن گئی۔ مولانا ارشاد حسین کے مطالعے میں عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ اردو مرثیہ بھی رہا ہے، اس لیے وہ مرثیے کی فضا سے بخوبی واقف ہیں اور فارسی مرثیہ (دوازدہ بند) کے مطالعے میں ان کا تجزیاتی ذہن کام کرتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے 'دوازدہ بند' کے پہلے بند کی رثائی فضا بندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''اس کا پہلا بند ہی ان کی فکری توانائیوں کا غماز ہے۔ وہ شہادت امام حسینؑ کو نہایت دردانگیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا یہی انداز اس میں اثر آفرینی اور دلآویزی پیدا کرتا ہے، اور اس کو اس حد تک موثر بنا دیتا ہے کہ سنگ دل کا بھی دل پگھل جائے اور اس کی آنکھ

سے آنسو چھلک پڑے۔''[۴]

مولانا ارشاد حسین مشرقی شعریات کے ان رموز سے واقف ہیں جن سے مشرقی شعریات کو مغربی شعریات پر تفوق حاصل ہے۔ سنسکرت کی شعریات ہوں یا عربی و فارسی کی شعریات، جذبات نگاری کو خاص اہمیت کا حامل جزو تصور کیا جاتا ہے۔ 'دوازدہ بند' کاشانی کے تجزیاتی مطالعے میں مولانا ارشاد حسین معروفی نے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

''جذبات نگاری میں ان کو حد درجہ کمال حاصل ہے۔ گویا وہ انسانی نفسیات کے رازداں ہیں۔ وہ تمام واقعات کو تفصیل سے بیان نہیں کرتے بلکہ صرف اشارہ کر کے گزر جاتے ہیں، لیکن اسلوب وہ اختیار کرتے ہیں کہ تمام مناظر قاری یا سامع کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔''[۵]

مولانا ارشاد حسین معروفی نے محتشم کاشانی کی خصوصیاتِ شعری کا محاکمہ کرتے ہوئے جس طرح کی لفظیات استعمال کی ہیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ مولانا موصوف ادبیات کے غواص ہیں:

''وہ شعوری طور پر اپنی زبردست قوت متخیلہ سے ایسی دور کی تشبیہیں اور استعارے پیش کرتے ہیں جو عموماً دوسروں کی دسترس سے باہر ہیں۔ کردار نگاری، جذبات نگاری، اختراع تشبیہات، شدت مبالغہ اور اسلوب کی بے ساختگی اور برجستگی میں ان کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔ صنائع و بدائع کا استعمال بھی اس خوبی سے کرتے ہیں کہ شعر کا حسن اور اثر آفرینی دوبالا ہو جاتی ہے اور یہی ان کا مابہ الامتیاز ہے۔''[۶]

مولانا ارشاد حسین معروفی عربی، فارسی اور اردو زبان پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ نیز متذکرہ تینوں زبانوں کی ادبیات کے رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ ان کی شعریات کے اسلوب کے امتیازی اوصاف سے بھی واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے 'دوازدہ بند' کے ترجمے میں جہاں آسان اردو کا استعمال کیا ہے وہیں ان الفاظ کو اپنے ترجمے میں جگہ دی ہے جن سے قاری تخلیق کار کے فکری نہج تک آسانی سے پہنچ سکے۔ ترجمہ مشکل فن ہے لیکن مولانا ارشاد حسین معروفی نے جو زبان استعمال کی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ترجمے کی تکنیک کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'دوازدہ بند' کے پہلے بند کے تیسرے شعر کا ترجمہ ملاحظہ کریں اور میرے جملوں کی تصدیق کریں۔

این صبح تیرہ باز دمید از کجا کزو
کارِ جہان و خلق جہان جملہ درہم است

ترجمہ: یہ تاریک صبح کہاں سے نکل آئی جس کے باعث دنیا اور مخلوق کے سارے کام ٹھپ پڑ گئے ہیں۔

جن و ملک بر آدمیان نوحہ می کنند
گویا عزائے اشرفِ اولادِ آدم است

ترجمہ: جن و ملک آدمیوں پر نوحہ کر رہے ہیں گویا یہ اولاد آدم کے شریف ترین انسان کی عزا ہے۔

آن دم فلک بر آتش غیرت سپند شد
کز خوف خصم، در حرم، افغان بلند شد

ترجمہ: اس وقت آسمان غیرت کی آگ میں جل گیا جب دشمن کے خوف سے حرم میں کہرام برپا ہوا۔

درج بالا میں چند اشعار اور ان کے ترجمے بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ پورے ترجمے میں سلاست، روانی اور برمحل اور مناسب لفظیات کے استعمال کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ترجمے کی یہ خوبی 'کریما'، 'صد پند لقمان' اور 'ایوان مدائن' از خاقانی میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ بطور مثال 'کریما' کے حمدیہ اشعار کے ترجمے کو دیکھیں:

''اے کریم ہمارے حال پر بخشش کر کہ میں خواہش نفس کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔
تیرے سوا ہمارے پاس فریاد کو پہنچنے والا کوئی نہیں بس تو ہی گنہگاروں کا گناہ بخشنے والا ہے،
ہم کو گناہ کے راستے سے محفوظ رکھ، گناہ کو معاف کر اور ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔''[۷]

ترجمے کا یہ انداز اور رنگ پورے کے پورے ترجمے میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی رنگ و آہنگ 'صد پند لقمان' میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ 'صد پند لقمان' حضرت لقمان کی ۱۰۰ نصیحتوں کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ مولانا ارشاد حسین نے فارسی سے اردو زبان میں کیا ہے۔ چوتھی نصیحت ''نماز را آن گونہ کہ شائستہ است بپادار۔'' کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ''نماز کو جس طرح مناسب ہو قائم رکھ۔''[۸]

اس ترجمے کی لفظیات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ نگار صرف اردو اور فارسی زبان کا واقف کار ہوتا تو 'قائم رکھ' کی جگہ 'نماز پڑھو' کرتا لیکن مولانا چوں کہ عربی زبان و ادب اور اس کی ہمہ گیری سے واقف تھے تو ترجمہ کرتے وقت حکم خداوندی ''اقیموا الصلوٰۃ'' کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ''قائم رکھ'' ترجمہ کیا جس سے نماز کے قیام کی آفاقی اقدار کا اندازہ ہوتا ہے۔

خاقانی فارسی قصیدہ گویوں میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ اس کی شعریات نے فارسی ادبیات کو عالمی ادبیات میں جگہ دلائی ہے۔ اس لیے کہ اس کی شعریات کے اجتہادات اور رنگ و آہنگ نے اسے فارسی

شعرا میں عظمت کا حامل بنا دیا ہے۔ اس کا قصیدہ 'ایوان مدائن' فارسی ادبیات کا شاہکار ہے اور سودا کے اردو قصیدہ 'تضحیک روزگار' کی طرح فارسی شاعری میں شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اسی طرح فارسی شعریات کے حوالے سے یہ ایک منفرد ادبی اور تہذیبی دستاویز ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے جہاں اس کا خوب صورت ترجمہ کیا وہیں اس کا تعارف بھی درج ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے:

''قصیدہ ایوان مدائن فارسی کلاسیکی شاعری کا ایک بے مثال شاہکار ہے جسے عظیم شاعر خاقانی شروانی نے تخلیق کیا۔ یہ قصیدہ نہ صرف فارسی ادب میں فنی و فکری اعتبار سے بلند مقام رکھتا ہے بلکہ اس کے موضوعات اسے ایک منفرد ادبی اور تہذیبی دستاویز بناتے ہیں۔ اس میں شاعر نے زوال سلطنت، تغیر زمانہ، انسانی عظمت کے زوال اور فلسفہ تاریخ کو نہایت عبرت انگیز اسلوب میں پیش کیا ہے۔''[۹]

مولانا ارشاد حسین نے لکھا ہے کہ خاقانی نے جب مدائن کا سفر کیا تو وہاں کے عظیم الشان محلات، ایوان کسریٰ اور خاکستر تخت و تاج کو دیکھ کر اس پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا۔ مولانا کا خیال ہے کہ خاقانی نے اسے دنیا کی بے ثباتی، مال و دولت کی ناپائیداری اور اقتدار کے زوال کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے آخر میں اس قصیدے کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا:

''قصیدہ ایوان مدائن فقط مدائن کی بربادی کا مرثیہ نہیں بلکہ انسانی کبر و نخوت، وقت کے انصاف اور دنیا کی ناپائیداری کا آئینہ ہے۔ خاقانی نے اسے اس طرح پیکر الفاظ میں ڈھالا کہ صدیوں بعد بھی اسی شدت کے ساتھ دل و دماغ کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔''[۱۰]

استادِ گرامی مولانا ارشاد حسین مشرقی شعریات کے نباض تھے۔ جہاں انھوں نے فارسی زبان کی شعریات کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہیں تاریخ و تصوف پر بھی گہری نظر تھی۔ ان کی متذکرہ خصوصیات کو ان کے ایک اہم مقالہ 'امام خمینی کی شاعری میں عشق و عرفان' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ متذکرہ مضمون 'فیضانِ ادب' کے جنوری تا جون ۲۰۱۶ء سے جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء کے شماروں میں چار قسطوں میں شائع ہوا ہے جس میں مولانا کی تنقیدی و تجزیاتی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان اقساط میں انھوں نے تصوف کا شاعری سے ربط، خصوصاً فارسی شاعری سے تصوف کا رشتہ، تصوف کی اصطلاحوں کی تفہیم کے ساتھ امام خمینی کی عرفانی غزلوں میں تصوف کے ساتھ ساتھ فلسفۂ عرفان کی ترسیل کو بخوبی بیان کیا ہے۔

امام خمینی بلاشبہہ بیسویں صدی کے ایسے نابغہ روزگار تھے جنھوں نے عالم اور مُلائیت کے فرق کو دنیا پر واضح کیا اور پوری دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اسلامی نظام کے تحت عالم ہی عوام و خواص کو ایک منصفانہ نظام

دے سکتا ہے۔انھوں نے اسلامی انقلاب برپا کر کے یہ ثابت کیا کہ علما انبیا ورسل کے وارث ہیں اور انبیا نے نظامِ حکومت کو عدالت کے تحت کامیابی سے ہمکنار کیا ہے،تو موجودہ منظر نامے میں بھی امام المرسلین اور امام المتقین کی سیرت کے آئینے میں ایک بہتر نظام حکومت دیا جا سکتا ہے اور اسے انھوں نے انقلاب اسلامی ایران کے نظام ولایت کے ذریعہ پوری دنیا سے الگ عوامی آزادی کی حکومت کے ذریعہ پیش کیا۔امام خمینی جہاں ایک بڑے عالم،مدبر،مفکر اور سیاست داں تھے وہیں وہ عربی وفارسی شعریات کے بھی شناور تھے۔حالاں کہ ان کی زیادہ تر شعریات ضائع ہوگئیں لیکن' آئینہ دانشوران' اور' آثار الحجۃ' میں ان کے اشعار کی اشاعت کے بعد ان کے فارسی اشعار کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے اور برصغیر میں بھی ان کے اشعار کی گونج سنائی دی۔ترجمے کے ساتھ ساتھ امام خمینی کی شاعری پر مقالات بھی سپردِ قلم کیے گئے۔مولانا ارشاد حسین چوں کہ شعریات سے خاص شغف رکھتے تھے اس لیے امام خمینی کی شعریات کا بغور مطالعہ کیا اور ان کی شعریات کے مفاہیم کے ساتھ ساتھ ان کے فلسفیانہ فکر سے اردو قارئین کو متعارف کرایا جو فارسی شعریات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔مولانا ارشاد حسین نے اپنے مقالے کی ابتدا میں امام خمینی کی شخصیت کا جن الفاظ میں محاکمہ کیا ہے، وہ ثابت کرتے ہیں کہ مولانا نے ان کی شعریات کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا ہے:

> ''نابغۂ روزگار،مفکر اسلام روح اللہ خمینی کا شمار بیسویں صدی کے بلند پایہ عالموں میں ہوتا ہے۔ان کی شخصیت دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔وہ بیک وقت ایک مفکر و مدبر، باکمال عالم دین، فقیہ، دانشمند، فلسفی، عارف اور سیاسی رہنما ہونے کے باوجود با ذوق شاعر بھی تھے۔انھوں نے اپنی شاعری میں قرآن وسنت کے مفاہیم کو بخوبی سمویا اور روزمرہ کے پیچیدہ مسائل اور مشکلات کو قرآن وسنت کی روشنی میں فلسفہ وعرفان کی آنچ دے کر اس طرح برتا کہ بالکل شریعت سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔''[۱۱]

مولانا ارشاد حسین کا خیال ہے کہ امام خمینی ملک الشعرا بہار اور میرزا اشرف الدین قزوینی کے سیاسی اور عرفانی اشعار کو پسند کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنی تصنیفات اور شعریات میں حافظ اور مولانا روم کے عارفانہ کلام سے استشہاد کیا ہے۔ان کی شعری خصوصیات کے امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے موصوف اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''اسلامی روایات کے گہرے مطالعے کی وجہ سے اپنی اکثر کتابوں میں ایرانی شعرا جیسے حافظ اور مولانا روم کے عارفانہ کلام سے استشہاد کیا ہے اور اسی سرزمین کے حکما،علما اور عرفا

کی طرح ایک عظیم حکیم، عالم اور عارف کی حیثیت سے اپنے بلند افکار و خیالات کو شعری جامہ پہنایا ہے۔ان کی شاعری محض تفنن طبع یا شعری ذوق کی تسکین کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک عظیم پیغام تھا جسے وہ امت تک پہنچانا چاہتے تھے۔ان کے اشعار کے مطالعے سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔''[۱۲]

عشق و عرفان انسانی تاریخ کا خاص اور اہم موضوع رہا ہے۔اس موضوع سے اپنے قاری کو متعارف کرانے کے لیے مولانا ارشاد حسین نے خاصی بحث کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ امام خمینی کے عشق و عرفان کا فلسفہ منطق اور فلسفے کی عام ڈگر سے قدرے مختلف ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ استدلالی اور عقلی بحثوں سے بالاتر ہوکر حسی تجربوں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اسی سبب ان کے افکار و نظریات میں آفاقیت پائی جاتی ہے اور یہ عشق کی حدود سے گزر کر عرفان کی منزل میں داخل ہو گئے ہیں۔مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کی شعریات کی روشنی میں عشق و عرفان کے تعلق کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

''عشق و عرفان کا تعلق ان مسائل و مباحث سے ہے جسے عقل، منطق اور فلسفے کی میزان میں تولا نہیں جا سکتا بلکہ جب انسان عشق کے مراحل طے کرتے ہوئے معشوق حقیقی کی تلاش میں اپنی ذات کو فنا کر دیتا ہے تو وہ عرفان کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے اور جب انسان اس منزل تک پہنچ جائے تو اسرار و رموز خداوندی اس پر منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں، پھر اسے ساری کائنات میں اللہ کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ذرّات جن کی کوئی حقیقت نہیں، ان میں بھی ذات حق کی جلوہ گری دکھائی دیتی ہے۔''[۱۳]

مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کے عشق و عرفان کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

''ان کے خیال میں عشق حقیقی اور پھر عرفان تک پہنچنا اسی وقت ممکن ہے جب انسان خود کو وجود حقیقی کے لیے فنا کر دے۔یعنی جب تک انسان کبر و خود پرستی اور انانیت کے بت توڑ کر اس کی بارگاہ میں سر تسلیم خم نہ کرے، اس کو عرفان کے مراتب تک رسائی حاصل نہیں ہوسکتی۔''[۱۴]

مولانا ارشاد حسین نے عشق و عرفان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فارسی ادبیات سے اس کے رشتے کی بھی وضاحت کی ہے۔امام خمینی کے نظریے کے مطابق کمال عشق یہی ہے کہ انسان اپنے نقطۂ وجود کی تلاش میں رہے اور اس کے عشق میں سرگرداں رہے۔یہی مومن کی علامت بھی ہے۔امام خمینی کا خیال ہے کہ عشق حقیقی ایک انمول تحفہ ہے جسے اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کو بقدر ظرف عطا کرتا ہے۔مولانا ارشاد حسین

نے اس بحث میں افلاطون کے ساتھ ساتھ امام غزالی کے افکار سے استفادہ کیا ہے اور امام خمینی کے نظریے کو ملخص کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عشق حقیقی گناہوں سے بچنے کی مشق اور مکتب عشق، مکتب اخلاص و تصفیہ ہے جس کے آگے کی منزل عرفان ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کے اس نظریے کی ترسیل کی ہے کہ فقط کلام موزوں و مقفّیٰ کو شعر نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کے لیے جذبات و احساسات کی شدت درکار ہے جو انسان پر اس طرح اثر انداز ہو کہ اس پر ایک بے خودی سی کیفیت طاری ہو جائے۔ انھوں نے شعر کی تفہیم کو مزید وسعت دیتے ہوئے لکھا کہ اس عالم میں فکر و خیال کے گھوڑے دوڑائے پھر جب یہ خاص تخیل وزن کے سانچے میں ڈھل جائے تو وہ شعر بن جاتا ہے اور یہی کمالِ سخنوری ہے۔ مولانا ارشاد حسین امام خمینی کی شعر و شاعری کے تعلق سے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے ان کی شاعری کی امتیازی صفت عشق و عرفان کی کیفیت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کی شاعری میں ایک شعوری حس پایا جاتا ہے جس کی بنیادی وجہ ان کا حساس ہونا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار میں ارتعاش کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ عشق و عرفان ایک ایسا موضوع ہے جس کی وسعت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کی مختلف تشریحات کی جاتی ہیں اور ہر قاری اپنے ذوق شعری کے مطابق ان سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنے زاویۂ نظر سے ان کے معانی و مفاہیم بیان کرتا ہے۔''[۱۵]

مولانا ارشاد حسین کا خیال ہے کہ امام خمینی کی شاعری میں اگرچہ استدلالی انداز پایا جاتا ہے لیکن جب عشق و محبت میں ان کے جذبات شدید ہو جاتے ہیں تو وہ بات بات پر استدلال کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی لیے مولانا ان کی شاعری کی ان خوبیوں سے متعارف کراتے ہیں جو امام خمینی کو فارسی کا خاص شاعر بنا دیتی ہیں:

> ''ان کے اشعار میں پائی جانے والی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں معنی کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو فلسفہ و عرفان کے ساتھ سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں جن کے مطالعے سے ان کی عارفانہ اور فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ گہرے سیاسی اور سماجی شعور کا بھی احساس ہوتا ہے۔''[۱۶]

مولانا ارشاد حسین کا خیال ہے کہ امام خمینی اپنی شعریات کی تخلیق میں ایک فلسفی اور عارف کی طرح پہروں غور و فکر کے مرحلے سے گزرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں فکری بالیدگی کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کے اشعار کے موضوعات میں دینی معاملات، فلسفیانہ خیالات اور عرفانی واردات کے درمیان

مطابقت پائی جاتی ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ ان کے اشعار کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیشرو شعرا ابن عربی، سنائی، عطار، رومی اور جامی کے اشعار کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں موجودہ عالمی منظرنامے کی گونج محسوس ہوتی ہے۔ امام خمینی چوں کہ اسلامی مفکر تھے اس لیے ان کے اشعار میں مسلمانوں کی بے عملی، بے راہ روی اور خواب غفلت پر گلہ اور شکوہ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن یہ گلہ اور شکوہ بر بنائے خلوص محسوس ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں ان کے اشعار میں طنز و نشتر بھی دکھائی دیتے ہیں، لیکن یہ نشتریت اتنی لطیف ہے کہ گوارا معلوم ہوتی ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کی مسلمانوں کی بربادی اور مستضعفین کے قتل و غارت گری کی فکرمندی کو ان کے اشعار میں تلاش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انھیں اس بات کا ہمیشہ قلق رہا کہ اسلام دشمن استعماری طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کی بربادی اور مستضعفین کی گردن زدنی کے درپے ہیں اور بعض اسلامی ممالک کے سربراہان ان کی کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے انھوں نے خدا کی بارگاہ میں شکوہ کیا ہے اور مسلمانوں کے ناحق خون بہنے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔''[۱۷]

مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کے مختلف اشعار کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے کلام میں علامات، تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کے خوب صورت استعمال کی مداحی کرتے ہوئے اس کی وجہ ان کی سیاسی و سماجی قید و بند کو قرار دیا ہے، ساتھ ہی ان کے مشرقی روایات کے خزانۂ علمی کے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے:

''ان کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کا استعمال ہے۔ خوب صورت تشبیہات، بلیغ استعارات اور برمحل تلمیحات نے ان کی شاعری کو بقائے دوام عطا کر دیا۔ بعض اشعار میں علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے جس کی وجہ سیاسی اور سماجی قید و بند ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مشرقی روایات کے خزانۂ علمی سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔''[۱۸]

مولانا ارشاد حسین کا خیال ہے کہ امام خمینی کے اشعار کی تلمیحات میں ایران کے قصے، کہانیاں نظموں اور رزم ناموں کے ساتھ ساتھ آیات قرآنی، احادیث نبوی یا مشہور امثال کی طرف لطیف اشارے ملتے ہیں۔ انھوں نے امام خمینی کے بہت سے اشعار بطور مثال پیش کرتے ہوئے ان کے اشعار میں الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترکیب میں فن کارانہ مہارت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے اشعار میں موسیقیت اور نغمگی پیدا ہوگئی ہے، جس کے سبب امام خمینی حافظ، عطار اور مولانا روم کی صف میں کھڑے

دکھائی دیتے ہیں۔اس حوالے سے موصوف رقم طراز ہیں:

''صوتی آہنگ اور موضوع کی مناسبت سے الفاظ و تراکیب کے انتخاب سے ان کے اشعار کا حسن دو بالا ہو گیا ہے جو انھیں حافظ، عطار اور مولانا روم کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ان کے اشعار کے مطالعے کے وقت ترنم، موسیقی اور نغمگی ہمیں عطار، رومی اور جامی کی یاد دلاتی ہے۔''[۱۹]

مولانا ارشاد حسین نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ امام خمینی نے قرآن، حدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔اس حوالے سے ان کی متعدد تصانیف اور حواشی اہمیت کے حامل ہیں۔اسی لیے وہ فلسفہ و منطق کے مسائل میں بڑے بڑے فلاسفہ سے اختلاف کرتے ہوئے بعض مسائل و مباحث میں ان پر ایرادات و اعتراضات بھی کیے ہیں۔خصوصیت سے فلسفہ وحدت الوجود کے سلسلے میں انھوں نے صوفیا، عرفا اور فلاسفہ کی آرا سے شدید طریقے سے اختلاف کیا ہے اور اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو ایک فلسفی کے طور پر بھی ثابت کیا ہے۔اس حوالے سے مولانا ارشاد حسین نے ارسطو اور ابن عربی کے فلسفیانہ نظریات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام خمینی کا عرفان قرآن اور احادیث کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔اس سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے کہ امام خمینی نے ابن عربی کے افکار و نظریات سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن الہام کی حد تک نہیں۔اس بحث میں مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کے روس کے صدر گورباچیف کو لکھے گئے خط کا ذکر کرتے ہوئے کمیونسٹوں کے نظریات کی خامی کی طرف اشارے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کا عرفانی مشرب اسلام ناب سے ماخوذ ہے جو قرآن کریم، احادیث اور سیرت معصومین پر مبنی ہے۔علاوہ برایں انھوں نے گزشتہ مشاہیر عرفائے اسلامی کے افکار و نظریات سے بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، ہاں ان کے عرفان و تصوف سے صرف استفادہ کی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔''[۲۰]

مولانا ارشاد حسین کا فارسی شاعری کا مطالعہ وسیع ہے۔یہی وجہ ہے کہ موصوف فارسی شعریات کے موضوعات کے ساتھ ساتھ اس کے فنی رموز سے بھی بخوبی واقف ہیں۔موصوف جب امام خمینی کی غزلوں کی تفہیم کرتے ہیں تو ان کا تجزیاتی ذہن ان کی غزلوں کے معانی و مفاہیم کے ساتھ ساتھ اس کے علامتی اور استعاراتی نظام سے بھی اپنے قاری کو روبرو کرتا ہے۔انھوں نے امام خمینی کی غزلوں کے مختلف موارد سے مثالیں دے کر علامتی پیرائے میں عشق مجازی کی آنچ دے کر عشق حقیقی کی معراج دکھائی ہے۔اس حوالے

سے مولانا نے امام خمینی کی کتاب 'رہِ عشق' میں عرفان اور عرفانیات میں امام خمینی کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے علامتی نظام کے اختصاص کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

''ان کی شخصیت سیاست اور معنویت دونوں کو جامع تھی۔ انھوں نے ایک طرف عرفانیات کے دائرہ کار کو اپنے نئے علامتی نظام کے تحت وسعت بخشی تو دوسری طرف اسے کسی ایک خاص طبقے تک محدود نہیں رہنے دیا کہ جنھیں اصطلاح میں اہل دل سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ انھوں نے اس کے مفہوم کو عمومیت بخشی تا کہ ہر شخص اس سے مستفید ہو سکے۔''[۲۱]

مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کی شعر یات سے انسان کامل کے تصور پر بھی بحث کی ہے۔ مولانا ارشاد حسین کے نظریے کے مطابق امام خمینی میں انسان کامل کی صفات موجود تھیں۔ اس بحث کے حوالے سے مولانا ارشاد حسین نے شہید مطہری کے نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے امام خمینی کی شعریات میں انسان کامل کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''امام خمینی کے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ سے انسان کامل مختلف الجہات شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک عارف بھی ہے اور صوفی بھی، فلسفی بھی ہے اور فقیہ بھی، گویا وہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مظہر ہے۔''[۲۲]

مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کی عرفانی شاعری کی تشریح و تعبیر کے ذیل میں عرفا کی کتابوں میں مندرج مطالب کی غلط تعبیر و تشریح پر بحث کرتے ہوئے سیر و سلوک کے مدارج کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے عرفان میں رائج سالکان طریقت کی سیر کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس طرح مولانا نے اپنے قاری کو تصوف کی اس اہم اصطلاح کے مندرج حصوں سیر الی اللہ، سیر فی اللہ، سیر باللہ، سیر من اللہ، اور سیر اجتماعی کے مطالب کی وضاحت کرتے ہوئے امام خمینی کے اشعار سے ان کی وضاحت کی ہے۔ اس طرح امام خمینی کی شعریات کے حوالے سے عارف کامل کی تعریف مولانا ارشاد حسین نے درج ذیل الفاظ میں بیان کی ہے:

''ایک عارف کامل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دل آئینہ کی طرح صاف ہو اور اسے ایسے انوار مل جائیں جو ذات باری تعالیٰ کی طرف ہدایت کریں۔ اسے ایک ایسی روحانیت مل جائے جو موت سے باہر لے جائے تا کہ اسے دنیاوی حیات کے بعد ایسی حیات حاصل ہو جائے جو ابدیت اور بقا کی ضامن ہو۔ عرفان میں فنا فی اللہ سے مراد یہ ہے کہ دل سے آرزوؤں، خواہشات اور ہوائے نفس کے بتوں کو باہر پھینک کر انھیں توبہ، ایمان اور عمل صالح کی ہمت سے توڑ دیا جائے۔ ایسا انسان خودی کے صنم کو توڑ کر

ذات واجب میں خود کو گم کر دیتا ہے۔ اس کا نفس اتنا پاکیزہ ہو جاتا ہے کہ وہ صفات الٰہی کا مظہر و آئینہ دار بن جاتا ہے۔'' [۲۳]

خمریات مشرقی شعریات کا اہم موضوع رہا ہے۔ عربی شاعری ہو یا فارسی شاعری یہ موضوع ہر اہم شاعر کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ عربی و فارسی کے زیر اثر اردو شاعری پر ہندوستانی زبانوں کے غالب اثر کے باوجود بھی خمریات اردو غزل کا پسندیدہ موضوع رہا اور فارسی و اردو کے مقبول شاعر غالبؔ نے تو یہاں کہہ دیا ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

فارسی کے زیادہ تر شعرا نے خمریات کے موضوع کو اپنی شاعری میں پیش کیا اور جام و شراب، صبو و پیمانہ ان کی شعریات کا غالب حصہ رہا ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کی شعریات میں مے و شراب کے موضوعات کی نشاندہی کی ہے، لیکن امام خمینی کی شعریات کے اس مطالعے میں مولانا ارشاد حسین نے مے و شراب کے حوالے سے عارفوں اور سالکوں کے نظریات کے ساتھ ساتھ فارسی شعرا کے عرفانی نظریات کے ذیل میں اس موضوع کی تفہیم و تعبیر کی ہے۔ مولانا ارشاد حسین کا خیال ہے کہ شراب بطور مطلق نشہ اور مستی و مدہوشی کا کنایہ ہے۔ عارفوں اور سالکوں کی اصطلاح میں یہ محبت اور جذبۂ حق ہے۔ ساتھ ہی عشق، ذوق، مستی اور مدہوشی کو بھی شراب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں عراقی ہمدانی کے نظریے پر گفتگو کرتے ہوئے امام خمینی کے درج ذیل شعر کو بطور مثال پیش کیا ہے ؎

مست از قدح شرابِ نابم
دور از برِ یار دل رُبایم

اس حوالے سے مولانا ارشاد حسین نے لکھا ہے کہ مے و شراب کا استعمال امام خمینی کے اشعار میں کثرت سے دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے امام خمینی کی شعریات کے ان الفاظ سے بھی بحث کی ہے جس سے انھوں نے معشوق حقیقی اور جلال و جمال کو خوب صورت استعاراتی نظام کے تحت فارسی شعریات کا حصہ بنایا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد اشعار بطور مثال پیش کیے ہیں اور امام خمینی کی شعریات کے اس پہلو پر جو نظریہ پیش کیا ہے، اس سے امام خمینی کا اختصاص واضح ہوتا ہے:

''امام خمینی نے بھی متقدمین سے خوشہ چینی کی ہے لیکن تقلید کی حد تک نہیں۔ انھوں نے اپنی بلندیٔ تخیل اور خیال آفرینی سے ان الفاظ کو مختلف معانی و مفاہیم عنایت کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ انھوں نے مضامین کے بیان میں صنائع و بدائع سے خوب خوب استفادہ کیا ہے، ساتھ ہی تمثیلی پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عشق و عرفان کے مطالب الفاظ کے قالب میں نہیں سما سکتے۔ اس مالک حقیقی کی تعریف و توصیف قوت بشری سے باہر ہے۔''[۲۴]

مولانا ارشاد حسین کے مطابق امام خمینی کی شاعری میں مے جوش محبت اور شراب معرفت ہے، جسے نوش کرنے کے بعد عاشق ذات وجود مطلق میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کی شعریات میں بے خودی و محویت، وصل کی لذت و فراق و الم اور لذت و الم کے حسی پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ''ان کی شاعری میں شراب سے مراد وہ ذوق و وجد اور کیف و حال ہے جو محبوب حقیقی کے جلوے سے غلبۂ محبت کے دوران سالک کے دل پر طاری ہوتا ہے اور اس کو مست و بے خود کر دیتا ہے۔ اس شراب کے آثار جملہ موجودات میں پائے جاتے ہیں مگر انسان میں قابلیت اور استعداد کی زیادتی کے سبب زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر افراد انسانی بیابان عشق میں سرگشتہ، محبوب حقیقی کی تلاش میں حیران و سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ان میں ایسے مرشد و رہنما کی جستجو رہتی ہے جو محبوب حقیقی کے وصال تک ان کی رہنمائی کرے اور انھیں خودی کی قید سے باہر نکالے۔ چنانچہ وہ ذوق و وجد جو تجلی ذات سے پیدا ہوتا ہے اور ہستی کی قید سے باہر نکال کر فنا کی طرف لے جاتا ہے، اسے اہل عرفان شرابِ طہور کا نام دیتے ہیں۔'' مولانا نے یہاں پر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مختلف ادوار میں شاعروں، صوفیوں اور عارفوں نے مے و شراب اور میخانے کی مختلف تعابیر اور ان میں سے ہر ایک کے لیے مختلف درجات بیان کیے ہیں لیکن ان سب کا مطلوب و مقصود ان الفاظ سے بادۂ طہور اور قرب پروردگار ہے۔ یہاں پر مولانا نے مقام محو سلوک کے منازل کے بیان میں ساقی و ساغر پر بھی گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ جذب و سوز عرفانیات کا ایک اہم باب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امام خمینی نے اپنے تخیل کی پرواز اور قوتِ ادراک نیز محاکاتی انداز، اشاریت اور ایمائیت سے کافی حد تک استفادہ کیا ہے جس سے قنوطیت کے بجائے رجائیت کی جلوہ فرمائی نظر آتی ہے۔ آخر میں مولانا ارشاد حسین نے امام خمینی کی شاعری کا محاکمہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''وہ ایک حساس دل رکھتے ہیں اور قوم و ملت سے غافل نہیں ہیں۔ ان کی شاعری کو بلا تکلف تعمیری اور پیغامی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے عشق و محبت کو ہی اپنی شاعری کی بنیاد قرار دیا لیکن عشق و محبت کو عرفانیات کی آنچ دے کر اس طرح پیش کیا کہ اس سے انسانی سیرت کی تعمیر کا کام لیا جا سکے۔''[۲۵]

اس طرح مولانا ارشاد حسین نے متذکرہ مقالے میں امام خمینی کی شعریات کی تفہیم اس انداز سے کی ہے کہ امام خمینی کی شخصیت کے اس اہم پہلو سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ساتھ ہی متذکرہ مقالے سے مولانا ارشاد حسین کی فارسی شاعری اور اس کی تحقیق وتنقید پر گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

گزشتہ سطور میں مولانا ارشاد حسین کی مشرقی شعریات کی تنقید کے حوالے سے فارسی ادب پر مشتمل نگارشات سے بحث کی گئی اور یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مولانا ارشاد حسین عربی و فارسی ادب کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلجھے ہوئے قلم کار ہی نہیں بلکہ تنقید وتحقیق کے شہسوار بھی ہیں۔ تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ انھوں نے فارسی ادب کے متعدد شاہکار کو اردو ترجمہ کے مرحلوں سے گزار کر ایک کامیاب مترجم کی بھی شناخت قائم کی ہے۔ مولانا ارشاد حسین مشرقی زبانوں میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر حاوی تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت درس نظامی کے تحت ہوئی، اس وجہ سے انھیں عربی وفارسی زبان وادب میں مہارت تھی، لیکن ان کی مادری زبان اردو تھی اور ان کی عربی وفارسی کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو ہی تھا، اس لیے انھیں اپنی مادری زبان سے شناسائی ہی نہیں بلکہ اس کی ادبیات اور اس کے قواعد پر عبور حاصل تھا۔ عام طور سے عربی مدارس کے تعلیم یافتہ اردو زبان سے تو بخوبی واقف ہوتے ہیں لیکن ادبیات سے دور رہتے ہیں لیکن عربی مدارس کے بہت سے اہل قلم ایسے بھی ہیں جنھوں نے مذہبیات کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب اور اس کی تحقیق وتنقید میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

مولانا ارشاد حسین عربی مدارس کے ایسے اساتذہ میں سے ہیں جنھوں نے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اردو ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کو انھوں نے قلم وقرطاس کے حوالے کیا۔ اردو ادب کے حوالے سے ان کے مضامین جہاں رثائی ادب کی تنقید کے حوالے سے اہم ہیں وہیں ان کا مضمون 'مولانا حسرت موہانی کی سیاسی شاعری' اس بات کا غماز ہے کہ انھیں غزل ونظم کی شعریات کے ساتھ ساتھ ادب آزادی کا بھی خاصا مطالعہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے متذکرہ مضمون میں حسرت موہانی کی مقناطیسی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے جنگ آزادی میں استعمال ہونے والے نعرہ کو بھی مولانا حسرت موہانی کی تخلیق قرار دیا، انھوں نے لکھا:

> ''تحریک آزادی کے عظیم نعرے 'انقلاب زندہ باد' کی تخلیق سے لے کر استعماریت کے خلاف مزاحمت کی آواز اٹھانے میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حسرت موہانی کی سیاسی شاعری نے عوام کے دلوں میں جوش وولولہ پیدا کیا۔ وہ سودیسی تحریک کے پرجوش حامی تھے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک غیر ملکی اشیا سے پرہیز کرتے رہے اور دوسروں کو بھی

اس کی تلقین کرتے رہے۔''[۲۶]

'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۲۱ء میں سب سے پہلے دیا تھا جسے بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور اشفاق اللہ خاں نے پھانسی پر چڑھتے ہوئے زندۂ جاوید بنا دیا۔ جنگ آزادی کا یہ نعرہ مجاہدین آزادی کی زبانوں سے ہوتا ہوا آج بھی سیاسی نعرہ بن گیا ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے حسرت موہانی کی سودیشی تحریک سے وابستگی کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور متعدد منابع سے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ کانگریس پارٹی کی یہ تحریک مولانا حسرت موہانی ہی نے شروع کی تھی۔ مولانا حسرت موہانی سودیشی پر عمل پیرا مجاہد آزادی تھے اور انھوں نے 'مکمل آزادی' کا نعرہ بھی دیا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ارشاد حسین لکھتے ہیں:

''سیاسی طور پر حسرت موہانی ایک نڈر اور بے باک رہنما تھے۔ وہ کانگریس کے رکن رہے، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانیوں میں تھے اور مسلم لیگ کے ساتھ بھی منسلک رہے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں پہلی بار ''مکمل آزادی'' کا مطالبہ پیش کیا، جو اس وقت صرف ایک انقلابی خیال تھا۔''[۲۷]

درج بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا حسرت موہانی کانگریس، کمیونسٹ کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ سے بھی وابستہ رہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے، ساتھ ہی ساتھ وہ ایک مقبول شاعر ہونے کے ساتھ نڈر صحافی بھی تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۳ء میں 'اردوئے معلیٰ' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ انگریزی استعمار کے خلاف انھوں نے ہمیشہ آواز بلند کی اور اس جرم میں انھیں متعدد بار جیل کی ہوا کھانی پڑی جس کی طرف انھوں نے خود اشارہ کیا ہے ؎

ایک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

مولانا ارشاد حسین نے حسرت موہانی کی انقلابی شاعری کو ان کی غزلوں میں تلاش کرتے ہوئے ان کے فکری نہج کی بھی نشاندہی کی ہے۔ چنانچہ مولانا کی کمیونزم سے وابستگی پر بحث کرتے ہوئے کمیونزم کے ان پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی ہے جس سے مولانا متاثر تھے۔ یہاں پر مولانا ارشاد حسین کا خیال ہے کہ حسرت موہانی مکمل طور پر کمیونزم کو اپنائے ہوئے نہیں تھے بلکہ اس طبقاتی جدوجہد کے نظام سے متاثر تھے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

''مولانا نے کمیونزم کی سب سے اہم تعلیم طبقاتی جدوجہد پر زور دیا۔ ان کے مطابق انسانی

تاریخ کی بنیاد طبقاتی کشمکش پر ہے، یعنی طاقتور طبقہ (بورژوا) ہمیشہ کمزور طبقے (پرولتاریہ یا مزدور) کا استحصال کرتا رہا ہے۔ کمیونزم کا ماننا ہے کہ مزدور طبقہ جب اس ظلم کے خلاف متحد ہوگا تو وہ ایک انقلابی حکومت قائم کرے گا جو سرمایہ داروں کی طاقت کو ختم کر کے وسائل کو عوامی ملکیت میں تبدیل کر دے گا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں مولانا حسرت کی کوششوں سے کانپور میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس منعقد ہوئی۔''[۲۸]

مولانا حسرت موہانی کا خیال تھا کہ اگر کمیونزم سے کچھ بڑی خرابیوں کو نکال دیا جائے تو بالکل اسلام کے اصول وضوابط کے مطابق ہو جائے۔ انھوں نے اپنے اشعار اور مضامین میں بہت سی جگہوں پر اسلام اور کمیونزم میں مماثلت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے حسرت کے اس مضمون کے اشعار کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے بہت سے اشعار ایسے مل جائیں گے جن میں صلح کل کی پُرزور حمایت کی گئی ہے۔ مولانا ارشاد حسین حسرت کو فطری شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ حسرت کی شاعری میں روایتی کلاسیکی غزل کی شیرینی محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں عشق مجازی کی لطافت اور سیاسی شعور کی آمیزش ملتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ انھوں نے جیل کی زندگی میں چکی پیسی تھی۔ مولانا ارشاد حسین نے حسرت کی جیل کی مشقت کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا کو آزادی کی جدوجہد کے دوران کئی مرتبہ جیل جانا پڑا۔ انھوں نے ان لمحات کو بھی شاعری کے لیے استعمال کیا۔ ان کی جیل کی شاعری میں صبر، استقامت، یقین اور فتح کی امید جھلکتی ہے۔''[۲۹]

مولانا ارشاد حسین حسرت کی شاعری کو سچائی اور بے باکی کا روشن نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ صرف ایک غزل گو شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انقلابی فکر کے حامل ادیب، سیاستداں اور مجاہد آزادی بھی تھے جنھوں نے اپنے قلم کے ذریعے نہ صرف عشق کی لطیف کیفیات کو بیان کیا بلکہ سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی جرأت مندانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔ حسرت کی شاعری ہمیں یہ باور کراتی ہے کہ حسرت نے اپنے خیالات کو زمانے کے خوف یا اقتدار کے دباؤ میں ڈھکنے کی کوشش نہیں کی جس کی طرف مولانا ارشاد حسین نے اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''بے باکی، حسرت موہانی کے شعری مزاج کا بنیادی وصف ہے۔ چاہے وہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف آواز بلند کرنا ہو یا مسلمانوں کے سماجی وسیاسی مسائل پر تنقید، حسرت نے ہمیشہ کھل کر اپنی بات کہی۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں جبر، غلامی، فرقہ پرستی اور منافقت کے

خلاف شدید ردّعمل پایا جاتا ہے۔ان کی معروف نظم ''چاہتے ہیں حسن و دل، لیلیٰ بھی ہو مجنوں بھی ہو'' یا آزادی ہند کے لیے لکھے گئے اشعار، ہر جگہ ایک سچا، باہمت اور مصلحت سے بے نیاز شاعر بولتا ہوا نظر آتا ہے۔''[۳۰]

مولانا ارشاد حسین نے حسرت کی شاعری کے مختلف موارد اور خصوصیات شعری سے بحث کرتے ہوئے ان کی سیاسی بصیرت کو تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ حسرت کے یہ اشعار بیسویں صدی کے ابتدائی عالمی سیاسی منظر نامے، یورپی استعمار، چین پر دباؤ اور جاپان کی عسکری سیاست کو ایک نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں جو انقلابی، تنقیدی اور سامراج مخالف ہے۔ساتھ ہی یہ اشعار برصغیر کی تحریک آزادی کے ایک اہم اور نازک سیاسی لمحے پر تبصرہ کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مولانا حسرت موہانی کی سیاسی شاعری خالص، قومی، انقلابی اور بیداری پر مبنی ہے۔مولانا حسرت موہانی کی شاعری میں سیاست کا رنگ ایسے رچ بس گیا ہے کہ وہ محض نعرہ نہیں لگاتے بلکہ دلوں کو گرما دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مولانا ارشاد حسین بھی ان کی شاعری کے مداح ہیں اور اسے اردو زبان کے حسن و جمال کی ایک روشن مثال قرار دیتے ہیں:

''حسرت موہانی کی شاعری اردو زبان کے حسن و جمال کی ایک روشن مثال ہے۔ان کی زبان سادہ، رواں اور دل میں اتر جانے والی ہے، جس میں نہ صرف شعریت کا جمال پایا جاتا ہے بلکہ فصاحت و بلاغت کی شان بھی نظر آتی ہے۔انھوں نے زبان کو عوامی رنگ میں پیش کیا لیکن اس سادگی میں ایک عجیب قسم کی لطافت اور تاثیر چھپی ہے۔ان کے اشعار میں فارسی تراکیب کی جھلک کے ساتھ ساتھ دیسی الفاظ کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، جو ان کی شاعری کو ایک الگ پہچان عطا کرتی ہے۔''[۳۱]

درج بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا ارشاد حسین کسی شاعر کے تجزیہ و تنقید کرتے وقت متوازن نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں۔ان کی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعری جمالیات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ان کے اس خصوصی امتیاز کو راقم الحروف پر لکھے گئے مضمون 'اردو مرثیے کی جمالیات اور ڈاکٹر عابد حسین حیدری' میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مولانا جمالیات کی اصطلاح اور اس کے فنی مدارج سے بھی بخوبی واقف ہیں۔مولانائے مرحوم نے راقم الحروف کے لیے جن توصیفی کلمات کو مضمون کے شروع میں تحریر کیا ہے، وہ میرے لیے سند ہیں اور اس پر بات کرنا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔یہ حصہ دوسرے قلم کاروں پر چھوڑتا ہوں، لیکن جمالیات پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے جن نکات پر روشنی ڈالی ہے، وہ ان کے ذوق جمال اور ذوق مطالعہ دونوں پر دال ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''جمالیات کے حوالے سے اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ فلسفے کی ایک ایسی شاخ ہے جو کسی بھی تخلیق یا فن پارے کے حسن سے تنقیدی معیاروں کی روشنی میں بحث کرتی ہے۔ جدید فلاسفہ کے نزدیک جمالیات وہ علم ہے جو تخلیقی تجربہ، تجربۂ حسن اور نقد و نظر کی قدروں اور معیاروں سے بحث کرتا ہے اور نوعیت و عمل کے اعتبار سے منطق و نفسیات سے جا ملتا ہے۔ اس کو منطق اور نفسیات سے وابستہ اس لیے قرار دیا جاتا ہے کہ حسن و قبح عقلی ہیں۔ یعنی اگر کوئی شے اچھی ہے تو عقل اس کے اچھی ہونے کی دلیل طلب کرتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شے قبیح ہے تو اس کے قبح پر عقل کو دلیل دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بغیر دلیل کے کسی بھی شے کے اچھی یا بری ہونے کا فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔''[۳۲]

درج بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا ارشاد حسین کا جمالیاتی شعور اور جمالیات کا مطالعہ کتنا وسعت اختیار کیے ہوئے ہے۔ انھوں نے متذکرہ مضمون میں لکھا ہے کہ کائنات کی ہر شے میں جمالیات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے مرثیے کی جمالیات پر بحث کرتے ہوئے اسے ترقی پسند تحریک سے بھی جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ پریم چند کے مشہور جملے ''اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا'' کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرثیہ نگاروں خصوصاً انیسؔ و دبیرؔ بہت پہلے حسن کا معیار بدل چکے ہیں۔ انھوں نے لکھا:

''۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند نے ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ ''اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا'' جس کا مطلب صاف ہے کہ ادب کی ترقی کے لیے حسن و جمال کے مفہوم کو وسعت دینی ہوگی جو اصلاح معاشرہ کے لیے ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہو اور اس کے لیے کسی بھی اعتبار سے ممد و معاون ہو۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ بہت پہلے حسن کا معیار بدل چکے ہیں۔ انھوں نے مرثیہ کے حسن کو غزل کے حسن سے وزنی قرار دیا اور مرثیہ کو صرف رونے رلانے تک محدود نہیں رکھا بلکہ گریہ کو محض خاتمہ کے طور پر پیش کیا اور اس خاتمے سے قبل کے تمام گوشے فنون حرب، شجاعت، رجز، گھوڑا اور تلوار وغیرہ کی جمالیات کو مرثیہ کے عناصر لاینفک کے طور پر بیان کیا جو آج بھی مرثیہ کے لازمی اجزا شمار کیے جاتے ہیں۔''[۳۳]

مولانا ارشاد حسین نے دراصل متذکرہ مضمون راقم الحروف کی کتاب 'اردو مرثیے کی جمالیات' سے متاثر ہو کر تحریر کیا ہے جس میں اس کتاب کے اقتباسات نقل کرتے ہوئے مرثیے کی جمالیات کے متعدد

موارد سے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ مرثیہ کی فنی خوبیوں کے ساتھ جمالیاتی قدروں کی تلاش کی جانی چاہیے۔ انھوں نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عہد حاضر میں مرثیہ کی تنقید میں لب ولہجہ اور لفظیات کے ساتھ مختلف النوع وسعت، خوش رفتاری، خوش گفتاری، جراری، وفاداری، محبت واخوت، بھائی کے بھائی کے ساتھ جذبات و احساسات، بہن کی بھائی سے محبت، بھائی کی بہن سے عقیدت، بیٹی کی باپ سے الفت اور باپ کی بیٹی سے محبت وغیرہ ایسے محاسن اور خوبیاں ہیں جو مرثیے میں یکجا ہوجاتی ہیں۔ اس سے مرثیے کی نئی جمالیات کی راہیں کھلتی ہیں اور شاعری کو روایتی حسن و جمال کے تصور سے باہر بھی نکالتی ہیں جو مدتوں سے ہمارے ذہن ودماغ پر مسلط رہا ہے۔''[۳۴]

مولانا ارشاد حسین نے 'اردو مرثیے کی جمالیات' کے مقدمے سے لے کر 'فنی قدریں، نعتیہ بازگشت' اور 'رثائی بستیاں' پر بحث کرتے ہوئے تحریر کیا جس سے مولانائے موصوف کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے:

''مرتب کی یہ کامیاب کوشش مرثیہ کی تنقید میں قابل قدر اضافہ ہے۔ مرتب نے اتنے بڑے اور اہم موضوع کو اٹھایا ہے اور اپنی کاوشوں سے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرثیہ کی جمالیات ایک وسیع وعریض موضوع ہے جس پر باضابطہ کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مرثیہ کی جمالیات کے بنیادی خدوخال روشن ہوسکیں۔ ان کی یہ کتاب اس گلدستہ کی مانند ہے جس میں رنگ برنگے پھول اپنی گوناگوں خوشبوؤں سے مشام جاں کو معطر کرتے ہیں۔''[۳۵]

مرثیہ تنقید کے حوالے سے مولانا ارشاد حسین کا دوسرا اہم موضوع 'آل رضا کی مرثیہ گوئی: تطہیر غم سے تجلی شعور تک' ہے جس میں مولانا نے جدید مرثیہ کے اہم شاعر سید آل رضا کے احوال وآثار کے ساتھ ان کے فن پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مرثیہ تنقید کے حوالے سے ان کا متذکرہ مضمون یہ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ کو صرف عقیدت سے نہیں بلکہ فن کی کسوٹی پر پرکھ کر پڑھا ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری کی انفرادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ارشاد حسین رقم طراز ہیں:

''آل رضا کی مرثیہ گوئی اردو ادب میں اس روایت کی توسیع ہے جس میں میر انیسؔ و دبیرؔ کے بعد مرثیہ کو مذہب سے اٹھا کر انسانیت کے دائرے میں داخل کیا۔ انھوں نے زبان کو وقار بخشا، خیال کو وسعت عطا کی اور مرثیہ کے جذبے کو عصری معنویت بخشی۔ ان کے مراثی میں

ایمان کی حرارت، فکر کی روشنی اور احساس کی لطافت ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان کے مراثی نہ صرف سوگ کا آئینہ ہیں بلکہ زندگی کے شعور کا درس بھی۔ ان کے مرثیے محض فن نہیں، ایک روحانی تجربہ ہیں جو قاری کے باطن کو منور کرتے ہیں اور دلوں میں تسلیم و رضا کی شمعیں روشن کر دیتے ہیں۔''[۳۶]

آل رضا جدید مرثیہ کے عناصر اربعہ میں شامل ہیں۔ جوشؔ نے جب 'حسین اور انقلاب' کے ذریعے مرثیے کے نئے رنگ و آہنگ سے اردو مرثیے کو روشناس کرایا تو جوشؔ کے ساتھ جمیل مظہری، نسیم امروہوی اور آل رضا نے بھی مرثیے کی ان اقدار سے اردو قارئین کو متعارف کرایا جس کی طرف مرثیے کے عقیدت پسند قارئین نے توجہ نہیں دی تھی۔ جوشؔ نے جب یہ صدا بلند کی ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

تو آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد آل رضا جو بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، انھوں نے مقصدیت کے نئے رنگ سے اردو مرثیے کو متعارف کرایا اور جوش کے بھاری بھرکم شعری وجود کے سامنے جب ان کا یہ بند سامنے آیا ؎

ابر بے فصل نے اب کی یہ سماں دکھلایا
آسمان سوگ میں تھا، جب کہ محرم آیا
رندھ گئی جتنی فضا اتنا ہی غم بھی چھایا
بوندیں پڑنے جو لگیں یاد نے دل تڑپایا
کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

مرثیہ میں یہ لہجہ اور یہ آہنگ صرف جذباتی نوحہ گری نہیں تھی بلکہ اخلاقی اور فکری فلسفہ تھا جہاں عزم و حوصلہ کے ساتھ درد و غم کی ترجمانی بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آل رضا کے مراثی میں سیاسی شعور، فکری بیداری اور سماجی احتجاج کے رنگ نمایاں ہیں۔ مولانا ارشاد حسین نے آل رضا کے مراثی کے متعدد بند پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے یہاں امام حسین کی جدوجہد ظلم کے خلاف ایک آفاقی احتجاج کی علامت بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مراثی قاری کو نہ صرف رنجیدہ کرتے ہیں بلکہ عمل پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔ ان کے مراثی کا ڈکشن، درس عمل، حریت فکر اور اخلاقی استقلال کا حسین سنگم ہے۔ مولانا ارشاد حسین نے ان

کے مراثی کا خوب صورت محاکمہ کرتے ہوئے درج ذیل رائے قائم کی ہے:

''آل رضا کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی بیان کی متانت اور زبان کی کلاسیکی عظمت ہے۔ان کے کلام میں فارسی وعربی الفاظ کی آمیزش ایک خاص جلال پیدا کرتی ہے،مگر اس کے باوجود سلاست وروانی متاثر نہیں ہوتی۔وہ جذبات کو توازن کے ساتھ برتتے ہیں اور فکر کو سادگی کے پردے میں پیش کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں ایک عجیب سکون ہے جو قاری کے دل میں ٹھہر جاتا ہے۔ان کے مراثی میں صوتی آہنگ، بندش الفاظ اور مصرعوں کی موسیقیت اس قدر لطیف ہے کہ پڑھنے والا خود کو ایک روحانی فضا میں محسوس کرتا ہے۔یہی فنی پختگی ان کے کلام کو ایک خاص دائرۂ فکر سے نکال کر آفاقیت سے روشناس کراتی ہے۔''[۳۷]

اس طرح مولانا ارشاد حسین نے جدید مرثیہ کے اہم شاعر آل رضا کے مراثی کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ مرثیہ کے سنجیدہ قاری ہونے کے ساتھ ساتھ مرثیہ تنقید اور اس کی فنی اقدار سے بخوبی واقف ہیں۔اس طرح جب ہم مولانا ارشاد حسین کے فارسی اور اردو مضامین کی قرأت کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ موصوف صرف مسند درس کے غازی نہیں ہیں بلکہ قلم وقرطاس کے سپاہی بھی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔دوازدہ بند،محتشم کاشانی،مقدمہ واردو ترجمہ: مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء،ص ۱۶۲

۲۔ایضاً،ص ۱۶۲ ۳۔ایضاً،ص ۱۶۳

۴۔ایضاً،ص ۱۶۴ ۵۔ایضاً،ص ۱۶۴

۶۔ایضاً،ص ۱۶۴

۷۔کریما،شیخ سعدی شیرازی،اردو ترجمہ: مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب،اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۴

۸۔صد پند لقمان مع اردو ترجمہ،مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب،جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء،ص ۱۵۰

۹۔ایوان مدائن از خاقانی، اردو ترجمہ: مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب، جولائی تا ستمبر ۲۰۲۵ء، ص ۱۷۴

۱۰۔ایضاً،ص ۱۷۴
۱۱۔امام خمینی کی شاعری میں عشق وعرفان،ارشاد حسین، فیضان ادب،جنوری تا جون ۲۰۱۶ء،ص ۱۸
۱۲۔ایضاً،ص ۱۸ ۱۳۔ایضاً،ص ۱۹
۱۴۔ایضاً،ص ۲۰ ۱۵۔ایضاً،ص ۲۲
۱۶۔ایضاً،ص ۲۲ ۱۷۔ایضاً،ص ۲۴
۱۸۔ایضاً،ص ۲۴ ۱۹۔ایضاً،ص ۲۵
۲۰۔فیضان ادب، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء،ص ۲۰
۲۱۔ایضاً،ص ۲۲ ۲۲۔ایضاً،ص ۲۳
۲۳۔فیضان ادب،جنوری تا جون ۲۰۱۷ء،ص ۱۶
۲۴۔فیضان ادب، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۷ء،ص ۴۸۔۴۹
۲۵۔ایضاً،ص ۵۰
۲۶۔مولانا حسرت موہانی کی سیاسی شاعری، مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب ، اپریل تا جون ۲۰۲۵ء،ص ۸
۲۷۔فیضان ادب،اپریل تا جون ۲۰۲۵ء،ص ۹
۲۸۔ایضاً،ص ۱۰ ۲۹۔ایضاً،ص ۱۲
۳۰۔ایضاً،ص ۱۳
۳۱۔فیضان ادب،اپریل تا جون ۲۰۲۵ء،ص ۱۵۔۱۶
۳۲۔اردو مرثیے کی جمالیات اور ڈاکٹر عابد حسین حیدری،مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب،اپریل تا جون ۲۰۲۲ء،ص ۴۰
۳۳۔ایضاً،ص ۴۰۔۴۱ ۳۴۔ایضاً،ص ۴۳
۳۵۔ایضاً،ص ۴۴
۳۶۔آل رضا کی مرثیہ گوئی: تطہیر غم سے تجلی شعور تک،مولانا ارشاد حسین، فیضان ادب،جنوری تا مارچ ۲۰۲۶ء،ص ۲۴
۳۷۔ایضاً،ص ۲۹

☆☆☆

ڈاکٹر ذیشان حیدر
ایسوسی ایٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ، رابطہ نمبر: 9336027795

علوم القرآن: ایک تعارفی تجزیہ

تلخیص:

علوم القرآن، والد ماجد، استاذ الاساتذہ جناب مولانا ارشاد حسین رضوان اللہ علیہ کی تالیف کی ہوئی علوم قرآن پر مشتمل خطی نسخے کی صورت میں ایک مدلل کتاب ہے۔ علوم قرآن وہ علم ہے جس میں قرآن کریم کے ان مخصوص مباحث و مسائل کا ادراک ہوتا ہے جو تلاوت قرآن اور اس کے معانی و مقاصد کے فہم و ادراک میں براہ راست معاون ہوں۔ اس کتاب میں قرآنی اصطلاحات مثلاً قرآن، نزول قرآن، اقسام نزول، وحی، اقسام وحی، سورہ، آیت، مکی، مدنی، قرأت، قراء سبعہ، جمع قرآن، محکم، متشابہ، ناسخ، منسوخ، حروف مقطعات، امثال القرآن، مجاز، تشبیہ، استعارہ، مجمل، مبین، عام، خاص، مطلق، مقید، تکرار، عدم تحریف قرآن وغیرہ کی تفصیلات واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ لفظ قرآن کے لغوی معنی پڑھنے کے ہیں جو قرأت کا مترادف ہے۔ چوں کہ کتابِ خدا دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے لہٰذا یہ کثرتِ قرأت، قرآن کریم کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس خطی نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مولف نے ہر اصطلاح کو نہایت سادہ مگر علمی انداز میں پیش کیا ہے، جس سے مبتدی اور ماہر دونوں یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ کتاب میں دلائل کے ساتھ آیاتِ قرآنی اور اقوالِ مفسرین کو شامل کیا گیا ہے، جس سے اس کی استنادی حیثیت مستحکم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ، اسلوب میں روانی اور دل نشینی کے ساتھ ایسا نظم و ضبط موجود ہے جو قاری کو ابتدا سے انتہا تک باندھے رکھتا ہے۔ یہ تالیف علومِ قرآن کے طلبہ اور محققین کے لیے ایک نہایت مفید اور رہنما کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

کلیدی الفاظ:

علوم القرآن، مولانا ارشاد حسین، وحی، ایحاء، محاسبی، فہم القرآن، فرقان، تنزیل، وجہ تسمیہ، صفات قرآن، سورہ، آیت، مکی، مدنی، نزول دفعی، نزول تدریجی، حدیث سبعۃ احرف۔

علوم القرآن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قرآنی علوم پر مشتمل والد ماجد، کریم النفس و عالم جلیل القدر، متقی و عابد شب زندہ دار اور محسن و مربی مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ کی تالیف کردہ ایک معتبر و مستند کتاب ہے جو ابھی خطی نسخے کی شکل میں موجود ہے اور ان شاء اللہ مستقبل قریب میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر عوام و خواص کے مابین منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگی۔

علوم القرآن میں مختلف قرآنی استشہادات و تاریخی دستاویزات سے استفادہ کر کے متعدد اصطلاحات، علوم اور فنون کی تبیین کی گئی ہے۔ سب سے پہلے علوم قرآن کی چند تعریفیں پیش کی گئی ہیں، پھر قیود احتراز یہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد مختلف اصطلاحات مثلاً قرآن، نزول قرآن، اقسام نزول، وحی، اقسام وحی، سورہ، آیت، مکی، مدنی، قرأت، قراء سبعہ، جمع قرآن، محکم، متشابہ، ناسخ، منسوخ، حروف مقطعات، امثال القرآن، مجاز، تشبیہ، استعارہ، مجمل، مبین، عام، خاص، مطلق، مقید، تکرار، عدم تحریف قرآن وغیرہ کی مدلل توضیح پیش کی گئی ہے۔

تعریف علوم قرآن کا بیان: کتاب علوم القرآن میں علوم قرآن کی تعریف سے متعلق چند اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ مولف نے اس سے متعلق اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے تعریف کی توضیح اور قیود احتراز یہ وغیرہ کی تشریح پیش کی ہے۔ علوم قرآن کا تعلق ایسے علوم سے ہوتا ہے جو قرآن فہمی میں مقدمہ کے طور پر ذکر کیے جاتے ہیں اور اس میں تفسیر کے مبادی و اصول کا تذکرہ ہوتا ہے۔ علوم قرآن کی مختلف تعریفوں کی تلخیص پیش خدمت ہے، ملاحظہ کیجیے:

۱۔ وہ علم جو قرآن کریم سے متعلق مباحث کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو جیسے اسباب نزول کی معرفت، قرآن کی جمع و ترتیب، مکی و مدنی، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ وغیرہ کی معرفت۔

۲۔ وہ مباحث جو قرآن کریم کے نزول، جمع، قرأت، تفسیر، ناسخ و منسوخ، اسباب نزول، مکی و مدنی ہونے کے اعتبار سے قرآن سے متعلق ہوں۔

۳۔ وہ مباحث جو قرآن کریم کے نزول، جمع و ترتیب، رسم الخط، قرأت، تفسیر، اعجاز، ناسخ و منسوخ اور شبہات کے دفاع وغیرہ کے اعتبار سے قرآن سے متعلق ہوں۔

۴۔ وہ علم جس میں قرآن کریم سے متعلق متعدد معارف اور امور سے بحث ہوتی ہے۔

۵۔علوم قرآن ان مختلف معارف کا نام ہے جو متعدد زاویوں سے قرآن کریم سے متعلق ہوں۔

۶۔علوم قرآن وہ علم ہے جس میں قرآن کریم کے ان مخصوص مباحث و مسائل کا ادراک ہوتا ہے جو تلاوت قرآن اور اس کے معانی و مقاصد کے فہم و ادراک میں براہ راست معاون ہوں۔

مذکورہ تمام تعریفات کا ہدف یکساں ہے اور وہ تفسیر قرآن و قرآن فہمی کے باب میں تمام لازمی علوم سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔مولف کتاب نے چھٹی تعریف کو من جملہ زیادہ بسیط مفہوم پر محیط قرار دیا ہے۔

چھٹی تعریف کی قیود اور توضیح مندرجہ ذیل ہیں:

علم بمنزلہ جنس ہے جو شرعی اور غیر شرعی، قرآنی اور غیر قرآنی علوم کو شامل ہے۔

قرآن کریم قید احترازی ہے جس سے غیر قرآنی علوم خارج ہو گئے۔

مخصوص مسائل و مباحث قید توضیحی ہے جو اس فن میں شامل کیے گئے جملہ مسائل کی وضاحت کرتی ہے۔مثلاً نزول قرآن، جمع قرآن، مکی و مدنی، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، عام و خاص، مطلق و مقید، مجمل و مبین، اعجاز قرآن و عدم تحریف قرآن وغیرہ جیسے مباحث کا اس علم میں تذکرہ ہوتا ہے۔

''تلاوت قرآن اور اس کے معانی و مطالب کا فہم و ادراک'' اس فقرے میں علوم قرآن کے ثمرہ اور نتیجہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کا اصلی ہدف ہے۔''براہ راست معاون ہوں۔'' یہ قید احترازی ہے جس سے وہ علوم جو قرآن فہمی کے لیے براہ راست معاون نہیں ہیں بلکہ بالواسطہ معاون ہیں، خارج ہو گئے مثلاً علم نحو، علم صرف، علم اصول فقہ وغیرہ۔اس علم کے لیے علم قرآن کے بجائے علوم قرآن کا استعمال اس وجہ سے ہوتا ہے کہ قرآن فہمی کا دارومدار متعدد معاون علوم کی معلومات پر منحصر ہوتا ہے اور ان معاون علوم میں سے ہر ایک بذات خود ایک مستقل علم ہوتا ہے اور اس کے مجموعے کو علوم کہتے ہیں۔

تقسیم علوم قرآن: علوم قرآن کی تقسیم سے متعلق نہایت مفید اور اہم معلومات پیش کی جاتی ہیں کہ یہ علوم دو حصوں میں منقسم ہوتے ہیں: ۱۔وہ علوم جن کا تعلق قرآن فہمی سے ہوتا ہے۔ ۲۔وہ علوم جو قرآن کریم کے مضامین و محتویات اور معانی و مفاہیم پر مشتمل ہوتے ہیں۔

قسم اول میں قرآن کریم کی تدوین و ترتیب، وحی، نزول، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، عام و خاص، مطلق و مقید، مجمل و مبین، قرأت و تجوید، اعجاز قرآن وغیرہ سے تفصیلی بحث کی جاتی ہے جن کی معلومات کے بغیر کسی انسان کا مفسر ہونا ممکن نہیں ہے۔لہٰذا اسے مقدمۂ تفسیر قرآن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔تفسیر قرآن سے قبل ان علوم کا جاننا لازمی ہے کیوں کہ یہی علوم مقدمۂ علم اور قرآن کریم کے لیے مقدمۂ کتاب شمار کیے جاتے ہیں۔چوں کہ مقدمۂ واجب واجب ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ علوم کی معلومات، قرآن کریم کی صحیح تفسیر کے

لیے ضروری ہے۔

قسم دوم میں قرآن کریم کے مضامین اور آیات کے معانی و مفاہیم سے بحث ہوتی ہے۔ اسے تفسیر قرآن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تفسیر کا اسلوب کیا ہے؟ تفسیر کی شرائط کیا ہیں؟ مفسر کا معیار کیا ہے؟ مشہور مفسرین کون کون سے ہیں؟ صحیح اور غلط تفسیر کا پیمانہ کیا ہے؟ وغیرہ کے علم سے اس قسم میں بحث کی جاتی ہے تاکہ صحیح تفسیر کے ذریعہ احکام الٰہی تک رسائی ممکن ہو سکے، بندگان خدا ان احکام کی تعمیل کر سکیں اور عبرت حاصل کر سکیں۔ درحقیقت یہی اس کا اساسی مقصود بھی ہے۔

موضوع علوم قرآن: علوم قرآن کا موضوع کیا ہے؟ والد ماجد مولف علوم القرآن مولانا ارشاد حسین مرحوم، موضوع علوم قرآن سے متعلق مصطفیٰ زرقانی کی تالیف مناھل القرآن کے حوالے سے یہ تحریر فرماتے ہیں: علوم قرآن کا موضوع خود قرآن کریم ہے باعتبار نزول قرآن، جمع و ترتیب، رسم الخط، قرأت، تفسیر، اعجاز، ناسخ و منسوخ وغیرہ۔ یعنی ان متعدد زاویوں میں سے کسی بھی زاویہ کے اعتبار سے علوم قرآن کا موضوع قرآن کریم ہے۔[۱]

واضع علوم قرآن: علوم قرآن کا واضع کون ہے؟ اس کے بارے میں مختلف نظریات موجود ہیں۔ مولف نے اس سے متعلق چار نظریات بیان کیے ہیں، جن میں چوتھے نظریے کو اولیٰ و انسب قرار دیا ہے۔ اس کی تلخیص پیش خدمت ہے:

۱۔ علوم قرآن کی اصطلاح کا ظہور پانچویں صدی ہجری میں ہوا جب علی بن ابراہیم الحوفی (متوفی: ۴۳۰ھ) کی تصنیف 'البرھان فی علوم القرآن' معرض وجود میں آئی، لہٰذا امام حوفی کو علوم قرآن کا واضع قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ علوم قرآن کی اصطلاح کا ظہور تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہو گیا تھا اور لوگ اس فن کے مبادی اور معارف سے واقف ہو چکے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب محمد بن خلف بن المرزبان کی تصنیف 'الحاوی فی علوم القرآن' منظر عام پر آ چکی تھی۔ گویا کہ اس فن کے واضع محمد بن خلف بن المرزبان قرار پائے۔

۳۔ علامہ سیوطی کے بقول امام بلقینی کی کتاب 'مواقع العلوم فی مواقع النجوم' اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ چوں کہ اس سے قبل متعدد کتابیں علوم قرآن میں شائع ہو چکی ہیں، لہٰذا علامہ جلال الدین بلقینی کو اس فن کا واضع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ علوم قرآن کی سب سے پہلی تصنیف محاسبی (متوفی: ۲۴۳ھ) کی 'فہم القرآن' ہے، لہٰذا محاسبی

کو اس کا واضع قرار دیا جانا انسب و اولیٰ ہے۔

علوم قرآن پر مشتمل چند اہم تالیفات: مولف علوم القرآن نے علوم قرآن سے متعلق اہل سنت و اہل تشیع کی چند اہم تالیفات کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں مناسب تفصیلات کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں پر چند کتب اور ان کے مولفین کے نام درج ذیل ہیں: ۱۔ فہم القرآن، از محاسبی، ۲۔ التنبیہ علیٰ فضل القرآن، از ابوالقاسم محمد بن حبیب نیشاپوری، ۳۔ الحاوی فی علوم القرآن، از محمد بن خلف بن المرزبان، ۴۔ عجائب القرآن، از ابوبکر انباری، ۵۔ الاستغناء فی علوم القرآن، از محمد بن علی الادفوی، ۶۔ البرھان فی علوم القرآن، از علامہ حوفی، ۷۔ البیان فی علوم القرآن، از ابو عامر جرجانی، ۸۔ فنون الافنان فی عیون علوم القرآن، از ابن جوزی، ۹۔ البرھان فی علوم القرآن، از امام بدرالدین زرکشی، ۱۰۔ مواقع العلوم فی مواقع النجوم، از علامہ جلال الدین بلقینی، ۱۱۔ الاتقان فی علوم القرآن، از علامہ جلال الدین سیوطی، ۱۲۔ الزیادۃ و الاحسان فی علوم القرآن، از جمال الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد عقیلہ المکی، ۱۳۔ عجیب البیان فی علوم القرآن، از مولانا عبدالباسط قنوجی، ان کے علاوہ چار دیگر کتب جو قرآن مجید کے لغوی محاسن، ادبی اسالیب اور قرأت وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ یہ کتابیں علوم قرآن کی اصطلاح کے وضع ہونے سے قبل تالیف کی گئی ہیں جو افادیت میں بے مثال ہیں اور حسب ذیل ہیں: ۱۴۔ معانی القرآن، از یحییٰ بن زیاد الفراء، ۱۵۔ مجاز القرآن، از ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ، ۱۶۔ تفسیر قرآن، (درفن قرأت) از قتادہ، ۱۷۔ الناسخ والمنسوخ، از حسن بصری۔ مذکورہ چار کتب کے علاوہ علوم قرآن پر مشتمل چند اہم کتابیں درج ذیل ہیں: ۱۸۔ البیان فی تفسیر القرآن، از امام ابوالقاسم الخوئی، ۱۹۔ المسیر فی علوم القرآن، از عبدالرسول غفار، ۲۰۔ الفکر الاسلامی وعلوم القرآن، از علامہ مرتضیٰ مطہری، ۲۱۔ المناھج التفسیریہ فی علوم القرآن، از جعفر سبحانی، ۲۲۔ الحجاج والاحتجاج باقوال سیبویہ فی علوم القرآن، از رجاء عجیل الحسناوی، ۲۳۔ التمھید فی علوم القرآن، از محمد ہادی معرفت، ۲۴۔ علوم القرآن، دروس منھجیۃ، از سید ریاض الحکیم، ۲۵۔ علوم القرآن، از سید باقر الحکیم۔ ۲۶۔ تعلیم علوم القرآن، از محمد ہادی معرفت۔ مذکورہ کتب کے علاوہ بعض دیگر کتابیں بھی علوم قرآن کے موضوع پر تالیف کی گئی ہیں اور ماشاءاللہ ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

بہ نظر غائر علوم قرآن کی خدمات کا تاریخی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر اور مباحث قرآنی کی تدوین سنہ ۲۰۰ھ سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے شخص یحییٰ بن یعمر ہیں جو ابوالاسود دوئلی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے فن قرأت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جو مختلف قسم کی قرأتوں پر مشتمل تھی۔ یہ اس فن قرأت کی اولین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ چوں کہ قرأت بھی علوم قرآن کا ایک جز ہے، لہٰذا ابوالاسود دوئلی کے شاگرد یحییٰ بن

یعمر کی شخصیت کو بھی علوم قرآن کی تاسیس میں ایک اہم رکن قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد علوم قرآن کی خدمات کا سلسلہ چل پڑا جو الحمدللہ تا حال جاری ہے اور ان شاءاللہ تعالیٰ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

لفظ قرآن کے لغوی و اصطلاحی معنی: لفظ قرآن کے لغوی و اصطلاحی معنی بیان کیے جاتے ہیں۔ قرآن کے لغوی معنی سے متعلق مختلف علما و محققین کے متعدد اقوال نقل کیے گئے ہیں، البتہ اس کے اصطلاحی معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن کے لغوی معنی سے متعلق یہ اقوال علمی افادیت کے لحاظ سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ والد ماجد مولف علوم القرآن مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ نے چوتھے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ چند اہم اور قابل ذکر اقوال ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ قرآن غیر مشتق ہے، مہموز نہیں ہے بلکہ کلام اللہ کا علم ہے جیسے توراۃ و انجیل۔ ۲۔ قرآن قرنت الشی بالشئ سے ماخوذ ہے جب تم ایک شے کو دوسری شے سے ملا دو اور قرآن میں سورے، آیات اور حروف ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ۳۔ قرآن قَرَأَ یَقْرَءُ مہموز لام کا مصدر ہے جس کا مشہور مصدر قراءۃ ہے۔ اس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ اسی سے ''قرأتُ الماء فی الحوض ای جمعته'' ہے۔ یعنی میں نے پانی کو حوض میں جمع کیا۔ ۴۔ قرآن، قرأۃ کی طرح مہموز لام کا مصدر تو ہے مگر ان دونوں کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ اسی معنیٰ میں قرآن کریم کی آیت ہے: ''اِنّ علینا جمعه و قرآنه'' (سورہ قیامۃ، آیت: ۱۷) یقیناً قرآن کا جمع کرنا اور پڑھنا دونوں ہماری ذمہ داری ہے۔ چوں کہ اس آیت میں جمع کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اس کے بعد لفظ قرآن آیا ہے، لہٰذا وہ دلالت کرتا ہے کہ اس کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ ۵۔ قرآن قرائن سے ماخوذ ہے اس لیے کہ اس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اور ان میں بعض بعض کے مشابہ ہیں۔ یہ قول درست نہیں ہے بلکہ سہو پر مبنی ہے۔ ۶۔ مصدر کو اسم مفعول کے معنی میں بھی استعمال کیا کرتے ہیں جیسے قرآن بمعنی مقروء یعنی پڑھی ہوئی کتاب۔

مولف نے چوتھے قول کو ترجیح دی ہے اور اس کی علت بھی بیان کر دی ہے، ملاحظہ کیجیے: ان اقوال میں چوتھا قول راجح ہے یعنی قرآن مہموز لام کا مصدر ثانی ہے اور مصدر اول قرأۃ ہے جو مشہور ہے۔ اس کی قرأت کی خدا نے ذمہ داری لی ہے، اس لیے پوری دنیا میں جو کتاب سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے وہ قرآن مجید ہے۔ [۲] قرآن کریم کے اصطلاحی معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مولف علوم القرآن مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ نے اس کی تعریف کو علما کے مابین متفق علیہ قرار دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''قرآن کے اصطلاحی معنی ''المنزل علی الرسول، المکتوب فی المصاحف، المنقول الینا نقلاً متواتراً بلا شبهة'' قرآن خدا کی طرف سے رسول پر نازل ہوا،

مصاحف میں لکھا گیا اور بغیر شک وشبہہ کے ہماری طرف تواتر کے ساتھ نقل کیا گیا۔ یہ تعریف علما کے درمیان متفق علیہ ہے۔''[۳]

قرآن کی وجہ تسمیہ: قرآن کو قرآن کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کے اسباب وعلل اور وجہ تسمیہ سے متعلق مختلف تحقیقات پیش کی گئی ہیں:

قرآن کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ قرآن غفران اور کفران کے وزن پر قرأ یقرأ کا مصدر ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں اور یہ لفظِ قرآن پڑھنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ چوں کہ اس میں حروف وکلمات کو جمع کیا گیا ہے اس لیے اسے قرآن کہتے ہیں۔ ایک وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں سابقہ کتب سماویہ کے ثمرات جمع کیے گئے ہیں لہٰذا اس کا نام قرآن رکھا گیا ہے۔ ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں ہر قسم کے علوم جمع کر دیئے گئے ہیں، اس لیے اس کو قرآن کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ایک قول کے مطابق قرآن کا مادہ قَرَوَ ہے۔ واو کو ہمزہ سے بدل دیا قَرَءَ ہو گیا۔ یہ بھی جمع کرنے کے معنی میں ہے۔ چوں کہ قرآن میں عقائد، احکام، واقعات وقصص وغیرہ ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں، اس لیے اس کا نام قرآن رکھ دیا گیا۔ اس کی وجہ تسمیہ سے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ قرآن کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس وغیرہ پوشیدہ طور پر رسول اللہ کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سنتے تھے اور جب باہم ملاقات کرتے تھے تو اس پر ایک دوسرے کی ملامت کیا کرتے تھے، پھر ان سرداران قریش نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ نہ خود قرآن کو سنا جائے اور نہ دوسروں کو سننے دیا جائے، بلکہ اس کی تلاوت کے درمیان شور وغل اور لغو باتوں کے ذریعہ رخنہ اندازی کی جائے تا کہ ان کی تلاوت پر غالب آجائیں۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس کی ترجمانی کرتی ہے: ''**قال الذین کفروا لاتسمعوا لھذا القرآن و الغوا فیه لعلکم تغلبون**'' (حم سجدہ، آیت:۲۶) کفار نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور لغو وفضول باتوں کے ذریعہ اس کی تلاوت کے درمیان رخنہ ڈالو تا کہ تم غالب آجاؤ یعنی تلاوت کی آواز دب جائے اور مغلوب ہو جائے۔ خداوند کریم نے کفار کی اس خواہش کے برخلاف قرآن مجید کو اتنی زیادہ شہرت عنایت کی کہ آج وہ کائنات میں کثرت کے ساتھ تلاوت کی جانے والی کتاب شمار کی جاتی ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہی کثرت تلاوت ہے۔

مولف علوم القرآن نے مذکورہ آیت اور اس کے مفہوم کو بیان کرنے کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ: ''اللہ سبحانہ نے ان (کفار) کی اس حرکت کا یہ جواب دیا کہ اپنی کتاب میں لفظ قرآن کو اکسٹھ بار بیان کیا اور لفظ قرآن اتنا مشہور ہوا کہ کلام اللہ کا علم بن گیا۔ یعنی مقصود پروردگار ہے کہ جتنا کفار اسے روکیں گے اتنا ہی وہ اس کی تلاوت کو فروغ دے گا، اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پوری دنیا میں اربوں کی تعداد

میں مسلم وغیر مسلم گھرانوں میں یہ قرآن بغیر کسی فرق کے ایک ہی حالت میں موجود ہے، لوگ اسے پڑھتے ہیں اور اس کے مطالب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں البتہ بدنیت دشمن اس کی آیات کو غلط معنی کا جامہ پہنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہی کثرت قرأت، قرآن کی اصل وجہ تسمیہ ہے۔''[۴]

قرآن مجید کے لیے پانچ اسما کو علَم کے طور پر استعمال کیا گیا ہے: مولف علوم القرآن نے قرآن مجید کے لیے پانچ اسما کو علَم کے طور پر استعمال کیا ہے جو قرآنی شواہد کے ساتھ درج ذیل طریقے پر بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔قرآن: ''یٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ''(سورہ یس، آیت:۱ تا ۴)اے سید وسردار! حکمت والے قرآن کی قسم کہ یقیناً تم رسولوں میں سے ایک ہو، صراط مستقیم پر ثابت قدم ہو۔

۲۔فرقان: ''وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ''(سورہ آل عمران، آیت: ۳-۴)اللہ نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے توریت وانجیل کو نازل کیا اور حق وباطل میں فرق کرنے والا فرقان نازل کیا۔

۳۔ذکر:''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ''(سورہ حجر، آیت:۹)بے شک ہم نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

۴۔کتاب:''الم ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ''(سورہ بقرہ، آیت:۱ و ۲) یہ وہ کتاب ہے جس کے کتاب خدا ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔قرآن کو کتاب اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کی آیات رسول اللہ کی زندگی میں مختلف اشیا پر مکمل طور پر تحریر میں آچکی تھیں۔

۵۔تنزیل:''تَنزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ لِتُنذِرَ قَوْماً مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ''(سورہ یس، آیت:۵-۶)بڑے رحم کرنے والے غالب خدا کی تنزیل ہے تاکہ تم ان لوگوں کو عذاب خدا سے ڈراؤ جن کے باپ دادا تم سے پہلے کسی پیغمبر سے ڈرائے نہیں گئے جس کی بنا پر وہ دین سے بالکل بے خبر ہیں۔

مولف علوم القرآن نے تنزیل کی توضیح کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ تنزیل تدریجی نزول کو کہتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیتیں ۲۳ رسال کی مدت میں وقتاً فوقتاً بوقت ضرورت نازل ہوتی رہیں۔علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں صرف قرآن کریم کے چار نام علَم کے طور پر بیان کیے ہیں اور وہ یہ ہیں۔۱۔قرآن، ۲۔فرقان، ۳۔کتاب، ۴۔ذکر۔[۵]

صفاتِ قرآن کریم: قرآن کریم میں صفاتِ قرآن کریم کا کثرت کے ساتھ ذکر موجود ہے۔ مولف علوم القرآن نے ۱۵/ صفات کا آیاتِ قرآنی سے استشہاد کرتے ہوئے ذکر کیا ہے جو نہایت مفید اور حسب ذیل ہیں:

''صفاتِ قرآن نوے سے متجاوز ہیں جن میں سے چند یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

۱۔ مجید: ''ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيد'' (سورہ ق، آیت:۱) ق، قرآن مجید یعنی صاحبِ مجد قرآن کی قسم

۲۔ کریم: ''إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ'' (سورہ واقعہ، آیت:۷۷) یقیناً وہ معزز و صاحبِ کرم قرآن ہے۔

۳۔ حکیم: ''یس وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ انک لمن المرسلين'' (سورہ یس، آیت:۱-۳) اے سید و سردار! حکمت والے قرآن کی قسم کہ آپ رسول ہیں۔

۴۔ عظیم: ''وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ۔'' (سورہ حجر، آیت:۸۷) یقیناً ہم نے تم کو سبع مثانی اور عظمت والا قرآن عطا کیا ہے۔

۵۔ شفاء: ''وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔'' (سورہ اسراء، آیت:۸۲) اس میں مومنین کے لیے شفا و رحمت ہے۔ دل کی بیماری کفر و جہل کو دور کرنے کے ساتھ جسمانی امراض کے لیے بھی شفا ہے۔

۶۔ ''هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ'' (سورہ بقرہ، آیت:۳) متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ ھدیً یعنی یہ ہدایت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یہ مبالغہ کی غرض سے صیغۂ فاعل کی جگہ پر بطور مصدر استعمال ہوا ہے۔

۷۔ نور: ''وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُوراً نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا'' (سورہ شوریٰ، آیت:۵۲) اور لیکن ہم نے اس (قرآن کریم) کو نور بنایا ہے۔ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جو ہدایت کا خواہشمند ہوتا ہے اس کی ہدایت کرتے ہیں یعنی ظلمات سے نور اور ضلالت سے ہدایت کی طرف لے آتے ہیں۔

۸۔ مبارک: ''وَهَذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ'' (سورہ انبیاء، آیت:۵۰) قرآن یہ بابرکت ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ اس کی برکت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۹۔ مبین: ''الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُّبِينٍ'' (سورہ حجر، آیت:۱) الر، یہ کتاب خدا اور روشن قرآن کی چند آیتیں ہیں۔

۱۰۔ عزیز: ''وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ'' (سورہ حم فصلت، آیت:۴۱) یقیناً وہ کتاب عزیز یعنی عالی مرتبت کتاب ہے۔

۱۱-۱۲۔ متشابہ و مثانی: ''اللهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَاباً مُّتَشَابِهاً مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ

الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ۔" (سورہ زمر، آیت: ۲۳) اللہ نے بہت اچھا کلام یعنی یہ کتاب نازل فرمائی جو متشابہ ہے یعنی اس کی آیتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور مثانی ہے یعنی کئی بار دہرائی گئی ہیں، اس کے سننے سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو خشیت پروردگار رکھتے ہیں۔

۱۳۔احسن الحدیث: "اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ" (سورہ الزمر، آیت: ۲۳) اللہ نے بہت اچھا کلام یعنی قرآن مجید کو نازل کیا۔ چوں کہ کوئی کلام قرآن سے بہتر نہیں ہے جو خدا کی معرفت اور انسان کی سعادت کا سلیقہ سکھائے اس لیے اس کا نام احسن الحدیث رکھا گیا۔

۱۴۔روح: "كَذَالِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحاً مِّنْ أَمْرِنَا" (سورہ شوریٰ، آیت: ۵۲) اس طرح ہم نے اپنے امر کی روح کو تمہاری طرف وحی کر کے بھیجا۔ یہ آیت "یسئلونک عن الروح" کا جواب بھی بن سکتی ہے۔

۱۵۔حکمت بالغہ: "حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ" (سورہ قمر، آیت: ۵) ان کے پاس پہنچی ہوئی دانائی آئی مگر انذار کی تمام چیزوں نے انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔"[۶]

وحی کے لغوی و اصطلاحی معنی: وحی کے لغوی معنی و مفہوم سے متعلق ذکر یہ ہے کہ وحی ثلاثی مجرد اور ایحاء ثلاثی مزید فیہ ہے۔ لغت عرب میں ان دونوں الفاظ کا مفہوم سرعت سے اشارہ کرنا ہے، خواہ یہ اشارہ رمز، کنایہ، آواز، تحریر، نقوش یا کسی عضو کے توسط سے کیا جائے۔ ایک قول کے مطابق وحی اعلام خفی یعنی پوشیدہ طور پر خبر کرنے کو کہتے ہیں۔ اس طرح الہام کو بھی وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "اصل الوحی الاشارۃ السریعۃ" وحی کی اصل ایسا اشارہ ہے جس میں سرعت پائی جائے اور وہ جلدی سے انجام پا جائے۔ وحی ایسے پوشیدہ کلام کو بھی کہتے ہیں کہ جب اس کا القا اپنے غیر پر کیا جائے تو وہ اس کلام سے واقف ہو جائے خواہ اس کی کیفیت جو بھی ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وحی و ایحا کے مابین فرق کیا ہے؟ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ وحی انبیا سے مخصوص ہے اور ایحا نبی و غیر نبی دونوں کو عام ہے یعنی وحی اور ایحاء کے درمیان عموم و خصوص مطلق کی نسبت موجود ہے۔ وحی، کشف اور الہام کے مابین فرق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وحی وہ الہام ہے جو نبی سے مخصوص ہے۔ کشف وہ الہام ہے جو نبی کے علاوہ کسی شخص کو حواس کے ذریعہ حاصل ہو، جس میں مشاہدہ کا دخل ہوتا ہے اور الہام وہ القا ہے جو وجدان کے ذریعہ بغیر حواس کے حاصل ہو۔

مولف علوم القرآن وحی کے اصطلاحی معنی سے متعلق بیان کرتے ہیں: "الوحی کلام اللہ المنزل علیٰ نبی من انبیائہ (یعنی) وحی اللہ کا وہ کلام ہے جو اس کے انبیا میں سے کسی نبی پر نازل کیا گیا ہو۔[۷]

مولف نے قرآن مجید میں وحی کے متعدد معانی ومطالب، آیات کریمہ کے شواہد کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ طوالت سے احتراز کرتے ہوئے یہاں فقط عنوانات اور آیات کے حوالہ جات درج کیے جاتے ہیں۔ صاحبان دانش وبینش ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ ۱۔ رمز واشارہ (سورہ مریم، آیت: ۱۱) ۲۔ الہام یعنی القا برائے انسان (سورہ قصص، آیت: ۷) ۳۔ القا برائے جاندار بغیر انسان (سورہ نحل، آیت: ۶۸) ۴۔ القا برائے جمادات بمعنی حکم (سورہ زلزال، آیت: ۴-۵) ۵۔ الہام برائے ملک بمعنی خطاب (سورہ انفال، آیت: ۱۲) ۶۔ وحی بمعنی وسوسۂ شیطانی (سورہ انعام، آیت: ۱۱۲) ۷۔ وحی رسالی یعنی نبی ورسول پر وحی کا نزول (سورہ یوسف، آیت: ۳)۔

وحی رسالی کی اقسام: وحی رسالی تین اقسام پر مشتمل ہے۔ ۱۔ وحی قلبی: اس میں خداوند متعال بغیر کسی واسطہ کے براہ راست نبی کے قلب پر کسی حکم کا القا کرتا ہے۔ جس کے باعث نبی کے قلب میں کوئی بات جاگزیں ہوجاتی ہے جسے وہ بالیقین حکم خدا سمجھتا ہے۔ یہ صورت حال خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں ممکن ہے۔ جیسے جناب ابراہیم علیہ السلام نے عالم خواب میں اپنے فرزند جناب اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تو بیداری کے عالم میں اسے حکم خدا سمجھتے ہوئے اس کی تعمیل کے لیے آمادہ ہوگئے۔ اس موقع پر خداوند متعال کا ارشاد گرامی ہے کہ **یا ابراھیم قد صدّقت الرّویا**۔ (سورہ صافات، آیت: ۱۰۴-۱۰۵) اے ابراہیم تم نے حکم کی تعمیل میں خواب کو سچ کر دکھایا۔ ۲۔ وحی رسالی کی دوسری قسم یہ ہے کہ پردے کے پیچھے سے بغیر کسی فرشتے کے واسطے کے، نبی کو صرف ایک آواز سنائی دیتی ہے جو اس کے پردہ سماعت میں لرزش کا سبب بنتی ہے۔ یہ آواز مخلوقات کی آواز سے جداگانہ ہوتی ہے۔ اس کی کیفیت سے صرف نبی ہی آشنا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس چیز میں چاہے آواز پیدا کر کے اپنے نبی سے کلام کرسکتا ہے۔ جیسے اس نے جناب موسیٰ سے کلام کرنے کے لیے درخت میں آواز پیدا کردی۔ **و کلّم اللہ موسیٰ تکلیماً**۔ (سورہ نساء، آیت: ۱۶۳) اللہ نے جناب موسیٰ سے کلام کیا جو کلام کرنے کا حق ہے۔ ۳۔ وحی ملکی، اس میں خداوند متعال فرشتے کے ذریعہ بالخصوص جناب جبریل امین کے توسط سے اپنا پیغام اپنے پیغمبر تک پہنچاتا ہے۔ جناب جبریل کو امین اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ انھوں نے آیات قرآنی کو نہایت امانت داری کے ساتھ نبی اکرم تک پہنچایا ہے۔

وحی کی مذکورہ تینوں اقسام پر قرآن مجید کی یہ آیت محیط ہے۔ "**وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا**" (سورہ شوریٰ، آیت: ۵۱) کسی بشر کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ یا پردے کے پیچھے سے یا کسی فرشتے کو بھیج کر۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مِن وَرَاءِ حِجَاب یعنی پردے کے پیچھے سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے میں ایک سمت کا تصور ہوتا ہے اور اس کی ذات کو کسی سمت میں محدود و محصور کرنا نہ صرف غیر معقول ہے بلکہ کفر ہے، کیوں کہ وہ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ مگر پردے کے پیچھے کے لفظ سے ایک سمت کا تصور ہوتا ہے جس میں ایک طرف وحی کرنے والا ہو اور دوسری طرف وہ شخص جس پر وحی کی جائے۔ آخر اس شبہہ کا ازالہ کیوں کر ممکن ہے؟ اس ایراد کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد کوئی واقعی سمت نہیں ہے بلکہ یہ سمجھانے کے لیے بطور علامت استعمال کی گئی ہے۔ جیسے ہم اللہ کے لیے لفظ ''فوق'' کا استعمال کرتے ہیں مگر یہ کوئی واقعی سمت نہیں ہوتی ہے بلکہ اللہ کی ذات بلند و بالا ہے، لہٰذا ہم اس کی طرف بلندی کی نسبت دے دیتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ مِن وَرَاءِ حِجَاب یعنی پردے کے پیچھے سے خدا کے کلام کرنے سے کوئی خاص سمت مراد نہیں لی جا سکتی۔ اس سے متعلق مولف علوم القرآن درج ذیل استدلال پیش کرتے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

''حقیقت یہ ہے کہ آپ پردے کا تصور جس سمت میں کر لیجیے اور جس پر وحی کی جائے وہ جدھر بھی جائے اس کو اپنے محاذی و مقابل میں وحی کرنے والے کی آواز سنائی دے گی اور وہ محسوس نہیں کر سکتا کہ کس سمت سے آواز آ رہی ہے بلکہ ہر سمت سے آواز آتی ہوئی محسوس ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''من وراء حجاب'' سے کوئی خاص سمت مراد نہیں لی جا سکتی بلکہ افہام و تفہیم کے لیے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔''[۸]

جبرئیل امین کس کی شکل میں رسول اکرم کے پاس نازل ہوتے تھے: جناب جبرئیل اکثر دحیہ کلبی کی شکل میں نبی اکرم کے پاس آیا کرتے تھے۔ دحیہ کلبی مدینہ کے نہایت حسین انسان تھے۔ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، لہٰذا اس نے جناب جبریل کے لیے دحیہ کلبی کی شکل کا انتخاب کیا۔ وہ اسی شکل میں رسول اکرم کے پاس وحی لے کر آتے تھے۔

رسول اکرمؐ نے اپنے اصحاب کرام کو سختی کے ساتھ یہ انتباہ دیا تھا کہ جس وقت دحیہ کلبی میرے پاس موجود ہوں تم لوگ میرے قریب نہ آیا کرو۔ حدیث ملاحظہ ہو:

> ''قال اذا رأیتم دحیه کلبی عندی فلا یدخلنّ علیّ احدٌ۔'' رسول اکرم نے اپنے اصحاب سے ارشاد فرمایا کہ جب دحیہ کلبی کو میرے پاس دیکھو تو ہرگز کوئی شخص میرے پاس داخل نہ ہو۔[۹]

مولف علوم القرآن نے ذکر کیا ہے کہ جناب جبرئیل حضور اکرم کے سامنے دوزانو ہو کر باادب بیٹھتے تھے۔ انھوں نے ایک روایت نقل کی ہے، پیش خدمت ہے:

> ''قال الامام الصادق اِنّ جبرئیل کان اذا اتی النبی ثم یدخل حتی یستاذنه و اذا

دخل علیہ قعد بین یدیہ قعدۃ العبد'' امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ جب جبرئیل نبی کے پاس آتے تھے تو بغیر اجازت کے داخل نہیں ہوتے تھے اور آپ کے سامنے اس طرح بیٹھتے تھے جیسے کوئی غلام بیٹھتا ہو۔''[۱۰]

رسول اکرم نے صرف دو بار جبرئیل کو ان کی اصل صورت میں دیکھا ہے: خداوند متعال نے جبرئیل امین کی تخلیق ایک بارعب اور ہیبت ناک شکل میں کی ہے۔ اصل صورت میں ان کا دیدار آسان کام نہیں ہے۔ اس دیدار سے متعلق مجمع البیان اور تفسیر صافی میں درج قول کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

رسول اکرم نے صرف دو بار جبرئیل کا ان کی اصل صورت میں دیدار کیا ہے۔ ایک بار آغاز وحی کے موقع پر جب وہ حرا میں اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے جس پر اللہ نے انھیں خلق فرمایا ہے۔ اس وقت وہ مشرق و مغرب کے آسمان کے افق کو گھیرے ہوئے تھے، پس نبی اکرم پر زبردست ہیبت طاری ہوئی۔ اس کے بعد جناب جبرئیل ان پر آدمی کی شکل میں نازل ہوئے اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ بعدہٗ ہمیشہ ایک خوب صورت انسان کی شکل میں تشریف لاتے رہے۔ دوسری بار جب نبی اکرم نے استدعا کی تھی کہ جبرئیل ہمیشہ آدمی کی شکل میں نازل ہوتے ہیں، میری ان سے درخواست ہے کہ وہ خود کو دوسری بار مجھے اپنی اصل صورت دکھا دیں جس پر اللہ نے انھیں خلق فرمایا ہے۔ اس وقت جبرئیل نے انھیں اپنی اصلی شکل دکھا دی۔ پس جبرئیل نے افق کو پُر کر دیا، اسی تعلق سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے ''ھو فی الافق الاعلیٰ'' وہ آسمان کے افق اعلیٰ میں تھے۔ یہ پہلی مرتبہ دیدار کی ترجمانی ہے اور اللہ کا قول ''نزلۃ اخریٰ'' دوسری بار دیدار کی ترجمانی ہے۔[۱۱]

نزول وحی کے وقت کیفیت رسول اکرم: نزول وحی کے وقت رسول اکرم کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟ جب روح القدس قلب پیغمبر پر آیات قرآنی کا القا کرتے تھے تو یہ صورت قلب پیغمبر پر گرانی کا موجب ہوتی تھی۔ نزول وحی کے وقت پردے کے پیچھے سے ایک گھنٹی کی آواز سنائی دیتی تھی جس سے آپ کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور جبین مبارک پسینے سے تر ہو جاتی تھی۔ اسے صوت الجرس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر آپ اس وقت اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو گرانی کے سبب اس کا شکم اتنا خم ہو جاتا تھا کہ وہ تقریباً زمین سے متصل ہو جاتا تھا۔ عموماً یہ کیفیت اس وقت طاری ہوتی تھی جب عذاب اور وعید پر مشتمل آیات کا نزول ہوتا تھا۔ ایسے عالم میں اصحاب اپنے سروں کو خم کر لیتے تھے۔

مولف علوم القرآن نے نزول وحی کی کیفیت کو اس طرح نقل کیا ہے، ملاحظہ کیجیے: ''حضرت امام علی علیہ السلام کا قول ہے کہ سورہ مائدہ کے نزول کے وقت حضور ''شہباء'' نامی اونٹنی پر سوار تھے، وحی کی گرانی

سے وہ تھم گئی اور اتنا خم ہوگئی کہ قریب تھا کہ اس کی ناف زمین سے متصل ہوجائے۔ اس وقت آپ کی حالت غیر تھی اور آپ اپنا ایک ہاتھ ایک صحابی کے سر پر رکھے ہوئے تھے۔[۱۲]

عبادہ بن صامت کے قول کے مطابق نزول وحی کے وقت آپ کا چہرہ اور بدن متغیر ہوجاتا تھا۔ آپ اور آپ کے اصحاب اس وقت سروں کو جھکا لیا کرتے تھے۔[۱۳]

ضرورت وحی: وحی کی اہمیت وضرورت کیا ہے؟ خداوند متعال نے ساری کائنات کو انسانوں کی منفعت کے لیے خلق کیا ہے اور انسانوں کو اپنی طاعت و بندگی کے لیے خلق کیا ہے، لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ کائنات کی تمام چیزوں کا بحسن وخوبی مطالعہ کرے اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ معلوم کرے تاکہ اس کی خلقت کے مقصد کی تکمیل ہوسکے۔ خداوند متعال نے اس کو تین قسم کے ذرائع علم عنایت کیے ہیں جن میں اول حواس ہیں خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی۔ دوم عقل ہے جس کے ذریعہ انسان حسن وقبح کی شناخت کرتا ہے اور اسی کی بدولت اسے اشرف المخلوقات کے شرف سے نوزا گیا ہے۔ سوم وحی ہے، جس کے ذریعہ انسان کو اپنی خلقت کا مقصد، اللہ کی عبادت کے طریقے اور اس کی خوشنودی و ناراضگی کے سلیقے معلوم ہوسکتے ہیں۔ علم کلام کی روشنی میں اللہ تعالیٰ پر بطور لطف یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ انبیا و مرسلین کو بھیج کر انسان کی ہدایت کے تمام پہلوؤں کی رہنمائی کرے تاکہ اسے اطاعت پر جزا اور نافرمانی پر سزا کا استحقاق ہوسکے اور یہ کام صرف وحی کے ذریعہ ممکن ہے۔ چنانچہ جو چیزیں وحی کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں وہ حواس وعقل کے ذریعہ معلوم نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے وحی کا مرتبہ ان دونوں سے بہت بلند ہے۔ پس وحی کے ذریعہ عبد ومعبود کا رشتہ استوار ہوتا ہے، کلام اللہ کے درست معانی ومطالب سے آشنائی حاصل ہوتی ہے، راہ راست کی معلومات ہوتی ہے جو انسان کو راہ نجات پر گامزن رکھنے کا موجب ہے اور اس سے تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ یہی انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے۔ خداوند متعال نے ہر قوم کے لیے ہادی مقرر اور مبعوث کیا ہے تاکہ اتمام حجت ہوجائے اور جہنم کا ایندھن بنائے جانے کی صورت میں کسی کو شکوے کا موقع فراہم نہ ہو۔

تاریخ نزول قرآن ونزول دفعی وتدریجی: قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ یہ ان سوروں اور آیات کا مجموعہ ہے جو رسول اکرم پر ہجرت سے قبل یا اس کے بعد مختلف حالات میں نازل ہوئے۔ تاریخ نزول قرآن سے متعلق علما و محققین کے درمیان مختلف نظریات واقوال موجود ہیں۔ مولف علوم قرآن مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ نے اس سلسلے میں علامہ سیوطی کے تین اقوال نقل کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں: ''علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ نزول کے تعلق سے تین اقوال پیش کیے ہیں:

۱۔ پہلا قول جسے انھوں نے اصح اور اشہر قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ مکمل قرآن شب قدر میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر دفعۃً نازل ہوا پھر رفتہ رفتہ بیس سال، تیئس سال یا پچیس سال تک بوقت ضرورت تدریجاً نازل ہوتا رہا۔ مدت کا یہ اختلاف رسول اکرمؐ کے قیام مکہ کی مدت سے وابستہ ہے مگر نزول کا آغاز شب قدر میں ہوا۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن کا نزول آسمان دنیا پر بیس، تیئس یا پچیس کی شب قدر میں ہوا۔ یہاں بیس سے مراد اکیس رمضان ہے، اس لیے کہ شب قدر طاق رات کو کہتے ہیں اور ایک سال کے اندر جتنی آیات وسور کا نزول مقصود ہوتا اتنا حصہ ایک دفعہ آسمان دنیا پر اتار دیا جاتا، پھر وہاں سے بہ تفریق تمام سال موقع بموقع نازل ہوا کرتا۔ یہ قول امام فخر الدین رازی کا ہے۔ اس سے پیغمبر کی زندگی کا ہر رمضان اور ہر شب قدر مراد ہے۔ (تفسیر کبیر رازی، جلد ۵، ص ۸۵)

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ قرآن کا نزول شب قدر میں لوح محفوظ سے بیت معمور آسمان دنیا پر ہوا جسے بیت العزت بھی کہتے ہیں، یہ آغاز نزول ہے، اس کے بعد مختلف اوقات میں بہ تفریق نازل ہوتا رہا۔ [۱۴]

مذہب امامیہ کا نظریہ یہ ہے کہ شب قدر میں قرآن کریم کا نزول لوح محفوظ سے بیت معمور پر اور بیت معمور سے قلب پیغمبر پر کاملاً یکبارگی ہوا۔ بیت المعمور کو بیت العزت بھی کہا جاتا ہے جو خانہ کعبہ کے مقابل آسمان چہارم پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، اس نزول کو نزول دفعی کہتے ہیں۔ قلب پیغمبر اتنا قوی تھا کہ جس ثقل اکبر کا تحمل کوہ گراں نہ کر سکا قلب پیغمبر اس کا متحمل ہوا، پھر وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق جبرئیل امین تدریجاً قرآن کی آیات اور سورے رسول اکرم کے پاس لاتے رہے۔ اس نزول کو نزول تدریجی کہتے ہیں۔ قلب پیغمبر پر پورے قرآن کے دفعۃً نزول کا مطلب مفاہیم قرآن کا نزول ہے نہ کہ الفاظ قرآن کا نزول۔

قرآن کریم میں دفعی نزول کے لیے انزال کا لفظ استعمال ہوا ہے اور تدریجی نزول کے لیے تنزیل کا لفظ۔ دفعی نزول کی مثال ملاحظہ کیجیے: ۱۔ "اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِی لَیْلَةِ الْقَدْرِ" (سورہ قدر، آیت: ۱) ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا۔ ۲۔ "اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِی لَیْلَةٍ مُبٰرَكَةٍ" (سورہ دخان، آیت: ۳) ہم نے اسے مبارک شب میں نازل کیا۔ اب تدریجی نزول کی مثال پیش خدمت ہے: "وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهُ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا" (سورہ بنی اسرائیل، آیت: ۱۰۶) اور ہم نے قرآن کو بتفریق نازل کیا ہے تاکہ تم اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کے پڑھو اور ہم نے اس کو تنزیل کے اعتبار سے نازل کیا ہے۔ تدریجی نزول کے لیے تنزیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم شب قدر میں نزول دفعی کی صورت میں نازل ہوا ہے اور شب قدر کے علاوہ حضور اکرم کی بعثت کے وقت سے ترسٹھ سال کی عمر مبارک تک مختلف حالات میں نزول تدریجی کی صورت میں نازل ہوا ہے۔قرآن کریم کا تدریجی نزول چند مصلحتوں کا مقتضی ہے جیسے قرآن کی پیشین گوئیاں جیسے روم کا مغلوب ہونا وغیرہ، اگر بیت معمور کے علاوہ اس روئے زمین پر قرآن کے دفعی نزول کو تسلیم کیا جائے تو تمام احکام کا وجوب یکبارگی اور دفعتاً لازم آئے گا جس سے رسول اکرم کی ۲۰ رسال یا ۲۳ رسال کی تبلیغی زندگی بے معنی ہوکر رہ جاتی اور اس طویل مدت میں تدریجی احکام و واقعات اور اسباب نزول کا تعین دشوار ہوتا جس کے باعث بہت سے اختلافات پیدا ہوتے۔قرآن کریم میں ناسخ منسوخ، مجمل مبین، عام خاص وغیرہ کا وجود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کا نزول تدریجی ہے۔والد ماجد مولف علوم القرآن مذکورہ تدریجی نزول کی ایک مستند دلیل اس طرح پیش کرتے ہیں: ''قرآن میں ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید، عام و خاص، مبہم ومبین آیات کا وجود اس بات کی تائید کرتا ہے کہ پورا قرآن دفعتاً نازل نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ کسی آیت کا ناسخ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ منسوخ اس سے پہلے موجود ہو جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پورا قرآن یکبارگی نازل نہیں ہوا۔''[۱۵]

مولف علوم القرآن نے تعیین شب قدر کے بارے میں شیخ صدوق کا قول نقل کیا ہے ملاحظہ کیجیے: ''شب قدر ہمارے نزدیک ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی دو راتوں اکیس یا تیئس کی شب کے درمیان مشکوک یا مشترک ہے۔حدیث جہنی کے مطابق راجح یہ ہے کہ وہ تیئس کی شب ہے۔صدوق علیہ الرحمہ اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمام مشائخ کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ تیئیسویں رمضان کی شب ہے جسے شب قدر کہا جاتا ہے۔''[۱۶]

فترت کسے کہتے ہیں: رسول اکرم ہجرت سے ۱۳ رسال قبل ۶۰۹ء میں ۲۷ رجب کو نزول وحی کے بعد مبعوث بہ رسالت ہوئے۔لیکن ایک آسمانی کتاب کے عنوان سے نزول قرآن کا آغاز تین سال کے بعد ہوا۔اس تین سال کے وقفے کو 'فترت' کہتے ہیں۔اس دوران رسول اکرم خفیہ طور پر تبلیغ دین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔یہاں تک کہ ''فاصدع بماتومر'' (آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اسے ڈنکے کی چوٹ پر بیان کردیں۔) آیت نازل ہوئی جس کے بعد آپ نے اعلانیہ تبلیغ شروع کردی۔

مولف علوم القرآن مولانا ارشاد حسین رضوان اللہ علیہ نے اس تین سال کی پوشیدہ تبلیغ سے متعلق درج ذیل دو اقوال نقل کیے ہیں: ''قال الیعقوبی و اقام رسول اللہ بمکۃ ثلث سنین یکتم امرہ''[۱۷] یعقوبی کا قول ہے کہ رسول خدا نے تین سال مکہ میں اس طرح قیام کیا کہ وہ امر تبلیغ کو چھپائے ہوئے تھے۔

محمد بن اسحاق کا قول ہے کہ مبعث کے تین سال بعد ''فاصدع بماتومر'' کا نزول ہوا جس کے بعد آپ نے بالاعلان دعوت تبلیغ شروع کردی اور انذار کو عام کرنے کا حکم دے دیا۔[۱۸]

سبب نزول اور شان نزول میں فرق کیا ہے: شان نزول: جو واقعات و حادثات ماضی، حال یا استقبال میں رونما ہوئے یا ہونے والے ہیں یا جو فرائض و احکام نازل ہوئے یا ہونے والے ہیں، ان سب کے بیان کو شان نزول کہتے ہے۔

سبب نزول: وہ خاص واقعات و حادثات جن کے فوراً بعد کسی آیت یا سورہ کا نزول ہوا ہو اور اس کا تعلق ماضی و حال سے ہو، استقبال سے نہ ہو تو ان واقعات و حادثات کو سبب نزول کہتے ہیں۔

مولف نے شان نزول و سبب نزول کی توضیح کے بعد ذکر کیا ہے: ''اکثر مفسرین کے نزدیک سبب نزول اور شان نزول کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور ان دونوں میں کسی زمانے کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ یہ دونوں مترادف الفاظ ہیں۔''[۱۹]

سورہ کے لغوی و اصطلاحی معنی: سورہ: مولف نے سورہ کے ۳/لغوی معنی بیان کیے ہیں جس کی تلخیص درج ذیل ہے: ۱۔ سؤرہ: مہموز عین ''سؤر'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی باقی ماندہ اور بچے ہوئے کے ہیں۔ اس نظریہ کی بنیاد پر سورہ قرآن کا جز و اور حصہ ہے۔ یہاں سؤرہ میں تخفیف کر کے ہمزہ کو واو سے بدل دیا، سورہ ہو گیا۔ ۲۔ سورہ: اجوف واوی علو مرتبت کے معنی میں ہے کیوں کہ وہ کلام اللہ کی وجہ سے بلند مرتبت ہے۔ ۳۔ سورہ اجوف واوی ہے اور سور البلد سے ماخوذ ہے جس کے معنی فصیل شہر، یا شہر پناہ کے ہیں۔ سورہ اپنی آیات کا احاطہ اس طرح کر لیتا ہے جیسے شہر پناہ کی دیوار شہر کے مکانات کا احاطہ کرتی ہے۔

سورہ کے اصطلاحی معنی: مولف علوم القرآن اس سے متعلق فرماتے ہیں: ''سورہ اصطلاح میں وہ حصۂ قرآن ہے جو کسی آغاز و خاتمہ رکھنے والی آیتوں کو شامل ہو اور کم از کم تین روشن آیتوں کا مجموعہ ہو جس پر سورہ نور کی پہلی آیت دلالت کرتی ہے۔ ''سُورَةٌ أَنزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔'' (سورہ نور، آیت: ۱) یہ ایک سورہ ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے احکام کو فرض کیا ہے اور اس میں چند روشن آیتیں نازل کی ہیں تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔''[۲۰]

سورہ کے استشہاد میں مولف کے ذریعہ پیش کی گئی مذکورہ آیت میں 'آیات بینات' کا ذکر ہے۔ لفظِ آیات جمع ہے اور عربی میں جمع کی دلالت حداقل تین یا اس سے زائد چیزوں پر ہوتی ہے، اسی لیے انھوں نے سورہ کی تعریف میں یہ ذکر کیا ہے کہ (سورہ) کم از کم تین روشن آیتوں کا مجموعہ ہو۔

آیت کے معنی: آیت کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں، جس طرح قصائد ابیات کا مجموعہ

ہوتے ہیں اسی طرح سورے آیات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ہر سورہ کی ہر ایک آیت قرآنی معجزے کا ایک جز ہوتی ہے جو ہمیشہ انسان کو غور وخوض کی دعوت دیتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں بار بار استعمال ہوا ہے کہ "آیات لقوم یعقلون" بالخصوص کائنات کی خلقت اور اس کے نظام کو منظم رکھنے والے کے بارے میں یہ جملہ بہت استعمال ہوا ہے۔ یہ سب اللہ کی آیات یعنی نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو عقل وشعور کی صفت سے متصف ہے۔

مکی ومدنی آیات وسور کی خصوصیات: مکی ومدنی آیات وسور کے تعلق سے تین اصطلاحات مقرر کی گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ جو حصۂ قرآن ہجرتِ مدینہ سے قبل نازل ہوا وہ مکی ہے اور جو حصۂ قرآن ہجرتِ مدینہ کے بعد نازل ہوا وہ مدنی ہے۔ یہاں زمان کو معیار قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر مدینہ پہنچنے سے پہلے راستے میں جو آیات نازل ہوئیں، وہ سب کی سب مکی قرار دی جائیں گی، چاہے مدینہ کے علاوہ جہاں بھی نازل ہوئی ہوں، اور مدینہ پہنچنے کے بعد جو آیات نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں، چاہے فتح مکہ کے بعد خود مکہ میں نازل ہوئی ہوں۔

۲۔ جو لوگ مکان کو معیار قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو آیات یا سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں وہ مکی ہیں اور جو مدینہ میں نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں اور جو ان دونوں مقامات کے علاوہ تیسری جگہ نازل ہوئیں، وہ نہ مکی ہیں نہ مدنی۔ چنانچہ ایسی آیات اور سورتیں محل نزول کی طرف منسوب کی جائیں گی مثلاً سورہ قصص کی آیت ۸۵ جحفہ میں نازل ہوئی جو مدینہ سے پہلے ایک مقام کا نام ہے۔ وہ نہ مکی ہے نہ مدنی بلکہ وہ آیت جحفی ہے۔

۳۔ مکی قرآن کا وہ حصہ ہے جس کے مخاطب اہل مکہ ہیں اور مدنی وہ حصۂ قرآن ہے جس میں اہل مدینہ سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح عبداللہ ابن مسعود کی روایت سے ماخوذ ہے یعنی جس میں ''یَاأَیُّهَا النَّاسُ'' ہو وہ مکی ہے اور جس میں ''یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا'' ہو وہ مدنی ہے۔

زرکشی کہتے ہیں کہ اہل مکہ پر کفر غالب تھا اور اہل مدینہ پر ایمان کا غلبہ تھا، اسی لیے خطاب کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ (مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ قاعدہ استقرائی ہے۔)[۲۱]

حجم کے لحاظ سے سورہ کی اقسام: حجم اور آیات کی تعداد کے لحاظ سے قرآن کریم کے سوروں کو چار انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ سبع طوال: سات طویل سورے۔ ۱۔ بقرہ ۲۔ آل عمران ۳۔ نساء ۴۔ مائدہ ۵۔ انعام ۶۔ اعراف ۷۔ یونس یا کہف۔ مجاہد اور سعید کا قول ہے کہ ساتواں سورہ یونس ہے اور حاکم کی ایک روایت میں ذکر ہوا ہے کہ ساتواں سورہ کہف ہے۔

۲۔ مئین: اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر سورہ میں ایک سو سے زیادہ آیات ہیں جیسے توبہ، نحل، یوسف، ھود، طٰہٰ، انبیا وغیرہ جن کا حجم طوال سے کم ہے۔ ایسے سوروں کی تعداد بارہ ہے۔ ۳۔ مثانی: ایسے سورے جن کی آیات سو سے کم ہیں، تکرار تلاوت کی وجہ سے انھیں مثانی کہا جاتا ہے۔ بعض دفعہ مثانی کا اطلاق پورے قرآن پر اور بعض دفعہ سورہ فاتحہ پر ہوتا ہے۔ ایک قول ہے کہ یہ سورے طوال اور مئین کے مقابلے میں بہت زیادہ دہرائے جاتے ہیں، لہٰذا انھیں مثانی کہتے ہیں۔ ایک قول کی بنیاد پر ان سوروں میں عبرت انگیز قصص واخبار کے ساتھ امثال کو مکرر بیان کیا گیا ہے لہٰذا اسے مثانی کہتے ہیں۔ ۴۔ مفصل: قرآن کریم کے آخری چھوٹے سوروں کو کہتے ہیں جن کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا فاصلہ ہے۔

مولف علوم القرآن نے ۸۶ سوروں کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ مکی سورے ہیں، ۲۸ سوروں کو تفصیلات کے ساتھ مدنی سورہ قرار دیا ہے اور ۴۲ سورے ایسے ہیں جن کے دو یا دو سے زائد نام ہیں۔ ان میں صرف دو سوروں کے متعدد نام یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ ۱۔ فاتحہ: ۱۔ فاتحۃ الکتاب ۲۔ ام الکتاب ۳۔ سبع مثانی ۴۔ ام القرآن ۵۔ الوافیہ ۶۔ الکنز ۷۔ الکافیہ ۸۔ الاساس ۹۔ نور ۱۰۔ الشکر ۱۱۔ الصلوٰۃ ۱۲۔ دعا ۱۳۔ سؤال ۱۴۔ مناجات ۱۵۔ تفویض۔ ۲۔ البراءۃ: ۱۔ توبہ ۲۔ سورۃ الفاضحہ ۳۔ سورۃ العذاب ۴۔ مقشقشہ ۵۔ براءۃ المنقرہ ۶۔ بحوث ۷۔ الحافرہ ۸۔ المبیثرہ ۹۔ المخزیہ ۱۰۔ المنکلہ ۱۱۔ المشردہ ۱۲۔ المدمدۃ۔

سب سے پہلے نازل ہونے والا سورہ کون ہے؟ کون سا سورہ سب سے پہلے نازل ہوا ہے؟ اس کے بارے میں علما و محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولف نے متعدد حوالوں کے ساتھ مفصل طور پر تین اقوال نقل کیے ہیں۔ قول اول: سب سے پہلے سورہ ''اقرأ'' کی ابتدائی تین یا پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ رسول اکرم پابندی کے ساتھ غار حرا میں عبادت کے لیے جایا کرتے تھے۔ ایک دن جبرئیل امین نازل ہوئے اور کہا کہ ''اقرأ'' پڑھو، آپ نے فرمایا کہ کیا پڑھوں؟ اس پر جبرئیل نے علق کی پانچ آیتیں سنائیں۔ مولف نے اس مفہوم کے لیے کہ سب سے پہلے سورہ ''اقرأ'' کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں اتقان، مروج الذھب اور الکافی کی روایتیں بیان کی ہیں۔ یہاں پر صرف الکافی کی روایت نقل کی جاتی ہے: ''امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ سب سے پہلا سورہ جو رسول اللہؐ پر نازل ہوا وہ **''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اقرأ باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ و ربک الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم''** ہے اور آخر میں جو سورہ آپ پر نازل ہوا وہ ''اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ'' ہے۔''[۲۲]

سورہ علق کے اول سورہ ہونے کے تعلق سے شیعہ وسنی کی کئی روایتیں پیش کی گئی ہیں۔ اس کے

علاوہ بھی متعدد دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سورہ اقرأ سب سے پہلے نازل ہوا۔

قول دوم: دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے سورہ مدثر نازل ہوا۔اس قول کی دلیل میں اتقان اور صحیح مسلم کے حوالے سے جناب جابر بن عبداللہ سے روایت نقل کی گئی ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ سب سے پہلے نازل ہونے والا سورہ، مدثر ہے۔اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اکرم غار حرا کی عبادت کے بعد جب شہر کی جانب روانہ ہوئے تو وادی کے وسط میں ناگاہ جبرئیل امین نظر آئے۔ان کو دیکھ کر رسول اکرم پر لرزہ طاری ہوا، انھوں نے جناب خدیجہ کے پاس آ کر لوگوں کو حکم دیا کہ مجھے چادر اڑھادو، چادر اڑھائی گئی پھر اللہ نے "**یاایھا المدثر قم فانذر**" کا سورہ نازل فرمایا۔مزید تفصیل کے لیے اتقان، ج ا، ص ۳۲، مطبع دار المعرفۃ بیروت لبنان؛ صحیح مسلم، ج ا، ص ۹۹، کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

مولف علوم القرآن نے نقل کیا ہے: اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ جلال الدین سیوطی نے یہ بات کہی ہے کہ جابر بن عبداللہ نے اس حدیث میں المدثر کو رسول اللہ پر نازل ہونے والا پہلا سورہ قرار دیا ہے۔درحقیقت یہ حدیث فترت وحی کے بعد کی ہے جسے جناب جابر نے آغاز وحی گمان کر لیا ہے۔[۲۳]

قول سوم: تیسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے نازل ہونے والا سورہ، سورہ فاتحہ ہے۔مولف علوم القرآن نے اتقان، ج ا، ص ۳۲۔ ۳۳، مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۴۰۵، اسباب النزول للواحدی، ص ۱۱، سے اس نظریہ پر روایات نقل کر کے استناد فرمایا ہے۔طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے یہاں فقط مجمع البیان کی روایت پیش خدمت ہے:

> ''علامہ طبرسی نے استاد احمد بن زاہد سے کتاب ''الایضاح'' میں روایت کی ہے۔سعید بن مسیب کی یہ روایت علی بن ابی طالب سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے ثواب قرآن کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے ایک ایک سورہ کا ثواب اس ترتیب کے ساتھ بیان کیا جیسے آسمان سے نازل ہوا تھا پس پہلا سورہ جو آپ پر مکہ میں نازل ہوا وہ سورۂ فاتحۃ الکتاب ہے، پھر اقرأ باسم ربک پھر نون والقلم۔''[۲۴]

"**لاصلوٰۃ الّا بفاتحۃ الکتاب**" کی حدیث تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے کہ بغیر سورہ فاتحہ کے کوئی نماز قائم نہیں ہو سکتی اور یہ بات ثابت ہے کہ روز بعثت سے ہی رسول اکرمؐ نماز ادا کرتے تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ سب سے پہلے سورہ فاتحہ کا نزول ہوا، اسی لیے کتاب اللہ کے شروع میں اسے رکھا گیا ہے اور اسے فاتحۃ الکتاب کا نام دیا گیا ہے۔

مولف علوم القرآن کا یہ درست خیال ہے کہ یہ تینوں سورے جن کی قبلیت میں اختلاف ہے۔ان سب کے بارے میں وافر دلیلیں موجود ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ ان تینوں سوروں کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آیت تسمیہ کا نزول ہوا۔اس کے بعد سورہ کے اعتبار سے یہ مشہور ہے ''اقرأ'' کی پانچ آیتیں **"مالم یعلم"** تک شب قدر میں سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ پھر تین سال تک فترت وحی کا زمانہ رہا جس میں وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔فترت کے بعد مدثر نازل ہوا۔ پھر سورہ فاتحہ کا نزول ہوا جس کے بعد نماز کا حکم آیا۔پہلی نماز بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ادا کی گئی جس کی نوعیت یہ تھی کہ رسول اکرمؐ کے دائیں جانب حضرت علیؑ، بائیں جانب جعفر بن ابی طالب اور زید بن حارثہ اور عقب میں جناب خدیجہؑ نماز میں مصروف تھیں۔ان پانچ افراد پر مشتمل پہلی نماز کی تشکیل عمل میں آئی۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ علق کی پانچ آیتوں کے علاوہ باقی آیتیں کب نازل ہوئیں؟ ایک قول کے مطابق وہ کئی سال بعد نازل ہوئیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ فترت وحی کے تین سال گزرنے کے بعد کئی سورے نازل ہوئے، اس کے بعد سورہ علق کی باقی آیتوں کا نزول ہوا تو یہ بات صحت سے قریب ہوگی۔ بہرحال چوں کہ سورہ علق کی پانچ آیات کا نزول سب سے پہلے ہو گیا تھا لہٰذا سورہ علق ہی کو پہلا سورہ قرار دیا جائے گا، خواہ بعد کی آیات کا نزول جب بھی ہوا ہو۔

سب سے آخر میں نازل ہونے والا سورہ یا آیت کون ہے؟ اس سے متعلق چار اقوال ہیں۔

قول اول: سب سے آخر میں سورہ نصر نازل ہوا۔الکافی کی حدیث ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ سب سے آخری سورہ جو نبی اکرمؐ پر نازل ہوا وہ سورہ نصر ہے۔[۲۵]

قول دوم: سب سے آخر میں جس سورہ کا نزول ہوا ہے وہ سورہ براءۃ ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ آخری سورہ جو نازل ہوا وہ سورہ براءۃ ہے۔ یہ فتح مکہ کے بعد نویں صدی ہجری میں نازل ہوا جب آپ غزوہ تبوک سے واپس ہو رہے تھے، سورہ براءۃ کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں جنھیں نبی اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ گروہ مشرکین کو پڑھ کر سنائیں۔ نبی کو حکم خدا تھا کہ آپ ان آیتوں کو مشرکین کے سامنے پڑھیں یا اس کو بھیجیں جو آپ میں سے ہو۔[۲۶]

قول سوم: مروی ہے کہ آخری آیت جو نازل ہوئی وہ **وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ** (سورہ البقرہ، آیت:۲۸۱) ہے۔(ترجمہ) اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کی طرف پلٹائے جاؤ گے اور ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ جبرئیل یہ آیت لے کر آئے اور کہا کہ اسے سورہ بقرہ کی دو سو اسی آیت کے اوپر لکھو۔رسول خدا اس

کے بعد اکیس دن اور ایک قول کی بنا پر سات دن زندہ رہے۔[۲۷] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخری آیت "واتقوا یوماً" ہے۔

قول چہارم: آخری آیت، آیۂ اکمال ہے۔ ابن واضع یعقوبی کا قول ہے کہ آخری آیت جو نبیؐ پر نازل ہوئی وہ اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِي وَرَضِیتُ لَکُمُ الإِسْلاَمَ دِیناً۔" (مائدہ، ۳) ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے اور صراحت کے ساتھ ثابت ہے کہ اس آیت کا نزول اس دن ہوا جب غدیر خم میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی ولایت پر نص وارد ہوئی۔[۲۸]

مولف نے یعقوبی کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ آیہ اکملت میں اکمال دین کا اعلان ہے، لہٰذا یہی آیت تبلیغ اور انذار کی آخری آیت قرار دی جاسکتی ہے۔

حدیث سبعۃ احرف کی حقیقت: حدیث "سبعۃ احرف" سے متعلق مختلف معانی ومطالب بیان کیے گئے ہیں۔ ایک قول کے مطابق سات حروف سے سات لغات یا لہجات مراد ہیں۔ ایک نظریے کے مطابق اس سے سات بطون مراد ہیں اور کوئی اس سے سات قسم کے فنون کلام مراد لیتا ہے۔ بعض سبعۃ احرف سے نہی، امر، حلال، حرام، محکم، متشابہ اور امثال مراد لیتے ہیں۔ جب کہ بعض دیگر اس سے امر، نہی، رغبت، خوف، جنگ، جہاد اور قصے مراد لیتے ہیں۔ مولف علوم القرآن نے اس کے بارے میں اہل سنت اور اہل بیت کی تین تین روایات نقل کی ہیں۔ اس کے بعد امام خوئی کا نظریہ بیان کیا ہے، انھوں نے ان روایات کے بارے میں بیان کیا ہے کہ احادیث اہل بیت کے ضمن میں جتنی روایات مذکور ہوئیں ان میں کوئی نہ کوئی کمی موجود ہے۔ پہلی روایت مرسل ہے، دوسری روایت میں ایک راوی مجہول ہے اور تیسری روایت میں ایک راوی غالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام خوئی اور شیخ بلاغی نے فرمایا ہے کہ ان روایات کی سندیں وثاقت کے ساتھ ثابت نہیں ہیں لہٰذا "سبعۃ احرف" کی حدیث میں اشکال ہے۔

سبعۃ احرف کے ذریعہ کلمات قرآن میں تبدیلی کا جواز پیدا نہیں ہوسکتا۔ ظاہری بات ہے کہ قرآن کا نزول صرف ایک خاص کلمہ کے ساتھ ہوا ہے۔ اگر اس کلمہ کو مختلف کلمات کے ساتھ پڑھا جائے تو اعجاز قرآن پر حرف آجائے گا اور اس کی فصاحت وبلاغت بھی مجروح ہوجائے گی کیوں کہ پورا قرآن بطور اعجاز و تحدی نازل ہوا ہے۔ سبعۃ احرف کے ضمن میں مولف نے امام خوئی رضوان اللہ علیہ کی تالیف البیان سے ایک روایت نقل کی ہے، ملاحظہ کیجیے: "ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے براء بن عاذب کو ایک دعا تعلیم فرمائی جس کے الفاظ یہ تھے "ونبیک الذی ارسلت" براء نے اس کی جگہ "ورسولک الذی ارسلت" پڑھا تو پیغمبر نے حکم دیا کہ تم نبی کی جگہ رسول کو نہ رکھو اور جیسے تم کو بتایا گیا ہے ویسے ہی پڑھو۔ امام

ابوالقاسم الخوئی اس موقع پر فرماتے ہیں کہ جب رسول اکرمؐ نے دعا میں اتنی احتیاط برتی ہے تو وہ قرآن میں کس قدر احتیاط سے کام لیں گے جب کہ وہ ہمیشہ کے لیے اللہ کا کلام منزل ہے۔''[۲۹]

البتہ مجبوری کے عالم میں کیسے پڑھا جائے، ایک عجمی جو درست پڑھنے پر قادر نہ ہو وہ کیسے پڑھے، اس سے متعلق حضور اکرم کی ایک حدیث ہے ''**انّ الرجل الاعجمی من امتی لیقرء القرآن بعجمیته فترفعه الملائکة علی عربیته**'' [۳۰] اگر میری امت کا کوئی عجمی قرآن کو اپنی عجمیت کے ساتھ پڑھتا ہے تو ملائکہ اسے اس کی عربیت کے ساتھ بلند کرتے ہیں۔ چوں کہ خداوند متعال اپنے کسی بندے کو تکلیف مالایطاق نہیں دیتا یعنی ایسا حکم جس کی بندہ طاقت نہیں رکھتا، اس کی انجام دہی کو لازم قرار نہیں دیتا، لہٰذا حدیث مذکور ایسے عجمی افراد کے لیے جو عربی کا درست تلفظ کرنے سے قاصر ہیں، لطف پروردگار ہے۔

یہاں مولف کا نظریہ ملاحظہ کیجیے: غور طلب بات ہے کہ عرضۂ اخیرہ یعنی جبرئیل امین کے ساتھ رسول اکرم کے آخری دور کے وقت تمام کلمات قرآنی متعین ہو چکے تھے بلکہ یہ کہوں کہ نزول کے مطابق طے ہو چکے تھے اور مترادف الفاظ کے استعمال کی اجازت بھی ختم ہو چکی تھی تو پھر قرّاء سبعہ ہوں یا عشرہ یا اربعۃ عشریہ سب دوصدی یا اس کے بعد پیدا ہوئے اس لیے حدیث ''سبعۃ احرف'' میں قرّاء سبعہ کی قرأت مراد نہیں لی جاسکتی۔[۳۱]

قرّاء سبعہ: ابن مجاہد کی کتاب ''السبعہ'' میں ساتوں قرّاء اور ان کے راویوں کی جو تفصیل درج ہے، یہاں پیش کی جاتی ہے:

۱۔عبداللہ بن عامر یحصبی (قاری شام) ت: ۱۱۸ھ۔ان کے دونوں راوی ہشام بن عمار اور ابن ذکوان ہیں۔ان دونوں نے ان کا زمانہ نہیں پایا اس لیے کہ ہشام، ابن عامر کی وفات کے پینتیس سال بعد ۱۵۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۵ھ میں وفات پائی۔ابن ذکوان پچپن سال بعد ۱۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۲ھ میں وفات پائی۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلا واسطہ براہ راست ابن عامر سے روایت نہیں کر سکے تو بالواسطہ اس سے روایت کی۔

۲۔عبداللہ بن کثیر الدارمی (قاری مکہ) ت ۱۲۰ھ۔ان کے دونوں راوی بزّی اور قنبل ہیں۔ان دونوں نے بھی ابن کثیر کا زمانہ نہیں پایا اس لیے کہ بزّی ابن کثیر کی وفات کے پچاس سال بعد ۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۰ھ میں وفات پائی۔اور قنبل پچہتّر سال بعد ۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۹۱ھ میں وفات پائی۔اس طرح ان کے دونوں راویوں نے بالواسطہ ان سے روایت کی ہے، براہ راست روایت نہ کر سکے۔

۳۔عاصم بن ابی النجود الاسدی (قاری کوفہ) ت ۱۲۸ھ۔ان کے دونوں راویوں نے ابی النجود کا

زمانہ پایا اور ان سے براہ راست روایت کی ہے۔ ا۔ حفص بن سلیمان (ربیبہ) ولادت ۹۰ھ اور وفات: ۱۸۰ھ، ۲۔ ابوبکر شعبہ بن عیاش ولادت ۹۵ھ اور وفات ۱۹۳ھ، قرأت عاصم کے تعلق سے حفص زیادہ مضبوط ہیں۔ پوری دنیا میں حفص کی قرأت کثرت سے رائج ہے۔

۴۔ ابوعمرو زبان بن علاء المازنی (قاری بصرہ) ت ۱۵۴ھ۔ ان کے دونوں راوی ا۔ حفص بن عمر الدوری متوفی ۲۴۶ھ، ۲۔ صالح بن زیاد السوسی متوفی ۲۶۱ھ، ان دونوں نے بھی ابن علاء المازنی کا زمانہ نہیں پایا ان دونوں نے یزیدی کے واسطے سے ان سے روایت کی ہے۔

۵۔ حمزہ بن حبیب الزیات (قاری کوفہ ایضاً) ت ۱۵۶ھ۔ ان کے دونوں راوی ا۔ خلف بن ہشام بزاز (۱۵۰ھ۔۲۲۹ھ) ۲۔ خلاد بن خالد شیبانی (ت ۲۲۰ھ) ان دونوں نے بالواسطہ ان سے روایت کی ہے۔

۶۔ نافع بن عبدالرحمٰن اللیثی (قاری مدینہ) ت ۱۶۹ھ۔ ان کے راوی ا۔ قالون ربیب نافع ان کا نام عیسیٰ بن مینا ء ہے (۱۲۰ھ۔۲۲۰ھ) ۲۔ ورش عثمان بن سعید (۱۱۰ھ۔۱۹۷ھ)۔

۷۔ علی بن حمزہ کسائی (قاری کوفہ ایضاً) ت ۱۸۹ھ۔ ان کے راوی ا۔ لیث بن خالد بغدادی (متوفی ۲۴۰ھ) ۲۔ حفص بن عمر الدوری (ت ۲۴۶ھ) یہ ابوعمر مازنی کے بھی راوی ہیں۔

مولف علوم القرآن نے سات قاریوں کے مذہبی نظریات سے متعلق ذکر کیا ہے کہ قرّاء سبعہ میں سے چار کا شیعہ اہل بیت سے ہونا متیقن ہے۔ ا۔ عاصم بن ابی النجود ۲۔ ابوعمرو زبان بن العلاء المازنی ۳۔ حمزہ بن حبیب ۴۔ علی بن حمزہ کسائی اور ایک شیعہ معاویہ تھا ابن عامر جو کذب وفسق سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔ ابن کثیر المکی اور نافع المدنی کے حالات پوشیدہ ہیں۔ ان کے بارے میں صرف یقینی اطلاع یہ ہے کہ وہ فارس سے تعلق رکھتے تھے اس بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کا مذہب بھی مذہب اہل بیت رہا ہوگا مگر یقینی طور پر ان کے مذہب کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ [۳۲]

تقریباً اسی مفہوم کا بیان تعلیم علوم قرآن میں بھی موجود ہے، ملاحظہ کیجیے: ''عاصم، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی صریحاً اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ ابن کثیر اور نافع بھی ایرانی ہونے کے سبب احتمالاً شیعہ تھے۔ لیکن ابن عامر بنی امیہ کا پروردہ لاابالی اور ناکارہ تھا۔'' [۳۳]

قرّاء سبعہ میں حفص فن قرأت کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے جس کے باعث تمام قاریوں میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ان کی قرأت کے معتبر ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ حفص نے اپنے استاد عاصم کی قرأت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اسی طرح عاصم نے اپنے استاد ابوعبدالرحمٰن سلمی کی قرأت کو عام کیا اور اس میں کوئی ردو بدل نہیں کی اور سلّمی نے بابائے قرأت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی قرأت کو

ہو بہو بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے رواج دیا۔ اس پاکیزہ سلسلے کی برکت سے پوری دنیا میں یہ قرأت مشہور ہوئی مگر چوں کہ اس راہ میں سب سے زیادہ کوشش عاصم کے ربیبہ حفص نے کی، اس لیے اسے قرأت حفص کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

قرأت کے معنی اور اختلاف قرأت کے اسباب: قرأت کے معنی لغت میں پڑھنے کے ہیں اور اصطلاح میں قرأت اس تلاوت کو کہتے ہیں جو معروف قاریوں میں سے کسی ایک کے مطابق ہو اور علم تجوید و قرأت کے پیمانے پر پوری اترتی ہو۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ قرأت یہ ہے کہ حروف کو ان کے صحیح مخارج سے ادا کیا جائے۔ منصوص من اللہ صرف ایک قرأت ہے جس میں رسول اللہ تلاوت قرآن کریم کیا کرتے تھے۔ کفار قریش اس کو پوشیدہ طور پر سنا کرتے تھے۔ وہ خود تو اسے سنتے تھے مگر دوسروں کو سننے سے روکتے تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے قرأت کی عظمت بیان کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ قرآن ایک ہے اور ایک خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، قرآن کے سلسلے میں اختلاف راویوں اور قاریوں کی طرف سے پیدا ہوا ہے۔ [۳۴]

منصوص من اللہ قرأت تک رسائی کے نام پر قرّاء اجتہاد اور سعی و کوشش میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس اجتہاد میں مختلف قرأتوں نے جنم لیا، جب اختلاف قرأت شدید ہو گیا تو تحریف کے خوف سے اتحاد کی صورت نکالی گئی۔ سب سے پہلے ابوعبید قاسم بن سلام انصاری (متوفی: ۲۲۴ھ) نے قرأت کے اصول و ضوابط مقرر کرنے کے لیے صحیح قرأتوں کو جمع کر کے ایک ضخیم کتاب تالیف دی۔ ابن مجاہد نے ان قرأتوں کو سات قاریوں میں محدود کر دیا اور اس کے لیے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام السبعہ رکھا۔

متواتر قرأت کے لیے تین شرطیں لازم قرار دی جاتی ہیں۔ ۱۔ وہ قرأت موجودہ قرآن کے مطابق ہو۔ ۲۔ وہ قرأت عقل و شرع کے عین مطابق ہو۔ ۳۔ عربی زبان کے معیاری اصول و قواعد سے میل کھاتی ہو۔ قرأت حفص میں یہ تمام شرائط موجود ہیں۔ لہٰذا یہ قرأت متواتر اور معروف ہے۔ مولف علوم قرآن نے بیان کیا ہے کہ قرّاء سبعہ سے حدیث سبعۃ احرف کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس مفہوم پر حدیث سے استدلال پیش کیا ہے اور قرأت میں اختلاف کے دس مواقع بھی ذکر کیے ہیں۔ اس کتاب میں مولف کا طرز بیان ایسا ہے کہ وہ جس بحث کو شروع کرتے ہیں سب سے پہلے اس لفظ کے لغوی معنی بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے اصطلاحی معنی ذکر کرتے ہیں۔ پھر اس کے سلسلے میں عقلی، تاریخی یا قرآنی استشہاد کے توسط سے مدلل بحث کرتے ہیں۔ ان کی روش تحریر سادہ، سلیس، جاذب اور دل نشیں ہے۔

جمع القرآن: حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے کہ قرآن تین مرتبہ جمع کیا گیا ہے۔ پہلی مرتبہ

رسول اکرم کی موجودگی میں جمع کیا گیا۔ دوسری مرتبہ حضرت ابوبکر کے زمانے میں جمع قرآن کا کام انجام دیا گیا اور تیسری مرتبہ حضرت عثمان کے عہد میں جمع قرآن کا عمل انجام دیا گیا۔

مورخین و محققین کے قول کے مطابق کتابت وحی کا کام زیادہ تر علی ابن ابی طالب، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن ارقم زہری کے سپرد تھا۔ ان کے علاوہ دیگر کاتبین کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ کاتبین وحی میں چالیس سے زائد افراد شامل تھے جن سے رسول اکرم بعض اوقات کتابت کا کام لے لیا کرتے تھے۔ مولف علوم القرآن نے چند چیزوں کا ذکر کیا ہے جن پر عہد پیغمبر میں کاتبین وحی حکم رسول سے قرآن کی آیات رقم کرتے تھے۔

۱۔ عُسُب: عسیب کی جمع، کھجور کی شاخ کو پتوں سے صاف کر کے اس پر کتابت کا کام انجام دیا جاتا تھا؛ ۲۔ لخاف: لخفہ کی جمع، سفید باریک پتھر، عموماً سفید پتھروں کی باریک سلیں ہوا کرتی تھیں جن پر قرآن کی آیات کو تحریر کیا جاتا تھا؛ ۳۔ اُدُم: ادیم کی جمع، جانوروں کی کھالوں کو صاف کر کے کتابت کے لائق بنایا جاتا تھا اور ان پر آیتیں لکھی جاتی تھیں؛ ۴۔ رقاع: رقعہ کی جمع، کاغذ کے ٹکڑوں اور پتوں پر کتابت کی جاتی تھی؛ ۵۔ ثیاب: ثوب کی جمع، کپڑوں بالخصوص کپڑے کی خولوں پر قرآن لکھ کر محفوظ کر لیا جاتا تھا؛ ۶۔ اقتاب: قتب کی جمع، اونٹ کی کاٹھیاں یعنی کجاوے کتابت قرآن کے لیے استعمال کیے جاتے تھے؛ ۷۔ اکتاف: کتف کی جمع، شانوں کی ہڈیوں پر بھی قرآن کی آیات لکھی جاتی تھیں۔

غرض جس چیز پر بھی کتابت ممکن تھی اس پر آیات قرآنی تحریر کر کے محفوظ کر لی جاتی تھیں اور وہ تمام تحریریں رسول اکرمؐ کی تحویل میں ہوتی تھیں۔ آیتوں کی ترتیب و تنظیم حکم رسول سے ان کی نگرانی میں انجام پاتی تھی اسے اصطلاح میں توقیفی کہا جاتا ہے۔ بعض بزرگ صحابہ جو آپ کے کاتبین میں سے تھے، اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن بھی اپنے پاس رکھتے تھے۔ جو آیات و سور ان کے پاس موجود نہیں ہوتی تھیں وہ رسالت مآب سے اجازت لے کر ان محفوظ نسخوں سے نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس بھی منتشر قرآن جمع ہو جایا کرتا تھا۔ [۳۵]

عہد رسالت میں جمع قرآن: مولف علوم القرآن نے عہد رسالت میں قرآن کے کتابی شکل میں موجود ہونے کی روایات سے چار دلیلیں پیش کی ہیں۔ یہاں پر صرف ایک روایت بیان کی جاتی ہے۔ رسول اکرمؐ نے وقت وفات قلم، دوات اور قرطاس کا مطالبہ کیا تھا تاکہ وہ ایسا نوشتہ تحریر کر دیں جس کے بعد امت کبھی گمراہ نہ ہو۔ اس وقت ایک بزرگ صحابی نے کہا تھا کہ ہمیں کسی نوشتہ کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے۔ اگر عہد رسول اکرم میں قرآن کریم صحیفہ کی شکل میں موجود نہ ہوتا تو اس کو کتاب خدا

کہہ کر اس کی کفایت کا دعویٰ نہ کیا جاتا۔

خلافت اولیٰ میں جمع قرآن: مولف علوم القرآن نے اس سلسلے میں الاتقان سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ جنگ یمامہ کے بعد ایک روز حضرت ابوبکر نے زید بن ثابت کو بلایا، وہاں حضرت عمر بھی موجود تھے۔ جب زید خدمت میں حاضر ہوئے تو ابوبکر نے ان سے فرمایا کہ جنگ یمامہ میں متعدد حفاظ کرام کی شہادت کے بعد خطرہ لاحق ہوگیا کہ اگر اسی طرح کے اور واقعات رونما ہوگئے تو کہیں قرآن کریم کا کچھ حصہ ضائع نہ ہوجائے، اس لیے لازم ہے کہ جمع قرآن کا کام انجام دیا جائے اور تم غیر متہم، عقلمند نوجوان ہو، رسول خداؐ کے کاتب بھی رہ چکے ہو، اس لیے تم اس کام کو بخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہو۔ قرآن کی آیتوں کو معلوم کر کے انھیں جمع کرنے کا کام شروع کردو۔ حفاظت قرآن کے لیے یہ قدم اٹھانا نہایت ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ زید نے اسے قبول کرلیا اور صحابۂ کرام کی مدد سے یہ کام انجام دیا۔ پہلے چند صحابہ کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، اس کے بعد عام اعلان ہوگیا کہ جس کے پاس جتنا قرآن موجود ہے وہ مسجد میں اس کمیٹی کے سامنے لاکر حاضر کرے۔ لوگ مسجد میں آتے اور ان کے پاس جتنی آیتیں یا سورتیں موجود ہوتیں وہ لاکر پیش کرتے۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔ جناب زید نے نہایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے قرآن کو جمع کیا۔ اس طرح دور خلافت اولیٰ میں بھی جناب زید بن ثابت کے ذریعہ قرآن کو جمع کیا گیا اور جمع قرآن صرف عہد خلافت ثالثہ سے مخصوص نہیں ہے۔

خلافت ثالثہ میں جمع قرآن: مولف علوم القرآن نے الاتقان سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ ملاحظہ کیجیے۔ حذیفہ یمانی آرمینیا اور آذربائیجان کی فتوحات میں اہل شام اور اہل عراق کے ساتھ مل کر محاذ آرائی میں مصروف تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان دونوں ملکوں (عراق وشام) کے مسلمانوں کے مابین قرأت قرآن سے متعلق سخت اختلاف واقع ہوگیا ہے۔ ایک قول کے مطابق دونوں کے درمیان شمشیر زنی کی باری آگئی تھی۔ حذیفہ کو سخت تشویش لاحق ہوئی اور واپسی کے بعد انھوں نے حضرت عثمان کو صورت حال کی اطلاع دی اور یہ مفید مشورہ دیا کہ اس سے پہلے کہ امت مسلمہ یہود ونصاریٰ کی طرح سخت اختلاف کا شکار ہوجائے آپ تمام بلاد اسلامی میں ایک مصحف کو نافذ کردیجیے۔ انھوں نے مشورہ کو سنجیدگی سے لیا اور زعمائے مدینہ کا ایک جلسہ منعقد کر کے ابی بن کعب کی سربراہی میں اس کام کی انجام دہی کے لیے ایک حکم صادر کردیا۔ حضرت عثمان نے چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی۔ جس میں زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث کے نام شامل تھے۔ حضرت حفصہ کے پاس زید کا جمع کیا ہوا مصحف بحفاظت موجود تھا، اس کو واپسی کی شرط کے ساتھ ان کے پاس سے منگوایا اور ان چاروں

افراد کو نقل نسخہ پر مامور کر دیا۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ اگر تمہارے درمیان کسی لفظ میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان میں رکھنا کیوں کہ قرآن کریم قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ جب لفظ تابوت کے لکھنے کی باری آئی تو زید نے کہا کہ اسے گول تا کے ساتھ لکھا جائے، ان کے علاوہ باقی تینوں افراد کا تعلق قریش سے تھا اس لیے ان کے اصرار پر تابوت کو لمبی تا کے ساتھ لکھا گیا۔ چنانچہ پانچ یا سات نسخے تیار کیے گئے۔ ان میں سے ایک ایک مصحف مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ ارسال کر دیا گیا اس تاکید کے ساتھ کہ باقی تمام مصاحف ضائع کر دیئے جائیں تا کہ قرأت کا اختلاف رفع ہو جائے اور ایک نسخہ مدینہ میں اپنے پاس بحفاظت رکھا۔ یہ وہی قرآن ہے جو چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی بغیر کسی تبدیلی کے ہمارے درمیان اسی طرح باقی ہے۔

حضرت علیؑ کا جمع قرآن: یوں تو کاتبین وحی کی تعداد اچھی خاصی تھی مگر حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی، رسول اکرمؐ مجھے املا کراتے اور اگر میں موجود نہ رہتا تو اسے دوسرے کاتب سے لکھوا لیتے۔ میرے آنے کے بعد دوبارہ مجھے املا کراتے۔ اس طرح ترتیب نزول کا میں نے ہمیشہ خیال رکھا اور وفات رسول کے بعد اسی انداز سے میں نے قرآن کو جمع کیا۔ اس میں کچھ مبہم مقامات کی شرحیں تھیں، اسباب نزول کا تفصیلی بیان تھا۔ اس طرح آپ نے اس عمدہ اور انوکھے طرز پر جمع قرآن کی تکمیل کی۔ یہ کام آپ نے چھ مہینے کی مدت میں انجام دیا، اس دوران نماز کے علاوہ کبھی ردا سر پر نہیں ڈالی۔[۳۶]

کلبی کہتا ہے کہ جب رسول اللہؐ کی وفات ہوگئی تو علی ابن ابی طالب اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور قرآن کو اس کی ترتیب نزول کے اعتبار سے جمع کیا۔ اگر وہ مصحف موجود ہوتا تو اس میں علم کبیر پایا جاتا۔[۳۷]

مولف علوم القرآن مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ نے محکم و متشابہ کی تعیین کے لیے ۱۴/اقوال نقل کیے ہیں۔ ان میں سے چند بیان کیے جاتے ہیں: ۱۔ جن آیات کی مراد صاف طور پر معلوم ہو جائے وہ محکم ہیں اور جو آیات بغیر تاویل کے سمجھ میں نہ آئیں وہ متشابہ ہیں۔ ۲۔ جس کے معنی عقل میں آتے ہوں وہ محکم ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ متشابہ ہے۔ ۳۔ محکمات ام الکتاب ہیں اور متشابہات میں محکمات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ ۴۔ محکمات وہ آیات ہیں جو منسوخ نہیں ہوتی ہیں اور متشابہ آیات میں منسوخ آیات بھی شامل ہیں۔ ۵۔ حروف مقطعات، متشابہات ہیں جن کا علم اللہ، رسول اور خاصان خدا کو ہے جنھیں قرآن کی اصطلاح میں راسخون فی العلم کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد مولف نے بارہ متشابہ آیتیں ذکر کی ہیں۔ یہاں پر صرف دو متشابہ آیتیں بیان کی جاتی ہیں: ۱۔ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى (سورہ طہ، آیت: ۵) ترجمہ: رحمٰن عرش پر حکمران ہے۔ ۲۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (سورہ قصص، آیت: ۸۸) ترجمہ: اس کی ذات

کے سوا ہر شے فنا پذیر ہے۔

مولف نے ناسخ و منسوخ کی تفصیلات بیان کی ہیں اور واضح کیا ہے کہ آیہ نجویٰ منسوخ آیت ہے۔ حروف مقطعات سے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ یہ بھی متشابہات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا علم صرف اللہ، رسول اور راسخون فی العلم کے پاس ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں امثال کا ذکر موجود ہے جیسے **لیس للانسان الاماسعیٰ** (سورہ نجم، آیت: ۳۹) ترجمہ: انسان کا حق بس اتنا ہی ہے جتنی اس نے کوشش کی ہے۔ **لااکراہ فی الدین** (سورہ بقرہ، آیت: ۲۵۶) ترجمہ: دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

مجمل اسے کہتے ہیں جس کی دلالت واضح نہ ہو اور مبین اس کا برعکس ہے۔ مولف نے قرآن کریم میں تشبیہ، مجاز، استعارہ، کنایہ، عام، خاص، مطلق اور مقید وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں اور ہر ایک کے لیے بطور شاہد مثال آیات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس دوران ان کا جا بجا منطقی استدلال قابل غور و فکر ہے۔

والد ماجد، استاذ الاساتذہ مولانا ارشاد حسین مرحوم نے تصنیف و تالیف کے میدان میں ہمیں گراں بہا سرمایہ عطا کیا ہے جس کی تبیین برادرم ڈاکٹر فیضان حیدر نے عمدہ اور مناسب انداز میں کر دی ہے، تکرار اور طوالت سے احتراز کرتے ہوئے اسے ترک کرتا ہوں۔ وہ شعر و شاعری کی اساس عروض و قوافی سے بخوبی واقف تھے اور علم و عمل کے پیکر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں افکار کی بلندی، خیالات کی پاکیزگی اور بیان کی شیرینی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے تراجم، تقاریظ اور مضامین پُر مغز اور دل کش مفاہیم پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان سب کے باوجود ان کا اصل کارنامہ درس و تدریس اور طلبہ نوازی ہے، جس کی خدمت میں انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ افسوس کہ انھوں نے ۱۴/اپریل ۲۰۲۵ء کو ایرا اسپتال، لکھنؤ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وہ ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔ خداوند کریم ان کو جنت الفردوس میں بلند مقام عنایت فرمائے اور علوم القرآن کی تالیف کو خوشنودی کا ذریعہ قرار دے۔ آمین

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین، نسخۂ خطی، ص ۲، نقل از مناھل العرفان، ص ۲۷

۲۔ علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین، نسخۂ خطی، ص ۸

۳۔ ایضاً، ص ۹

۴۔ ایضاً، ص ۱۰

۵۔ایضاً،ص۱۱

۶۔ایضاً،ص ۱۲ – ۱۳

۷۔ایضاً،ص ۱۵

۸۔ایضاً،ص ۲۲

۹۔بحارالانوار،جلد ۷۳،ص۳۲۶

۱۰۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۱۹ ،نقل از کمال الدین، از شیخ صدوق، ص۸۵

۱۱۔مجمع البیان، ازطبرسی،جلد۹،ص ۱۷۳۔۱۷۵،تفسیر الصافی، ازفیض کاشانی،جلد ۲،ص۶۱۸

۱۲۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۲۱،نقل ازتفسیر عیاشی،جلد ۱،ص۳۸۸

۱۳۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۲۱،نقل ازطبقات بن سعد،جلد ۱،ص۱۳۱

۱۴۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۲۳،نقل از اتقان للسیوطی، النوع السادس عشر،ص ۵۳، دارالمعرفۃ، بیروت،لبنان

۱۵۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۲۸

۱۶۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۲۳،نقل از الخصال للصدوق، جلد ۲، ص۱۰۲

۱۷۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۲۵،نقل از تاریخ الیعقوبی،جلد ۲،ص۱۹

۱۸۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۲۵،نقل از سیرت ہشام،جلد ۱،ص۲۸۰

۱۹۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۳۳

۲۰۔ایضاً،ص ۳۵

۲۱۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۳۹،نقل از البرھان للزرکشی،جلد ۱،ص۱۹۷

۲۲۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۴۹،نقل از الکافی، ج ۲،ص۶۲۸

۲۳۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین،نسخۂ خطی،ص ۵۰

۲۴۔مجمع البیان، ج ۱۰،ص۴۰۵

۲۵۔الکافی، ج ۲،ص۶۲۸

۲۶۔تفسیر الصافی للفیض، ج ۱،ص۶۸۰

۲۷۔تفسیر شبر، ص، ۸۳
۲۸۔تاریخ الیعقوبی، ج ۲، ص ۳۵
۲۹۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین، نسخۂ خطی، ص ۵۸، نقل از البیان للخوئی، ص ۱۸۱، مطبوعہ موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، لبنان
۳۰۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین، نسخۂ خطی، ص ۵۸، نقل از وسائل الشیعہ، ص ۸۶۶
۳۱۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین، نسخۂ خطی، ص ۵۸
۳۲۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین، نسخۂ خطی، ص ۶۱
۳۳۔تعلیم علوم قرآن، از آیۃ اللہ محمد ہادی معرفت، مطبوعہ ایرانین آرٹ پرنٹرس، دہلی، ص ۹۶
۳۴۔اصول کافی، ج ۲، ص ۶۳۰
۳۵۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین، نسخۂ خطی، ص ۶۸
۳۶۔علوم القرآن مولفہ مولانا ارشاد حسین، نسخۂ خطی، ص ۳۷، نقل از تفسیر القمی، ص ۴۵۷
۳۷۔التصحیح لعلوم التنزیل، ج ۱، ص ۴

☆☆☆

ڈاکٹر فیضان حیدر
فیضانِ ارشاد
استاد شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ایم کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 7388886628

شاگردانِ مولانا ارشاد حسین

تلخیص:

تاریخ شاہد ہے کہ کسی بھی عظیم استاد کی شناخت صرف اس کی تصانیف، خطبات یا علمی، ادبی اور مذہبی خدمات سے ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے شاگردوں کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ استاد دراصل ایسے چراغ کی مانند ہے جس سے بے شمار چراغ روشن ہوتے ہیں اور پھر یہی چراغ علم وفکر کی روشنی کو نسل در نسل منتقل کرتے رہتے ہیں۔ تاریخِ اسلام میں ہمیں ائمہ، محدثین، فقہا اور اہل علم کی ایسی درخشاں مثالیں ملتی ہیں جن کے فیض کا دائرہ ان کے شاگردوں کے ذریعے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اسی روایتِ علمی کی ایک روشن کڑی مولانا ارشاد حسین معروفی کی شخصیت بھی ہے، جنھوں نے پوری زندگی تعلیم وتربیت، اصلاح وارشاد، دینی ومذہبی اور علمی وادبی خدمات کے لیے وقف کردی۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت مختلف علاقوں میں علم وادب اور دین کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا ہے جن کی علمی تربیت نے بہت سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ انھوں نے طلبہ کے اندر تحصیل علم کا ذوق پیدا کیا اور ان کو علم وعمل پر آمادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کوئی تدریس کے میدان میں سرگرم ہے، کوئی تصنیف وتالیف اور تحقیق میں مصروف ہے، کوئی دینی خدمات اور اصلاحِ معاشرہ کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اور کوئی علمی وادبی خدمات کے ذریعے معاشرے میں بیداری پیدا کر رہا ہے۔ اس طرح مولانا کی شخصیت ایک ایسے سرچشمۂ علم کی حیثیت اختیار کرگئی جس سے نکلنے والی علمی نہریں دور دور تک پھیلتی چلی گئیں۔ زیرِ نظر مضمون میں شاگردانِ مولانا ارشاد حسین کی ایک مختصر جھلک پیش کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش کی گئی ہے۔ اس میں مولانا کے بیالیس اہم شاگردوں کا تعارف پیش

کیا گیا ہے جنھوں نے مختلف علمی، ادبی اور دینی میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ہر شاگرد کے تذکرے میں ان کا نام، ولدیت، تاریخ پیدائش، تعلیمی مراحل اور ان کی علمی، ادبی اور مذہبی خدمات کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ مولانا ارشاد حسین کی تربیت نے کس طرح ایک وسیع علمی و ادبی قافلہ تیار کیا۔

کلیدی الفاظ:

شاگردان مولانا ارشاد حسین، علمی وراثت، دینی خدمات، تصنیف و تالیف، تحقیق و تنقید، اصلاحِ معاشرہ، روحانی تربیت، تعلیمی خدمات، علمی قافلہ۔

ابرار حسین ولد مظفر حسین مرحوم (مولوی ڈاکٹر)

مولوی ابرار حسین ولد مظفر حسین مرحوم کا تعلق مبارک پور کے معروف محلے پورہ دلہن سے ہے، جو امام باڑہ سیف علی شاہ کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ ان کی ولادت ۱۰ رمئی ۱۹۹۱ء کو اسی محلے میں ہوئی۔ والد مرحوم کی اخلاقی تربیت اور خاندانی اقدار نے ان کے اندر محنت، استقلال اور مقصدیت کا وہ شعور پیدا کیا جو آگے چل کر ان کی تعلیمی اور عملی زندگی کی بنیاد بنا۔

ابرار حسین کی تعلیمی زندگی کا آغاز مدرسہ بابُ العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ سے ہوا، جہاں انھوں نے دینی تعلیم کی ابتدائی اساس مضبوط کی۔ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم سے رشتہ قائم رکھنے کے لیے انھوں نے ریڈینس پبلک ہائی اسکول، مبارک پور سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور بعد ازاں مبارک پور انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ مکمل کیا۔ اس مرحلے پر ان کے تعلیمی سفر میں دینی اور دنیاوی تعلیم کا امتزاج واضح طور پر سامنے آ چکا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ابرار حسین نے لکھنؤ کا رخ کیا، جہاں انھوں نے سلطان المدارس و جامعہ سلطانیہ میں ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۶ء تک مسلسل آٹھ برس علمِ دین حاصل کیا۔ یہ دور ان کی فکری اور علمی نشوونما کا نہایت اہم مرحلہ ثابت ہوا، جس میں ان کے اندر مطالعہ اور ضبطِ نفس کی صفات پختہ ہوئیں۔ اسی دوران انھوں نے عصری تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور شیعہ کالج سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں، جس سے ان کے علمی افق میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔

تحقیقی میدان میں قدم رکھتے ہوئے ابرار حسین نے ۲۰۱۶ء میں حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں ایم فل میں داخلہ لیا اور ۲۰۱۸ء میں کامیابی کے ساتھ یہ مرحلہ مکمل کیا۔ اس کے بعد ۲۰۱۹ء میں دہلی یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ حاصل کیا، جسے انھوں نے ۲۰۲۴ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے بعد کچھ

عرصہ نجی کمپنیوں میں کام کیا، جس کے ذریعے انھیں عملی زندگی کے مختلف تجربات سے گزرنے کا موقع ملا۔

بعد ازاں دہلی کو خیر باد کہہ کر انھوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور مختصر مدت کے لیے صحافتی ادارے خبر نامہ سے وابستہ رہے، تاہم جلد ہی اس شعبے سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس وقت غفرانمآب کے امام باڑہ میں قائم نورِ ہدایت فاؤنڈیشن میں بطور پروف ریڈر خدمات انجام دے رہے ہیں اور تا حال اسی ذمہ داری کو سنجیدگی اور دیانت کے ساتھ نبھا رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ابرار حسین کی شخصیت ایک ایسے سنجیدہ طالبِ علم، محقق اور علمی ذوق رکھنے والے فرد کی آئینہ دار ہے جو دینی روایت، عصری تعلیم اور تحقیقی شعور کو یکجا کر کے اپنی فکری و عملی زندگی کو مسلسل آگے بڑھا رہا ہے۔

☆☆☆

احتشام الحسن ابنِ مرحوم شمس الحق (مولانا ڈاکٹر)

مولانا ڈاکٹر احتشام الحسن ابنِ مرحوم شمس الحق ایک علمی و دینی شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں، جنھوں نے علم و عمل کے میدان میں اپنی مستقل مزاجی اور فکری بصیرت کے ذریعے نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کا تعلق لکھنؤ کے معروف علاقے سرفراز گنج سے ہے۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم کے بعد انھوں نے دینی علوم کے حصول کے لیے ایران کے عظیم علمی مرکز، حوزۂ علمیہ قم المقدسہ کا رخ کیا، جہاں انھوں نے نہایت محنت اور ریاضت کے ساتھ مختلف علومِ اسلامیہ میں مہارت حاصل کی۔ قم کے علمی ماحول میں رہ کر انھوں نے فقہ و اصول، تفسیر و حدیث میں استعداد بہم پہنچائی ساتھ ہی فارسی زبان و ادب میں بھی خصوصی مہارت پیدا کی۔ ایران سے واپسی کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے، ایم اے (فارسی) اور فارسی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر احتشام الحسن کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی تبلیغی خدمات ہیں۔ انھوں نے دین کی ترویج و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور مختلف مقامات پر علمی و دینی مجالس، خطابات اور دروس کے ذریعے عوام و خواص کو مستفید کیا۔ ان کی تقریریں علمی، متوازن اور سادہ و موثر ہوتی ہیں جن کی بدولت سامعین نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ عملی زندگی میں دینی اصولوں کو اپنانے کی ترغیب بھی حاصل کرتے ہیں۔ تبلیغی سرگرمیاں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں، جن میں نوجوان نسل کی رہنمائی، اخلاقی تربیت اور فکری بیداری پر خاص توجہ مرکوز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر احتشام الحسن ایک سنجیدہ مدیر کے طور پر بھی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ 'مؤمل'

(Muammal) میگزین کے مدیر ہیں، جس کے ذریعے علمی اور دینی موضوعات پر معیاری مضامین کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔ اس رسالے نے علمی حلقوں میں ایک معتبر مقام حاصل کیا ہے اور اہلِ قلم کو اظہارِ خیال کا ایک موثر پلیٹ فارم فراہم کیا ہے۔ آپ کی بصیرت، انتخابِ مضامین میں سنجیدگی اور معیار کی پابندی اس مجلّے کی پہچان بن چکی ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں، جنھوں نے تدریس، تحقیق، تبلیغ اور صحافت سبھی میدانوں میں اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر رہے ہیں۔

☆☆☆

اصغر اعجاز ابن اعجاز حسین معجزؔ جلال پوری (مولانا ڈاکٹر)

مولانا ڈاکٹر اصغر اعجاز ابن اعجاز حسین معجزؔ جلال پوری اردو و دینیات کے ممتاز عالم، محقق، استاد اور صاحبِ طرز شاعر ہیں، جنھوں نے مذہبی اور علمی و ادبی میدانوں میں نمایاں شناخت قائم کی ہے۔ ۴/ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو جعفر آباد، جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر میں ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔

ان کے والد اعجاز حسین معجزؔ جلال پوری ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا خاص میدان واقعہ کربلا سے متعلق اصناف جیسے نوحہ، سلام اور سوز وغیرہ تھا، جن میں وہ اپنے مخصوص انداز، سوز و گداز اور اثر انگیزی کے باعث ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اس طرح مولانا اصغر اعجاز کو بچپن ہی سے ایسا خاندانی ماحول میسر آیا جس میں دینی شعور، ادبی ذوق اور شعری روایت باہم پیوست تھے۔ ابتدائی تعلیم آبائی قصبے میں ہی حاصل کی۔ ثانوی تعلیم کے لیے بابُ العلم، مبارک پور کا سفر کیا، جہاں مولوی و عالم کی اسناد حاصل کیں۔ بعد ازاں ناظمیہ عربی کالج میں اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۹۶-۹۷ میں ممتاز الافاضل کی ڈگری حاصل کی۔

دینی علوم کے ساتھ انھوں نے عصری تعلیم کی طرف بھی رجوع کیا۔ چنانچہ ۲۰۰۱ء میں اودھ یونیورسٹی، فیض آباد سے اردو میں ایم اے کیا اور اسی سال یو جی سی، نئی دہلی کا قومی اہلیتی امتحان (NET) پاس کیا۔ تحقیقی میدان میں ان کی سنجیدہ کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۰۱۸ء میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی تحقیق میں دینیات اور اردو ادب کا گہرا ربط اور تنقیدی بصیرت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا اصغر اعجاز نہ صرف ایک محقق اور مدرس ہیں بلکہ ایک قادر الکلام شاعر بھی ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ عربی زبان میں بھی شاعری کرتے ہیں، جو ان کی لسانی مہارت اور علمی وسعت کا بین ثبوت ہے۔ ان کے اشعار میں تہ داری، معنویت، جذبے کی صداقت اور کلاسیکی روایت کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

ان کی علمی و انتظامی صلاحیتوں کے اعتراف میں ۱۰؍نومبر ۲۰۲۵ء کو ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ دینیات (شیعہ) کا چیئرمین مقرر کیا گیا، اور تا حال اس منصب پر فائز ہیں۔ اس طرح وہ تدریس، تحقیق اور رہنمائی کے ساتھ شعبے کی ترقی میں بھی کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔

ان کی علمی، ادبی اور دینی خدمات ہمہ گیر اور متنوع ہیں۔ انھوں نے دینیات، اخلاقیات، لسانیات اور اردو و عربی ادب کے مختلف پہلوؤں پر گراں قدر تصنیفات و تالیفات پیش کی ہیں، جن میں فکری شعور، تحقیقی بصیرت اور اسلوبی پختگی نمایاں ہے۔ ان کی تصنیفی کاوشیں نہ صرف علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں بلکہ طلبہ و محققین کے لیے بھی رہنمائی کا اہم ذریعہ ہیں۔ انھوں نے ترتیب و تدوین، ترجمہ و تشریح کے میدان میں بھی قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں، جس سے ان کی علمی وسعت اور زبان و بیان پر قدرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں ان کی تصنیفات و تالیفات اور علمی کارناموں کی فہرست پیش کی جاتی ہے:

تصانیف:

۱۔ اخلاقی نظریات کا تقابلی مطالعہ
۲۔ اسلامی نظریۂ اخلاق
۳۔ آئینۂ علم و عمل
۴۔ قرآن از نظر صرف و نحو
۵۔ لوح محفوظ کی زینت
۶۔ سید العلما علی گڑھ میں
۷۔ اذان ولایت (اردو شاعری کا مجموعہ)
۸۔ سواطع الانوار (اردو شاعری کا مجموعہ)
۹۔ النزھۃ العاطرۃ فی فضائل العترۃ الطاھرۃ (عربی شاعری کا مجموعہ)

ترتیب و تدوین:

۱۰۔ روشنی
۱۱۔ تحفۂ جعفریہ
۱۲۔ حضرت علی اور تصوف
۱۳۔ شاہکار فکر و عمل
۱۴۔ صحیفۂ مدحت
۱۵۔ میراث المراثی حصہ اول
۱۶۔ میراث المراثی حصہ دوم
۱۷۔ معراج مودت

ترجمہ و تشریح:

۱۸۔ خواتیم الصالحین (فارسی سے اردو)
۱۹۔ خورشید فقاہت (عربی سے اردو)
۲۰۔ نزاہۃ الشقتین فی بلاغت الامام علی ابن الحسین علیہ السلام (عربی سے اردو) حصہ دوم
۲۱۔ نزاہۃ الشقتین فی بلاغت الامام علی ابن الحسین علیہ السلام (عربی سے اردو) حصہ سوم

زیر اشاعت تراجم:

۲۲۔ جواہر سخن در بلاغت حسن (عربی سے اردو)
۲۳۔ نزاہۃ الکشفتین فی بلاغۃ الامام علی ابن الحسین حصہ اول (عربی سے اردو)
۲۴۔ پچاس سے زیادہ تحقیقی مقالات ومضامین مختلف جرائد ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

اطہر رضوی ابن میر جواد حسین (مولانا سید)

مولانا سید اطہر رضوی ابنِ میر جواد حسین ایک دینی، علمی اور روحانی شخصیت کے طور پر اپنے حلقۂ اثر میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت یکم جنوری ۱۹۶۵ء کو اتر پردیش کے ضلع امبیڈکر نگر کے قصبہ بریاون میں ہوئی۔ والد میر جواد حسین اپنے علاقے میں دیانت، شرافت اور دینی رجحان کے اعتبار سے معروف تھے، جس کا اثر مولانا کی ابتدائی تربیت پر بھی نمایاں طور پر مرتب ہوا۔

مولانا سید اطہر رضوی نے اپنی ابتدائی اور رسمی تعلیم اپنے علاقے کے معروف تعلیمی ادارے رام اودھ جنتا انٹر کالج، بریاون سے حاصل کی، جہاں سے آپ نے انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم مکمل کی۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کے اندر سنجیدگی، علم دوستی اور دینی رجحان کے آثار نمایاں تھے، تاہم انٹرمیڈیٹ کے بعد ان کے اندر دینی علوم کے حصول کا شوق مزید پختہ ہوتا گیا۔ یہی شوق ان کو عصری تعلیم کے دائرے سے نکال کر دینی تعلیم کی طرف لے آیا۔ دینی تعلیم کے حصول کے لیے انھوں نے جامعہ ایمانیہ ناصریہ، جون پور کا رخ کیا۔ یہاں ثانوی دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے ایران کے علمی مرکز قم کا سفر اختیار کیا۔ قم میں قیام کے دوران انھوں نے تقریباً سات سال تک مختلف جید اساتذہ سے کسبِ فیض کیا اور فقہ، اصول، تفسیر، حدیث اور دیگر دینی علوم میں مہارت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا نے عملی میدان میں قدم رکھا اور دین کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ اس وقت چتوڑ کے علاقے پالم میں امامِ جمعہ وجماعت کے فرائض نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ ان کی خطابت میں سلاست، روانی اور دینی بصیرت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، جس کی بدولت عوام وخواص دونوں آپ کے بیانات سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف عبادات کی امامت کرتے ہیں بلکہ معاشرتی، اخلاقی اور دینی رہنمائی کے فرائض بھی بخوبی سرانجام دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت علم وعمل کا ایک حسین امتزاج ہے۔

☆☆☆

افسر علی ابن غضنفر علی انجم معروفی مرحوم (مولانا)

مولانا افسر علی ابنِ غضنفر علی ایک سنجیدہ فکر مدرس اور علمی ذوق رکھنے والی شخصیت کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق پورہ معروف، گُرتھی جعفر پور، ضلع مئو (اتر پردیش) سے ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جو علمی و دینی روایت کے اعتبار سے نمایاں شناخت رکھتا ہے۔ خاندانی ماحول دینی اقدار سے معمور تھا، جس کے باعث ان کے اندر ابتدائی عمر ہی سے علمِ دین کی طرف فطری رغبت پیدا ہوئی اور یہی شوق آگے چل کر ان کی زندگی کا محور بن گیا۔

ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں سے حاصل کی، جہاں بنیادی دینیات کے ساتھ عربی و اردو کی استعداد بہم پہنچائی۔ بعد ازاں باقاعدہ طور پر درسِ نظامی کی اعلیٰ تعلیم کا آغاز کیا اور محنت، لگن اور استقامت کے ساتھ مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ انھوں نے متعدد اسناد حاصل کیں، جن میں فاضلِ ادب، فاضلِ فقہ، فاضلِ معقولات اور فاضلِ طب شامل ہیں۔ یہ علمی تنوع اس بات کا غماز ہے کہ آپ نے نہ صرف فقہی میدان میں استعداد پیدا کی بلکہ معقولات اور طب جیسے مضامین میں بھی دسترس حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد تدریس کو اپنا میدانِ عمل بنایا اور مدرسہ جعفریہ کو پا گنج میں طلبہ کو دینی علوم کی تعلیم دینے میں مصروف ہو گئے۔ ان کا اندازِ تدریس سادہ ہے، جس کے باعث شاگرد نہ صرف مستفید ہوتے ہیں بلکہ اخلاقی و عملی اعتبار سے بھی مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ وہ طلبہ کی ذہنی تربیت، ان کے اندر علمی ذوق اور دینی شعور بیدار کرنے میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں تعلیم دین اور تربیت نسل نو کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔

☆☆☆

حسن عسکری ابن شبیر حسن (مولوی)

مولوی حسن عسکری ابن شبیر حسن ان افراد میں سے ہیں جنھوں نے کم عمری ہی میں علم دین، ادب اور خدمت معاشرہ کو زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ عالم، ناظم، نوحہ گو شاعر اور صحافتی خدمت گزار کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ۱۵/ جون ۱۹۹۵ء کو محلہ شاہ محمد پور، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد شبیر حسن مذہبی شعور رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے فرزند کی تربیت میں دینی اقدار، اخلاقی نظم و ضبط اور علم دوستی کو بنیادی حیثیت دی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا، جس نے حسن عسکری کے ذہن میں کم عمری ہی سے دین سے وابستگی، شوق مطالعہ اور علمی سنجیدگی پیدا کر دی۔

تعلیمی زندگی کا آغاز مدرسہ باب العلم، مبارک پور سے ہوا۔ یہیں سے اردو، دینیات اور قرآنِ مجید کے ساتھ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور عربی، فارسی، صرف، نحو، منطق، فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر اور حدیث جیسے علوم میں مہارت پیدا کی۔ یہاں قیام کے دوران متعدد جید اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا تاہم مولانا ارشاد حسین مرحوم سے آپ کی خصوصی علمی وابستگی رہی اور ان سے خصوصی فیض حاصل کیا۔ حسن عسکری کی علمی سمت متعین کرنے میں مولانا کی رہنمائی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مولانا کی ایما اور حوصلہ افزائی پر حسن عسکری نے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا جہاں اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔ جامعہ ناظمیہ کا علمی ماحول، منہجِ تدریس اور اساتذہ کی رہنمائی نے ان کی شخصیت میں وسعت، اعتدال اور تحقیقی شعور پیدا کیا۔ بالآخر ۲۰۱۷ء میں ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی اور فارغ التحصیل قرار پائے۔

دینی تعلیم کے ساتھ حسن عسکری نے عصری علوم کو بھی اہمیت دی۔ چنانچہ ۲۰۱۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۲۰۱۸ء میں ایم اے (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔ اردو زبان و ادب میں باضابطہ جامعاتی تعلیم نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا، زبان پر گرفت مضبوط کی اور تحریری اظہار میں سلیقہ و شائستگی پیدا کی۔ ۲۰۱۷ء میں حسن عسکری نے صحافتی میدان میں قدم رکھا۔ چنانچہ ماہنامہ 'اصلاح' لکھنؤ سے وابستہ ہوئے اور وہاں پروف ریڈر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ادبی ذوق کا ایک اہم مظہر ان کی نوحہ گوئی ہے۔ ان کی شاعری میں اہلِ بیت سے والہانہ عقیدت، کربلا کے پیغام کی معنوی آفاقیت اور زبان کی سادگی و تاثیر نمایاں ہے۔ ان کے نوحے تاریخی اور سماجی شعور کے حامل ہیں۔ اس وقت وہ دو دینی اداروں کی نگرانی بھی کر رہے ہیں:

۱۔ درس گاہ باقریہ، غازی منڈی، چوک، لکھنؤ؛ ۲۔ مدرسہ امام باقر علیہ السلام، مغل صاحبہ کا امام باڑہ، وزیر باغ، لکھنؤ (اس مدرسے کے بانی بھی ہیں۔)

ان اداروں کے ذریعے دینی تعلیم کے فروغ، نئی نسل کی تربیت اور مذہبی شعور کی آبیاری میں سرگرم عمل ہیں۔ موصوف تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی سرگرم ہیں۔ اس وقت ان کی دو اہم کتابیں 'بیت بازی' اور 'ماہنامہ اصلاح کی اجمالی فہرست' زیرِ ترتیب ہیں۔

☆☆☆

حسین رضا ابن علی رضا (مولوی)

مولوی حسین رضا ابن علی رضا، ضلع اعظم گڑھ (اتر پردیش) کی تحصیل سگڑی کے سمند پور کے

باشندہ ہیں۔ وہ ایک دینی و علمی ماحول رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر دینی علوم کے حصول کی طرف توجہ دی اور مدارسِ دینیہ میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے مختلف علمی مراحل طے کیے۔ اس تعلیمی سفر کے دوران انھوں نے منشی، مولوی، عالم، کامل اور فاضل کی اسناد حاصل کیں، جو ان کی علمی محنت اور دینی علوم میں مہارت کا واضح ثبوت ہیں۔

دینی تعلیم کے ساتھ انھوں نے عصری تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی اور شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی۔ اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کر کے اپنی علمی استعداد کو مزید وسعت دی۔ اس طرح ان کی تعلیم دینی اور عصری علوم کے حسین امتزاج کی آئینہ دار ہے، جس نے ان کی علمی شخصیت کو متوازن اور جامع بنا دیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد حسین رضا نے تدریسی اور دینی خدمات کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ اس وقت وہ مدرسہ بابُ العلم، مبارک پور (ضلع اعظم گڑھ) میں بطور استاد تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، جہاں وہ طلبہ کو دینی علوم کی تعلیم دیتے ہوئے ان کی علمی و اخلاقی تربیت میں مصروف ہیں۔

وہ ایسی علمی و دینی شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں جن کی زندگی تدریس، دینی خدمت اور تبلیغی سرگرمیوں سے عبارت ہے۔ اپنی علمی استعداد اور عملی خدمات کے ذریعے معاشرے میں دینی شعور کی بیداری اور علمی روایت کے فروغ میں اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

دلبر حسن قمی ابن اشفاق حسین (مولانا)

مولانا دلبر حسن قمی ابن اشفاق حسین ایک جید عالم دین، خطیب اور صاحبِ قلم کی حیثیت سے علمی و مذہبی حلقوں میں معروف ہیں۔ ان کی ولادت ۲۶ر جنوری ۱۹۷۲ء کو مصطفی آباد، نگپور، جلال پور (ضلع امبیڈکر نگر، اتر پردیش) میں ہوئی۔ ایک دینی و علمی خانوادے سے تعلق نے ان کی ابتدائی تربیت کو مذہبی اقدار سے ہم آہنگ کیا، جس کے باعث کم عمری ہی سے ان میں تحصیل علم کا شوق بیدار ہوا اور یہی شوق آپ کی زندگی کی راہ متعین کرتا چلا گیا۔

ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کرتے ہوئے منشی، مولوی، عالم، کامل اور فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ درسِ نظامی کی ان منازل کو کامیابی سے طے کرنے کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے عالم تشیع کے عظیم علمی مرکز، حوزہ علمیہ قم (ایران) کا رخ کیا۔ وہاں مسلسل دس سال تک درسِ خارج میں شرکت کی، جو دینی علوم کی اعلیٰ ترین سطح شمار کی جاتی ہے۔ اس طویل علمی ریاضت کے بعد آپ جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، قم سے باضابطہ طور پر

فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد عملی میدان میں قدم رکھا اور دینی و مذہبی خدمات کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ اس وقت مسجد امام باڑہ حیدری، سیتھل، بریلی میں امامِ جماعت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، جہاں باقاعدگی سے نمازِ جماعت کی امامت کے ساتھ دینی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ مزید برآں ہرہرپور مٹکلی، بریلی میں امامِ جمعہ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہے ہیں، جہاں ان کے خطبات جمعہ عوام میں دینی شعور، اخلاقی بیداری اور سماجی اصلاح کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ان کی علمی خدمات کا ایک اہم پہلو ترجمہ و تالیف بھی ہے۔ انھوں نے مختلف دینی و علمی موضوعات پر کام کرتے ہوئے ترجمہ اور تصنیف کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کی تحریروں میں سلاست، گہرائی اور علمی وقار نمایاں ہے، جو قارئین کو نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ ان کی فکری تربیت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔ مولانا دلبر حسن قمی کی شخصیت علم، عمل اور خدمت دین کا خوب صورت امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو دینی تعلیم، تبلیغ، امامت اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ان کی خدمات دینی و علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، اور ان کی مسلسل علمی و عملی جدوجہد یقیناً آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بنے گی۔

☆☆☆

ذیشان حیدر ابن مولانا ارشاد حسین (مولانا ڈاکٹر)

مولانا ڈاکٹر ذیشان حیدر ابن مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ، عہدِ حاضر کے اہم محقق، ناقد، مترجم اور استاد ہیں۔ ان کی ولادت ۸/ اگست ۱۹۷۴ء کو مردم خیز خطہ موضع پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، ضلع مئو (سابقہ ضلع اعظم گڑھ)، اتر پردیش، ہندوستان میں ہوئی۔ ان کے والد گرامی مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ اپنے وقت کے جید عالم، باکمال مدرس اور استاذ الاساتذہ تھے، جن کی علمی سرپرستی، تربیت اور دعاؤں نے ڈاکٹر ذیشان حیدر کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر ذیشان حیدر کی ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر ہی سے ہوا، جہاں والد مرحوم نے بسم اللہ کے ساتھ حروفِ تہجی کی تعلیم دی۔ بعد ازاں ان کا داخلہ محلے کے مکتب امامیہ میں ہوا، جہاں منشی رشید مرحوم نے ابتدائی تعلیم و تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے بعد وہ مدرسہ ایمانیہ ناصریہ میں کچھ عرصہ زیرِ تعلیم رہے، تاہم بعض ناگوار حالات کے سبب یہاں ان کا قیام بہت مختصر رہا۔

بعد ازاں مدرسہ باب العلم، مبارک پور منتقل ہوئے، جہاں درجہ چہارم میں داخلہ لیا۔ یہاں انھوں نے والد محترم اور دیگر اساتذہ سے نحو، صرف، دینیات، اردو، ریاضی اور جغرافیہ جیسے مضامین میں استعداد بہم پہنچائی۔ ۱۹۸۸ء میں جب مولانا ناظم علی خیرآبادی نے خیرآباد میں جامعہ حیدریہ مدینۃ العلوم کی بنیاد رکھی تو وہ یہاں کے اولین طلبہ میں شامل تھے۔ یہاں انھوں نے میزان منشعب، نحو میر، احکام الاسلام اور پنج گنج جیسی کتب کی تعلیم نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حاصل کی۔ اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کے لیے انھوں نے جامعہ ناظمیہ، لکھنؤ کا رخ کیا، جہاں عربی و فارسی، فقہ، اصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، بلاغت، حدیث، تفسیر اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کی اور ممتاز الافاضل کی سند سے سرفراز ہوئے۔

اسی دوران انھوں نے شیعہ پی جی کالج، لکھنؤ سے بی۔ اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ ایران گئے، جہاں ممتاز اساتذہ سے علمی فیض حاصل کیا۔ واپسی پر انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے 'بیسویں صدی کے نصف آخر کے چند معروف ایرانی شعرا' کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے مدرسہ باب العلم، مبارک پور اور جامعہ حیدریہ، خیرآباد میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں بطور گیسٹ ٹیچر خدمات انجام دیتے رہے۔

۲۰۰۸ء میں جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن کے تحت ملت کالج، پرسا (دمکا یونیورسٹی) میں ان کی تقرری ہوئی۔ اسی سال اتر پردیش پبلک سروس کمیشن میں کامیابی کے بعد انھوں نے گورنمنٹ رضا پی جی کالج، رامپور میں تدریس کا آغاز کیا۔ ۲۰۱۲ء میں وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے، جہاں اس وقت وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی نگرانی میں متعدد طلبہ نے پی ایچ۔ ڈی مکمل کی ہے جب کہ کئی دیگر تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر ذیشان حیدر کی علمی خدمات نہایت وسیع اور متنوع ہیں۔ ان کے بیس سے زائد تحقیقی مقالات قومی و بین الاقوامی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ آرسی ترجمہ نصاب فارسی [۲۰۰۶ء]

۲۔ ترجمہ چہار مقالہ ([۲۰۱۶ء] نظامی عروضی سمرقندی کی معروف تصنیف کا ترجمہ)

۳۔ بہار دانش ([۲۰۱۶ء] تحقیقی مضامین کا مجموعہ)

۴۔ ریاحین الانشاء ([۲۰۱۶ء] ادبی رقعات کی تدوین)

۵۔ عہد حاضر کے مشہور ایرانی شعرا [۲۰۱۷ء]

۶۔گلزار انشا ([۲۰۱۸ء] ریاحین الانشا کا اردو ترجمہ)

۷۔ ہمارے شب و روز ([۲۰۲۵ء] مولانا محمد حسنین کے شعری مجموعہ کی تدوین)

ان کی بعض دیگر اہم تصانیف زیرِ طبع یا غیر مطبوعہ ہیں، جن میں 'نازش ادب'، 'رقعات شیخ علی حزین لاہیجی کی تحقیق و تدوین'، اور 'انیسویں صدی کے دوران ہندوستان میں تصنیف شدہ فارسی کتب کا تجزیاتی مطالعہ' شامل ہیں۔ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں اتر پردیش اردو اکادمی نے 'ترجمہ چہار مقالہ' (۲۰۱۶ء) اور 'گلزار انشا' (۲۰۱۸ء) پر قیمتی ایوارڈز سے نوازا۔مزید برآں مختلف ادبی و سماجی تنظیموں نے بھی ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ان کی تصنیف 'ترجمہ چہار مقالہ' بہار کی جامعات میں نصاب کا حصہ ہے۔

انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مالی تعاون سے متعدد تحقیقی منصوبے کامیابی کے ساتھ مکمل کیے، جن میں 'رقعاتِ شیخ علی حزین لاہیجی کی تحقیق و تدوین' اور 'ہندوستان میں فارسی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ' شامل ہیں۔

☆☆☆

رضا نواز ابن زین العابدین عارفؔ (مولوی)

مولوی رضا نواز ابنِ زین العابدین ایک سنجیدہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کا تعلق پورہ رانی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ سے ہے۔مولوی رضا نواز کی ولادت ۲۵/ مارچ ۱۹۷۹ء کو ایک دیندار خانوادے میں ہوئی۔یہی خاندانی فضا آپ کی شخصیت کی تشکیل میں اوّلین بنیاد بنی اور آگے چل کر ان کے فکری رجحانات کی سمت متعین کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔

ابتدا ہی سے دینی علوم کی طرف فطری میلان نے باقاعدہ علمی راستے پر گامزن کیا۔ چنانچہ الٰہ آباد بورڈ سے مولوی، عالم، منشی، کامل، فاضلِ ادب، فاضل طب اور فاضل معقولات جیسی اسناد حاصل کر کے اپنی علمی وسعت کا ثبوت دیا۔خاص طور پر معقولات اور طب جیسے مضامین میں ان کی دلچسپی اس امر کی دلیل ہے کہ انھوں نے روایت کے ساتھ فکری توازن اور عقلی استدلال کو بھی اپنی علمی زندگی کا حصہ بنایا۔عصری اور ادبی شعور کی تکمیل کے لیے آپ نے جامعہ اردو علی گڑھ بورڈ سے ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل اور معلم اردو کی اسناد بھی حاصل کیں۔

باقاعدہ دینی تعلیمی سفر مدرسہ باب العلم مبارک پور سے شروع ہو کر جامعہ ناظمیہ، لکھنؤ تک محیط رہا۔ اس طویل تعلیمی سفر میں آپ کو جید اساتذہ کی صحبت نصیب ہوئی اور دینی نصاب کے اہم مراحل طے کرنے کا

موقع ملا۔ مدرسہ باب العلم کا علمی ماحول، روایت اور اخلاقی تربیت نے ان کی فکری تشکیل میں مرکزی کردار ادا کیا۔ خصوصی طور پر مولانا ارشاد حسین مرحوم سے علمی استفادہ ان کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ مولانا مرحوم کی علمی بصیرت اور فکری دیانت نے مولوی رضا نواز کے علمی مزاج کو متاثر کیا۔ ان کی رہنمائی میں آپ نے نہ صرف درسی علوم کو بہتر طور پر سمجھا بلکہ علم کو عمل سے جوڑنے کا سلیقہ بھی سیکھا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مولوی رضا نواز نے مدرسہ باب العلم، مبارک پور میں درس و تدریس کو اپنا مستقل میدانِ عمل بنایا۔ بحیثیت مدرس ذمہ داری، خلوص اور محنت کے ساتھ طلبہ کی علمی و اخلاقی تربیت میں مصروف ہیں۔ ان کا تدریسی اسلوب سادگی، وضاحت اور مثالوں پر مبنی ہے۔ دینی خدمات کے ضمن میں محلہ کی مسجد حیدری میں باقاعدگی سے نمازِ جماعت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ خدمت ان کی دینی اور سماجی ذمہ داری کا عملی نمونہ ہے۔ مسجد کے ذریعے وہ نہ صرف عبادت کی قیادت کرتے ہیں بلکہ اصلاح، باہمی اخوت اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں بھی موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

شاکر مہدی ابن علی جعفر (مولوی حکیم)

مولوی شاکر مہدی ابنِ علی جعفر کا تعلق قصبہ مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ سے ہے، جو علمی، دینی اور تہذیبی روایت کے اعتبار سے نمایاں شناخت رکھتا ہے۔ ولادت ۱۱ ستمبر ۱۹۸۴ء کو دیندار گھرانے میں ہوئی۔ خاندانی ماحول میں دینی شعور اور انسانی ہمدردی کی جو فضا قائم تھی، اسی نے شاکر مہدی کی شخصیت کو ابتدا ہی سے سنجیدگی، وقار اور سماجی ذمہ داری کے احساس سے آشنا کیا۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ باب العلم، مبارک پور میں ہوئی، جہاں دینی علوم کی بنیادی تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اسی ادارے میں ثانوی اور اعلیٰ دینی تعلیم بھی مکمل کی۔ باب العلم کا علمی ماحول، منظم نصاب اور اساتذۂ کرام کی رہنمائی نے ان کی فکر کو مستحکم کیا۔ مدرسہ باب العلم میں دورانِ تعلیم آپ کو جن اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں مولانا ارشاد حسین مرحوم کا نام نمایاں ہے۔ شاکر مہدی نے ان کی صحبت سے علمی وقار، اخلاقی توازن اور خدمتِ خلق کے اصول سیکھے۔ مولانا ہی کی ایما پر اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ یہاں انھوں نے نہایت یکسوئی اور محنت کے ساتھ دینی علوم کی اعلیٰ سطحی تعلیم حاصل کی۔ بالآخر ۲۰۱۸ء میں آپ نے جامعہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔ بی۔اے، ایم اے اردو۔ کے ساتھ طبابت میں بھی سند حاصل کی ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد شاکر مہدی نے اپنے خاندانی پیشے طبابت کو باقاعدہ طور پر اختیار کیا۔ اگرچہ دینی تعلیم مضبوط بنیادوں پر استوار تھی، تاہم طبابت کو محض پیشہ نہیں بلکہ خدمتِ خلق کا ذریعہ بنایا۔ وقت کے ساتھ ایک طبیبِ حاذق کی حیثیت سے اپنے قصبے اور اطراف کے علاقوں میں پہچانے جانے لگے۔ مریضوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ، تشخیص میں احتیاط اور علاج میں دیانت یہ وہ اوصاف ہیں جن کی بنا پر ان کو عوامی اعتماد حاصل ہوا۔ شاکر مہدی کی طبابت کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ علاج کے ساتھ ساتھ اخلاقی تسلی اور انسانی ہمدردی کو بھی لازم سمجھتے ہیں۔ غریب اور نادار مریضوں کے ساتھ خصوصی رعایت، بلا امتیاز خدمت اور سماجی ذمہ داری کا شعور آپ کے کردار کا نمایاں حصہ ہے۔ مشغلہ کے طور پر طبابت آپ کی زندگی کا مرکزی محور ہے، تاہم اس کے پس منظر میں دینی فکر اور اخلاقی اقدار پوری طرح کارفرما ہیں۔

☆☆☆

شاہد رضا ابن انصار حسین (مولوی ڈاکٹر)

نام شاہد رضا والد کا نام انصار حسین، ۱۲/ مارچ ۱۹۸۵ء کو سمند پور، سگڑی، ضلع اعظم گڑھ میں ایک دیندار اور محنتی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی، جہاں قرآنِ مجید، اردو، دینیات کی تعلیم حاصل تھی۔ یہی مرحلہ علمی زندگی کی اساس ثابت ہوا، جس نے نہ صرف دینی رجحان کو مضبوط کیا بلکہ مطالعے کی مستقل عادت بھی پیدا کی۔ ثانوی اور اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ میں داخلہ لیا۔ یہاں قیام کے دوران فقہ، اصولِ فقہ، منطق اور عربی ادب جیسے علوم میں استعداد بہم پہنچائی۔ اس ادارے کا علمی ماحول فکری ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مدرسہ باب العلم میں جن اساتذۂ کرام کی صحبت میسر آئی، ان میں مولانا ارشاد حسین مرحوم کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا مرحوم کی علمی بصیرت، تدریسی مہارت اور شاگردوں کی رہنمائی نے شاہد رضا کے ذہنی افق کو وسعت بخشی۔ ان کی ایما اور حوصلہ افزائی پر آپ نے اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ ناظمیہ، لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ یہاں درسِ نظامی کے اعلیٰ مراحل طے کیے اور دینی علوم میں مہارت حاصل کی۔ بالآخر ۲۰۱۴ء میں یہاں سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔

دینی تعلیم کے ساتھ شاہد رضا نے عصری علوم کے حصول کو بھی اپنی ضرورت سمجھا۔ اسی مقصد کے تحت شیعہ کالج، لکھنؤ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۲۰۰۷ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی اور ۲۰۰۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو مکمل کیا۔ اس کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس سے ۲۰۱۴ء

میں ایم۔اے فارسی کی ڈگری حاصل کی۔ان کا علمی سفر یہیں ختم نہیں ہوا۔مسلسل محنت اور تحقیقی شوق کے نتیجے میں آپ نے ۲۰۲۳ء میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ہی سے فارسی زبان میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔تحقیق کے دوران کلاسیکی متون، لسانی روایت اور فکری مباحث پر گہری نظر ڈالی، جو ان کے تحقیقی مزاج کی غماز ہے۔

عملی زندگی میں شاہد رضا ہمہ جہت مصروفیات کے حامل ہیں۔مجالس ومحافل میں شرکت دینی وفکری رہنمائی کا ذریعہ بنی، جب کہ نمازِ جماعت کی امامت کے ذریعے معاشرتی سطح پر دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اسکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی کام کرتے ہیں، جہاں دینی وسماجی موضوعات کو موثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔عصری تقاضوں کے پیشِ نظر کمپیوٹر آپریٹنگ اور ڈیزائننگ کے میدان میں بھی مہارت حاصل کی ہے۔یہ فنی صلاحیتیں آپ کو جدید ذرائعِ ابلاغ اور علمی اظہار کے نئے امکانات سے جوڑتی ہیں، جس کے ذریعے وہ اپنے فکری پیغام کو وسیع حلقے تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔توقع کی جاسکتی ہے کہ آئندہ بھی اسی استقامت، اخلاص اور بصیرت کے ساتھ علمی وسماجی میدان میں اپنی خدمات جاری رکھیں گے اور نئی نسل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنیں گے۔

☆☆☆

شمیم ریاض ابن ظفر الحسن مرحوم (مولانا)

مولانا شمیم ریاض ابن ظفر الحسن مرحوم کا تعلق ضلع اعظم گڑھ کے معروف قصبہ مبارک پور سے ہے۔۲۶/جنوری ۱۹۸۴ء کو یہیں پیدا ہوئے۔ایک علمی اور سنجیدہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب ابتدا ہی سے ان کے مزاج میں وقار، مطالعہ اور فکری یکسوئی موجود تھی۔ان کے والد ظفر الحسن مرحوم کی دینی وابستگی اور اخلاقی تربیت نے ان کی شخصیت کی بنیاد مضبوط کی اور انھیں علم کو حصولِ معاش کے بجائے خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھنے کا شعور عطا کیا۔

مولانا شمیم ریاض کی تعلیمی زندگی کا آغاز مدرسہ بابُ العلم، مبارک پور سے ہوا۔یہاں انھوں نے ابتدائی اور ثانوی دینی تعلیم حاصل کی اور عربی و فارسی زبان کی بنیادی ساخت سے واقفیت پیدا کی۔اسی ادارے میں انھیں مولانا ارشاد حسین سے خصوصی استفادہ کا موقع ملا، جس نے ان کی فکری سمت متعین کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔مولانا مرحوم کی علمی بصیرت، استدلالی انداز نے شمیم ریاض کے اندر تحقیق، تدبر اور اعتدال پسندی کی مضبوط بنیاد ڈال دی۔اعلیٰ دینی تعلیم کے مرحلے میں انھوں نے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ

لیا۔ یہاں سے انھوں نے درسِ نظامی کے اعلیٰ مراحل طے کرتے ہوئے ممتازُ الافاضل کی سند حاصل کی۔ بعدازاں علمی افق کو مزید وسعت دینے کی غرض سے مدرسہ حجتیہ، قم (ایران) کا رخ کیا، جہاں سے کارشناسی ارشد کی ڈگری حاصل کی۔ قم کے علمی ماحول، بین الاقوامی طلبہ کی صحبت اور تحقیقی روایت نے ان کے علمی ذوق کو مزید وسعت عطا کی اور ان کے مطالعے کو ایک عالمی تناظر فراہم کیا۔

دینی علوم کے ساتھ عصری زبان و ادب سے وابستگی بھی شمیم ریاض کی علمی ترجیحات میں شامل رہی۔ اسی شعور کے تحت انھوں نے خواجہ معین الدین چشتی لسان یونیورسٹی (سابق اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی)، لکھنؤ سے ایم۔اے فارسی کی ڈگری حاصل کی۔ فارسی زبان و ادب میں باقاعدہ یونیورسٹی تعلیم نے ان کی ترجمہ نگاری اور لسانی نزاکت کو نمایاں طور پر نکھارا۔ کلاسیکی اور جدید فارسی متون سے گہری واقفیت نے انھیں ایسے علمی وسائل فراہم کیے جو ان کے تدریسی عمل میں بھرپور طور پر کارآمد ثابت ہوئے۔

شمیم ریاض کی عملی زندگی کا محور تدریس و تبلیغ ہے، جسے وہ دینی و سماجی خدمت کا موثر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ترجمہ، تحقیق اور مقالہ نویسی کے میدان میں بھی سرگرم ہیں۔ ان کی تحریروں میں موضوع سے گہری وابستگی، زبان کی شستگی اور علمی دیانت محسوس کی جاسکتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت میں روایت و جدت کا حسین امتزاج انھیں اپنے علمی حلقے میں معتبر مقام عطا کرتا ہے۔

☆☆☆

ضرغام حیدر ابن باقر حسین (مولانا)

مولانا ضرغام حیدر ابن باقر حسین ضلع اعظم گڑھ کی تحصیل سگڑی کے سمند پور کے باشندہ ہیں۔ ان کی تاریخِ ولادت ۱۰/اپریل ۱۹۸۲ء ہے۔ وہ ایک علمی اور دیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کی ابتدائی تعلیم و تربیت کو مضبوط بنیاد فراہم ہوئی۔ سمند پور میں ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد مدرسہ باب العلم کا رخ کیا جہاں انھوں نے مولانا ارشاد حسین مرحوم سے خصوصی استفادہ کیا۔ اس کے بعد جامعہ ناظمیہ لکھنؤ گئے اور وہاں سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔

تعلیمی میدان میں ضرغام حیدر نے دینی اور عصری دونوں تعلیم حاصل کی اور مختلف مدارج طے کرتے ہوئے متعدد اسناد حاصل کیں۔ دینی تعلیم کے سلسلے میں انھوں نے منشی، مولوی، عالم اور کامل جیسی بنیادی اور اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے تخصّصی سطح پر فاضل ادب، فاضل دینیات، فاضل معقولات اور فاضل طب جیسی اسناد بھی حاصل کیں، جو ان کے وسیع علمی مطالعے اور متنوع دلچسپیوں کا مظہر ہیں۔

عصری تعلیم کے میدان میں بھی انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انگریزی میں ایم اے اور اردو میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس طرح دینی علوم کے ساتھ زبان و ادب کے میدان میں بھی انھوں نے گہری علمی بصیرت حاصل کی، جس کے نتیجے میں ان کی شخصیت دینی اور ادبی دونوں پہلوؤں سے ایک متوازن علمی شخصیت کے طور پر سامنے آئی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے تدریس کو پیشے کے طور پر اختیار کیا اور اس وقت وہ بطور استاد اپنے علاقے کے ایک سرکاری مدرسے میں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تدریس کے ذریعے وہ طلبہ کی علمی و فکری تربیت میں مصروف ہیں اور علم و ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کی علمی زندگی مطالعہ و تدریس سے عبارت ہے، اور وہ اپنی تعلیمی قابلیت کے ذریعے نئی نسل کو علم کی روشنی فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔

☆☆☆

ظفر النقی ابن کوثر علی (مولانا ڈاکٹر)

مولانا ڈاکٹر ظفر النقی ابن کوثر علی ضلع مئو (اتر پردیش) کے قصبہ کوپا گنج کے باشندہ ہیں۔ ان کی ولادت کے صحیح دن اور سال کے بارے میں یقینی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ خاندانی روایت کے مطابق ان کی والدہ کے بیان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش کے وقت علاقے میں ایک غیر معمولی اور شدید سیلاب آیا تھا۔ تاہم سرکاری دستاویزات اور تعلیمی اسناد میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۴ رفروری ۱۹۸۰ درج ہے، جو رسمی اور قانونی طور پر مستند ہے۔

ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے علاقے کے معروف دینی ادارے مدرسۂ مصباح العلوم سے کیا، جہاں انھوں نے بنیادی دینی تعلیم حاصل کی اور علمی سفر کی بنیاد رکھی۔ مزید تعلیم کے حصول کے لیے ۱۹۹۲ میں انھوں نے جامعۂ حیدریہ، خیرآباد میں داخلہ لیا۔ یہاں ایک سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے مدرسہ بابُ العلم، مبارک پور میں داخلہ لیا اور وہاں دینی و علمی تعلیم کے مختلف مراحل طے کیے۔ بعد ازاں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے سلطان المدارس، لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے باقاعدہ محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور ۲۰۰۳ء میں صدر الافاضل کی اعلیٰ سند حاصل کر کے فراغت پائی۔ دینی تعلیم کے ساتھ انھوں نے عصری تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے بی اے اور ایم۔ اے اردو کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے پروفیسر انیس

اشفاق کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی (ڈاکٹریٹ) کی ڈگری حاصل کی اور اس طرح دینی وعصری علوم کے امتزاج کے ساتھ اپنی علمی شخصیت کو مزید مستحکم کیا۔

پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز انھوں نے ایک گورنمنٹ کالج سے کیا، جہاں ۲۰۱۰ء سے ۲۰۲۰ء تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے تدریس، تحقیق اور علمی سرگرمیوں کے ذریعے طلبہ کی علمی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ بعدازاں وہ خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ سے وابستہ ہو گئے، جہاں اس وقت اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) کے عہدے پر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی ذہنی تشکیل میں جن اساتذہ کی شخصیت نے گہرا اثر ڈالا، ان میں بالخصوص مولانا ارشاد حسین اور پروفیسر انیس اشفاق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں اساتذہ کی علمی بصیرت، تدریسی مہارت اور رہنمائی نے ظفر النقی کی علمی و ذہنی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا اور ان کے تحقیقی و تدریسی رجحانات کو سمت عطا کی۔

ڈاکٹر ظفر النقی کی علمی سرگرمیوں کا دائرہ تدریس و تحقیق تک محدود نہیں بلکہ وہ دینی و ادبی ذوق کے حامل بھی ہیں۔ انھیں مجالس عزا پڑھنے کا شوق ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ، تحریر اور تدریس ان کی زندگی کے اہم مشاغل ہیں۔ اب تک ان کی کئی کتابیں اور تحقیقی و تنقیدی مضامین زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

ظہیر عباس ابن عزیز الحسن مرحوم (مولانا واعظ)

مولانا ظہیر عباس ابن مرحوم عزیز الحسن مئوناتھ بھنجن کے قدیم محلہ کیاری ٹولہ کے باشندہ ہیں۔ ان کی ولادت ۴/اکتوبر ۱۹۶۹ء کو ایک دینی و تہذیبی ماحول میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن ہی سے آپ کی شخصیت میں سنجیدگی، محنت اور حصولِ علم کا غیر معمولی شوق پیدا ہوا۔

ابتدائی تربیت گھر کے علمی ماحول میں ہوئی، جس نے آپ کے اندر علم و ادب سے گہری وابستگی پیدا کی۔ ابتدائی تعلیم شہر کے ایک مدرسہ میں ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ بابُ العلم مبارک پور گئے، جہاں سے ثانوی تعلیم مکمل کی۔ اس دور میں انھوں نے غیر معمولی ذہانت، شوقِ مطالعہ اور تعلیمی انہماک کا مظاہرہ کیا، جس کی بنا پر اساتذہ اور رفقائے درس میں آپ کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہاں انھوں نے مولانا ارشاد حسین سے خصوصی کسب فیض کیا۔

ثانوی تعلیم کے بعد آپ نے اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے ملک کے ممتاز علمی ادارے سلطان المدارس میں داخلہ لیا۔ یہاں آپ نے فقہ، تفسیر، حدیث، عربی ادب اور دیگر دینی علوم میں گہری بصیرت حاصل کی۔

اپنی مسلسل محنت، علمی ذوق اور غیر معمولی استعداد کے باعث آپ نے یہاں سے صدرالافاضل کی سند حاصل کی۔ دینی تعلیم کے ساتھ آپ نے خطابت اور دعوت وتبلیغ کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مدرسۃ الواعظین سے 'واعظ' کی سند حاصل کی۔ آپ کی گفتگو میں علمی استدلال، فکری پختگی اور اثر آفرینی موجود ہے۔ آپ نے عصری تعلیم کی اہمیت کو بھی محسوس کیا اور اردو زبان وادب میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس تعلیمی پس منظر نے آپ کی شخصیت میں دینی وعصری علوم کا حسین امتزاج پیدا کیا اور آپ کو ایک ہمہ جہت علمی وانتظامی شخصیت کے طور پر ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد سرکاری خدمات کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی غیر معمولی محنت، ذہانت اور عزمِ صمیم کے ساتھ اتر پردیش پبلک سروس کمیشن (UPPSC) کا مسابقتی امتحان پاس کیا۔ یہ کامیابی آپ کی مسلسل جدوجہد، علمی استقامت اور بلند حوصلگی کا واضح ثبوت ہے۔ اس نمایاں کامیابی کے نتیجے میں آپ کا انتخاب اقلیتی بہبود افسر (Minority Welfare Officer) کے منصب پر ہوا۔

بطور اقلیتی بہبود افسر آپ نے اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں خدمات انجام دیں اور ہر مقام پر اپنی انتظامی صلاحیت، فرض شناسی اور عوامی خدمت کے جذبے کی بدولت منفرد شناخت قائم کی۔ آپ نے خصوصاً اقلیتی طبقات کی تعلیمی، سماجی اور معاشی ترقی کے لیے متعدد موثر اقدامات کیے اور اپنی ذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ فی الوقت اسی منصب پر فائز ہیں اور پوری سنجیدگی و اخلاص کے ساتھ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی زندگی اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ مسلسل محنت، مضبوط عزم اور خدمتِ خلق کا جذبہ انسان کو کامیابی کی بلند منزلوں تک پہنچا دیتا ہے۔ آپ کی شخصیت نوجوان نسل کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

عابد حسین حیدری ابن یعقوب حسین مرحوم (مولانا پروفیسر)

مولانا پروفیسر عابد حسین حیدری عصر حاضر کے ان ممتاز اہلِ علم وادب میں شمار ہوتے ہیں جن کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ اردو زبان وادب، بالخصوص رثائی ادب کے محقق، ناقد اور استاد کی حیثیت سے مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ تدریس، تحقیق، تصنیف، تدوین اور ادارتی خدمات یہ تمام میدان ان کی علمی وسعت اور عملی توانائی کا بین ثبوت ہیں۔

پروفیسر عابد حسین حیدری ۱۰؍نومبر ۱۹۶۸ء کو قصبہ کوپا گنج، ضلع مئو کے محلہ نیا پورہ میں اپنے آبائی

مکان میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جہاں دین، علم اور تہذیبی اقدار کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ والد یعقوب حسین مرحوم، سنجیدہ اور ذمہ دار شخصیت کے حامل تھے جن کی سادہ طرزِ زندگی اور اخلاقی تربیت نے عابد حسین حیدری کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

قرآنِ مجید اور اردو زبان کی ابتدائی تعلیم حاجی عبید اللہ انصاری سے حاصل کی۔ بعد ازاں مدرسہ امامیہ، کوپاگنج میں ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ مصباح العلوم، کوپاگنج اور مدرسہ جامع العلوم میں داخل ہو کر عربی اول تک تعلیم مکمل کی۔ ان ابتدائی دینی مراحل نے ان کے اندر مطالعہ اور علمی انہماک کی وہ عادتیں راسخ کیں جو بعد کی زندگی میں نمایاں طور پر جلوہ گر ہوئیں۔ ۱۹۸۲ء میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ لیا، جو شیعہ دینیات کا ایک عظیم اور تاریخی مرکز ہے۔ یہاں نہایت یکسوئی اور محنت کے ساتھ درسِ نظامی کے مراحل طے کیے۔ سلطان المدارس کا علمی ماحول، جید اساتذہ کی صحبت اور علمی مباحث نے آپ کی صلاحیتوں کو جِلا بخشی۔ ۱۹۹۵ء میں صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔

انھوں نے عربی و فارسی بورڈ کے تحت منشی، مولوی، عالم، کامل، فاضل ادب، فاضل دینیات اور فاضل طب کی اسناد حاصل کر کے اپنی علمی وسعت کو مزید مستحکم کیا۔ اس کے علاوہ مدرسہ باب العلم، مبارک پور سے عربی و فارسی بورڈ کے فاضل فقہ کا امتحان بھی کامیابی سے پاس کیا، جس کے لیے آپ نے مولانا ارشاد حسین مرحوم سے خصوصی استفادہ کیا۔ مولانا ارشاد حسین مرحوم سے آپ نے سبعہ معلقات اور مقاماتِ حریری کے دروس حاصل کیے، جو آپ کے کلاسیکی عربی ادب پر عبور کا ثبوت ہیں۔

دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے عصری علوم کو بھی وقت کی اہم ضرورت سمجھا۔ سلطان المدارس میں تعلیم کے دوران ہی آپ نے شعبۂ علومِ مشرقیات، لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر ماہر (۱۹۸۴ء)، دبیر کامل (۱۹۸۵ء) اور فاضل تفسیر (۱۹۸۶ء) کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد شیعہ پی جی کالج، لکھنؤ سے ۱۹۸۹ء میں بی۔اے اور ۱۹۹۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔

۱۹۹۶ء میں یو جی سی نیٹ میں کامیابی حاصل کی جو آپ کی علمی صلاحیت کا اعتراف تھا۔ ۱۵/ جنوری ۲۰۰۱ء کو اتر پردیش ہائر ایجوکیشن کمیشن، الہ آباد کے ذریعے منتخب ہو کر ایم جی ایم، پوسٹ گریجویٹ کالج، سنبھل میں بحیثیت لکچرر (اردو) مقرر ہوئے۔ تب سے اب تک اسی ادارے میں نہایت ذمہ داری سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ فی الحال وہ بحیثیت پروفیسر و صدر شعبہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹/ جولائی ۲۰۱۶ء سے ۹/ نومبر ۲۰۲۱ء تک اس کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے بھی انتظامی خدمات انجام دیں۔

۲۰۰۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی، جس میں ان کے نگراں پروفیسر انیس اشفاق عابدی تھے۔ان کی تحقیق نے اردو کے رثائی ادب میں کئی اہم نئی جہات متعارف کرائیں۔

پروفیسر عابد حسین حیدری کی تحقیقی، علمی اور ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ انھوں نے اردو ادب، خصوصاً رثائی ادب کو موضوعاتی یا روایتی دائرے میں محدود نہیں رکھا بلکہ اسے فکری، جمالیاتی اور تنقیدی سطح پر مضبوط علمی اساس فراہم کی۔ان کی تحقیقات میں متن کی صحت، حوالہ جاتی دیانت، تاریخی شعور اور تنقیدی توازن موجود ہے۔اسی طرح ان کے ادبی مضامین میں زبان کی شائستگی موجود ہے۔ عابد حیدری ۲۴ رکتابوں کے مصنف و مولف ہیں اور سینکڑوں تحقیقی و تنقیدی مضامین اور کتابوں پر تبصرے ملک و بیرونِ ملک کے معتبر و موقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ رثائی ادب کے رسیا کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ان کی اہم تحقیقی و تنقیدی کتب یہ ہیں:

۱۔ادبیاتِ کشمیر	۲۔ارمغانِ محسن
۳۔اردو میں شخصی مرثیے کی روایت	۴۔علی جواد زیدی: شخص اور شاعر
۵۔رثائیات: تجزیات و شخصیات	۶۔دبستانِ زید پور کی مرثیہ گوئی
۷۔اردو کے منتخب شخصی مرثیے	۸۔اردو مرثیے کی جمالیات
۹۔میرے تجزیاتی اوراق	۱۰۔تخیلاتِ عابد حیدری
۱۱۔دبستانِ میرٹھ کی مرثیہ گوئی	۱۲۔سنبھل میں اردو کی ثقافتی و ادبی روایت

مہاراشٹرا ایجوکیشن بورڈ، پونہ کے لیے آپ نے زراعت، سیاسیات اور نفسیات پر تین کتابیں مرتب کیں جو وہاں معاون نصابی کتب کے طور پر شاملِ نصاب ہیں۔صحافت کے میدان میں بھی ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔سہ ماہی فیضانِ ادب (پورہ معروف، مئو) کے شعبۂ ادارت کے فعال رکن، ایم جی ایم کالج میگزین کے چیف ایڈیٹر اور سہ لسانی ایم جی ایم نیوز لیٹر کے نگراں بھی ہیں۔

☆☆☆

عترت حسین ابن فصیح احمد (مولانا ڈاکٹر سید)

مولانا سید عترت حسین ابن فصیح احمد کی ولادت ۵ رمئی ۱۹۷۵ء کو شاہ دِیوَئت، ضلع اعظم گڑھ، اتر پردیش کے ایک علمی و دینی ماحول میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم وطنِ مالوف کے مکتبِ امامیہ میں حاصل کی۔ پندرہ برس کی عمر میں مدرسہ باب العلم، مبارک پور میں باقاعدہ دینی تعلیم کا آغاز کیا اور پانچ سال کی مسلسل

محنت و یکسوئی کے بعد مولوی کلاس، الٰہ آباد (انگریزی مضمون کے ساتھ) فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا۔ اس دور میں انھیں مولانا ارشاد حسین مرحوم سے خصوصی استفادہ کا موقع ملا، جس سے ان کی فکری تشکیل اور علمی ذوق کی آبیاری ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے مولانا سید عترت حسین نے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا، جہاں تقریباً نو برس قیام کر کے دینی علوم کی تکمیل کی۔ یہاں سے ممتاز الافاضل کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ اسی دوران انھوں نے مدرسۃ الواعظین، لکھنؤ سے واعظ کا کورس بھی مکمل کیا، جس سے ان کی خطیبانہ صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں علمی گرفت مزید مضبوط ہوئی۔

مزید اعلیٰ تعلیم اور تحقیقی ذوق وشوق نے انھیں ۱۹۹۷ء میں قمِ مقدسہ، ایران کی طرف متوجہ کیا، جہاں سولہ برس قیام کر کے سطحِ چہار (درسِ خارج) تک تعلیم مکمل کی۔ جامعۃ المصطفیٰ، قم سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر کے بین الاقوامی سطح پر دینی و تحقیقی قابلیت کا اعتراف کروایا۔ قم کے علمی ماحول میں طویل قیام نے ان کے فکری افق کو وسعت بخشی اور انھیں کلاسیکی و جدید دینی مباحث پر گہری نظر عطا کی۔ ہندوستان واپسی کے بعد مسلسل دو برس تک دہلی، گجرات، بہار اور اتر پردیش کے مختلف علاقوں میں تبلیغی و اصلاحی دورے کیے، جن کے ذریعے اپنے علم کو عوامی سطح پر موثر انداز میں منتقل کیا۔

۲۰۱۸ء سے مولانا سید عترت حسین جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں درجاتِ عالیہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور علمی و تربیتی میدان میں سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ جامعۃ الہدیٰ اعظم گڑھ (مدرسۂ خواہران، وابستہ بہ جامعۃ المصطفیٰ، ایران) کے موسس و مدیر ہیں، نیز غدیر مشن، قم ایران کے بانی بھی ہیں۔ اس کے علاوہ جعفریہ سوسائٹی، اعظم گڑھ کے موسس و سکریٹری، دارالقرآن جامعہ ناظمیہ لکھنؤ کے نگراں کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کی ڈگری حاصل کر کے اپنی ادبی وابستگی اور لسانی شعور کو بھی مستحکم کیا۔ اس طرح مولانا سید عترت حسین کی شخصیت تدریس، تبلیغ اور تنظیمی قیادت کا ایک جامع اور باوقار نمونہ بن گئی۔

☆☆☆

عون محمد ابنِ ضرغام حیدر (مولوی)

عون محمد ضلع مئو کے قصبہ بڑا گاؤں، گھوسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش یکم اکتوبر ۱۹۹۴ء کو ایک ایسے ماحول میں ہوئی جہاں مذہبی اقدار، تہذیبی روایت اور دینی شعور زندگی کا فطری حصہ رہے ہیں۔ اس فضا نے ان کے مزاج میں کم عمری سے ہی سنجیدگی، ذمہ داری اور دینی وابستگی کو پروان چڑھایا۔ گھریلو

تربیت نے انھیں علم کو وقار، اور خدمت دین کو زندگی کا مقصد سمجھنے کا شعور عطا کیا۔

ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز وطن کے معروف ادارے مدرسہ حسینیہ سے ہوا، جہاں انھوں نے دینیات کی بنیادی تعلیم حاصل کی۔ قرآن فہمی، ابتدائی فقہی مباحث اور دینی اخلاقیات سے یہ پہلا تعارف ان کی علمی سمت متعین کرنے میں معاون ثابت ہوا۔ مزید علمی ارتقا کے لیے ۲۰۰۷ء میں انھوں نے مدرسہ بابُ العلم، مبارک پور میں داخلہ لیا۔ مدرسہ بابُ العلم میں انھوں نے مولانا ارشاد حسین کی نگرانی میں درسِ نظامی کے مراحل محنت اور یکسوئی کے ساتھ طے کیے اور بالآخر عالم کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے علمی سفر کو مزید وسعت دینے کے لیے وہ ایران روانہ ہوئے، جہاں مدرسہ امام خمینی سے کارشناسی کی تعلیم مکمل کی۔ ایران کے علمی ماحول نے ان کے زاویۂ نظر کو مزید نکھرنے کا موقع فراہم کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد عون محمد اس وقت بنارس میں مبلغ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی دعوتی سرگرمیوں کا محور اصلاحِ معاشرہ، اخلاقی بیداری اور دینی شعور کی ترسیل ہے۔ وہ تبلیغ کو مسلسل فکری مکالمہ سمجھتے ہیں، جس میں علم، عمل اور اخلاص کا امتزاج موجود ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت ایک ایسے نوجوان عالم کی نمائندگی کرتی ہے جو مضبوط علمی بنیاد اور عملی وابستگی کے ساتھ دین کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔

☆☆☆

علی اصغر ابن محمد حیدر (مولوی ڈاکٹر)

مولوی علی اصغر ابنِ محمد حیدر کا تعلق ضلع مئو کے معروف قصبے بڑا گاؤں، گھوسی سے ہے۔ ۱۹۹۱ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن کے ایام اسی گاؤں میں بسر ہوئے، جہاں ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کیے۔ دینی تعلیم کے باب میں علی اصغر کی بنیاد مدرسہ باب العلم میں پڑی، جہاں انھوں نے وہاں کے جید اساتذہ بالخصوص مولانا ارشاد حسین مرحوم سے نہ صرف نصابی علوم حاصل کیے بلکہ زبان، بیان اور فہم متن کی وہ صلاحیتیں بھی پیدا کیں جو آگے چل کر ان کی علمی شناخت کا ذریعہ بنیں۔ بعد ازاں انھوں نے جامعہ ناظمیہ، لکھنؤ میں اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی اور یہاں سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔ جامعہ ناظمیہ کا علمی ماحول، اساتذہ کی رہنمائی اور مباحثہ و مطالعہ کی روایت نے ان کے اندر تحقیقی و تنقیدی شعور کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

عصری تعلیم کی طرف ان کا رجحان بھی اتنا ہی سنجیدہ اور منظم رہا۔ اسی تسلسل میں انھوں نے شیعہ پی۔ جی کالج سے، جو لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق ہے، گریجویشن مکمل کیا۔ مدرسہ اور کالج دونوں نظامِ تعلیم سے

وابستگی نے ان کے ذہن کو روایت اور جدّت کے درمیان ایک بامعنی توازن پیدا کیا، جو ان کی تحریروں اور علمی رویّے میں صاف جھلکتا ہے۔ اعلیٰ تحقیق کے میدان میں علی اصغر کی علمی زندگی کا نقطۂ عروج جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی بنی، جہاں سے انھوں نے فارسی میں ایم اے (۲۰۱۶ء)، ایم فل (۲۰۱۸ء) اور پی ایچ۔ ڈی (۲۰۲۲ء) جیسی اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔ یہاں انھوں نے تحقیق کے جدید مناہج، بین المتونی مطالعے اور علمی دیانت کے اصولوں کو عملاً برتا۔ جے این یو کے کثیر الثقافتی اور علمی تنوع سے بھرپور ماحول نے ان کی فکر میں وسعت پیدا کی۔

علی اصغر کا اصل مشغلہ تعلیم و تدریس ہے۔ اس کے ساتھ مقالہ نگاری، تصنیف و تالیف، ترجمہ اور شاعری میں بھی سرگرم رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں علمی استدلال، زبان کی شستگی اور موضوع سے گہری وابستگی نمایاں ہے، جب کہ شاعری میں فکری لطافت اور تہذیبی شعور کی جھلک ملتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت ایک ایسے عالم و محقق کی تصویر پیش کرتی ہے جو علمی روایت کا امین بھی ہے اور عصری تقاضوں سے پوری طرح باخبر بھی۔ ۲۰۲۲ء میں ان کا فارسی شعری مجموعہ بعنوان 'حضرت دہلی' منظر عام پر آچکا ہے ساتھ ہی تقریباً پچیس تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ امید ہے یہ سلسلہ اسی رفتار سے جاری و ساری رہے گا۔

☆☆☆

فیضان جعفر علی ابن مولانا تفضّل مہدی (مولوی ڈاکٹر)

مولوی فیضان جعفر علی ولد مولانا تفضّل مہدی ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو پورہ معروف کے ایک علمی و مذہبی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے مدرسہ امامیہ پورہ معروف سے حاصل کی۔ اس کے بعد چند برس جامعہ حیدریہ خیرآباد میں زیرِ تعلیم رہے۔ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۸ء تک انھوں نے لکھنؤ کے معروف علمی ادارے مدرسہ سلطان المدارس میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران انھوں نے عصری تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی اور شیعہ کالج (لکھنؤ یونیورسٹی) سے ۲۰۰۶ء میں بی اے اور ۲۰۰۸ء میں ایم اے اردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایران کا رخ کیا، جہاں انھوں نے جامعہ اہل البیت (علیہم السلام) سے تاریخِ اسلام میں ایم اے کیا۔ علمی جستجو اور تحقیقی ذوق نے انھیں مزید آگے پڑھنے پر آمادہ کیا، چنانچہ انھوں نے تہران یونیورسٹی سے تاریخِ اسلام میں ہی پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے دینی و علمی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ امامت و خطابت کے میدان میں وہ سرگرم عمل ہیں اور مختلف علمی و مذہبی مجالس میں اپنے خطبات اور بیانات کے ذریعے دینی معارف کو عام کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تصنیف، تدوین اور ترجمہ کے میدان میں بھی مسلسل مصروفِ عمل ہیں۔ فی الوقت لکھنؤ کے علمی مرکز، حوزۂ علمیہ عقیلہ بنی ہاشم میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، جہاں وہ طلبۂ علومِ دینیہ کی علمی تربیت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

علمی و تحقیقی میدان میں ان کی متعدد تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں 'تاریخ پورہ معروف اور شیعہ علما و اکابر (اردو)' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس میں ایک اہم علمی و مذہبی مرکز اور اس سے وابستہ شخصیات کی تاریخ کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اسی طرح فارسی زبان میں ان کی اہم کتابیں 'تحولات اجتماعی و فرہنگی شیعیان اودھ'، 'تذکرہ علمای شیعی مبارک پور' اور 'تاریخ نگاری منہاج سراج' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے والد گرامی کی علمی و شخصی خدمات پر مبنی کتاب 'مولانا تفضّل مہدی: شخصی و علمی زاویے' کی تالیف میں مصروف ہیں جو زیرِ تالیف ہے۔

تدوین کے میدان میں بھی انھوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتابوں میں 'وہی عزمی جو تھا بلند اقبال'، 'مظہر'، 'سلطان آزاد: شخص اور عکس'، 'تخیلات عابد حیدری' اور 'نقوشِ مانی' شامل ہیں۔ ان کتابوں کی تدوین کے ذریعے انھوں نے مختلف علمی و ادبی اور مذہبی شخصیات کے افکار و آثار کو منظم انداز میں پیش کیا ہے۔

ترجمہ کے میدان میں بھی فیضان جعفر علی نے نمایاں کام کیا ہے۔ ان کے تراجم میں 'اسئلہ یوسفیہ' (انصاریان پبلشر، قم، ۲۰۱۵ء)، 'حامیۃ الرسول' (قم، ۲۰۱۸)، 'ملیکا' ([اردو و ہندی]، وحدت پبلی کیشنز لکھنؤ، ۲۰۱۸ء) اور 'عاشورا' ([اردو و ہندی]، وحدت پبلی کیشنز، لکھنؤ، ۲۰۱۸ء) شامل ہیں۔

مقالہ نگاری کے میدان میں بھی ان کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ فارسی زبان میں لکھے گئے ان کے اہم مقالات میں 'مطالعۂ قرآنی پژوہشگران ہندو مذہب'، 'تاریخ نگاری و تاریخ نگاری منہاج سراج' اور 'مراکز علمی نوین شیعہ در اودھ' شامل ہیں۔ اسی طرح اردو میں ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین 'اسلامی ثقافت کا قدیم شہر منصورہ'، 'اردو ادبِ اطفال پر مظفر حنفی کا فیضان' اور 'ہندوستان میں انساب نگاری کی روایت' قابلِ توجہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد مذہبی و علمی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں، اور کئی کتابوں کے لیے انھوں نے مبسوط مقدمے بھی تحریر کیے ہیں۔

☆☆☆

فیضان حیدر ابن مولانا ارشاد حسین مرحوم (مولوی ڈاکٹر)

راقم الحروف کا نام فیضان حیدر، والد کا نام مولانا ارشاد حسین اور والدہ کا نام شمیم زہرا ہے۔ ارجون ۱۹۸۶ء کو قصبہ پورہ معروف، ضلع مئو، اتر پردیش کے ایک متوسط اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ جب ہوش سنبھالا تو والد نے محلہ کے مکتب امامیہ میں داخل کر دیا جہاں ابتدائی تعلیم و تربیت پائی۔ متوسط اور اعلیٰ تعلیم مدرسہ باب العلم مبارک پور، سلطان المدارس لکھنؤ اور جامعہ ناظمیہ لکھنؤ سے حاصل کی، اور بالآخر جامعہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔

۲۰۰۳ء میں شیعہ کالج لکھنؤ کی ایوننگ شفٹ میں بی۔اے میں داخلہ لیا اور اس کے بعد ۲۰۰۸ میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۲۰۰۸ء ہی میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی کا رخ کیا، جہاں سے ۲۰۱۰ء میں ایم اے (فارسی) پاس کیا۔ ایم فل میں داخلہ ہونے کے بعد ایرانی ٹسٹ میں کامیابی حاصل کی اور اکتوبر ۲۰۱۰ء میں ایران کا سفر کیا۔ وہاں مدرسہ امام خمینی میں جنوری ۲۰۲۳ء تک زیر تعلیم رہا۔ مارچ ۲۰۱۳ میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا اور ۲۰۱۸ء میں ''سفرنامہ نویسی فارسی در ہند'' کے عنوان پر فارسی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۲۰۱۹ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا اور ''بیسویں صدی میں اردو سفرنامہ: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان پر ۲۰۲۴ء میں ڈاکٹریٹ (اردو) کی سند حاصل کی۔ فی الحال للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے ایک آئینی کالج (سی۔ایم کالج) میں ارجولائی ۲۰۲۲ء سے استاد کی حیثیت سے وابستہ ہوں۔

حقیر کی تصانیف میں اظہارِ نظر (۲۰۱۵ء)، رباعیاتِ خیام مع اردو ترجمہ و معانی الفاظ (۲۰۱۶ء)، تاریخ گورکھپور [فارسی] (۲۰۱۶ء)، رہنمائے ازدواج [فارسی سے ترجمہ] (۲۰۱۶ء)، انتخاب کلام پروین اعتصامی (۲۰۱۷ء) اور متن، معنی اور تنقید (۲۰۲۶ء) شامل ہیں، جو اردو و فارسی ادب کے تحقیقی، تنقیدی اور تدوینی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ علاوہ برایں پچاس سے زائد علمی و تحقیقی مضامین اور سو سے زیادہ کتابوں پر تبصرے ملک و بیرونِ ملک کے معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف کی ادارت میں ۲۰۱۶ء سے بین الاقوامی علمی، ادبی و تحقیقی جریدہ 'فیضانِ ادب' باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

☆☆☆

کاظم حسین مظہری ابن مظہر حسین (مولوی)

کاظم حسین مظہری ابن مظہر حسین گھوسی ضلع مئو کے موضع بڑا گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ان کی

تاریخ ولادت ۲۰ر دسمبر ۱۹۹۴ء ہے۔ انھوں نے دینی ماحول میں پرورش پائی اور بچپن ہی سے تعلیم کے سلسلے میں سنجیدگی اور شوق کا مظاہرہ کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے کے مدرسہ حسینیہ بڑا گاؤں گھوسی میں حاصل کی۔ ۲۰۰۷ء میں اسی مدرسے سے درجہ ششم پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے مدرسہ بابُ العلم مبارک پور کا رخ کیا، جہاں ۱۵ر جولائی ۲۰۰۷ء کو درجہ ششم میں داخلہ لیا۔ مدرسہ بابُ العلم میں تقریباً تین سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ ناظمیہ، لکھنؤ میں داخلہ لیا، اور مسلسل علمی محنت اور سنجیدہ مطالعے کے بعد ۲۰۱۸ء میں یہاں سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کر کے فراغت پائی۔ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈپلومہ اِن الیمنٹری ایجوکیشن (D.El.Ed) بھی کیا۔

۲۰۱۹ء سے مدرسہ حسینیہ بڑا گاؤں گھوسی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور اسی ادارے کے مدیر کی حیثیت سے بھی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی وفلاحی سرگرمیوں میں بھی فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ سماجی خدمت کے میدان میں کاظم حسین مظہری کی سرگرمیاں قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں توحید المسلمین ٹرسٹ کے ذریعے ضلع مئو کے مستحق اور باصلاحیت طلبہ کو اسکالرشپ فراہم کی جاتی ہے، جب کہ مختلف تعلیمی اداروں کے تعاون سے محنتی اور ضرورت مند طلبہ کو وظائف دلانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

کاظم علی ابن ظہیر حسن (مولانا)

مولانا کاظم علی ابن ظہیر حسن ۴ر جنوری ۱۹۷۱ء کو قصبہ جلال پور، امبیڈکر نگر کے محلہ عثمان پور میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک دینی وعلمی ماحول رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جس نے ان کی فکری و مذہبی تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے دینی علوم کے حصول کی طرف توجہ دی اور باقاعدہ طور پر مدارسِ دینیہ میں تعلیم حاصل کی۔ اپنی محنت، لگن اور مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں انھوں نے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور 'ممتاز الافاضل' کی سند حاصل کی، بعد ازاں مدرسۃ الواعظین میں داخل ہوئے اور وہاں سے واعظ کی سند حاصل کی، جو دینی علوم میں ان کی علمی استعداد اور قابلیت کی مظہر ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا کاظم علی واعظ نے تدریسی وتبلیغی خدمات کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ اس وقت وہ مدرسہ باب العلم میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، جہاں وہ طلبہ کو دینی علوم کی تعلیم

دیتے ہوئے ان کی علمی و اخلاقی تربیت میں مصروف ہیں۔ تدریس کے ساتھ ساتھ وہ تبلیغ دین کے میدان میں بھی سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مختلف مقامات پر منعقد ہونے والی مجالس، محافل اور مذہبی اجتماعات میں شرکت کر کے دین اسلام اور اہلِ بیت کی تعلیمات کو عام کرتے ہیں اور اپنے خطابات کے ذریعے سامعین کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مولانا کاظم علی واعظ کی دینی خدمات کا ایک نمایاں پہلو مجالس عزا اور مذہبی محافل میں ان کی فعال شرکت ہے۔ وہ ایک باوقار واعظ کے طور پر مختلف علاقوں میں مجالس اور محافل سے خطاب کرتے ہیں اور اپنے موثر اندازِ بیان کے ذریعے مذہبی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کا طریقۂ تدریس جامع اور استدلالی ہے۔ راقم الحروف خود ان کا شاگرد رہ چکا ہے۔ مشکل سے مشکل مسائل کو نہایت سادہ اور دل نشیں انداز میں بیان کرنا ان کا خاص وصف ہے۔ وہ طلبہ کو سوال کرنے کی آزادی دیتے اور نہایت تحمل کے ساتھ ان کے اشکالات دور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد کردار سازی اور اخلاقی تربیت بھی تھا، اسی لیے وہ علمی تربیت کے ساتھ عملی اصلاح پر بھی خاص توجہ دیتے تھے۔

☆☆☆

کرار حسین اظہری ابن جناب الحاج مزمل حسین (مولانا)

مولانا کرار حسین اظہری ابن جناب الحاج مزمل حسین، ضلع اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے تاریخی اور علمی قصبہ مبارک پور کے معروف محلہ پورہ صوفی متصل برئی ٹولہ کے باشندہ ہیں۔ ان کی تاریخِ ولادت ۲۱ ستمبر ۱۹۶۶ء ہے۔ وہ ایک دینی اور علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے دینی و ادبی علوم کے حصول کی جانب باقاعدہ توجہ دی اور مختلف تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے متعدد اسناد حاصل کیں۔

تعلیمی اعتبار سے مولانا کرار حسین اظہری نے الہ آباد بورڈ سے منشی، مولوی، کامل، عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب اور فاضل معقولات جیسی اعلیٰ دینی و علمی اسناد حاصل کیں، جو ان کی علمی محنت اور سنجیدہ مطالعہ کا واضح ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے جامعہ اردو، علی گڑھ سے ابتدائی اور ادیب ماہر کی اسناد بھی حاصل کیں، جب کہ لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر ماہر کی سند حاصل کر کے اپنی ادبی و علمی استعداد کو مزید مستحکم کیا۔ اس طرح دینی و ادبی علوم کے مختلف میدانوں میں انھوں نے منظم اور باقاعدہ تعلیم حاصل کی، جس کے نتیجے میں ان کی علمی شخصیت ہمہ جہت انداز میں سامنے آئی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد کرار حسین اظہری نے دینی و سماجی خدمات کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ وہ

اپنے علاقے میں اقامۂ نمازِ جماعت کا اہتمام کرتے اور مذہبی امور میں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نکاح اور طلاق جیسے شرعی معاملات میں رہنمائی فراہم کرنا بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ دینی خدمات کے ساتھ وہ تدریس کے میدان میں بھی سرگرم ہیں اور طلبہ کو دینی و ادبی علوم کی تعلیم دے کر علمی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ مزید برآں وہ تالیف و ترجمہ کے میدان میں بھی مصروفِ عمل ہیں اور علمی و مذہبی موضوعات پر اپنی کاوشوں کے ذریعے علم و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ مولانا کرار حسین اظہری ایک ایسی علمی و دینی شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں جن کی زندگی تدریس، اقامۂ جماعت، شرعی رہنمائی، تصنیف و ترجمہ اور علمی خدمت کے مختلف پہلوؤں سے عبارت ہے۔ اپنی مسلسل علمی و عملی سرگرمیوں کے باعث وہ اپنے علاقے میں دینی رہنمائی اور علمی خدمت کے حوالے سے ایک معتبر اور باوقار مقام رکھتے ہیں۔

☆☆☆

کلب عباس ابن علمدار عباس (مولوی ڈاکٹر)

مولوی کلب عباس ابنِ علمدار عباس معاصر علمی و ادبی حلقوں میں سنجیدہ محققانہ شعور کی وجہ سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ولادت ۱۶ رمئی ۱۹۸۸ء کو محلہ بازید پورہ، کوپاگنج، ضلع مئو میں ہوئی۔ یہ خطہ اپنی مذہبی روایات کے سبب پہلے ہی سے علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے، چنانچہ اس فضا نے کلب عباس کی ذہنی ساخت اور فکری سمت متعین کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کم عمری سے مطالعے، زبان و بیان اور دینی مباحث سے شغف نے علمی جستجو اور تحقیقی مزاج کو بیدار کیا، جو آگے چل کر باقاعدہ ادبی سفر کی صورت اختیار کر گیا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ جعفریہ کوپاگنج میں حاصل کی اور باقاعدہ دینی تعلیم کا تسلسل سلطان المدارس، لکھنؤ جیسے معتبر ادارے سے جڑتا ہے، جہاں نہایت محنت اور یکسوئی کے ساتھ درسِ نظامی کے مراحل طے کیے اور ۲۰۱۳ء میں صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ ان کو مولانا ارشاد حسین مرحوم سے خصوصی استفادے کا موقع بھی ملا، جن کی علمی بصیرت اور تحقیقی دیانت نے مزاج میں سنجیدگی، ضبط اور علمی وقار پیدا کیا۔ مولانا مرحوم کی رہنمائی سے کلاسیکی متون کی افہام و تفہیم کا ملکہ بھی پیدا ہوا۔

دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ کلب عباس نے عصری تحقیقی میدان میں بھی اپنی شناخت قائم کی۔ شیعہ کالج لکھنؤ سے ۲۰۰۹ء میں بی۔اے اور ۲۰۱۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی اسناد حاصل کیں۔ فارسی زبان و ادب سے گہری وابستگی کے نتیجے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس سے ۲۰۱۷ء

میں فارسی میں ایم اے اور ۲۰۲۲ میں ''معرفی و انتخاب نوشتہ ہای مہم ادبیات فارسی علمای اودھ'' کے موضوع پر یہیں سے پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ان کی تحقیقات اردو، فارسی ادبی روایت اور برصغیر کی تہذیبی ہم آہنگی کے مطالعے میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس تناظر میں ان کی تصنیف ''تاریخ مرثیہ نگاری درشہر لکھنؤ و تاثیر پذیری آن از فرہنگ و مظاہر ہندویی'' خصوصی اہمیت رکھتی ہے، جس میں لکھنؤ کی مرثیہ نگاری کی تاریخ کو ہندوستانی تہذیب، بالخصوص ہندو ثقافتی مظاہر کے اثرات کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے۔یہ کتاب انتشارات سمیر تہران سے ۲۰۱۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔

عملی اور تخلیقی سطح پر کلب عباس خطابت، شاعری اور مضمون نگاری کے میدان میں سرگرم ہیں۔ خطابت میں انداز متوازن اور استدلالی ہے، جس میں روایت کی پاسداری کے ساتھ عصری شعور کی جھلک بھی ملتی ہے۔شاعری میں ان کا رجحان سنجیدہ مضامین اور مذہبی موضوعات کی طرف ہے، جب کہ مضمون نگاری میں تحقیقی ضبط، حوالہ جاتی احتیاط اور زبان کی شائستگی جیسے اوصاف نمایاں ہیں۔اب تک ۱۳/مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

گوہر عباس ابن اکبر علی (مولانا ڈاکٹر)

مولانا گوہر عباس کا تعلق ضلع مئو کے معروف قصبے کوپا گنج سے ہے، جو دینی شعور اور علمی روایت کے اعتبار سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ولادت ۱۶/جنوری ۱۹۷۷ء کو اسی علاقے میں ہوئی۔ان کے مزاج میں کم عمری ہی سے وقار اور سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز قصبے کے جامعہ جعفریہ سے ہوا جہاں دینی تعلیم کی ابتدائی اساس قائم کی۔قرآنِ مجید کی تعلیم، تجوید اور بنیادی دینی مضامین سے شناسائی نے ان کے ذہن میں مذہبی شعور کو راسخ کیا۔بعد ازاں اعلیٰ دینی تعلیم کی غرض سے نجفی ہاؤس، بمبئی تشریف لے گئے، جو اپنی مضبوط علمی روایت اور منظم نصاب کے لیے معروف تھا۔یہاں انھوں نے فقہ، اصولِ فقہ اور دیگر مروجہ علومِ عقلی و نقلی میں مہارت حاصل کی۔الہ آباد بورڈ کے امتحانات کے دوران مدرسہ بابُ العلم میں بھی قیام رہا اور یہاں مولانا ارشاد حسین سے خصوصی استفادے کا موقع ملا، جو ان کی علمی تشکیل میں نہایت اہم ثابت ہوا۔مولانا مرحوم کے تدریسی و استدلالی انداز اور فکری اعتدال نے گوہر عباس کے ذہن میں تحقیق، تنقید اور تدبر کی وہ صلاحیتیں پیدا کیں جو ایک سنجیدہ عالم کی پہچان سمجھی جاتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے میدان میں انھوں نے اپنے علمی سفر کو بین الاقوامی سطح تک وسعت دیتے ہوئے

ایران کا رخ کیا، جہاں جامعۃ المصطفیٰ جیسے معتبر عالمی علمی ادارے سے وابستہ ہوئے۔ یہاں انھوں نے نہ صرف اسلامی علوم میں گہرے مطالعے کا موقع پایا بلکہ تحقیق کے جدید مناہج سے بھی استفادہ کیا۔ اسی ادارے سے انھوں نے سطح چہار تک کی تعلیم حاصل کی، جو ان کی علمی کاوشوں اور تحقیقی صلاحیت کا اعتراف ہے۔ ایران کے علمی وفکری ماحول نے ان کے مطالعے کو وسعت اور ان کی فکر کو عالمی تناظر عطا کیا۔

ایران سے واپسی کے بعد انھوں نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے ۲۰۲۲ء میں فارسی زبان وادب میں ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کی۔ گوہر عباس کی شناخت ایک فعال داعی دین اور صاحبِ قلم عالم کے طور پر ہوتی ہے۔ وہ تبلیغ دین کے ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی مصروف ہیں اور خاص طور پر فارسی زبان کی تدریس (فارسی کلاسیز) ان کے نمایاں مشاغل میں شامل ہے۔ ان کی علمی سرگرمیوں میں سنجیدگی، فکری توازن اور علمی دیانت نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

مجتبیٰ حیدر ابن مکرم عباس مرحوم (مولانا)

مولانا مجتبیٰ حیدر معروفی ابن مکرم عباس، علمی ودینی حلقوں میں سنجیدہ مزاج عالم دین، مدرس اور مبلغ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت ۲۶/اگست ۱۹۸۱ء کو مردم خیز خطہ پورہ معروف، ضلع مئو (اتر پردیش) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مکتب امامیہ، پورہ معروف سے حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ بابُ العلم، مبارک پور میں داخلہ لیا اور وہاں درجہ عالم تک کی تعلیم مکمل کی۔ دورانِ تعلیم ان کی علمی جستجو اور سنجیدگی اساتذہ کی توجہ کا مرکز بنی رہی، جس کے باعث مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے مختلف علمی مراکز کی طرف رجوع کا موقع ملا۔

بعد ازاں ممبئی کا رخ کیا، جہاں مدرسہ نور الہدیٰ، گونڈی میں داخلہ لیا اور وہاں الصّف الخامس تک کی تعلیم حاصل کی۔ اس مرحلے پر ان کی علمی استعداد مزید نکھری اور انھوں نے اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے عالمی سطح کے علمی مرکز قم (ایران) کا انتخاب کیا۔ چنانچہ جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، قم میں داخل ہوئے، جہاں باقاعدہ طور پر 'دورۂ کارشناسی ارشد' (ماسٹرز کے مساوی) مکمل کیا۔ اس ادارے سے فراغت نے ان کی علمی بصیرت کو وسعت عطا کی اور ایک وسیع تر فکری وتحقیقی منظر نامے سے روشناس کرایا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد تدریس کو اپنا میدانِ عمل بنایا اور مختلف حوزاتِ علمیہ میں اپنی خدمات انجام دیں۔ ان اداروں میں مدرسہ امام صادق (ممبئی)، مدرسہ امام حسین (چھپرا، بہار) اور مدرسہ امام ہادی (ہادی سینٹر، ممبئی) قابلِ ذکر ہیں، جہاں انھوں نے طلبہ کو دینی علوم کی تعلیم دی اور ان کی علمی واخلاقی تربیت

میں اہم کردار ادا کیا۔ فی الوقت المرتضیٰ عربی کالج، سادات، غازی پور میں بحیثیت مدرس اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، جہاں نہایت ذمہ داری اور خلوص کے ساتھ تدریسی فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ اس کے ساتھ وہ میدانِ تبلیغ میں بھی سرگرمِ عمل ہیں۔ خطابت، اقامۂ نمازِ جماعت، عقد خوانی اور عوام کو دینی احکام و مسائل سے آگاہ کرنا ان کی روزمرہ کی دینی خدمات کا حصہ ہے۔

☆☆☆

محمد اصغر ابن شبر حسین (مولوی)

مولوی محمد اصغر ابن شبر حسین اُن سنجیدہ اور علم دوست افراد میں ہیں جنھوں نے دینی اور عصری تعلیم دونوں میدانوں میں یکساں دلچسپی، محنت اور لگن کے ساتھ اپنی شناخت قائم کی۔ ان کا تعلق ضلع امبیڈکر نگر کے معروف قصبہ جلال پور سے ہے۔ ۱۱/ اگست ۱۹۸۹ء کو ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شبر حسین نہایت متین، با اخلاق اور دینی مزاج کے حامل شخص ہیں، جن کی تربیت اور رہنمائی نے محمد اصغر کی شخصیت سازی میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ محمد اصغر کی ابتدائی تعلیم مکتب امامیہ مہدیہ سے ہوئی، جہاں انھوں نے قرآنِ مجید اور ابتدائی دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد باقاعدہ حوزوی تعلیم کا انتخاب کیا اور حوزۂ علمیہ بقیۃ اللہ، جلال پور میں داخلہ لیا۔ یہاں عربی، فارسی، صرف، نحو، منطق، فقہ اور دیگر بنیادی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں مدرسہ بابُ العلم، مبارک پور (اعظم گڑھ) میں تعلیم حاصل کی، جو دینی و علمی اعتبار سے ایک معتبر ادارہ مانا جاتا ہے۔ یہاں رہتے ہوئے یہاں کے دیگر اساتذہ کے ساتھ مولانا ارشاد حسین مرحوم کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا اور درسِ نظامی کے اہم مراحل طے کیے۔ دینی تعلیم کے سلسلے کی معراج جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ کی صورت میں ہوئی، جہاں ممتاز اساتذہ کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کی اور ۲۰۱۷ء میں ممتاز الافاضل کا امتحان پاس کیا۔

دینی علوم کے ساتھ محمد اصغر نے عصری تعلیم کو بھی یکساں اہمیت دی۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے اردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اردو زبان و ادب میں ان کی دلچسپی نے ان کے ذوقِ مطالعہ کو مزید وسعت دی اور کلاسیکی و جدید ادب کے مطالعے سے ان کے اسلوبِ فکر و نگارش میں نکھار پیدا ہوا۔ مزید برآں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

محمد اصغر کی شخصیت میں سنجیدگی، وقار، شائستگی اور اخلاقی توازن نمایاں ہے۔ مطالعہ کے شوقین، تحقیق کے دلدادہ اور اپنی تعلیم میں مزید وسعت کے خواہاں ہیں۔ دینی و ادبی حلقوں میں ان کی شناخت

ایک با اخلاق، سنجیدہ اور محنتی طالبِ علم و معلم کی ہے۔ انھوں نے دین و دنیا اور مدرسہ اور یونیورسٹی کے درمیان ایک خوب صورت توازن قائم کیا۔ فی الحال لکھنؤ میں ہی مقیم ہیں اور اصلاح معاشرہ اور تبلیغی سرگرمیوں میں منہمک ہیں۔

☆☆☆

محمد حجت ابن سبط حسن (مولانا)

مولانا محمد حجت ابن سبط حسن ابن حاجی سعد اللہ کا شمار عصر حاضر کے ان سنجیدہ مزاج علما میں ہوتا ہے جنھوں نے تدریس اور تصنیف و تالیف کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا تعلق ضلع مئو (اتر پردیش) کی قدیم، علمی اور مردم خیز بستی بڑا گاؤں گھوسی سے ہے۔ ان کی ولادت ۸ رفروری ۱۹۶۵ء کو ایک دیندار اور علمی خانوادے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن کے معروف دینی ادارے، مدرسہ حسینیہ، میں حاصل کی، جہاں سے آپ کی علمی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور دینی علوم کی طرف میلان پیدا ہوا۔

اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ جوادیہ، بنارس کا رخ کیا، جو معیاری نصاب اور علمی ماحول کے لیے معروف ہے۔ یہاں انھوں نے نہ صرف رسمی علوم میں مہارت حاصل کی بلکہ اپنے اساتذۂ کرام خصوصاً مولانا سید شمیم الحسن، مولانا سید احمد حسن، مولانا احمد علی، مولانا سید محمد حسینی اور مولانا عطا حسین نجفی کی صحبت سے علمی و فکری بالیدگی بھی حاصل کی۔ جامعہ سے فراغت کے بعد اعلیٰ علمی مدارج کی تکمیل کے لیے حوزۂ علمیہ قم (ایران) کا سفر کیا۔ قم میں قیام کے دوران متعدد جید علما اور مراجعِ کرام سے استفادہ کیا، جن میں آیت اللہ مصطفیٰ اعتمادی، آیت اللہ وجدانی فخر اور آیت اللہ نوری جیسے اکابرین شامل ہیں۔ ان بزرگوں کی علمی تربیت نے ان کے فکری افق کو وسعت عطا کی اور ان کے تحقیقی ذوق و شوق کو جلا بخشی۔

ایران سے واپسی کے بعد انھوں نے عملی میدان میں قدم رکھتے ہوئے حوزۂ علمیہ نجفی ہاؤس، بمبئی میں کچھ عرصہ تدریسی خدمات انجام دیں، جہاں انھوں نے طلبہ کی علمی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں ۱۴ ردسمبر ۱۹۹۶ء کو ان کا تقرر وثیقہ عربی کالج میں بطور استاد عمل میں آیا۔ اس ادارے میں آپ گزشتہ کئی دہائیوں سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور اپنے علم، اخلاص اور تدریسی مہارت کے ذریعے بے شمار طلبہ کو فیضیاب کر چکے ہیں۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی مولانا محمد حجت کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے دینی اور اخلاقی موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں عظمتِ والدین، رہنمائے طلاب، اسرارِ نماز، اسرارِ

حج، اسرارِ روزہ، ذکر و اذکار، اسرارِ عمل عاشورہ، اسرارِ زیارتِ عاشورہ، اسرارِ زیارتِ اربعین اور تاریخِ عزاداری خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان تصانیف میں دینی تعلیمات کو سادہ، مدلل اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں مفید ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد علمی و مذہبی مضامین ماہنامہ الجواد (بنارس) اور ماہنامہ اصلاح (لکھنؤ) جیسے معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ادبی ذوق کے اعتبار سے بھی یہ ایک صاحبِ طبع شخص ہیں۔ شعر و شاعری سے شغف رکھتے ہیں اور اپنے کلام کی اصلاح کے لیے مولانا ارشاد حسین معروفی سے رجوع کرتے رہے ہیں۔ مولانا ارشاد معروفی سے ان کا تعلق ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اوائل سے قائم ہوا، جو علمی و ادبی سطح پر نہایت مفید ثابت ہوا۔ مولانا معروفی نے ان کی متعدد کتابوں پر تقریظات بھی تحریر کیں، جو ان کی علمی کاوشوں کے اعتراف کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مجموعی طور پر مولانا محمد حجت کی شخصیت علم، عمل، تدریس اور تصنیف کا حسین امتزاج ہے، اور وہ اپنی متوازن علمی بصیرت اور دینی خدمات کے باعث علمی و مذہبی حلقوں میں ایک معتبر مقام کے حامل ہیں۔

☆☆☆

محمد رضی ابن انصر حسین (مولوی)

مولوی محمد رضی کا تعلق ضلع مئو کے معروف علاقے پورہ معروف سے ہے۔ ولادت ۰۸ رمئی ۱۹۸۸ء کو اسی خطے میں ہوئی، جو دینی شعور اور مذہبی سرگرمیوں کے سبب نمایاں شناخت رکھتا ہے۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے کے باعث ان کے مزاج میں کم عمری سے ہی دین سے وابستگی، وقار اور فکری یکسوئی پیدا ہوگئی۔ خاندانی تربیت نے ان کے اندر اخلاقی استحکام اور دینی خدمت کے جذبے کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ تعلیمی زندگی کے ابتدائی مراحل میں محمد رضی نے قصبے کے مدرسہ امامیہ سے دینی تعلیم حاصل کی، جہاں قرآن، تجوید اور ابتدائی علومِ دینیہ سے واقفیت پیدا ہوئی۔ بعد ازاں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے انھوں نے جامعہ امامیہ انوارُ العلوم، الہ آباد میں داخلہ لیا، جہاں درسِ نظامی کے مختلف مراحل طے کیے۔ اس ادارے کا علمی ماحول اور اساتذہ کی رہنمائی ان کی فکری تربیت میں نہایت معاون ثابت ہوئی اور ان کے اندر تدبر اور مطالعے کی عادت راسخ ہوگئی۔

اعلیٰ تعلیم کے میدان میں محمد رضی نے اپنے علمی سفر کو بین الاقوامی سطح تک وسعت دی۔ اسی تسلسل میں انھوں نے ایران میں کارشناسی کی تعلیم مکمل کی، جہاں انھیں دینی علوم کے جدید اور منظم طریقِ تدریس سے آشنائی ہوئی۔ بعد ازاں وہ کربلا گئے اور وہاں سے کلیۃُ المعارف الاسلامیہ کی تعلیم حاصل کی۔ ان علمی

مراکز سے وابستگی نے ان کے فکری افق کو وسیع کیا اور اسلامی علوم کو عالمی تناظر میں سمجھنے کی صلاحیت عطا کی۔

ان کی علمی تشکیل میں ایک اہم مرحلہ وہ بھی ہے جب ایران کی جانب سے منعقد کردہ درسِ قرآن کے موقع پر اعظم گڑھ میں جامعہ امام مہدی میں شرکت کے دوران انھیں مولانا ارشاد حسین سے خصوصی استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اس صحبت نے ان کے فہم قرآن، اسلوبِ بیان اور تدریسی ذوق کو مزید نکھارا۔ مولانا مرحوم کی علمیت اور قرآنی شعور نے محمد رضی کی فکری سمت متعین کرنے میں نہایت موثر کردار ادا کیا۔

عملی زندگی میں محمد رضی کی شناخت ایک سرگرم داعی دین کے طور پر ہے۔ وہ تبلیغ دین کے ساتھ قرآنی دروس کا اہتمام کرتے اور عوامی سطح پر قرآن فہمی کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مقالہ نگاری، قرأت، خطابت اور بالخصوص رثائی شاعری ان کے نمایاں علمی و ادبی مشاغل ہیں۔

☆☆☆

محمد طاہر ابن مولانا صادق حسین (مولوی)

مولوی محمد طاہر ابن مولانا صادق حسین ضلع اعظم گڑھ کے موضع سمند پور، پوسٹ سگڑی کے باشندہ ہیں۔ تاریخ پیدائش ۵ رجولائی ۱۹۸۶ء ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں کے مکتب امامیہ جعفریہ میں حاصل کی، جہاں درجہ دوم تک بنیادی دینی تعلیم سے فیض یاب ہوئے۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے مدرسہ بابُ العلم، قصبہ مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ کا رخ کیا اور وہاں درجہ ہشتم تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اعلیٰ دینی تعلیم کی غرض سے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا، جہاں درجہ نہم سے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کرتے ہوئے اعلیٰ درجات طے کیے اور اسی عظیم درس گاہ سے ممتاز الافاضل کی آخری سند حاصل کر کے فراغت پائی۔

تعلیمی اسناد کے اعتبار سے بھی متعدد معتبر اداروں سے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ مدرسہ تعلیمی بورڈ اتر پردیش سے منشی، مولوی، عالم اور فاضل کی اسناد حاصل کیں، جب کہ جامعہ اردو، علی گڑھ سے ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل اور معلم کی اسناد حاصل کیں۔ اس طرح ان کی علمی تربیت دینی اور ادبی دونوں میدانوں میں مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئی۔

دورانِ تعلیم ہی ان کی علمی صلاحیت اور تدریسی ذوق کو دیکھتے ہوئے ۲۰۱۰ء میں جامعہ امامیہ انوار العلوم، مرزا غالب روڈ، الہ آباد میں ان کا تقرر بحیثیت مدرس ہو گیا۔ تب سے اب تک اسی ادارے میں مسلسل تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور طلبہ کی تربیت میں مصروف ہیں۔ اسی زمانے میں ایران میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایرانی علما کی جانب سے ایک امتحان بھی لیا گیا تھا، جس میں آپ کامیاب ہوئے، تاہم

سرکاری مدرس کی حیثیت سے تقرر ہو جانے کے باعث ایران جانے کا ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

تدریسی خدمات کے ساتھ دینی و مذہبی میدان میں بھی اہم ذمہ داریاں انجام دی ہیں۔ الہ آباد میں سب سے پہلے مصلیٰ ذیشان، کریلی باغ میں آپ کو جامعہ امامیہ انوار العلوم الہ آباد کے مدیر حجۃ الاسلام مولانا سید جواد حیدر جوادی کی جانب سے امامِ جماعت مقرر کیا گیا، جہاں تقریباً چار برس تک امامت کے فرائض نہایت ذمہ داری کے ساتھ انجام دیئے۔ اس کے بعد عبادت خانہ الخضر ا، رحمت نگر، کریلی، الہ آباد میں امامت کا سلسلہ شروع کیا، جو مئی ۲۰۲۵ء تک جاری رہا۔

درس و تدریس اور امامت کے علاوہ محمد طاہر تبلیغ دین مبین اسلام کے میدان میں بھی سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مختلف محافل و مجالس میں دینی بیانات کے ذریعے مذہبی تعلیمات کو عام کرتے ہیں اور نئی نسل کی دینی و اخلاقی تربیت کے لیے خصوصی اسلامی کلاسز کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت علم و عمل، تدریس و تبلیغ اور دینی خدمت کے جامع امتزاج کی آئینہ دار ہے۔

☆☆☆

محمد ظہیر الحسن ابن ریاضُ الحسن مرحوم (مولانا)

مولانا محمد ظہیر الحسن ابن ریاضُ الحسن ایک سنجیدہ مزاج دینی شخصیت، عالم دین اور مبلغ کی حیثیت سے اپنے حلقۂ اثر میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت یکم مارچ ۱۹۷۸ء کو محلہ پھلیل پورہ، قصبہ کوپاگنج، ضلع مئو (اتر پردیش) میں ہوئی۔ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث ان کی ابتدائی تربیت دینی اقدار اور اسلامی شعور کے زیرِ اثر ہوئی، جس نے آگے چل کر علمی و عملی زندگی کی بنیاد مستحکم کی۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم مقامی اداروں سے حاصل کی۔ بعد ازاں باقاعدہ طور پر دینی علوم کی تحصیل کا آغاز کیا اور روایتی درسِ نظامی کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے مولوی، عالم اور فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ ان مراحل میں انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، منطق اور فلسفہ جیسے اہم علوم میں مہارت حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے تدریس و تبلیغ کو عملی زندگی کا مرکز بنایا۔ انھوں نے مختلف اداروں اور مقامات پر تدریسی خدمات انجام دیں، جہاں طلبہ کو دینی علوم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ان کی اخلاقی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی۔ فی الحال جامعہ جعفریہ کوپاگنج میں بطور مدرس خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کا اندازِ تدریس سادہ، موثر اور طلبہ کی سطحِ فہم کے مطابق ہوتا ہے، جس کے باعث شاگرد علمی میدان میں

نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔تبلیغ کے میدان میں بھی سرگرم ہیں۔خطابت، وعظ ونصیحت اورعوام کو دینی احکام ومسائل سے آگاہ کرنا ان کی نمایاں خدمات ہیں۔مختلف مذہبی اجتماعات میں شرکت کے ذریعہ دین اسلام کی صحیح تعلیمات کو عام کرتے اور معاشرے کی اصلاح میں موثر کردار ادا کررہے ہیں۔

☆☆☆

محمد عابد (مولوی)

مولوی محمد عابد ایک باصلاحیت دینی وعلمی شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان کی تاریخ ولادت ۱۷؍ستمبر ۱۹۹۰ء ہے۔ابتدائی اوراعلیٰ دینی تعلیم کے مراحل طے کرتے ہوئے انھوں نے ممتاز دینی درس گاہ جامعہ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے دینی وتعلیمی میدان میں فعال کردار ادا کرنا شروع کیا۔اس وقت تنظیم المکاتب،لکھنؤ میں بطور انسپکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔وہ اس منصب پر فائز ہوکر مدارس اور مکاتب کے تعلیمی نظام کی نگرانی، اصلاح اور ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔اس ذمہ داری کے تحت مختلف مکاتب کا معائنہ،تعلیمی معیار کی جانچ اور تدریسی نظام کی بہتری کے لیے رہنمائی فراہم کرنا ان کے فرائض میں شامل ہے۔محمد عابد کی شخصیت دینی تعلیم،تنظیمی صلاحیت اور تعلیمی خدمت کے حسین امتزاج کی نمائندہ ہے۔وہ اپنی علمی قابلیت اور عملی جدوجہد کے ذریعے مکاتب کے نظامِ تعلیم کو مضبوط بنانے اور نئی نسل کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے مسلسل مصروفِ عمل ہیں۔

☆☆☆

مرغوب عالم عسکری ابن الحاج شبیر حسن کربلائی (مولانا)

مرغوب عالم عسکری ابن الحاج شبیر حسن کربلائی کا شمار ان علمی ودینی شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے تدریس، تحقیق،تصنیف اور تبلیغ کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔۱۸؍اکتوبر ۱۹۷۲ء کو موضع سمند پور، پوسٹ سگڑی،ضلع اعظم گڑھ کے ایک معروف مذہبی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کا آغاز گاؤں کے مدرسہ امامیہ جعفریہ سے ہوا جہاں درجہ سوم تک تعلیم حاصل کی۔بعدازاں ۱۹۸۴ء میں مدرسہ باب العلم مبارک پور،اعظم گڑھ میں درجہ پنجم میں داخلہ لیا اور تقریباً پانچ برس تک عربی وفارسی علوم کی تحصیل میں مصروف رہے۔اسی ادارے سے منشی اور مولوی کے امتحانات امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیے۔زمانۂ طالب علمی میں جن اساتذہ سے خصوصی استفادہ نصیب ہوا،ان میں استاذِ محترم مولانا ارشاد حسین معروفی کا نام

خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ وہ نحو، صرف، منطق، فلسفہ اور دیگر معقول و منقول علوم میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کی علمی سرپرستی نے مولانا کی علمی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۸۸ء میں مولوی کی تکمیل کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جامعہ ناظمیہ، لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں قابل اور فاضل کے امتحانات سے فراغت حاصل کی اور ۱۹۹۲ء میں ایرانی ٹسٹ میں کامیابی کے بعد علومِ اہل بیتؑ کے عظیم مرکز، حوزۂ علمیہ قم المقدسہ ایران کی طرف عازم ہوئے۔ قم میں تقریباً اٹھارہ برس تک قیام کے دوران انھوں نے فقہ و اصول میں گہری علمی استعداد حاصل کی۔ درسِ خارج میں تقریباً پانچ سال تک شرکت کا شرف حاصل رہا۔ دورانِ تحصیل جن عظیم اساتذۂ کرام سے استفادہ کیا، ان میں استاد ہاشم موسوی، استاد سید عادل علوی، استاد ربانی گلپایگانی، حضرت آیت اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی، حضرت آیت اللہ العظمیٰ عبداللہ جوادی آملی اور حضرت آیت اللہ العظمیٰ وحید خراسانی شامل ہیں۔ یہ علمی سفر ۲۰۱۰ء تک جاری رہا۔ مولانا مرغوب عالم عسکری کو دورانِ تعلیم قم میں تین مرتبہ 'سازمان مدارس' کی جانب سے ہندوستان کے مختلف مدارس میں بطور مدرس اعزام ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ۱۹۹۹ء میں مدرسہ باب العلم مبارک پور میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں ۲۰۱۱ء اور ۲۰۱۲ء میں مدرسہ منصبیہ، میرٹھ میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالی، اور پھر مدرسہ ایمانیہ ناصریہ، جون پور منتقل ہوئے، جہاں عارضی تدریس کے بعد مستقل مدرس کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ان کی علمی و قلمی خدمات بھی نہایت وسیع ہیں۔ انھوں نے فارسی و اردو زبان میں متعدد اہم کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں، جن میں 'نقش ابتلا و امتحان در تربیت انسان'، 'حکم فروش قرآن بہ کفار'، 'النبیؐ و مستقبل الدعوۃ'، 'قطرہ ای از دریای غدیر'، 'گوہر عمر'، 'تحفۂ دختران (مہکتی کلیاں)' اور 'پاسخ بعضی از شبہات' جیسی اہم تصانیف و تراجم شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے ہیں جو مختلف موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی خدمات دینی و علمی حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

☆☆☆

مہدی رضا ابن محمد شریف (مولوی ڈاکٹر)

نام مہدی رضا، والد کا نام محمد شریف ہے، وطن ضلع مئو کا معروف قصبہ بڑا گاؤں گھوسی ہے۔ ۲؍جون ۱۹۸۵ء کو یہیں پیدا ہوئے۔ بیدار ماحول میں پرورش پانے کے سبب شخصیت میں کم عمری ہی سے دینی وابستگی نمایاں ہونے لگی اور خاندانی تربیت نے اسے مزید جلا بخشی۔ مہدی رضا کی تعلیمی زندگی کا آغاز

قصبے کے ایک مکتب سے ہوا، جہاں دینی تعلیم کی ابتدائی اساس قائم کی۔ بعد ازاں مدرسہ بابُ العلم، مبارک پور میں داخلہ لے کر ثانوی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔ بابُ العلم کے منظم نصاب اور علمی فضا نے ان کی ذہنی تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اسی ادارے میں انھیں مولانا ارشاد حسین سے خصوصی استفادہ کا موقع ملا، جن کی علمی بصیرت اور تدریسی انداز نے مہدی رضا کے علمی ذوق کو سمت و رفتار عطا کی۔

مزید اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا اور یہاں سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔ انھوں نے اپنے علمی افق کو بین الاقوامی سطح تک وسعت دینے کی غرض سے اہلِ بیت یونیورسٹی، تہران کا انتخاب کیا، جہاں سے تاریخ تشیع میں ایم اے کیا۔ تہران کے علمی و تحقیقی ماحول نے مطالعے کو نئے زاویے عطا کیے اور متون کے تقابلی مطالعے اور جدید تحقیقی مناہج سے استفادہ کی صلاحیت پیدا کی۔

دینی علوم کے ساتھ زبان و ادب سے مضبوط وابستگی مہدی رضا کی علمی شناخت کا اہم پہلو ہے۔ انھوں نے شیعہ کالج سے بی اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اردو مکمل کیا۔ بعد ازاں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے ایم۔اے فارسی اور ایم۔فل فارسی کی اسناد حاصل کیں، جب کہ فارسی زبان و ادب میں اعلیٰ ترین تحقیقی مرحلہ طے کرتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی (فارسی) کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ان مراحل نے ان کی لسانی مہارت اور تحقیقی بصیرت کو ایک جامع شکل دی۔ اس وقت ماہنامہ 'شعاعِ عمل' لکھنؤ سے بطور معاون وابستہ ہیں، جہاں علمی مواد کی تیاری میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

محمد محسن ابن جناب ابوالحسن (مولانا)

مولانا محمد محسن ابن جناب ابوالحسن، ۷ رنومبر ۱۹۷۳ء کو ضلع اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے مردم خیز گاؤں موضع سمند پور، پوسٹ سگڑی میں پیدا ہوئے۔ ایک علمی و دینی خانوادے سے تعلق رکھنے کے باعث انھیں ابتدا ہی سے دینی تعلیم کی طرف رغبت حاصل ہوئی۔ انھوں نے ثانوی تعلیم مدرسہ باب العلم میں حاصل کی اور یہاں مولانا ارشاد حسین سے استفادے کا خصوصی موقع ملا۔ چنانچہ انھوں نے روایتی درسِ نظامی کی تکمیل کرتے ہوئے عالم، کامل اور فاضل کی اسناد مدرسہ تعلیمی بورڈ اتر پردیش لکھنؤ سے حاصل کیں۔ بعد ازاں انھوں نے علمی ارتقا کی مزید منازل طے کرتے ہوئے ناظمیہ عربی کالج لکھنؤ سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی، جو ان کی علمی قابلیت اور تدریسی مہارت کا روشن ثبوت ہے۔

فراغت کے بعد انھوں نے درس و تدریس کا مقدس پیشہ اختیار کیا اور اس وقت مدرسہ عربیہ تنویر

العلوم نوشہرہ، جین پور، اعظم گڑھ میں بحیثیت مدرس خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج، محنتی اور علم دوست شخصیت کے مالک ہیں، جنھوں نے اپنی تدریسی زندگی میں بے شمار طلبہ کو زیورِ علم سے آراستہ کیا اور ان کے اندر دینی و اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ محمد محسن کی شخصیت سادگی، متانت اور اخلاص کا حسین امتزاج ہے۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب مدرس ہیں بلکہ ایک مخلص مربی اور رہنما بھی ہیں، جو اپنی علمی و عملی زندگی کے ذریعے معاشرے میں علم دین کی روشنی پھیلانے میں مصروفِ عمل ہیں۔

☆☆☆

محمد مہدی ابن فیاض حسین مرحوم (مولانا)

مولانا محمد مہدی ابنِ فیاض حسین ایک دینی شخصیت اور عالم دین کے طور پر اپنے حلقۂ اثر میں جانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق خیرآباد بازار، ضلع مئو (اتر پردیش) سے ہے۔ ایک دیندار اور علمی ماحول رکھنے والے خانوادے میں آنکھ کھولنے کے باعث ابتدائی تربیت دینی اقدار کے زیرِ اثر ہوئی، جس نے ان کی ذہنی، فکری اور عملی زندگی کی بنیاد مستحکم کی۔

ابتدائی و ثانوی تعلیم مکتب امامیہ و جامعہ حیدریہ سے حاصل کی، جہاں قرآنِ کریم، دینیات اور ابتدائی عربی و فارسی علوم کی تحصیل کی۔ بعد ازاں باقاعدہ طور پر اعلیٰ دینی علوم کی طرف رخ کیا اور درسِ نظامی کے مراحل کی تکمیل کے لیے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔

تعلیم کے بعد اپنی زندگی کو خدمتِ دین کے لیے وقف کر دیا۔ جامعہ حیدریہ اور مکتب امامیہ، خیرآباد میں طویل عرصے تک خدمات انجام دیں، جہاں انھوں نے تدریس، تربیت اور دینی رہنمائی کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان اداروں میں ان کی خدمات نے متعدد طلبہ کی علمی و اخلاقی تربیت میں اہم رول ادا کیا، اور انھوں نے نہایت اخلاص کے ساتھ نسلِ نو کو دینی شعور سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔

فی الوقت شیعہ جامع مسجد خیرآباد میں امامِ جماعت کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی عوام الناس کی دینی رہنمائی، مسائلِ شرعیہ کی وضاحت اور مذہبی تعلیمات کی ترویج میں بھی سرگرمِ عمل ہیں۔ مولانا محمد مہدی نے اپنی تمام تر توانائیاں دینی خدمات، اصلاحِ معاشرہ اور اشاعتِ علم کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ ان کی زندگی مسلسل محنت، دیانت اور دین اسلام کی خدمت سے عبارت ہے، جو یقیناً آنے والی نسلوں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔

☆☆☆

منہال رضا ابن مولانا ناظم علی خیرآبادی (مولانا)

مولانا منہال رضا ابن مولانا ناظم علی خیرآبادی ممتاز دینی و علمی شخصیت، صاحبِ قلم عالم اور بہترین مدرس کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹/اگست ۱۹۷۵ء کو خیرآباد، مئو (اتر پردیش) میں ایک معزز علمی و مذہبی خانوادے میں ہوئی۔ والد مولانا ناظم علی خیرآبادی، خود ایک جید عالم ہیں، جن کی علمی سرپرستی اور دینی ماحول نے ان کی ابتدائی تربیت کو نہایت مضبوط بنیاد فراہم کی۔

ابتدائی تعلیم مکتب امامیہ، خیرآباد سے حاصل کی، جہاں قرآنِ کریم، دینیات اور عربی و فارسی کی بنیادی تعلیم حاصل کی۔ باقاعدہ اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ امامیہ تنظیم المکاتب، لکھنؤ میں داخلہ لیا، جہاں ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۳ء تک درسِ نظامی کے مختلف مراحل محنت اور یکسوئی کے ساتھ طے کیے۔ اس دوران فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر، حدیث، منطق اور فلسفہ جیسے علوم میں استعداد بہم پہنچائی۔

اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لیے ۱۹۹۳ء میں عالم تشیع کے عظیم علمی مرکز، حوزہ علمیہ قم (ایران) کا رخ کیا، جہاں ۲۰۰۰ء تک مسلسل علمی ریاضت میں مشغول رہ کر اپنے علمی افق کو مزید وسعت دی۔ قم میں قیام کے دوران درسِ خارج کے اہم متون، خصوصاً 'رسائل' اور 'مکاسب' کی تکمیل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد عملی میدان میں قدم رکھا اور اپنی زندگی کو تالیف، تقریر اور تدریس جیسے اہم شعبوں کے لیے وقف کر دیا۔ تدریس کے میدان میں جامعہ حیدریہ میں خدمات انجام دیتے ہوئے طلبہ کو دینی علوم سے آراستہ کیا اور ان کی علمی و اخلاقی تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا اندازِ تدریس نہایت سادہ، مدلل اور تحقیق پر مبنی ہوتا ہے، جس کے باعث طلبہ ان سے پورے طور پر استفادہ کرتے ہیں۔

تقریر کے میدان میں بھی ان کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے خطبات اور بیانات کے ذریعے نہ صرف دینی تعلیمات کو عام کرتے ہیں بلکہ اصلاح معاشرہ اور اخلاقی بیداری کا پیغام بھی موثر انداز میں پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی تالیف و تصنیف کے میدان میں بھی سرگرم ہیں۔

☆☆☆

نایاب حیدر ابن سید نسیم حیدر (مولوی سید)

مولوی سید نایاب حیدر ابن سید نسیم حیدر کی ولادت ۱۳/ پریل ۱۹۸۲ء کو قصبہ میر پور، ضلع اعظم گڑھ میں علمی و دینی ماحول میں ہوئی۔ ان کا خاندانی پس منظر ساداتِ کرام سے تعلق رکھتا ہے، یہی وراثت آگے چل کر فکری اور عملی زندگی میں نمایاں طور پر جلوہ گر ہوئی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ باب العلم میں داخلہ لیا۔ یہیں سے دینی تعلیم کی بنیادیں مضبوط کیں اور قرآن، حدیث، فقہ، عربی زبان و ادب اور دیگر مروجہ علوم میں مہارت حاصل کی۔ مدرسہ باب العلم میں دورانِ تعلیم جن اساتذۂ کرام سے آپ نے خصوصی استفادہ کیا، ان میں مولانا ارشاد حسین مرحوم کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سید نایاب حیدر نے ان کی صحبت علمی سے فیض اٹھایا اور دینی علوم کے ساتھ سنجیدہ مطالعہ اور تدریسی ذوق جیسے اوصاف بھی انہی سے مستفاد کیے۔ مولانا مرحوم ہی کی ایما پر اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ کا رخ کیا۔ یہاں جلیل القدر اساتذہ کی سرپرستی میسر آئی اور دینی علوم کی وسعت سے واقفیت کا موقع میسر ہوا اور درسِ نظامی کے مروجہ نصاب کو مکمل کیا۔ بالآخر ۲۰۱۰ء میں جامعہ ناظمیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سید نایاب حیدر نے عملی میدان میں قدم رکھتے ہوئے درس و تدریس کو اپنا مستقل مشغلہ بنایا اور جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ مجالس، محافل اور دیگر دینی خدمات میں بھی سرگرم رہتے ہیں۔

☆☆☆

نسیم الحسن ابن غلام علی مرحوم (مولانا)

مولانا نسیم الحسن ابن غلام علی نوحہ خواں مرحوم ان علما میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے علمِ دین کو محض حصولِ سند تک محدود نہیں رکھا بلکہ تدریس، تبلیغ، اصلاحِ معاشرہ اور عملی زندگی کے میدان میں پوری دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ برتا۔ مولانا کی ولادت ۸ر نومبر ۱۹۶۶ء کو بڑا گاؤں، گھوسی، ضلع مئو کے ایک معزز، مذہبی اور عزادار گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد غلام علی مرحوم اپنے علاقے کے معروف نوحہ خواں تھے۔ اسی فضا میں مولانا نسیم الحسن کی پرورش ہوئی، جس نے ان کے مزاج میں دین سے وابستگی، مذہبی شعور اور شخصیت میں سنجیدگی پیدا کر دی۔ ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز مدرسہ حسینیہ گھوسی سے ہوا، جہاں انھوں نے قرآنِ مجید، ابتدائی دینیات، فقہی مسائل اور اخلاقی تربیت حاصل کی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ باب العلم، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ کا رخ کیا۔ یہاں ثانوی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔ عربی زبان و ادب، صرف و نحو، منطق و فلسفہ، فقہ و اصولِ فقہ اور دیگر علومِ اسلامی میں استعداد بہم پہنچائی۔ یہاں آپ کو متعدد جید اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا، تاہم مولانا ارشاد حسین مرحوم سے ان کی خصوصی علمی وابستگی رہی۔ ان کی صحبت نے مولانا کی علمی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا اور ان کے اندر تحقیق، استدلال اور اعتدال جیسی صفات پیدا کیں۔ دینی تعلیم کے سفر کی تکمیل جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں ہوئی

جہاں سے ۱۹۹۲ء میں ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا نسیم الحسن نے تدریس اور خدمت دین کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ ۲۳ر مئی ۲۰۱۵ء سے جامعہ جعفریہ، کوپاگنج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارے میں نہایت اخلاص، دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ طلبہ کو دینی علوم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ تدریس کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ اور تبلیغ دین کے میدان میں بھی سرگرم ہیں۔ وہ عملی زندگی میں اخلاقی اقدار، سماجی ہم آہنگی اور دینی شعور کے فروغ پر زور دیتے ہیں۔ گفتگو میں اعتدال اور دردِ انسانیت نمایاں ہے۔ وہ دینی روایت کو عصری تقاضوں سے جوڑتے ہوئے تدریس، تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

☆☆☆

نفیس اختر ابن ناصر رضی مرحوم (مولوی)

مولوی نفیس اختر ابن ناصر رضی ضلع مئو (اتر پردیش) کے معروف قصبہ پورہ معروف، کرتھی جعفر پور کے باشندہ ہیں۔ ان کی تاریخِ ولادت ۲۶ر جنوری ۱۹۸۲ء ہے۔ وہ ایک ایسے دینی ماحول میں پیدا ہوئے جہاں علم و تربیت کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، اسی وجہ سے انھوں نے ابتدائی زمانے سے دینی تعلیم کی طرف رغبت ظاہر کی۔ ابتدائی تعلیم پورہ معروف کے محلہ بلوہ میں واقع مدرسہ ضیاء العلوم میں حاصل کی۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لیے آپ نے تقریباً ۱۹۹۴ء/ ۱۹۹۵ء میں جامعہ حیدریہ مدینۃ العلوم خیرآباد میں داخلہ لیا۔ اس ممتاز علمی ادارے میں آپ نے مسلسل محنت اور علمی یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور ۲۰۰۱ء تک وہیں زیرِ تعلیم رہے۔ مزید علمی ترقی اور دینی علوم تک رسائی کے لیے اسی سال انھوں نے بیرونِ ملک کا سفر اختیار کیا اور سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کے جوار میں واقع دمشق (سوریہ) کا رخ کیا۔ وہاں انھوں نے ۲۰۰۱ سے ۲۰۱۲ء تک کے طویل عرصے تک دینی علوم کے حصول میں وقت صرف کیا۔

۲۰۱۲ء میں وہ شام سے ہندوستان واپس تشریف لائے اور واپسی کے بعد تبلیغی و دینی خدمات میں سرگرم ہو گئے۔ ابتدا میں برہان پور میں تقریباً ڈھائی ماہ تک تبلیغی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد ۲۰۱۳ء میں کامدیو پور (امبیڈکر نگر) میں تقریباً ساڑھے سات ماہ تک تدریس اور تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی سال لکھنؤ منتقل ہو گئے جہاں مدرسہ عقیلہ بنی ہاشم میں تدریسی خدمات کا آغاز کیا اور ۲۰۱۶ء تک وہاں طلبہ کو دینی علوم کی تعلیم دیتے رہے۔ ۲۰۱۶ء سے تا حال حوزۂ ابو طالب علیہ السلام لکھنؤ میں تعلیم و تدریس

کے میدان میں مشغول ہیں اور دینی علوم کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ رسمی و ادبی تعلیم کے میدان میں بھی انھوں نے متعدد اسناد حاصل کی ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے آپ نے ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل اور معلم اردو کی اسناد حاصل کیں، جب کہ یو پی مدرسہ بورڈ سے منشی، منشی کامل، مولوی، عالم اور فاضل جیسی اسناد حاصل کیں۔ مولوی نفیس اختر ایک ایسی دینی و علمی شخصیت کے حامل فرد ہیں جن کی زندگی تعلیم، تدریس اور تبلیغ دین سے عبارت ہے۔

☆☆☆

نفیس الحسن ابن کلب حسن مرحوم (مولوی)

مولوی نفیس الحسن ابن کلب حسن مرحوم نے اپنی زندگی علمِ دین، درس و تدریس، تبلیغ، تحریر اور دعوت کے لیے وقف کر دی۔ ان کی ولادت ۰۶/اگست ۱۹۸۳ء کو محلہ پھولیل پورہ، کوپا گنج، ضلع مئو میں ہوئی۔ ان کا تعلق علمی و دینی خانوادے سے ہے۔ ان کے والد کلبِ حسن مرحوم طبابت کے پیشے سے وابستہ دیندار شخصیت کے حامل تھے۔ چنانچہ اپنے فرزند کی ابتدائی تربیت میں دین دوستی، سادگی اور اخلاقی استحکام کو بنیاد بنایا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی، جہاں بچپن ہی سے ان میں دینی رجحان اور مطالعے کا ذوق نمایاں ہونے لگا۔ بعد ازاں اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لیے انھوں نے جامعہ حیدریہ، خیرآباد کا رخ کیا۔ یہاں ان کی علمی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں اور انھوں نے نہایت یکسوئی کے ساتھ درسِ نظامی کے مراحل طے کیے۔ اسی دور میں انھوں نے منشی، مولوی، کامل، عالم اور فاضل کے امتحانات الہ آباد بورڈ سے نمایاں نمبروں کے ساتھ پاس کیے۔ ان کی علمی زندگی کا ایک نہایت اہم مرحلہ وہ ہے جب انھیں مولانا ارشاد حسین مرحوم کی شاگردی نصیب ہوئی۔ مولانا ارشاد حسین مرحوم سے الہ آباد بورڈ کے امتحانات کے دوران عربی و فارسی زبان و ادب، فقہ، منطق اور فلسفہ جیسے علوم میں خصوصی استفادہ کیا۔ مولانا مرحوم کی علمیت، تحقیقی ذوق اور تدریسی اسلوب نے نفیس الحسن کی شخصیت اور ان کی فکری تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔

مزید تعلیم کی غرض سے جامعہ سلطانیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا، جو برصغیر کی ممتاز علمی درس گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہاں انھوں نے اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی اور صدر الافاضل کی سند سے سرفراز کیے گئے۔ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم سے رابطہ بھی ان کی علمی ترجیحات میں شامل رہا۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے شیعہ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ نفیس الحسن کی عملی زندگی کا ایک اہم پہلو ان کی تبلیغی و دعوتی سرگرمیاں ہیں۔ بالخصوص ماہِ مبارک رمضان اور ایامِ محرم

میں وہ تبلیغ دین میں سرگرم رہتے ہیں، ان کی تقاریر سنجیدگی، اعتدال اور فکری بالیدگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ وہ جذباتیت کے بجائے دلیل، روایت کے بجائے شعور اور خطابت کے بجائے اصلاح کو ترجیح دیتے ہیں۔ فی الحال قم میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کی علمی کاوشیں، تعلیمی سفر، اساتذہ سے وابستگی، اور جدید ذرائع کے ذریعے دعوتی خدمات انھیں اپنے معاصرین میں منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ امید ہے کہ ان کی یہ علمی و دینی مساعی آئندہ بھی اسی اخلاص، استقامت اور فکری بالیدگی کے ساتھ جاری رہیں گی۔

☆☆☆

ہادی حسن فیضی ابن غلام علی کربلائی مرحوم (مولانا)

مولانا ہادی حسن فیضی ابن غلام علی کربلائی مرحوم ان اہلِ علم میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے دینی علوم کی تحصیل کو خالص تعلیمی سرگرمی کے بجائے ایک ہمہ جہت عملی مشن کے طور پر اختیار کیا۔ ان کی ولادت یکم فروری ۱۹۶۸ء کو جلال پور، ضلع امبیڈکر نگر میں ایک مذہبی اور دیندار گھرانے میں ہوئی۔ والد غلام علی کربلائی مرحوم دیندار، صاحبِ وقار اور خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار تھے، جن کی سادہ طرزِ حیات، اخلاص اور دینی وابستگی نے کم عمری ہی سے مولانا ہادی حسن فیضی کے ذہن و دل پر گہرے نقوش ثبت کیے۔

ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی، جہاں ابتدائی اردو، عربی، دینیات وغیرہ کی تعلیم حاصل تھی۔ مکتب کے سادہ مگر بامقصد تعلیمی ماحول نے ان کی فکری بنیادوں کو مضبوط کیا اور آگے چل کر باضابطہ دینی تعلیم کی راہیں ہموار کیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی اور اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے مدرسہ باب العلم مبارک پور، اعظم گڑھ میں داخلہ لیا۔ مدرسہ باب العلم میں قیام کے دوران آپ نے مروجہ دینی نصاب کے تمام اہم علوم جیسے فقہ، اصولِ فقہ، منطق، فلسفہ اور عربی ادب وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔

اسی ادارے میں آپ کو مولانا ارشاد حسین مرحوم جیسے جید عالم اور صاحبِ بصیرت استاد کی صحبت میسر آئی، جن سے آپ نے خصوصی استفادہ کیا۔ مولانا مرحوم کی علمیت، تدریسی بصیرت اور شاگرد نوازی نے مولانا ہادی حسن فیضی کی فکری ساخت پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔ مولانا ارشاد حسین مرحوم ہی کی ایما اور حوصلہ افزائی پر آپ نے جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں آپ کا تعلیمی سفر نہایت سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ جاری رہا۔ یہاں دینی علوم کی اعلیٰ سطحی تدریس سے استفادہ کیا اور تحقیقی مزاج کو فروغ دیا اور ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی۔

مزید تعلیمی ارتقا کی غرض سے آپ نے قم، ایران کا سفر کیا، جو عالمِ تشیع کا ایک بین الاقوامی علمی مرکز

ہے۔قم میں قیام کے دوران اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی اور مختلف علوم میں تخصص حاصل کیا۔اس بین الاقوامی علمی ماحول نے ان کے فکری افق کو وسیع کیا اور دینی علوم کے تقابلی اور عالمی تناظر سے روشناس کرایا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا ہادی حسن فیضی نے تدریس کو اپنا مستقل مشغلہ بنایا۔جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ان کا تدریسی اسلوب متوازن، مدلل اور افہام و تفہیم پر مبنی ہے،جس میں روایت اور معاصرت کے درمیان حسین امتزاج نظر آتا ہے۔تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ دین اور اصلاحِ معاشرہ میں بھی سرگرم کردار ادا کر رہے ہیں۔خطابت کے میدان میں آپ کا انداز سنجیدہ، باوقار اور علمی ہے،جس میں جذباتیت کے بجائے استدلال اور حکمت کو ترجیح دیتے ہیں۔علاوہ بریں ترجمہ،تصنیف اور تالیف کے شعبوں میں بھی آپ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں،جن کے ذریعے آپ نے علمی سرمایہ میں اضافہ کیا اور دینی افکار کو وسیع حلقے تک پہنچانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا ارشاد حسین کے فیض تربیت سے مستفید ہونے والے شاگردوں کی تعداد اس مختصر فہرست تک محدود نہیں، بلکہ ایک کثیر جماعت ایسی بھی ہے جس نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ان کے کسب فیض کیا۔تاہم ان میں سے بعض کے حالات و کوائف دستیاب نہ ہو سکے، جب کہ چند اہلِ علم نے ذاتی وجوہات کے باعث اپنی تفصیلات کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی۔چنانچہ یہاں صرف انہی اصحاب کا تذکرہ ممکن ہو سکا جن کے بارے میں مستند معلومات فراہم ہو سکیں، جب کہ بعض دیگر مستفیدین کا تفصیلی ذکر عدمِ دستیابیِ مواد کے سبب اس مقام پر نہیں کیا جا سکا۔ان افراد میں مولانا رئیس احمد، مولانا جعفر حسین (سمند پور)، مولانا سید مرتضیٰ حسین زیدی (لکھیم پور)، مولانا سید انور علی زیدی (بنگالی)، سید مشیر حسن زیدی (رسول آباد، جون پور)، مولانا سید محمد اسلم (بنارس، مقیم حال پونہ)، مولانا سید تقی رضا رضوی (ملانی، الہ آباد)، مولانا سید مجیب الحسن زیدی (محمود پور سریّاں)، مولانا سید شمیم الحسن زیدی (محمود پور سریاں)، مولانا سید عابد حسین (محمد آباد، مئو، مقیم حال ناصریہ جون پور)، شاعر اہل بیت مولانا وقار سلطان پوری، مولانا اشتیاق حسین (جلال پور)، مولانا مشیر حسین خان (سیل خان، سلطان پور) مولانا عسکری خان، مولانا شایان حیدر، مولانا ابوذر علی (رنّو جون پور)، مولانا سلطان حسین (اعظم گڑھ)، مولوی علی رضا (خیر آباد)، مولوی مختار محسن (گھوسی)، مولانا محمد اسلم (پورہ معروف)، مولانا محمد معظم ابن مولانا خیرات الحسنین (پورہ معروف)، مولانا رضی الجعفر (کوپا گنج) اور مولانا محمد رضا (مبارک پور) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆

مولانا ناظم علی خیرآبادی
عمید جامعہ حیدریہ، خیرآباد، ضلع مئو، رابطہ نمبر: 9415250426

خراجِ عقیدت

گل سرسبد چمنستانِ تدریس

عالم کے تمام موجودات، کائنات کی کل اشیا، جن وانس، حیوانات، چرند و پرند با عقل و بے عقل کو اللہ تبارک وتعالیٰ وحدہ لاشریک نے اپنے قدر پر خلق فرمایا۔ اناخلقنا کل شئ بقدر۔ مخلوقات میں انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا۔ انا خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ بنی آدم کو مرد وعورت کے حقیقی جنسی امتزاج سے پیدا کر کے شعوب وقبائل میں قرار دیا تا کہ انھیں پہچانا جا سکے۔ ان میں سب سے مکرم سب سے زیادہ تقویٰ والوں کو قرار دیا۔ انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا، خشکی وتری میں حامل بنایا، پاکیزہ رزق عطا کیا اور بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی۔ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی اور انھیں خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو ستھری چیزوں سے رزق دیا اور انھیں اپنی بہت سی مخلوق پر بہت سی برتری دی۔) یہ انسان اگر ایمان اور عمل صالح سے وابستہ رہتا ہے تو اسے ثواب جمیل اور اجر جزیل سے ثروت مند بناتا ہے ورنہ اسفل سافلین میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح سے متمسک رہتے ہوئے صاحب علم ہو تو اس کے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ۔ (مجادلہ ۱۱، ترجمہ: اللہ تم میں سے ایمان والوں کے اور ان کے درجات بلند فرماتا ہے جنھیں علم دیا گیا۔)

استاذ الاساتذہ مولانا ارشاد حسین معروفی ایمان وعمل اور علم سے مزین تھے۔ انھوں نے علوم میں سب سے افضل مرکزی علم دین اور اس سے متعلق علوم کو نہایت جد وجہد اور جاں فشانی سے حاصل کیا۔ کیوں کہ وہ اس کی قدر ومنزلت سے واقف تھے۔ اس لیے تمام تر زحمت وتکلیف کو برداشت کرتے ہوئے تحصیل علم میں ہمہ جہت مصروف رہے۔ ان کے پیش نظر حضرت امام سجاد (ع) کا قول رہتا تھا: لو یعلم الناس ما

فی طلب العلم لطلبواہ و لو بسفک المھج و خوض اللج۔(بحار الانوار، ج ا،ص ۱۸۵) اگر انسانوں کو علم و دانش کی قدر و منزلت کا علم ہو جائے تو وہ اسے ضرور طلب کریں گے، چاہے اس کے لیے جنگ وخوں ریزی کا سامنا ہو۔مولانا نے سخت ترین حالات اور مشکل ترین وقت میں نفس و ماحول سے جہاد کرتے ہوئے حیات کو علم دین کی ڈیوڑھی پر ڈال دیا۔سعی پیہم اور جہد مسلسل نے کامیابی سے ہم کنار کیا لیس للانسان الا ماسعیٰ۔من جدّ وجد کے مطابق خلوص نیت کے نتیجہ میں نور علم سے معمور ہو گئے۔ العلم نور یقذفہُ اللہُ فی قلب من یشاء۔خدا جس کے دل میں چاہتا ہے نور علم ڈال دیتا ہے۔

مولانا ارشاد حسین کی پیدائش موضع پورہ معروف میں ہوئی۔بچپن کے حالات سے گزرتے ہوئے ابتدائی تعلیم موضع کے ایک مدرسہ میں ہوئی۔سن تمیز کو پہنچنے کے بعد مدرسہ باب العلم مبارک پور میں داخل ہوئے اور درجہ مولوی تک امتیازی کیفیت کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔مذکورہ مدرسے میں حقیر اور مولانا سلمان احمد صاحب کا ساتھ رہا اور عربی و فارسی بورڈ کے امتحانات میں اول نمبر سے کامیابی حاصل کی۔اس مدرسہ کے اساتذہ میں مولانا عبدالحمید شاہ ناظر مبارک پوری، مولانا فیاض حسین واعظ مبارک پوری، اور حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا علی ارشاد صاحب مبارک پوری قابل ذکر اور لائق صد تحسین تھے جنھوں نے نہایت شفقت اور محبت سے تعلیم دی۔اس مرحلہ سے گزر کر ہندوستان کی عظیم و باوقار درس گاہ مدرسہ مبارکہ مشارع الشرائع المعروف بہ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا اور آخری درجہ ممتاز الافاضل تک امتیازی شان و شوکت سے تعلیم حاصل کی۔اسی زمانے میں عالم، فاضل فقہ، فاضل ادب، فاضل معقولات اور فاضل طب کے امتحانات میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔مولانا کے اساتذہ میں مفتی اعظم آیۃ اللہ سید احمد علی، مولانا سید مرتضیٰ نقوی، ماہر اصول فقہ مولانا محمد حسین نجفی، مولانا روشن علی، مولانا محمد شاکر، مولانا محمد ایوب، فیلسوف عصر مولانا حکیم محمد اطہر، مولانا محمد ہاشم، ادیب زمانہ مولانا ابن حیدر کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ان علما واساتذہ کی نظر میں مولانا مرحوم خصوصی عظمت کے حامل تھے۔

مذکورہ بالا مستند اساتذہ کے زیر نظارت و محبت مولانا نے فقہ، اصول، صرف ونحو، کلام، حدیث، تفسیر، عروض و بلاغت، عربی و فارسی ادب، علم الافلاک، منطق و فلسفہ اور دیگر ضروری متعلقہ علوم کی تکمیل کی۔ مولانا کو منطق و فلسفہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔اس کی اصطلاحات کو باقاعدہ جانتے اور پہچانتے تھے۔ان علوم کے تعلق سے مولانا نے صدرا، قاضی مبارک، شرح لمعہ، معالم الاصول، قوانین الاصول، رسائل، شرح کبیر اور مکاسب وغیرہ اعلیٰ دینی کتابوں کو باقاعدہ پڑھا تھا اور اس میں درک حاصل کیا تھا۔موقع موقع سے شاعری بھی کرتے تھے۔اکثر مقامی شعرا ان سے اصلاح لینے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

مسندِ تدریس:

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تدریس کو نصب العین قرار دیا، تعلیم و تدریس کو نہ تن پروری کا ذریعہ بنایا اور نہ مادی وسائل کی فراہمی کا وسیلہ قرار دیا۔ وہ بار بار مولانا روم کا یہ شعر دہرایا کرتے تھے ؎

علم را بر تن زنی ماری بود
علم را بر دل زنی یاری بود

مولانا نے جو علم حاصل کیا تھا اسے عالم الست میں عہد کے مطابق دوسرے قلب و ذہن تک منتقل کرنا اپنا فریضہ قرار دیا تا کہ ایک سراج منیر سے دوسرے چراغ روشن ہوسکیں اور دنیا میں چراغاں ہوجائے۔ انھیں رسول خدا کا یہ فرمان بخوبی ذہن نشین تھا: من تعلم حدیثتین اثنتین تنفع بھما نفسه او یتعلمھُما غیرہ فینتفع بھما کان خیراً من عبادة ستین سنة۔ (بحارالانوار، ج ۲، ص ۱۵۲) جو شخص دو حدیثیں یاد کرلے اور ان سے خود کمال حاصل کرنے کی راہ میں فائدہ حاصل کرے اور دوسروں کو سکھائے تا کہ دوسرے بھی اس سے استفادہ کریں، اس شخص کا یہ عمل ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے۔

نیز پیغمبر اسلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ یا علی ثلاث من حقائق الایمان، الانفاق فی الافقار و الضافک الناس من نفسک و بذل العلم للمتعلم۔ (من لایحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۳۵۹) اے علی! تین چیزیں ایمان کے حقائق میں سے ہیں۔ تنگ دستی میں بخشش کرنا، لوگوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کرنا اور متعلّم کو علم سے آراستہ کرنا۔

مولانا کی تدریسی خدمات کا سلسلہ موضع دہیاور، ضلع امیڈکر نگر سے شروع ہوا۔ یہاں مولانا نے امام جمعہ و جماعت کی ذمہ داری بھی سنبھالی اور مکتب امامیہ کے طلبا کو اصول و فروع کی تعلیم دینے میں مصروف رہے۔ بعد میں مدرسہ ناصریہ جون پور میں اعلیٰ درجات کے طلبہ کی تدریس میں مشغول ہوئے اور کچھ ناگفتہ بہ حالات اور نامعقول افراد کی عصبیت کی بنا پر ناصریہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تا کہ علم و دانش کی آبرو سلامت رہے۔ اس کے بعد مدرسہ باب العلم مبارک پور میں تدریسی خدمات انجام دیں، لیکن اس وقت کی مدرسہ کی خرد ماغ انتظامیہ کی بدعنوانی اور طلبہ و اساتذہ کے ساتھ گستاخانہ برتاؤ کو دیکھتے ہوئے باب العلم کو بھی چھوڑ دیا۔ اسی درمیان جامعہ حیدریہ، خیرآباد، ضلع مئو کا قیام مولانا کی تحریک پر عمل میں آچکا تھا تو مولانا اس کے مدرس اعلیٰ قرار پائے۔ قرب و جوار کے طلبہ کی معتد بہ تعداد جمع ہوگئی اور مولانا تدریس میں مشغول ہوگئے۔ بعد میں باب العلم کے ارباب حل وعقد کے مسلسل اصرار اور اہم دینی ضرورت کی وجہ

سے مدرسہ باب العلم میں علمی و دینی خدمت کے لیے گئے، لیکن جامعہ حیدریہ سے ان کا رشتہ ختم نہیں ہوا بلکہ یہ تعلق تاحیات باقی رہا۔

مولانا کا طریقہ تدریس دل پذیر اور موثر ہوتا تھا۔ وہ مشکل سے مشکل مطالب علمی کو نہایت آسان اسلوب اور سہل زبان میں بیان کرتے تھے جن کو طالب علم بہت جلدی یاد کر لیتا تھا۔ اور اگر کم فہم طالب علم کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کی اتنی بار تکرار کرتے تھے کہ اسے درک کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ اگر کوئی طالب علم بے توجہی کی بنا پر حاصل نہیں کر پاتا تو وقتی طور پر غصہ بھی کرتے تھے، مگر فوراً ہی محبت کے انداز میں سمجھانے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اور تب تک دہراتے رہتے جب تک اس کے دماغ میں مطلب اتر نہ جائے۔ منطق و فلسفہ کے دقیق اور باریک مطالب کو اس طرح دماغ میں راسخ کر دیتے تھے کہ اس کے فراموش کرنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔

مولانا دینی علوم و معارف سے تو واقف تھے ہی، وہ عالم اسلام میں درپیش مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، اخبارات، موبائل اور ٹی وی پر نشر ہونے والے امور سے بھی نہ صرف باخبر رہتے تھے بلکہ ان کے بارے میں اپنا مخصوص تنقیدی اور تحلیلی نقطہ نظر بھی رکھتے تھے۔ اس طرح وہ دین و دنیا کے امور کا علم بھی باقاعدہ رکھتے تھے۔ طلاب کی علمی مشکلات کو حل کرنے میں پیش پیش رہتے ہوئے شب و روز کا زیادہ وقت اسی میں صرف کرتے تھے۔

مولانا زندگی بھر علمی و دینی خدمت کرتے رہے۔ ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد ملک و بیرون ملک میں ترویج علم دین، تدریس اور تبلیغ میں مصروف ہے جن کی خدمات سے نسل در نسل تعلیم و تدریس کا سلسلہ قائم ہے۔ آج مولانا کا ظاہری جسمانی وجود نظر نہیں آتا لیکن ان کا روحانی فیض معنوی وجود کی صورت میں دلوں میں باقی ہے، اور جب تک ان کے شاگرد در شاگرد کا سلسلہ ہے، وہ ان کے حقیقی وجود کا شاہد ہے اور رہے گا۔ العلماء باقون مابقی الدھر۔

مولانا نے تدریس کے فریضہ اور ذمہ داری سے علیحدہ ہونے کے بعد علوم قرآن پر ایک جامع کتاب لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ الگ الگ اوراق پر مطالب بطور یادداشت لکھ رکھے تھے جس کو جمع کرنا شروع کیا۔ بڑی حد تک جمع کر چکے تھے۔ کچھ ہی باقی رہ گیا تھا جسے بیماری کی وجہ سے ترتیب نہ دے سکے۔ جس کو ان کے بڑے فرزند عالم دین ڈاکٹر ذیشان حیدر صاحب نے ترتیب دے دیا ہے۔ وہ ان شاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آئے گی، اور اس کے معانی و مطالب سے علم دوست افراد فیض یاب ہو سکیں گے۔

افسوس صد افسوس! گل سرسبد چمنستان تدریس و تحقیق مولانا ارشاد حسین پر بیماری کی باد سموم نے ایسا

حملہ کیا کہ پھول کمھلا گیا، دواؤں کی آبیاری بھی فائدہ نہ دے سکی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اور آخر اس بیماری دل نے کام تمام کر دیا، اور پورا خانوادہ، اعزا، اقربا، احباب کو روتا چھوڑ کر داعئ اجل کو لبیک کہا اور بارگاہ الٰہی میں پہنچ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خدا درجات کو بلند کرے۔

مولانا مرحوم کی حیات کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ وہ صرف ایک فرد نہیں بلکہ ایک مکمل عہد، ایک دبستانِ فکر اور ایک روشن روایت کے امین تھے۔ ان کی زندگی علم و عمل، زہد و تقویٰ اور اخلاص و ایثار کا ایسا حسین امتزاج تھی جس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ انھوں نے جس اخلاص کے ساتھ علم دین کی خدمت کی، وہ دراصل ان کے باطن کی صداقت اور مقصدِ حیات کی بلندی کا مظہر تھی۔ آج جب کہ مادیت اور خودغرضی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں، مولانا کی سیرت ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ علم کا اصل مقصد نہ شہرت ہے اور نہ دولت، بلکہ رضائے الٰہی اور انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ ان کے شاگردوں اور متعلقین کے لیے یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے کہ وہ اس علمی و روحانی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھیں بلکہ اسے مزید فروغ دیں، تاکہ آنے والی نسلیں بھی اس نورِ علم سے مستفیض ہو سکیں۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا ارشاد حسین معروفی کا وصال اگرچہ ایک عظیم خسارہ ہے، لیکن ان کا علمی فیضان، ان کے افکار اور ان کی قائم کردہ تعلیمی روایت ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ان کے شاگردوں کی خدمات، ان کے افکار کی ترجمانی اور ان کی تصنیفی کاوشیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایسے اہلِ علم کبھی مرتے نہیں، بلکہ اپنے علم و عمل کے ذریعے زندہ رہتے ہیں۔

مولانا کے علم و عمل کے وارث مولانا ڈاکٹر ذیشان حیدر، ماسٹر سلمان حیدر اور مولانا ڈاکٹر فیضان حیدر ہیں اور یہ تینوں حضرات علم دین اور قوم و ملت کی خدمت میں مصروف ہیں۔ دعا گو ہوں کہ ربِّ کریم انھیں طول عمر عطا کرے اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

☆☆☆

مولانا صادق حسین سمند پوری
سابق استاد درجات عالیہ، مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ

ایک مثالی استاد

(مولانا ارشاد حسین معروفی کی علمی وادبی شخصیت کا تاثراتی مطالعہ)

بعض شخصیات افراد نہیں ہوتیں بلکہ اپنے عہد کی فکری تاریخ کا روشن باب ہوتی ہیں۔ ان کی موجودگی زمانے کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ اور ان کی رخصت ایک خلا کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ استاذ الاساتذہ مولانا ارشاد حسین معروفی کی ذات گرامی بھی انہی نابغۂ روزگار اہلِ علم میں شمار ہوتی ہے جنھوں نے اپنی علمی بصیرت، تحقیقی ژرف نگاہی اور تدریسی مہارت کے ذریعہ فکر و دانش کے افق پر ایک گہرا اور دیرپا نقش ثبت کیا۔ وہ صرف معلم نہ تھے بلکہ اپنے وجود میں ایک مکتبِ فکر، ایک دبستانِ شعور اور ایک سرچشمۂ ہدایت تھے۔

تقریباً چالیس برسوں پر محیط رفاقت و دوستی کا یہ سفر جب حافظے کی دہلیز پر آہستہ آہستہ دستک دیتا ہے تو یادوں کی ایک کہکشاں سی آنکھوں کے سامنے جھلملا اٹھتی ہے۔ وقت کی گرد میں لپٹے ہوئے وہ لمحات پھر سے تازہ ہو جاتے ہیں، جب خلوص، اعتماد اور علمی ہم آہنگی نے ایک مضبوط تعلق کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ تعلق رسمی شناسائی نہ تھا، بلکہ دلوں کی ہم نوائی اور فکر کی ہم سَری کا رشتہ تھا، جو زمانے کی گردشوں کے باوجود اپنی آب و تاب کے ساتھ قائم رہا۔

جامعہ ناظمیہ لکھنؤ کی طالب علمی کے ابتدائی ایام سے لے کر مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ کی تدریسی خدمات تک کا زمانہ ایک مشترکہ جدوجہد اور علمی رفاقت کی روشن داستان ہے۔ درس گاہوں کے وہ شب و روز، مطالعے کی وہ محفلیں، مباحث و مکالمات کی وہ نشستیں سب آج بھی ذہن کے اوراق پر ثبت ہیں۔ یہ ساتھ چلنے کا عمل فقط اداروں کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ ایک فکری سفر تھا جس میں علم کی جستجو، تحقیق کی لگن اور تدریس کا شوق یکجا ہو کر ایک ہم آہنگ روایت میں ڈھل گئے تھے۔

وہ نہ صرف رفیق اور ساتھی رہے بلکہ فکری ہم سفر، نظریاتی ہم قدم اور علمی معاون بھی ثابت ہوئے۔

ان کی صحبت نے علم کو معلومات کے انبار سے نکال کر بصیرت و آگہی کی روشنی میں ڈھال دیا۔ انھوں نے سکھایا کہ علم کا اصل جوہر اس کی معنویت اور اس کی عملی تطبیق میں پوشیدہ ہے۔ ان کے ساتھ کا یہ طویل سفر رفاقت کی یاد کے ساتھ ایک ایسا سرمایۂ حیات ہے جس نے فکر کو جِلا بخشی اور شعور کو سمت و رفتار عطا کی۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی ذات کے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ جیتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایثار، خلوص اور خیر خواہی کا ایک ایسا امتزاج تھا جو ہر ملنے والے کو اپنا گرویدہ بنا لیتا۔ ان کی مسکراہٹ میں حوصلہ افزائی کی توانائی تھی اور ان کی نصیحت میں رہنمائی کی روشنی۔ انھوں نے شاگردوں کو محض کتابی علم نہیں دیا بلکہ زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی سکھایا۔ ان کی تدریس و تربیت کا فیض آج مختلف علمی، ادبی اور سماجی میدانوں میں نمایاں ہے اور یہی کسی معلم کی حقیقی کامیابی کی دلیل ہے کہ اس کے شاگرد اس کے فکر و اخلاق کے ترجمان بن جائیں۔

درس و تدریس ان کے لیے محض ذریعۂ معاش نہ تھی بلکہ عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ ان کی گفتگو میں ایسا توازن ہوتا کہ طالب علم بیک وقت متوجہ بھی رہتا اور محظوظ بھی ہوتا، اور درس کا ہر لمحہ ذہن پر دیرپا اثر چھوڑتا۔ علمی نکات کو وہ جس سلاست، گہرائی اور شگفتگی کے ساتھ بیان کرتے، سننے والا خود کو فکری طور پر سرشار محسوس کرتا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سہل، واضح اور دل نشیں پیرایۂ اظہار میں ڈھال دینا ان کا خاص ملکہ تھا۔ وہ امثال، استعارے اور مناسب حوالے اس مہارت سے برتتے کہ بات نہ صرف سمجھ میں آ جاتی بلکہ ذہن میں راسخ بھی ہو جاتی۔ ادب کی باریکیوں پر ان کی گرفت غیر معمولی تھی۔ نثر ہو یا نظم، عربی ہو یا فارسی ہر میدان میں انھیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ زبان کی صحت، اسلوب کی لطافت اور معنی کی تہ داری ان کے بیان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

وہ صرف ناقلِ علوم نہ تھے بلکہ معانی و مفاہیم کے خالق اور اذہان کے معمار تھے۔ ان کی فکر میں تحقیق کی سنجیدگی اور بیان میں حکمت کی حلاوت تھی۔ وہ کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے تو تاریخی پس منظر، فکری ارتقا اور عصری تقاضوں کو ساتھ لے کر چلتے۔ اسلوب میں اعتدال اور فکر میں وسعت ان کی پہچان تھی۔ وہ قدیم روایت کے امین بھی تھے اور جدید شعور سے آشنا بھی۔ یہی امتزاج انھیں ایک یادگار اور مثالی استاد کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

ان کی محفل میں علمی گفتگو خشک و بے رنگ نہ ہوتی بلکہ برجستگی، نکتہ آفرینی اور لطافت سے مزین ہوتی۔ بات کہتے تو ایسی کہ سامع مسکرا بھی دے اور سوچنے پر مجبور بھی ہو جائے۔ ان کی گفتگو میں شائستگی کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا۔ اختلاف رائے کو بھی تہذیب کے دائرے میں رہ کر بیان کرنا ان کا اصول تھا۔ وہ دلیل سے

قائل کرتے، جذبات سے مغلوب نہیں کرتے تھے۔ یہی علمی دیانت داری ان کی شخصیت کا روشن پہلو تھی۔

مولانا کی زندگی علم و عمل کے حسین امتزاج کی آئینہ دار تھی۔ سادگی ان کا شعار، پارسائی ان کا زیور اور وقت کی پابندی ان کا معمول تھا۔ وہ قول و فعل کی یکسانی کے قائل تھے۔ جس بات کی تلقین کرتے، پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوتے۔ ان کے نزدیک استاد کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اپنے کردار سے سبق دے۔ اس لیے ان کی ذات شاگردوں کے لیے ایک زندہ نمونہ تھی۔

انکساری اور سادہ زیستی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ مقامِ علم میں بلند ہونے کے باوجود طبیعت میں تواضع اور مزاج میں نرمی تھی۔ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت ان کے اخلاق کا مستقل حصہ تھا۔ دوستوں کے ساتھ اخلاص و وفاداری اور شاگردوں کے ساتھ بے لوث محبت ان کی طبیعت کی پہچان تھی۔ وہ علمی مجلس میں وقار کی علامت ہوتے اور تنہائی میں فکر و تدبر کا سرچشمہ۔

ایک یادگار و مثالی استاد کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات زمانے کے تغیرات سے متاثر نہیں ہوتیں۔ مولانا نے اس ضابطے کو پوری زندگی ملحوظ رکھا۔ ان کا اسلوب بدل سکتا تھا مگر اصول نہیں بدلتے تھے۔ وہ جدید ذرائع کو اختیار کرنے کے قائل تھے مگر فکری اساس کو برقرار رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک روایت اور جدت کا تصادم نہیں بلکہ تکامل ہونا چاہیے۔ وہ طلبہ کو جدید تقاضوں سے آشنا کرتے مگر انھیں اپنی علمی روایت سے منسلک رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

ان کی شخصیت میں ایک عالمانہ وقار کے ساتھ ادبی ذوق کی لطافت بھی شامل تھی۔ وہ شعر و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے اور بسا اوقات گفتگو میں مناسب اشعار سے استدلال کرتے۔ ان کی آواز میں سوز بھی تھا اور اثر بھی۔ ان کا اندازِ تدریس محض معلوماتی نہ تھا بلکہ تربیتی اور تحریکی تھا۔ ان کے نزدیک اصل تعلیم وہ تھی جو ذہن کو مہمیز دے اور فکر کو بیدار کرے۔

آج جب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں تو ان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے، مگر ان کی یادیں، ان کے افکار اور ان کا اندازِ تدریس ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ ایک استاد کی اصل زندگی اس کے شاگردوں کے کردار میں جلوہ گر ہوتی ہے، اور اس اعتبار سے وہ آج بھی زندہ ہیں۔ ان کے تربیت یافتہ افراد مختلف علمی اداروں، مدارس اور جامعات میں خدمت انجام دے رہے ہیں اور یوں ان کا فیض جاری ہے۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی حیاتِ مبارکہ اس امر کی بین دلیل تھی کہ استاد کا فریضہ دراصل نسلوں کی فکری و اخلاقی تشکیل ہے۔ وہ نصاب کا شارح ضرور ہوتا ہے، مگر اس سے کہیں بڑھ کر وہ شعور کا معمار اور کردار کا نگہبان ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی سے یہ ثابت کیا کہ تعلیم کا اصل جوہر حافظے کو بوجھل

کرنا نہیں بلکہ ذہن کو منور اور دل کو بیدار کرنا ہے۔

وہ ذہنوں کو جلا بخشتے اور دلوں کو منور کرتے تھے۔ ان کی تعلیم میں فکر کی روشنی بھی تھی اور اخلاق کی حرارت بھی۔ وہ علم کو اخلاق سے جدا نہیں کرتے تھے اور فکر کو عمل سے بے نیاز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ علم ناقص تھا جو کردار سازی سے محروم ہو اور وہ فکر ادھوری تھی جو عملی زندگی میں اثر انداز نہ ہو۔ چنانچہ ان کی تدریس میں علمی گہرائی کے ساتھ تہذیبی شائستگی اور اخلاقی سنجیدگی بھی شامل رہتی۔ وہ طلبہ کو یہ احساس دلاتے کہ علم ایک امانت ہے اور اس کا تقاضا دیانت، تواضع اور ذمہ داری ہے۔

ایسے اساتذہ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جو اپنے عہد کی حدود سے آگے بڑھ کر آنے والے زمانوں کے لیے مثال بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے بعد محض یادیں نہیں چھوڑتے بلکہ ایک زندہ روایت، ایک روشن فکر اور ایک پائیدار اقداری نظام چھوڑ جاتے ہیں۔ مولانا بھی انہی خوش نصیب معلمین میں سے تھے جنھوں نے اپنی ذات کو مقصد سے جوڑ کر زندگی گزاری اور اپنے عمل سے ایک ایسی علمی و اخلاقی روایت قائم کی جو ان کے بعد بھی جاری رہے گی۔ ان کا فیض ان کے شاگردوں کے کردار، ان کی تحریروں اور ان کی تدریسی خدمات میں جھلکتا رہے گا، اور یہی ان کی حقیقی بقا اور دائمی کامیابی کی علامت ہے۔

ہم ان کی روحِ پرفتوح کو سلام پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کے علمی و تربیتی فیض کو صدقۂ جاریہ بنائے۔ ان کی یاد ہمارے لیے مشعلِ راہ اور ان کا اسوہ ہمارے لیے سرمایۂ حیات ہے۔ بلاشبہہ وہ ایک یادگار اور مثالی استاد تھے اور رہیں گے۔ [۶ رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ، لکھنؤ]

☆☆☆

مولانا دلبر حسنین معروفی
امام جمعہ اجین، ایم پی، رابطہ نمبر: 8319692056

مولانا ارشاد حسین: علم، اخلاق اور انکسار کا پیکر

بعض علمی و ادبی شخصیتیں اپنے عہد میں بہت شور تو نہیں مچاتیں، مگر اپنے علم، کردار اور اخلاق کی روشنی سے جہل و نادانی کی دنیا میں ایک خاموش انقلاب برپا کر جاتی ہیں۔ مولانا ارشاد حسین صاحب بھی انہی نفوسِ قدسیہ میں سے تھے جن کی زندگی سادگی، سنجیدگی اور خلوص کا پیکر تھی۔ راقم الحروف کے لیے آپ محض ایک ہم وطن، ہمسایہ، ہم مدرسہ اور ہم مشرب نہ تھے بلکہ ایک ایسی باوقار علمی شخصیت تھے جن کے وجود سے درس و تدریس کی فضا میں وقار اور اطمینان در آتا تھا۔

عمر میں اگرچہ وہ مجھ سے چند سال بڑے تھے، مگر اپنے اخلاقِ کریمانہ سے کبھی مجھے چھوٹا محسوس نہ ہونے دیا۔ یہ ان کی شخصیت کا وہ پہلو ہے جو محض الفاظ سے نہیں، تجربے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ علمی برتری کے باوجود ان کے لہجے میں کبھی تفوق یا برتری کا شائبہ تک نہ آیا۔ ان کا طرزِ گفتگو ہمیشہ مشفقانہ، متوازن اور باوقار رہا۔

مولانا ارشاد حسین صاحب کا علمی مزاج نہایت سنجیدہ اور تحقیقی تھا۔ وہ نصوص کی گہرائی میں اترنے والے اور مباحث کی تہ تک پہنچنے والے معلم تھے۔ ان کی تدریس میں محض عبارت خوانی نہیں ہوتی تھی بلکہ فہمِ عبارت، پس منظر اور تطبیقِ مسائل کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ مشکل مباحث کو سہل پیرائے میں بیان کرنا ان کا خاص وصف تھا۔ وہ طلبہ کو صرف سبق یاد کرانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ سوچنے اور سوال کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔

جن اداروں میں موصوف مستقل بحیثیت مدرس و معلم رہے، ان میں تو نہایت دیانت داری اور فرض شناسی کی حد سے زیادہ ہی خدمات تعلیم و تعلّم انجام دیتے رہے۔ ان کے علاوہ تعطیلات کے دوران دیگر مدارس کے طلبا کے لیے باقاعدہ ان کے منتخب موضوعات پر تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ اکثر دیگر مدارس کے وہ طلاب جو اپنی منطقی، فلسفی و ادبی صلاحیت مضبوط کرنا چاہتے تھے، انھیں ان کے حسب منشا فیض پہنچایا۔ آپ

کے ان شاگردوں میں کئی اداروں کے فارغ التحصیل اور مدارس کے اساتذہ بھی شامل ہیں۔

ان کا اندازِ تدریس شور و خطابت سے عاری اور سنجیدہ استدلال سے مزین ہوتا تھا۔ وہ درس کے دوران غیر ضروری طوالت سے گریز کرتے، مگر جہاں وضاحت کی ضرورت ہوتی وہاں پوری دیانت کے ساتھ مسئلہ کھول کر بیان کرتے۔ ان کے یہاں علم ایک امانت تھا اور تدریس اس امانت کی ادائیگی۔

مختصر سہی لیکن قدرت نے جب ہمیں ایک ہی ادارے میں ساتھ ساتھ تدریس کا شرف بخشا تو راقم نے آپ کو اس عرصے میں نہایت منظم، وقت کا پابند اور ادارے کے وقار کا محافظ پایا۔ وہ نصاب کی روح کو سمجھتے تھے اور اس کی ترسیل میں اخلاص سے کام لیتے تھے۔ انتظامی معاملات میں بھی ان کی رائے متوازن اور خیر خواہانہ ہوتی تھی۔ طلبہ کے ساتھ ان کا تعلق محض استاد اور شاگرد کا نہ تھا، بلکہ مربی اور مشفق کا تھا۔ وہ طلبہ کی علمی کمزوریوں پر ناراضگی کے بجائے رہنمائی کو ترجیح دیتے۔ اگر کسی طالب علم سے کوتاہی ہو جاتی تو اسے تنبیہ بھی اس انداز میں کرتے کہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ ان کا احترام صرف رسمی نہیں بلکہ قلبی طور پر کرتے تھے۔

مولانا ارشاد حسین مرحوم کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف ان کا انکسار تھا۔ عمر اور علم میں برتر ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی برتری کا احساس دلانے کی کوشش نہ کی۔ اختلافِ رائے کی صورت میں بھی ان کا لہجہ نرم اور استدلال مہذب ہوتا۔ وہ اپنی بات پورے اعتماد سے کہتے مگر دوسرے کی بات بھی پوری توجہ سے سنتے۔ ذرّہ نوازی کا عالم یہ تھا کہ اہم اور حساس موضوعات پر بھی ناچیز سے مشورہ کرتے تھے اور ناچیز کی رائے کو معتبر مقام بھی عطا فرماتے تھے۔ انہی شفقتوں نے جانے کب اور کیسے ہم نفس و ہمدم بنا کر سن و سال اور علم و ہنر کے فاصلے کالعدم قرار دیئے، موصوف سے ایسا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنے کو، کان آواز سننے کو اور دل ان کی مسکراہٹ سے کھلنے کو بے قرار رہنے لگا تھا۔ طلبا اور مدرسین کی حمایت میں اکثر اداروں کی مجلس منتظمہ سے کشیدہ حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کبھی اقتدار کی بے جا حمایت نہ کر کے اپنی خودداری کو اپنا طرۂ امتیاز رکھا جس کی وجہ سے نامساعد حالات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

مجھے آج بھی بخوبی یاد ہے کہ جب کسی علمی نشست میں کوئی دقیق مسئلہ زیرِ بحث آتا تو وہ نہایت سکون، تحمل اور سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے۔ ان کی طبیعت میں نہ جلد بازی ہوتی اور نہ ہی اپنی بات منوانے کی کوئی بے صبری۔ وہ پہلے دوسروں کی آرا کو پورے انہماک سے سنتے، ہر نکتے پر غور کرتے اور پھر نہایت متانت کے ساتھ اپنی رائے پیش کرتے۔ اگر کبھی ان کی رائے کو چیلنج کیا جاتا یا کوئی شخص ان سے اختلاف کرتا تو وہ اسے اپنی ذات یا وقار کا مسئلہ نہیں بناتے تھے، بلکہ مسکراتے ہوئے دلیل اور استدلال کے

ذریعے بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کے لہجے میں شائستگی اور طرزِ بیان میں ایک خاص وقار پایا جاتا تھا جس سے سننے والا بے ساختہ متاثر ہو جاتا۔ ان کی خاموشی بھی معنی خیز ہوتی تھی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ بولنے سے پہلے ہر پہلو کو اچھی طرح تول رہے ہیں۔ جب وہ گفتگو کرتے تو ان کے الفاظ میں وزن، انداز میں سنجیدگی اور دلائل میں ایسی مضبوطی ہوتی کہ محفل میں بیٹھے ہوئے لوگ خاموشی سے ان کی بات سنتے اور اکثر ان کی گفتگو بحث کو کسی مثبت نتیجے تک پہنچا دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ علمی حلقوں میں ان کی موجودگی کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی، کیوں کہ وہ نہ صرف علم و تحقیق کے آدمی تھے بلکہ گفتگو کے آداب اور علمی اختلاف کے وقار کو بھی بخوبی سمجھتے تھے۔

ان کی نشست و برخاست میں بھی ایک طرح کی دل نشیں سادگی اور باوقار سنجیدگی کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا تھا جو پہلی ہی ملاقات میں دل پر اثر کر جاتا تھا۔ وہ ظاہری تکلفات اور بناوٹ سے ہمیشہ دور رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت میں ایک فطری وقار اور کشش موجود تھی جو ہر دیکھنے والے کو متاثر کرتی تھی۔ لباس کے معاملے میں وہ نہایت سادہ پسند تھے، صاف ستھرا مگر بے تکلف لباس ان کی طبیعت کی درویشانہ شان کی ترجمانی کرتا تھا۔ ان کی چال ڈھال میں ٹھہراؤ، گفتگو میں اعتدال اور برتاؤ میں توازن نمایاں نظر آتا تھا۔ طبیعت میں ایک خاص متانت اور مزاج میں ایسی استقامت تھی جو زندگی کے مختلف حالات میں بھی انھیں متزلزل نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ خود نمائی اور نمود و نمائش کے سخت مخالف تھے اور کبھی اپنی علمی یا شخصی خدمات کا چرچا خود نہیں کرتے تھے۔ شہرت اور ناموری کے حصول کی خواہش بھی ان کے مزاج میں شامل نہ تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے علمی و فکری کام میں مصروف رہتے اور یہی سمجھتے کہ اصل قدر و منزلت انسان کے عمل اور کردار سے پیدا ہوتی ہے، نہ کہ ظاہری تشہیر سے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جو لوگ انھیں قریب سے جانتے تھے وہ ان کی سادگی، وقار اور بے لوث مزاج کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

مولانا موصوف جیسی شخصیات اپنے پیچھے صرف یادیں نہیں چھوڑتیں بلکہ ایک فکری اور اخلاقی روایت چھوڑ جاتی ہیں۔ مولانا ارشاد حسین مرحوم نے بھی اپنے شاگردوں کے دلوں میں علم کی جو شمع روشن کی، وہ ان شاء اللہ مدتوں روشن رہے گی۔ ان کی تربیت یافتہ نسلیں ان کے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گی۔ موصوف نے باقیات الصالحات میں اپنی تربیت کے گراں بہا گوہر بہ شکل مولانا ڈاکٹر ذیشان حیدر، ماسٹر سلمان حیدر اور مولوی ڈاکٹر فیضان حیدر صاحبان کو چھوڑا جن میں آج بھی مولانا سراپا دیکھے جا سکتے ہیں۔

☆☆☆

مولانا محمد مہدی حسینی
وائس پرنسپل، مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ، رابطہ نمبر: 9956239598

مقبول و معتبر استاد

بزم طلاب و علما میں اپنی شناخت بنانا اور خود کو پسندیدہ اور معتبر ہونے کی منزل میں رکھنا اپنی ذاتی صلاحیت و حاضر جوابی اور علمی و فکری بلندی سے ہی ممکن ہے۔ ہم مولانا ارشاد حسین معروفی مرحوم کو اسی منزل میں پاتے ہیں۔ مولانا موصوف سے مدرسہ باب العلم مبارک پور میں تدریسی دنیا میں کافی عرصہ تک ہمراہی و ہم نشینی رہی ہے۔ اردو یا فارسی یا عربی ادب اور اس کی عبارتوں اور متون کی پیچیدگیوں کو اتنی آسانی سے حل فرماتے تھے کہ جیسے کوئی مشکل چیز ہی نہ ہو جب کہ ارباب علم و فکر جانتے ہیں کہ جب تک مطالب حل نہ ہو جائیں ذہن پر بار ہوتا ہے، مگر وہ بڑی آسانی سے اس علمی و فکری بار کو ختم کر دیتے تھے۔

تقریباً ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہوگا کہ حقیر اپنے ہم درس طلاب کے ہمراہ مسجد جامعہ ناظمیہ لکھنؤ کے صحن میں شرح جامی کا مباحثہ کر رہا تھا کہ ایک عبارت پر گاڑی پھنس گئی اور مولانا موصوف پاس میں کھڑے سن رہے تھے، ہم میں سے کوئی بھی آپ سے واقف نہ تھا، مگر آپ کو بزرگ اور ٹوپی شیروانی میں دیکھ کر احساس ہوا کہ آپ عالم ہیں۔ اس لیے ہم لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ آپ نے سیاق و سباق سے مربوط کر کے اس عبارت کو سمجھا دیا اور سب مطمئن ہو گئے پھر استفسار پر معلوم ہوا کہ آپ مولانا ارشاد حسین معروفی ہیں جو اسی ناظمیہ سے فارغ ہیں۔ حقیر کی نظر میں آپ کی علمی بلندی جاگزیں ہوگئی، پھر جب بھی ملاقات کا موقع ملتا آپ کا یہ واقعہ تصور میں آجاتا۔

۱۹۹۳ء میں حقیر وطن میں تھا تو آپ جناب محبوب حسین صاحب کے ہمراہ میرے گھر پر تشریف لائے اور سلام و اکرام کے بعد آپ دونوں نے مجھ سے مدرسہ باب العلم میں مدرسی کے لیے خواہش کی، چنانچہ میں نے استخارہ پر بنیاد رکھی اور استخارہ بھی آپ نے دیکھا اور خوب آنے پر میں راضی ہو گیا۔ پھر تو مدرسہ میں ساتھ رہنے کا موقع ہی مل گیا اور بہت ساری آپ کی خوبیاں دیکھنے کو ملیں، خصوصیت کے ساتھ بورڈ کے امتحانات منشی، مولوی، عالم، کامل اور فاضل کے موقع پر تو طلاب کا آپ کے اردگرد حصار رہتا تھا اور

سابق کے پرچوں میں موجود سوالوں کے جوابات یکے بعد دیگرے بغیر درجات کا امتیاز کیے، ہر ایک اتنی آسانی سے سمجھاتے کہ گمان ہوتا کہ آپ کی ذات تمام سوالوں کی حل شدہ کنجی ہے۔

علاوہ بریں جب وہ امتحان ہال میں نگران یا ممتحن کے طور پر موجود ہوتے تو ان کا اندازِ تدریس اور رہنمائی وہاں بھی اسی طرح نمایاں ہوتا جس طرح درس گاہ میں نظر آتا تھا۔ طلبہ اگر کسی مشکل عبارت یا لفظ کے بارے میں استفسار کرتے تو وہ براہِ راست جواب دینے کے بجائے ایک لطیف، منطقی اور بلیغ اشارے سے مسئلہ واضح کر دیتے۔ ان کی گفتگو میں نہ تو خشک استادی کا رنگ ہوتا اور نہ غیر ضروری سختی، بلکہ وہ طلبہ کی ذہنی تربیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسا جملہ کہتے جو بظاہر ہلکا سا تبصرہ معلوم ہوتا مگر اس کے اندر مکمل علمی رہنمائی پوشیدہ ہوتی۔ مثال کے طور پر اگر کسی عبارت پر اعراب لگانے کا سوال ہو اور کسی لفظ پر زبر لگنا مطلوب ہو تو وہ مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہہ دیتے: ''تم کیوں زبردستی کر رہے ہو؟'' یہ ایک نہایت بامعنی جملہ ہوتا جس میں لطافت بھی ہوتی اور رہنمائی بھی۔ ذہین اور بیدار مغز طلبہ فوراً سمجھ جاتے کہ لفظ پر زبر لگانا مقصود ہے۔ اس طرح وہ طلبہ کو براہِ راست جواب دینے کے بجائے ان کی فکری صلاحیت کو متحرک کرتے تھے تاکہ طالب علم خود غور و فکر کے ذریعے نتیجے تک پہنچے۔ یہی ان کی تدریسی حکمت کا خاص پہلو تھا کہ وہ علم کو محض معلومات کی صورت میں منتقل نہیں کرتے تھے بلکہ طلبہ کے ذہن میں استدلال اور فہم کی روشنی پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے ایسے چھوٹے چھوٹے اشارے بھی طلبہ کے لیے ایک مستقل علمی درس کی حیثیت رکھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کے شاگرد نہ صرف مضمون کو بہتر طور پر سمجھتے تھے بلکہ علمی نکات کو دیر تک یاد بھی رکھتے تھے۔

منطق، فلسفہ اور ادبیات جیسے دقیق علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ آپ کو عقائد، فقہ اور اصولِ فقہ پر بھی قابلِ رشک دسترس حاصل تھی۔ دینی مسائل میں آپ کا انداز نہایت متوازن اور محتاط ہوتا تھا، آپ ہمیشہ کتاب وسنت اور مجتہدین کے مستند فتاویٰ کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتے۔ اسی وجہ سے اہلِ محلہ اور مومنین میں آپ کی علمی بصیرت پر خاص اعتماد پایا جاتا تھا۔ جب کبھی عبادات سے متعلق کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، چاہے وہ طہارت ونجاست کا سوال ہو، نماز وروزہ کی جزئیات ہوں یا دیگر شرعی معاملات، تو لوگ بلاتکلف آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور رہنمائی طلب کرتے۔ آپ نہایت سنجیدگی اور وضاحت کے ساتھ مسئلے کو سنتے، پھر متعلقہ مجتہد کے فتوے اور فقہی اصولوں کی روشنی میں اس کا حل بیان کر دیتے۔ آپ کا انداز ایسا تھا کہ مسئلہ صرف حل ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ سننے والے کو اس کے پس منظر اور حکمت کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس طرح آپ کی ذات ایک ایسے عالم کی صورت میں نمایاں تھی جس میں عقلی علوم کی

گہرائی اور دینی علوم کی بصیرت یکجا ہوگئی تھی، اور یہی جامعیت آپ کی شخصیت کو علمی و دینی حلقوں میں خاص وقار عطا کرتی تھی۔

آپ کا طریقۂ زندگی سادہ اور بے لوث تھا۔ علما کی نشانی ٹوپی و شیروانی ہر موسم میں زیب تن رہتی تھی اور نماز کی پابندی و دیگر احکام پر عمل آوری میں انہماک رہتا تھا۔ پیش نمازی اور وعظ و نصیحت معمول تھا۔ علاوہ بریں دیانت داری میں اپنی مثال آپ تھے۔ چنانچہ گھر کے اخراجات مدرسہ سے ملنے والی تنخواہ پر موقوف تھے تو کبھی کبھی قرض لینے کی نوبت آجاتی تو جس سے قرض لیتے ادائیگی کے لیے وقت مقرر کر دیتے اور کوشش ہوتی کہ مقررہ وقت پر یا اس سے پہلے ادا کر دیں۔ اگر کبھی کسی دقت کی وجہ سے وقت مقررہ پر پیسہ نہیں رہتا تو قرض دہندہ سے معذرت کر لیتے اور پھر فراہم ہونے پر ادا کر دیتے تھے۔

ملازمت کے آخری دنوں میں جب آپ بیمار رہتے تھے تب بھی تدریسی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں بیماری کو خود پر غالب نہیں ہونے دیتے تھے اور معلمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ کی زندگی گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی۔ خدا آپ کو غریق رحمت کرے اور قبر کو نور سے بھرا رکھے اور ہمیشہ رحمتوں کا نزول فرمائے۔ آمین

☆☆☆

مولانا کاظم علی واعظ
استاد درجات عالیہ، مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ، رابطہ نمبر: 9415841815

آئینۂ تجلیات

لوح ایام پر کچھ نقوش ایسے ثبت ہوتے ہیں جنھیں مٹانے کے لیے گردش دوراں کے ہاتھ بھی مفلوج ہوجاتے ہیں۔ آج جس ہستی کو ہم خراج عقیدت پیش کررہے ہیں وہ کوئی عام پیکر خاکی نہ تھا بلکہ وہ ایک ایسا ''آئینۂ تجلی'' تھا جس کی بابت یہ کہنا عین صداقت ہے کہ ''**کان مرایا تنعکس انوار الحکمۃ و المعرفۃ**'' وہ ایسا آئینۂ تجلی تھا جس میں انوارِ حکمت وتجلیاتِ معرفت منعکس ہوتی تھی۔

وہ کوئی عام آئینہ نہ تھا بلکہ آئینہ تجلی کی وہ قندیل تھا جہاں حکمت کے انوار رقص کرتے اور معرفت کے چشمے پھوٹتے تھے۔ عجیب حیرتِ آئینہ تھی کہ اس نے اپنی ذات کو مٹا کر دوسروں کو ان کا اصل روپ دکھایا۔ وہ بستان علم کا وہ منشور تھا جس سے گزر کر خشک الفاظ معانی کے رنگین پیراہن زیب تن کر لیتے تھے۔ وہ بزم جہاں میں آئینۂ سکندر کی طرح نہیں آیا تھا جو صرف فتوحات کی خبر دے بلکہ وہ آئینۂ ضمیر بن کر آیا تھا تاکہ انسانیت کے اجڑے ہوئے گلشن میں اخلاق کی بہار پیدا کر سکے۔

وہ بزم وفا کا آئینہ تقدیس تھا اور مسند علم کا رشک اردیس تھا۔ اس کی جبیں پر نور ہدایت تھا۔ اس کے سینہ میں گنجینۂ درایت تھا۔ وہ علم کا آئینۂ جمال تھا۔ حکمت کا پیکرِ بے مثال تھا۔ اس کی گفتار میں 'سحر حلال' تھا۔ اس کے کردار میں رشکِ غزال تھا۔ وہ آئینۂ صدق وصفا تھا، شیوۂ مہر ووفا تھا، حق کا ترجمان تھا، دانش کا سائبان تھا۔ وہ ایسا آئینۂ ضمیر تھا جس کا ہر نقش بے نظیر تھا۔

وہ عقل کا امیر تھا نہ کہ نفس کا اسیر، وہ غواص بحر تشبیہات تھا، مرکز دائرۂ فیوضات تھا، بحر روایت کا خضر راہ تھا، فن درایت کا مہر وماہ تھا، اس کی ضیا سے حدیث کے متون غریبہ مانوس تھے۔ اسناد عالیہ اس کی پارکھ نظر کے ملموس تھے۔ اس کے اصول جاں کشیدہ کو روح بیداری بخشی اور روایات پیچیدہ کو حیات جاودانی عطا کی۔ وہ مردہ جذبوں کے لیے صور اسرافیل تھا، اس کے بیان میں جو ادبی طلاقت تھی وہ تشنہ کاموں کے لیے سلسبیل تھی۔ وہ الفاظ کا جادوگر نہیں بلکہ معانی کا پیغمبر تھا۔ وہ معقولات کا استاد کامل تھا،

عروض و ادب کا ممتاز ماہر تھا، اس کی نگاہ بصیرت میں ہر طالب علم ہیرا تھا جس کو تراش خراش کر کے شفاف بنانا اس کا وطیرہ تھا۔

استاد محترم کی شخصیت قدیم وضع داری کا وہ مرصع استعارہ تھی جہاں تمکنت طبع اور زہد فقر کا ایک نایاب سنگم تھا۔ سر پر کلف لگی سفید ٹوپی اور بدن پر سلیقے سے سجی شیروانی ان کی ظاہری پوشاک نہ تھی بلکہ اس موقر اور وجیہ پیکر کا ایک ایسا لازمہ تھی جس کے سائے میں بیٹھے ہوئے نکتہ چیں افراد ایک نوع کی ہیبت محسوس کرتے۔ وہ فطرتاً کم سخن اور صوم کلام کے پابند تھے۔ مگر ان کی یہ خاموشی کسی گوشہ نشیں کی بے نیازی نہیں، ایک حبس رعب تھی جو شرکائے محفل کو اپنے لفظوں کے انتخاب میں ''پھونک پھونک کر قدم رکھنے'' پر مجبور کر دیتی۔ وہ مروت کی بھینٹ چڑھ کر حق کی زبان بندی کے قائل نہ تھے۔ جہاں کسی کے قول میں ادنیٰ سی کجی دیکھتے یا مصلحت آمیز تلبیس بیانی کا شائبہ پاتے، ان کی جبیں پر حق گوئی کے بل پڑ جاتے اور فوراً نشتر تنقید سے کام لیتے۔ ان کی یہ نکتہ رسی محض اخلاقی گرفت تک محدود نہ تھی بلکہ وہ زبان و بیان کی فصیلوں پر کسی بیدار مغز پہریدار کی طرح ایستادہ تھے۔

۱۳ رجب کا موقع تھا، محفل کا پروگرام تھا۔ مدرسہ کے باہر میدان میں قصبہ (مبارک پور) کے لڑکے باہم دست و گریباں تھے۔ مدرسہ میں مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ ایک قدآور شخصیت، کہنہ مشق اور خوش فکر شاعر بھی مدعو تھے۔ انھوں نے آتے ہوئے باہر لڑکوں کو آپس میں گتھم گتھا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ محفل شروع نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بچے بھی محفل میں شرکت کی غرض سے مدرسہ میں آئے تو انھیں دیکھ کر آنجناب نے تمام مدرسین و اراکین و مہمانان کے سامنے اپنی فصاحت کی دھاک بٹھانے کے لیے ایک طنزیہ شقشقہ چھوڑا ''یہ لڑلڑ کے آرہے ہیں۔''

ان کا مقصود صنعت لفظی کے گورکھ دھندے میں اعصاب کو آزمانا تھا، مگر وہاں تو نکتہ رس نظریں پہرہ دے رہی تھیں۔ استاد محترم نے برجستہ اپنی بصیرت کا تیر اچھالا اور ترکی بہ ترکی جواب ''کے کے ہیں'' سے وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس مختصر مگر زہر خند میں ڈوبے ہوئے جملے نے طنز کی بساط الٹ دی اور ثابت کر دیا کہ آپ کے سامنے لفظوں کی بازی گری اور ملمع سازی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

مگر اس جلال طبع کا سب سے تابناک اور نادر پہلو ان کی وہ حق پرستی تھی جو انا کے کوہ گراں کو پاش پاش کر دیتی تھی۔ وہ ان روایتی علما میں سے نہ تھے جو اپنی تحقیق کو ''حکم ناطق'' سمجھ کر اس پر اڑ جاتے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ان سے ایک مولانا نے اپنے والد العلام کی شخصیت پر کچھ روشنی ڈالنے کی فرمائش کی تو آپ نے تمہیدی پیراگراف لکھ کر مجھے فون پر سنایا۔ وہ یہ تھا۔ شعر:

وہ جلوہ طور تھا گر مقتضیٔ شعلۂ طور
تو آگ کیوں نہ لگے ان کے آشیانے میں

غلط بیانی سے سخت ناراض ہوجاتے تھے، قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے چاہے زبانی ہو یا تحریری۔ چنانچہ جب 'جلوۂ طور' سامنے آئی تو آگ بگولہ ہوگئے اور 'شعلہ طور' لکھ ڈالی۔ احقر نے نہایت ادب سے توجہ دلائی۔ شعلہ طور کے بعد جلوہ طور اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ شعلہ طور کا جواب جلوہ طور ہے نہ کہ جلوہ طور کا جواب شعلہ طور۔ اس سلسلے میں مولانا موصوف سے ہی معلوم کرلیں۔ ان کے یہاں کتاب ہوگی اور حال ہی میں مولانا ابن حسن صاحب املوی کی کتاب ''تاریخ مدرسہ باب العلم'' خود نگاہوں سے گزری ہے۔ اس میں بھی شعلہ طور کی اشاعت پہلے ہے۔ جب یہ مستند حقیقت بتائی تو انھوں نے کسی ثقیل عذر کا سہارا لینے کے بجائے برملا اعتراف کرلیا۔ کسی خورد کی دی ہوئی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کردینا ان کے اس ظرف کی دلیل تھی جو صرف اور صرف سچائی کا متلاشی ہوتا ہے۔

یہاں اس تحریر کا مقصود یہ ہے کہ ان کی تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کی تحریر اردو کے ان شاہکاروں میں کھڑی ہے جہاں الفاظ بولتے ہیں اور قلم کی جلالت سے شخصیت کا ایک ایک پہلو مجسم ہوکر سامنے آجاتا ہے۔ سچ ہے وہ ایک کھردری مگر صندل کی قیمتی لکڑی کی مانند تھے جو اوپر سے سادہ اور سپاٹ نظر آتی ہے لیکن اسے جتنا خراشا جائے اتنا ہی اس کے اخلاص کی خوش بو مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔ وہ ایک کھردرے اور بے ریا انسان تھے جن کے نزدیک حق کا وقار اپنی ذات کی برتری سے کہیں بلند اور مقدم تھا۔ بلاشبہہ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ 'آئینۂ تجلیات' تھے جو ٹوٹ کر بکھر چکا ہے مگر وہ ٹوٹ کر بھی اپنی کرچیوں میں حق کے ہزاروں عکس چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی کرچیاں ہزاروں چراغ بن کر ملک و بیرون ملک میں مدرسوں، محرابوں، منبروں اور یونیورسٹیوں پر روشن و منور ہیں۔

استاذی العلام مرحوم و مغفور رخصت ہوکر بھی اپنی تحریروں (تصانیف) اپنے شاگردوں، اپنی علمی وجاہت ''اپنے فرزندوں'' کی صورت میں ایک عکس لازوال چھوڑ گئے ہیں۔ صریر خامہ تھک سکتا ہے، الفاظ ختم ہوسکتے ہیں لیکن اس ''آئینہ تجلیات'' کی ضیا پاشی تاریخ علم کے ماتھے کا جھومر رہے گی۔ ان کی رحلت صرف ایک سانحہ نہیں، بلکہ اقلیم علم و دانش کا وہ سناٹا ہے جو دلوں کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ ان کی بخشی ہوئی علمی بصیرت کبھی فنا نہیں ہوسکتی۔ وہ سینوں میں ایک امانت بن کر دھڑکتی رہے گی۔ فقط [کاظم علی واعظ]

☆☆☆

مولانا محمد حجّت
استاد درجات عالیہ، وثیقہ عربی کالج، فیض آباد، رابطہ نمبر: 9935088215

آہ! فخر المدرسین

یہ قرآنی حقیقت ہے کہ انسانی وجود بغیر علم کے مکمل نہیں ہے جیسا کہ قرآن مجید کے سورۂ علق کی ابتدائی آیات سے یہ بات بخوبی روشن ہے جس میں نعمت وجود کے فوراً ہی بعد نعمت علم کا ذکر ہے، مشیت نے واضح طور پر یہ بیان کر دیا کہ انسانی وجود کی زینت اگر کسی چیز سے ہے تو وہ علم ہے۔ انسان باعتبار وجود بھلے ہی خوب صورت ہو مگر بغیر علم معنوی خوب صورتی سے محروم ہے۔ اس معنوی و باطنی خوب صورتی کا ذریعہ صرف علم ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے وجود کو زیور علم و ادب سے آراستہ کر کے دنیا و آخرت میں اپنا قد اور رتبہ بلند کرتے ہیں، قابل فخر ہیں وہ اہل علم جو اپنے چراغ علم سے علم و ادب کے چراغ روشن کرنا اپنے علم کی خیرات سمجھتے ہیں اور اس طرح وہ دنیا میں رہ کر اپنی قبر و برزخ کی تاریکیوں کو دور کرنے کا دائمی انتظام کرتے ہیں۔ چنانچہ حدیث مبارکہ میں جناب موسیٰ سے قدرت کا خطاب ہے: اے موسیٰ! ''**فانّی منوّرٌ لمعلّمی الخیر و متعلّمیه قُبورهُم**'' (منتخب میزان الحکمۃ، ص ۴۰۰؛ فضل المعلم، ص ۱۳۳۵) میں خیر سیکھنے اور سکھانے والوں کی قبروں کو منور کر دوں گا۔

فخر المدرسین استاذ الاساتذہ مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ انھیں خصوصیات کے مالک ہیں جنھوں نے علم حاصل کر کے اپنے کو زیور علم و ادب سے آراستہ کر کے اپنی ذات کو معنوی جمال کا مظہر بنایا چنانچہ وارث علم نبی حضرت علیؑ سے منسوب ایک شعر میں حقیقی جمال و خوب صورتی کو اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''**انّ الجمال، جمال العلم و الادب**'' بے شک جمال تو علم و ادب کا جمال ہے۔ صحیح معنوں میں جس نے علم و ادب کے ذریعہ اپنی ذات کو معنوی جمال سے آراستہ کر لیا، اس نے اپنے کو اس حدیث کا مصداق بنا لیا۔

''**انّ الله جمیل یحب الجمال**'' بے شک اللہ جمیل ہے، وہ جمال (علم و ادب) کو پسند کرتا ہے۔ بغیر علم و ادب، ظاہری جمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں کیوں کہ ظاہری جمال پر مکمل زوال کا سایہ ہے

جب کہ علم وادب کے ذریعہ حاصل ہونے والا معنوی جمال سدا بہار ہے جس پر فنا کا سایہ ہی نہیں۔ حضرت علیؑ کی حدیث شاہد ہے: ''العلماء باقون مابقی الدھر .....'' (نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷) علما رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں۔ ان کے اجسام بے شک اوجھل ہوجاتے ہیں مگر ان کی صورتیں (آثار کی شکل میں) دلوں میں موجود رہتی ہیں۔

اخوالعلم حی خالدٌ بعد موته واوصاله تحت التراب رمیم

علم و ادب والا اپنی موت کے بعد بھی (اپنے علمی کارنامے کی وجہ سے) ہمیشہ زندہ رہے گا، حالاں کہ اس کے اعضا مٹی کے اندر بوسیدہ ہوجاتے ہیں۔

فخر المدرسین بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ عربی و فارسی، منطق وفلسفہ کے اچھے اور ذمہ دار استاد تھے۔ سخت مطالب کو بھی آسان الفاظ اور سادہ انداز میں طلاب کے ذہنوں میں اس طرح منتقل کردیتے تھے کہ وہ مطمئن ہوکر ہی آپ کے پاس سے ہٹتے۔ مرحوم عربی و فارسی اور اردو قواعد وادبیات پر گہری نظر رکھتے، لغات پر خاصا عبور تھا۔ مذکورہ تینوں زبانوں کے کافی اشعار حفظ بھی تھے جسے وہ برمحل سنایا کرتے تھے۔ آپ بہترین انشا پرداز اور ایک اچھے کہنہ مشق استاد شاعر بھی تھے۔ تحریر میں فکر کے ساتھ ادبی چاشنی ہوتی جسے پڑھنے والا پڑھ کر ہی دم لے۔ جو موصوف سے آشنا نہیں ہے ممکن ہے وہ میری باتوں پر یقین نہ کرے مگر جنھوں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے وہ یقیناً میری بات کی تائید کریں گے۔

میری پہلی ملاقات ۱۹۸۲ء میں ہوئی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا اور پھر ان سے برابر علمی استفادہ کرتا رہا۔ میری اکثر تالیفات طبع ہونے سے پہلے ان کی نگاہوں سے گزری ہیں جن پر بطور تقریظ آپ کے تاثرات بھی موجود ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ مرحوم کے یہاں ٹال مٹول یا سرسری نگاہوں سے دیکھ کر اپنے سر کی بلا ٹالنے کی عادت بالکل نہ تھی بلکہ وہ انتہائی دیانتداری، ذمہ داری اور دقت نظر سے دیکھتے اور جہاں ضرورت ہوتی وہاں مناسب اصلاح فرما کر متوجہ کرتے تھے۔ میرے پاس شکریہ کے لیے الفاظ نہیں، اب تو مغفرت اور بلندی درجات کے لیے صرف دعا ہے۔ انتقال سے ایک ہفتہ قبل خود ہی فون کیا اور کہا طبیعت سنبھل نہیں رہی ہے دعا کیجیے گا، آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، علم وادب کا یہ سورج اپنی علمی وادبی شعاعوں کو بکھیر کر گوشہ قبر میں چھپ گیا، اب کنج لحد میں نور ولایت آل محمدؐ کی تابانی ہے اور علمی وادبی آثار کی روشنی۔

☆☆☆

مولانا مظاہر حسین
پرنسپل مدرسہ باب العلم، مبارک پور، اعظم گڑھ، رابطہ نمبر: 9450540828

معلّمِ اُسوہ

(مولانا ارشاد حسین معروفی طاب ثراہ)

ولادت ۱۸؍اکتوبر ۱۹۴۹ء
وفات ۱۴؍اپریل ۲۰۲۵ء مطابق ۱۵؍شوال المکرم ۱۴۴۶ھ
بروز دوشنبہ، بمقام ایرا زلکھنؤ میڈیکل کالج واسپتال

اسلام کائنات میں وہ واحد مذہب ہے جس نے تعلیم وتعلم پر بہت زور دیا اور اس کو عبادت قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت ''اقراء باسم ربک الذی خلق'' (اس کا نام لے کر پڑھ جس نے پیدا کیا) اسی حقیقت کو لے کر اتری اور اسی مقصد کی ترجمانی کرتی ہے۔

اسلام کی نگاہ میں علم اور دین دونوں توأم (جڑواں) ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اسلام کی نظر میں تعلیم وتعلّم کا مقصد خالص رضائے الٰہی کی طلب ہے اور بس اس میں کسی دنیاوی غرض کا میل نہیں۔ اس کی نظر میں تعلیم کا اصلی مقصد صرف انسانی پیدائش کی منشا کو پورا کرنا، اچھے اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ ہونا، دوسروں کو آراستہ کرنا، اپنے علم کی روشنی سے جہل و نادانی کے اندھیرے کو دور کرنا، نہ جاننے والوں کو سکھانا، بھولے بھٹکے کو راہ دکھانا، حق کو پھیلانا اور باطل کو مٹانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اہل علم کی خوبیاں اور بڑائیاں گنا کر ان کے مرتبے بڑھائے۔ چنانچہ اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید میں بہت سی آیتیں اس بات کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے: شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ۔ ترجمہ: اللہ نے گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور فرشتوں نے اور اہل علم نے، وہ فیصلہ کرنے والا ہے عدل کے ساتھ۔ اس آیت میں اللہ نے پہلے اپنا نام لیا، پھر فرشتوں کا پھر تیسرا درجہ اہل علم کو عطا کیا ہے اور یہ اہل علم کے شرف وفضیلت کی ایک نشانی ہے۔

سورۂ زمر میں ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟ اسی طرح اہل علم کے درجات کی بلندی کا ذکر سورۂ مجادلہ میں ان الفاظ میں کیا ہے: يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ۔ تم میں سے جو ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا اللہ ان کے درجے بلند کرے گا۔ حضرت ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ علما کو عام مسلمانوں پر سات سو درجہ زیادہ فضیلت دی گئی ہے اور ان درجوں کے باہمی فرق کے لیے ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان پانچ سو سال کی مدت کا فصل سمجھنا چاہیے۔ پھر سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے: فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ اہل ذکر سے پوچھو اگر نہیں جانتے کہہ کر جہلا و نادانوں کو اہل علم و ذکر سے تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

پھر سورۂ عنکبوت میں اعلان ہوا: وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ۔ یہ مثالیں ہم نے لوگوں کے لیے بیان کیں اور انھیں سوائے علم والوں کے دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح سورۂ فاطر میں علما کو مخصوص فضیلت دی اور فرمایا: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

ایسے ہی احادیث نبویہ و اہل بیت علیہم السلام نے اہل علم کے فضائل بہت زیادہ بیان کیے ہیں جن میں سے چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ۔ علما، انبیا کے وارث ہیں۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا ایک عالم کی مجلس کی حاضری ایک ہزار نمازوں، ایک ہزار مریضوں کی عیادت اور ایک ہزار جنازوں کی شرکت سے افضل ہے۔ اس پر پوچھا گیا کہ قران کی تلاوت سے بھی؟ تو آپ نے فرمایا کہ کیا قرآن علم کے بغیر نفع پہنچا سکتا ہے؟

حضرت امیر المومنینؑ کا ارشاد گرامی ہے: الْعَالِمُ حَيٌّ وَإِنْ كَانَ مَيِّتًا۔ عالم زندہ ہے اگرچہ دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔ اسی طرح فرمایا: الْعُلَمَاءُ بَاقُونَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ، أَعْيَانُهُمْ مَفْقُودَةٌ وَأَمْثَالُهُمْ فِي الْقُلُوبِ مَوْجُودَةٌ۔ جب تک دنیا قائم ہے علما باقی رہنے والے ہیں ان کے اجسام بظاہر مفقود ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی با کردار، رفیع الدرجات، نابغۂ روزگار علما میں استاذ الاساتذہ صدر المتجرین، قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، معلم اسوہ، شاہکار تدریس میں مولانا ارشاد حسین معروفی کا شمار ہوتا ہے جن کی ابتدائی تعلیم وطن عزیز کے معروف ادارے اشاعت العلوم میں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں مشرقی یوپی کے قدیم و مشہور ادارہ مدرسہ باب العلم کے درجۂ ششم میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۵ء تک امتیازی نمبروں سے کامیابی کے بعد ۱۹۶۶ء کے آغاز میں ملک کے مشہور ادارہ مشارع الشرائع المعروف بہ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ میں درجہ عالم

میں داخلہ لیا اور اسی زمانے میں عصری تعلیم کا سلسلہ لکھنؤ یونیورسٹی میں جاری رہا اور ۱۹۷۲ء میں ممتاز الافاضل کی آخری سند حاصل کی۔

حصول علم کے بعد زَكَاةُ الْعِلْمِ أَنْ تُعَلِّمَهُ عِبَادَ اللهِ (علم کی زکوۃ اللہ کے بندوں کو تعلیم دینا اور سکھانا ہے) کے سائے میں اپنی زندگی گزار دی۔ عمر رواں کا ہر لمحہ علوم و معارف محمد و آل محمد علیہم السلام کی نشر و اشاعت اور ترویج میں صرف کیا۔ نہایت متانت، سنجیدگی، سادگی کے ساتھ مسند تدریس و محراب و منبر کی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔ آج کثیر تعداد میں آپ کے شاگرد قم، مشہد (ایران)، نجف و کربلا (عراق) اور شام میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہندوستان اور دیگر ممالک میں تدریس و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ آپ جامعہ ناظمیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف جگہوں، مختلف مدارس جن میں دہیاورا کبر پور، جامعہ ناصریہ جون پور، جامعہ حیدریہ خیر آباد و مدرسہ باب العلم مبارک پور میں تدریس و تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے اور جب سے مدرسہ باب العلم مبارک پور، اعظم گڑھ میں مشغول تدریس ہوئے، دنیائے علم میں آپ کی شہرت بڑھتی چلی گئی۔ مدرسے کی تعلیم کو اس طرح بام عروج تک پہنچایا کہ آج بھی ان کا نام فخر و احترام سے لیا جاتا ہے۔

وہ ایک فرد نہیں بلکہ مکمل ادارہ تھے جنھوں نے اپنے شاگردوں کو اس طرح پروان چڑھایا کہ وہ دنیائے علم کے لعل بے بہا بن کر دنیائے علم کو خوش بوئے علم سے معطر کیے ہوئے ہیں۔ وہ نہ فقط اپنے شاگردوں کے لیے بلکہ ہر زندہ دل اور پڑھے لکھے شخص کے لیے اُلگو اور نمونۂ عمل ہیں۔

روش تدریس: ان کی روش تدریس اساتذہ کے لیے قابل تاسّی ہے۔ وہ تدریس کے اوقات کو شب و روز میں تقسیم کر کے نہیں رکھتے تھے بلکہ جب کسی نے تشنگی علم کا اظہار کیا اپنے علمی چشمے سے سیراب کرنے کے لیے آمادہ رہتے۔ مطالعہ و پیش بینی تدریس سے پہلے کرنا اپنا وظیفہ سمجھتے تھے اور اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ معضلات، تاملات، پیچیدہ عبارتوں کو آسان سے آسان کر کے مختصر لفظوں میں دل و دماغ میں اس طرح اتارتے تھے کہ سبق اور اس کے مطالب و مفاہیم نقش کالحجر ہو جاتے تھے۔

طالب علم کے ذہن و فہم کے اعتبار سے تدریس کرنا ان کا خاصہ تھا۔ قلّ ما دلّ کے اسلوب پر جامع و مانع مطالب و متن ذہن نشین کراتے تھے تاکہ جب ضرورت ہو بلا حافظہ پر زیادہ زور دیئے بیان کیا جا سکے۔ یہ خوبی ایک ہنرمند استاد کی انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ خوبی ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

اکثر تدریس کرتے کرتے آواز بلند ہو جاتی، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ استاد اپنی بات طالب علم کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئے۔ طالب علم کے چہرے کی شادابی اور مسکان سے یہ بے خودی کے عالم میں خود بخود آواز بلند ہو جاتی ہے۔ کم فہم سے کم فہم طالب علم کو تمرین و ممارست اور بار بار تکرار کے ذریعے کچھ دن

کی مسلسل محنت سے بافہم وزیرک بنا دیتے تھے۔ یہ ایک اچھے استاد کی امتیازی خاصیت ہے جو ان میں نمایاں تھی۔ اکثر مدرسہ تعلیمی بورڈ (الہ آباد سابق میں) لکھنؤ کے امتحان کے لیے جامع العلوم جوادیہ عربی کالج یا ایمانیہ عربی کالج یا دیگر جگہوں کے بچے جب امتحان کی تیاری کے درمیان ان کی اس روش تدریس سے استفادہ کرتے تو باغ باغ ہوجاتے اور اس طرح کی آسان روش تدریس کا چرچا کرتے تھے۔ اس طرح ان کا نام دور دور تک پھیلا اور ان کی شہرت زباں زدِ خاص وعام ہوتی چلی گئی۔

جامعہ جوادیہ یا جامعہ ایمانیہ بنارس کے طلاب آج بھی مدرسہ باب العلم سے منشی، مولوی، عالم کا امتحان دیتے ہیں۔ چوں کہ سرکار ظفر الملۃ طاب ثراہ باب العلم کے پرنسپل رہ چکے ہیں، اس لیے یہ آپسی و امتحانی تال میل آج بھی قائم ہے اور مولانا ارشاد حسین معروفی طاب ثراہ کی بہترین محنت اور امتحان میں امتیازی نمبر دلانے کی انتھک کوششوں کا ثمرہ ہے۔ جس استاد کے ذریعے بچے اچھا رزلٹ لائیں گے ان کا نام دور دور تک ضرور شہرت پائے گا اور اس کے اسلوب تدریس وطرز فہمائش کا چرچا ہوگا۔

ایک اچھے اور ماہر استاد کی خوبی یہ ہے کہ وہ جن علوم وفنون کی تدریس کر رہا ہو اس پر خود مسلط ہو اور اکثر متونِ درسی زبانی یاد ہوں تاکہ طلاب کو مختصر سے مختصر، آسان سے آسان کر کے مطالب سبق ذہن میں اتار سکے۔ یہ خوبی مولانا میں حد درجہ پائی جاتی تھی۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، معانی و بیان، صرف ونحو، منطق وفلسفہ، ادبیات عرب وعجم پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ اکثر تشریح الاعضا وادویۂ مفردہ ومرکبہ کے نسخے راہ چلتے بتاتے رہتے تھے اور دیوان متنبی اور حماسہ کے اشعار، کافیہ، ہدایت النحو، دروس البلاغہ، شرحِ ملا جامی کی عبارتیں زبانی یاد تھیں۔ منطق وفلسفہ کی اصطلاحوں کو اختصار کے ساتھ بتاتے اور ذہن نشین کرانے کی مہارت رکھتے تھے۔ امتحان کی تیاری میں آپ کی روش یہ ہوا کرتی تھی کہ گزشتہ کئی سال کے پرچوں کو دیکھ کر ۱۰۔ ۱۲ سوالات کا خاکہ بنا کر بچوں کو اسی کے جواب کی تیاری کراتے اور کہتے کہ انشاءاللہ یہی سوالات آئیں گے۔ گیس (اندازہ) اتنا صحیح لگاتے تھے کہ امتحان گاہ میں وہی سوال ٹکرا جاتے تھے اور طلاب کے حق میں تازہ آمادگی کام آجاتی تھی اور خوش ہوکر کہتے تھے کہ میں کہہ رہا تھا یہی آئے گا تو دیکھا آیا نہ؟ یہ ان کے تجربے کا نتیجہ تھا۔

اپنے شاگردوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان میں نہایت درجہ کی انکساری تھی۔ اتنی صلاحیت کے باوجود تکبر کا شائبہ نہ تھا۔ اخلاص حد درجہ پایا جاتا تھا۔ سراپہ عالم باعمل تھے۔ علم وعمل کی مثال نام ونمود سے الگ طلبہ کے تئیں دردِ دل رکھنے والی عظیم شخصیت مرنے کے بعد بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوسکتی: اَلْعِلْمُ لَا یُعْطِیكَ بَعْضَهُ حَتّٰی تُعْطِیَهُ كُلَّه۔ (علم تمہیں اپنا بعض حصہ بھی نہ دے گا جب تک تم اسے اپنا سب

کچھ نہ دے دو) کے اصول پر پوری حیات کاربند رہے جس کا یہ نتیجہ تھا جو مختصراً ذکر ہوا۔ واقعی مولانا ارشاد اسم بامسمّٰی تھے ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' مضمون طولانی ہونے کے خوف سے آپ کے آثار و تالیف وتصنیفات اور اولاد وغیرہ کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا کیوں کہ اس کا ذکر اکثر سوانح نگاروں اور حیات و کارنامے لکھنے والوں نے لکھا ہے۔ یہ تکرار قاری کے لیے باعث ملول ہوگی۔ المختصر یہ صرف ان کی علمی و تدریسی خدمات کی ایک ہلکی سی جھلک ہے ان پر مکمل روشنی نہیں۔

مولانا ارشاد حسین معروفی کی حیاتِ مبارکہ درحقیقت علم وعمل کی ایک درخشاں مثال تھی، جس میں تعلیم وتعلم کو محض پیشہ نہیں بلکہ عبادت اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھا گیا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اسی قرآنی ونبوی پیغام کے مطابق بسر کی کہ علم انسان کو نہ صرف خود سنوارتا ہے بلکہ معاشرے کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی تدریسی زندگی اس بات کی آئینہ دار تھی کہ ایک سچا معلم وہی ہے جو طلبہ کے ذہن وفہم کے مطابق علم کو آسان اور موثر انداز میں منتقل کرے، اور یہی وصف ان میں بدرجۂ کمال موجود تھا۔ ان کا اخلاص، سادگی، علمی رسوخ اور طلبہ کے تئیں شفقت نے انھیں ایک زندہ ادارہ بنا دیا تھا، جن کے فیض سے بے شمار شاگرد آج دنیا کے مختلف خطوں میں علمِ دین کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ ان کی ذات اس حقیقت کی عملی تفسیر تھی کہ علما اگرچہ ظاہری طور پر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، مگر اپنے علم اور شاگردوں کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی شخصیت ہمہ جہت اوصاف کا مرقع تھی، جن میں علم، عمل، تواضع، اخلاص اور خدمتِ دین نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف درسی میدان میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوایا بلکہ طلبہ کی تربیت اور ان کے مستقبل کو سنوارنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ان کی زندگی اس اصول کی جیتی جاگتی تصویر تھی کہ علم اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دے، اور انھوں نے اپنی پوری حیات اسی راہ میں صرف کر دی۔ آج ان کا فقدان یقیناً علمی دنیا کا ایک عظیم خسارہ ہے، مگر ان کی تعلیمات، ان کا اسلوبِ تدریس اور ان کے تیار کردہ شاگردان کے لیے صدقۂ جاریہ بن کر ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے علمی فیوض کو تا قیامت جاری وساری رکھے۔

''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ شاہکارِ تدریس ومعلم اُسوہ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر احتشام الحسن زنگی پوری
المؤمّل کلچرل فاؤنڈیشن، لکھنؤ، رابطہ نمبر: 7388707110

عمر بھر جس نے جلائے علم وحکمت کے چراغ

اقلیم شعور کی سرحدوں کے قریب ننھے ننھے قدموں سے پہنچا ہی تھا، سلطنت فہم وفراست کے پاس پہنچ کر اپنی بچکانہ نظروں کی خیرگی پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ والدین کے جذبۂ دینداری، دین و شریعت سے قلبی لگاؤ نے چمنستان علم وآگہی میں انگلیاں تھام کر پہنچا دیا۔ ائمہ معصومینؑ سے والہانہ عشق نے ماں باپ کو ہمیں علم دین سکھانے کا عزم بالجزم کرنے پر آمادہ کر دیا، نتیجہ میں عالم تشیع کے اساطین علم وفن کی ڈیوڑھی پر جبہ سائی کا حسین موقع میسر ہوا۔ اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تو روحانی وعلمی فضا نے میرے نحیف وجود کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ جہالت کی تاریکی چھٹنے لگی، علم وآگہی کا نور نہاں خانہ قلب میں جلوہ افروز ہونے لگا۔ صحرائے وجود روز روشن کی طرح جگمگانے لگا۔ میرے نحیف ولاغر وجود کو علمی ومعنوی توانائی سے توانمند بنانے میں جن اساتذہ ذوی الاحترام نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ان میں فخر العلما، استاذ الاساتذہ، ماہر معقول ومنقول، عالم وفاضل حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا ارشاد حسین معروفی اعلیٰ اللہ مقامہ قابل ذکر ہیں جن کے علمی تبحر، ادبی اسرار ورموز پر دسترس، منطق وفلسفہ کے پیچیدہ نکات کی سادہ وعام فہم حلاجی دنیائے طلابِ علوم دینیہ میں زبان زد ہے۔ ظرافت، نکتہ آفرینی، بزلہ سنجی آپ کا طرہ، فصاحت زبان وبلاغت کلام آپ کا خاصہ، نپے تلے الفاظ، جدید مگر عام فہم تراکیب، بے جا لفظی بازیگری کے بجائے مفید اور جذابیت نیز شیریں بیانی ساحرانہ اثر رکھتی تھی جو صفحۂ ذہن پر نقش ہو جاتی۔ للّٰہیت واخلاص کا مجسمہ، شفقت ومہربانیوں کا پیکر، فرض شناس، علم دوست، طلاب کے دلسوز، جھوٹی شان وشوکت سے بے پروا اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف رہتے، طلبہ وشاگردوں کی حوصلہ افزائی، علمی وفنی مسائل کی گرہ کشائی، تعلیم کے ساتھ تربیت میں ہمہ جہت کوشاں رہتے تھے۔

مبارک پور کے قدیم دینی وعلمی مرکز مدرسہ باب العلم میں اربابِ اقتدار کی باہمی رسہ کشی نے جہاں بہت سے مسائل کو جنم دیا وہیں تعلیم وتربیت کو بھی ازحد متاثر کیا، طلبہ واساتذہ کے درمیان بے چینی و

اضطراب اس حد تک بڑھا کہ چند غیر تمند اساتذہ کے ساتھ کچھ طلبہ نے بھی مدرسہ کو خیر باد کہہ دیا۔ سب سے زیادہ حالات کے شکار استاد مرحوم ہوئے اور وہاں سے رخت سفر باندھ لیا۔ اسی زمانہ میں جامعہ حیدریہ خیر آباد کا قیام عمل میں آچکا تھا، استاد محترم کے ہمراہ حقیر وہاں منتقل ہو گیا اور اس چشمہ فیض سے فیض یاب ہوتا رہا، بنتے بگڑتے حالات، سازشی جرگہ نے استاد کو وہاں بھی سکون سے فرائض انجام دینے میں مختلف النوع مشکلات ایجاد کیں اور مجبوراً جامعہ حیدریہ کو خیر باد کہہ دیا۔ شاید یہ تذکرہ تلخ و کرب آور ہو اس لیے اس سے چشم پوشی ہی بہتر و قرین مصلحت ہے۔

تحصیل علم و ادب کے جذبہ شوق کی پُر پیچ وادیوں کو عبور کرتے ہوئے میدان عمل میں قدم رنجہ فرمایا تو حالات و زمانہ کی گردشیں بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئیں مگر سرد و گرمِ زمانہ سے بے پروا تعلیم و تربیت کے جاذب نظر اور پر کشش اسلوب کا انتخاب کیا اور پھر زندگی بھر یہی میدان تربیت و تدریس آپ کی تگ و دو کا مرکز بنا رہا۔ مراکزِ دینی و مدارسِ عربیہ میں صاحبان علم و فضل کی کمی تو نہیں رہی ہے، لیکن پیکر اخلاص و مروت، للّٰہیت کے حامل افراد کمیاب ضرور رہے ہیں، دین کی خدمت کا جذبہ اشاعت پیغام الٰہی کی سچی تڑپ ایسی جنس گراں مایہ ہے جو خال خال ہی نظر آتی ہے، مگر مرحوم کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

استاذِ علّام کو رب قدیر نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اردو ادب ہو یا عربی و فارسی ادب، آپ کی مہارت اور مکمل دسترس کو دیکھ کر کہنہ مشق اساتذہ دم بخود رہ جاتے تھے۔ آپ کا امتیاز یہ تھا کہ اپنے افکار و نظریات زبردستی کسی پر تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ مستند حوالہ جات اور مستحکم دلائل کا ایسا مجموعہ بیان کرتے کہ عظیم المرتبت مانی جانے والی شخصیات بھی دنگ رہ جاتی تھیں۔

اہل علم کے لیے علمی موشگافی، طلبہ کے لیے مشکل و پیچیدہ مسائل کی تشریح و توضیح سن کر ارباب فن عش عش کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ باتوں کو ذہنوں میں راسخ کرنے کا ان کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ معمولی ذہن کا انسان بھی مطمئن و قانع ہو جاتا۔ وہ اپنے دور کے صرف کہنہ مشق، تجربہ کار اور جملہ علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے ایک عظیم مدرس ہی نہیں بلکہ مدرس گر بھی تھے۔ صف اول کے نامور معلم، ممتاز اور قدآور علمی شخصیت تھے۔

نثر و نظم کی دنیا میں یکساں مہارت کے حامل تھے۔ سادگی، بے تکلفی، روانی نیز نثر میں استدلالی پہلو نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ آپ نے اردو، عربی نیز فارسی ادب کی نثر و نظم میں شاہکار ذخیرے چھوڑے ہیں۔ خدا کرے وہ ذخائر زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں تاکہ ان کی علمی، ادبی شخصیت مزید اجاگر ہو سکے۔

شہرت سے دور گوشہ نشینی کی زندگی کو قلمی و تحقیقی امور کی انجام دہی میں گزارا اور بہت ہی اچھوتے موضوعات پر قلم کو گردش دیا لیکن ادبی چاشنی، دل فریب تراکیب، پُرکشش انداز میں کہ پڑھنے والے کا ذہن بوجھل نہ ہو۔ مذہبی موضوعات ہوں یا ادبی عناوین ہر ایک پر قلم کو گردش دیا اور جب تک خود مطمئن نہ ہوئے تحقیق و جستجو کرتے رہے اور ایک مستند بات پیش کرنے کی کوشش کی۔

میدانِ تحریر ہو یا مسندِ تدریس ہر ایک شعبہ میں پورے ایقان و اذعان سے پڑھاتے اور لکھتے، خود کتابوں اور منابع کا مطالعہ کرتے تھے۔ آج کے شہرت یافتہ اساتذہ کے مانند طلبہ کا استحصال کسی بھی صورت قابل قبول نہ ہوتا۔

آہ! اب وہ معلم مہربان، وہ مربی مشفق زمانہ کی تنگ و تاریک وادیوں میں ہمیں تنہا چھوڑ کر ابدی دنیا کی طرف چلا گیا۔ دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے۔ اب کس سے علمی مسائل میں رجوع کریں؟ الجھی علمی گتھیاں کون سلجھائے گا، تبلیغ و ترویج دین کی کٹھن راہوں پر حوصلہ افزائی کون کرے گا؟

ع: ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

خدایا تیرے خزانہ میں کمی نہیں ہے، تو ہی مسبّب الاسباب ہے اور تو ہی بہترین نگہبان و سرپرست ہے۔ خدایا راہِ دین میں ہمیں تنہا نہ چھوڑنا اور ہمارے اساتذہ بالخصوص استاد مرحوم کے لیے جنت میں اعلیٰ مقام متعین فرما۔ بحق محمد و آل محمد علیہم السلام۔

☆☆☆

مولانا انصار احمد معروفی
استاذ مدرسہ چشمۂ فیض، ادری، مئو، رابطہ نمبر: 8853214848

جیدالاستعداد محقق، عالم دین، اور ادیب وشاعر

مولانا ارشاد حسین مرحوم اپنی علمی متانت اور علمی گہرائی و گیرائی میں ممتاز مانے جاتے ہیں، آپ نے پوری زندگی علم و ادب کی خدمت اور اس کی نشر و اشاعت میں گزار دی۔ آپ کی حیات مستعار تدریس و تحقیق سے عبارت تھی۔ علمی رنگ و آہنگ آپ کی ذاتی اور مجلسی گفتگو سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔ فکر میں وسعت اور اہل علم کا احترام و اکرام، علمی اداروں اور اہل علم سے آپ کو بے انتہا محبت تھی۔ پورہ معروف جسے مدینۃ العلم کہا جاتا ہے، جس کی مٹی نے بڑے بڑے جبال علم کو پیدا کیا، جن کی شہرت و مقبولیت علمی حلقوں میں پھیلی ہوئی ہے، ان علما میں اہل سنت علما کے دوش بدوش شیعہ علما کی خدماتِ جلیلہ بھی نا قابلِ فراموش ہیں، جن میں سرفہرست مولانا ارشاد حسین کی ذات گرامی اپنی علمی خدمات وتحقیقات کے حوالے سے بہت معروف ومعتبر ہے۔

آپ سے ملاقات 'المعارف دار المطالعہ' پورہ معروف میں اکثر ہوا کرتی تھی، جہاں آپ کتابوں کے مطالعے، یا کسی مسئلے کی بحث وتمحیص کے لیے تشریف لایا کرتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی عربی عبارت کے ترجمے اور اس کے مفاہیم کے ممکنہ وسیع معنی کی تعیین کے لیے پہنچتے، جہاں کئی اہل علم کے درمیان اس مسئلے کو رکھ کر مصنف کے اسلوب نگارش کے نئے نئے معنی کی تحقیق وجستجو ہوا کرتی تھی۔ کیوں کہ اکثر المعارف دار المطالعہ پورہ معروف میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا اجتماع ہو جایا کرتا تھا۔ طالبان علوم و فنون کبھی بھی علم سے مکمل سیرابی کا دعویٰ نہیں کرتے اور نہ ہی اہل علم سے رجوع کرنے میں انھیں کوئی عار محسوس ہوتا ہے، جب تک آپ کو کسی درپیش مسئلے کے تعلق سے تسلی وتشفی حاصل نہیں ہو جاتی تھی تب تک آپ کتابوں کے مطالعے یا اس فن کے ماہرین سے اخذ واکتساب میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اس لیے آپ اپنے سے کم علم اور کم عمر حضرات سے بھی اس درپیش مسئلے میں مراجعت کرنے میں پس وپیش نہیں کیا کرتے تھے اور بے جھجک اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں باہم تناصر وتفحص کے طریقۂ کار پر عمل پیرا ہو جاتے تھے۔

المعارف دار المطالعہ میں ان سے علمی تعلق قائم ہوا اور علمی بنیادوں پر اس میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ وہ اہل علم کے قدر داں اور ان کے مقام و مرتبہ سے کما حقہ واقف تھے۔ مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف میں انھوں نے فارسی و عربی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس لیے وہ اس ادارہ کے قدر شناس اور اس کے بہی خواہ تھے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنے درسی ساتھیوں سے ملاقات کرنے اور ان کی مزاج پرسی کے لیے بھی اس ادارے میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔

مدرسہ اشاعت العلوم کے اپنے وقت کے نائب ناظم مولانا مجیب الرحمٰن صاحب (متوفی: ۲۰۲۳ء) جو شاید ان کے درسی ساتھی یا ہم عصر تھے، وہ جب بیمار ہوئے تو ان کی عیادت کے لیے وہاں جایا کرتے تھے، ایک بار میں اور مولانا ارشاد حسین صاحب ساتھ ہی اس مدرسے میں اس غرض سے پہنچے اور مولانا مجیب الرحمٰن صاحب کی خیریت دریافت کرنا اپنا مقصد بتایا۔ جب کہ اس وقت مولانا ارشاد حسین صاحب کی طبیعت بھی ناساز ہی رہا کرتی تھی۔ مگر اہل علم و اساطین ادب سے ملاقات ان کی سرشت میں شامل تھی۔

مولانا ارشاد حسین صاحب نے اپنے ایک مضمون میں پورہ معروف کے علما و فقہا کی علمی خدمات کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ: ''الحمدللہ پورہ معروف علما اور فقہا کے اعتبار سے بڑی زرخیز بستی ہے، یہاں متعدد علوم و فنون کے متخصص پیدا ہوئے، حضرت مولانا عبدالجبار صاحب، حضرت مولانا عبدالستار صاحب، حضرت مولانا امانت اللہ صاحب، حضرت مولانا زین العابدین صاحب رحمہم اللہ، اور حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہ وغیرہم بلاشبہہ اللہ تعالیٰ کی نعمت تھے اور ہیں۔ ان کے بے شمار شاگرد نہ صرف ملک کے طول و عرض بلکہ دنیا کے ایک وسیع خطے میں علم دین کی روشنی پھیلانے میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

آپ حضرت مولانا زین العابدین علیہ الرحمہ کے بہت قدر داں تھے، اور المعارف دار المطالعہ میں مدرسے کی چھٹیوں میں حضرت سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ جب حضرت مولانا زین العابدین اعظمی معروفی کی وفات ۲۰۱۳ء میں ہوگئی، تو راقم الحروف نے اپنے پیر و مرشد کی حیات و خدمات پر مشتمل ماہنامہ 'پیغام' پورہ معروف کا ایک خاص ضخیم نمبر (مارچ ۲۰۱۴ء) مولانا کی یاد میں نکالا، اس موقع پر جہاں بہت سے اہل علم و قلم سے مضامین تحریر کرنے کی درخواست کی گئی وہیں مولانا ارشاد حسین صاحب سے بھی خصوصی طور پر مضمون لکھنے کی استدعا کی گئی۔ آپ نے اس نمبر کے لیے دو صفحہ کا مضمون قلم بند کیا جسے مذکورہ رسالہ میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ اس میں آپ لکھتے ہیں:

''ہمارے والد جناب شمس الدین مرحوم سے ان کے (یعنی حضرت مولانا زین العابدین)

کے بڑے اچھے روابط تھے۔ ایک بار وہ مجھے مولانا کی خدمت میں لے گئے، حضرت نے مجھ سے سوال کیا کہ بتاؤ اسمائے ستہ مکبّرہ کا اعراب کیا ہے؟ میں نے اعراب بتایا تو اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ میاں مکبّرہ کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟ میں نے کہا کہ جی جو مصغرہ نہ ہو، یہ سن کر مولانا نے میری پشت تھپتھپائی اور میرے لیے دعائے خیر کی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے حضرت کی دعا کو شرفِ قبولیت عطا کیا۔''

آگے حضرت سے مزید تعلقات اور ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حسن اتفاق کہ جب میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک مدرسہ باب العلم میں زیر تعلیم تھا، حضرت مولانا اس دوران مدرسہ احیاء العلوم، مبارک پور میں فریضۂ تدریس انجام دے رہے تھے، کچھ والد صاحب سے ان کی قربت، کچھ وطن کی محبت، کچھ طلب علم کا شوق مجھے ان سے ملاقات پر آمادہ کرتا، میں وقت نکال کر کبھی کبھی ان کی زیارت کو جاتا اور ان کے چشمۂ علم سے فیض یاب ہوتا۔''

آخر میں مولانا ارشاد حسین صاحب نے حضرت مولانا زین العابدین علیہ الرحمہ کے لیے ایصالِ ثواب اور ان سے عقیدت کے تعلق سے لکھا ہے کہ ''میرے ساتھ مولانا مرحوم کی جو محبت وشفقت تھی اسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ سورۂ فاتحہ کی شکل میں ہمیشہ ان پر عقیدت کے گوہر نثار کرتا رہوں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔'' درحقیقت اہل علم وفضل کے مقام ومرتبہ اور ان کی علمی حیثیت سے کوئی اہل علم ہی واقف ہوسکتا ہے، مولانا ارشاد حسین صاحب کا یہ مضمون ماہنامہ پیغام پورہ معروف میں صفحہ نمبر ۱۴ ۳/ پر شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے: ''افسوس! گلشن تدریس کا گل تر پژمردہ ہوگیا''

مولانا ارشاد حسین صاحب کا اخلاق بہت بلند تھا۔ ہمیشہ محبت وشفقت کے ساتھ ملتے اور نہایت خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خیریت دریافت کرتے، مدرسہ سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ صبح کو ٹہلنے کے لیے نکلتے اور میں اپنے مدرسے کے لیے جاتا تو راستے میں ملاقات ہوجاتی اور سلام ودعا کا تبادلہ ہوجاتا۔ المعارف دار المطالعہ میں تشریف لاتے، تو مولانا ارشاد خلیل قاسمی مرحوم اور ہم کئی احباب موجود رہتے، تو دیر تک علمی وادبی گفتگو چلتی رہتی جس میں شعری وادبی شخصیات نیز اردو اور فارسی کے شعرا کے کلام اور ان کی خصوصیات پر باتیں جاری رہتیں، اس وقت حوالے کے لیے کسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی تو فوراً استشہاد کے طور پر وہ کتاب نکالی جاتی، پھر چائے پانی کا دور چلتا۔ مولانا ارشاد حسین صاحب سخی اور مہمان نواز تھے۔ وہ بھی خود اپنی جیب خاص سے پیسے نکال کر میز پر رکھ دیتے اور بازار سے کوئی چیز

منگوا کر لذت کام و دہن کے سامان کا انتظام کر دیتے۔ یہ مجلس بہت پر لطف ہوتی اور عموماً مدارس اور مدرسین موضوع گفتگو ہوتے تھے۔ اس وقت یہ بات بھی زیر بحث آتی کہ مدرسین میں بھی اب علمی ذوق اور مطالعے کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی اساتذہ ہوتے ہیں جو پہلے سے سبق پڑھانے کی تیاری کر کے نہیں جاتے ہیں اور جلدی جلدی میں حاشیہ اور بین السطور دیکھ کر پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں جسے طلبہ بھی تاڑ جاتے ہیں۔ مولانا ارشاد حسین صاحب نے اس موقع پر کہا کہ طلبہ جب عبارت شروع کر دیتے ہیں تو استاذ اس کی عبارت خوانی کی غلطیوں پر کیسے گرفت کر سکتا ہے کیوں کہ وہ اس وقت حاشیہ دیکھ رہا ہوتا ہے اور چند سیکنڈ میں اپنا مسئلہ حل کرنے کی فکر میں محو رہتا ہے، اس لیے طلبہ غلط سلط عبارت پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر علی اصغر الحید ری
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، رابطہ نمبر: 9968616032

اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی

مولانا ارشاد حسین معروفی کی رحلت کا داغ ابھی تک تازہ ہے۔ آنکھیں اشکبار ہیں، دل نوحہ کناں ہے، اور فضا میں ایک ایسا سناٹا طاری ہے جس میں ہر صدا جیسے گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ روشنی کا ایک معتبر سرچشمہ یکا یک خشک ہو گیا ہو اور اس کے ساتھ ہی زندگی کے کئی گوشے نیم تاریکی میں ڈوب گئے ہوں۔ وہ رہنما، وہ مربی، وہ معلم شفیق جو ہمیشہ روشنیوں کا سراغ دیتا تھا آج خود قبر کے ایک گوشۂ بے روزن میں محو استراحت ہے۔ وہ ان اساتذہ میں سے نہ تھے جو زندگی کو محض اپنے لیے گزار دیتے ہیں، بلکہ ان میں سے تھے جو زندگی کو دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ وہ ایسے مشفق و مخلص استاد تھے جن کی بے قراری دراصل ان کے شاگردوں کی فکری و اخلاقی تربیت کے لیے تھی۔ ان کی راتیں بھی طلبہ کے سوالات کے گرد گھومتی تھیں اور دن بھی انہی کے اذہان کو جلا بخشنے میں صرف ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم ایک مقدس امانت تھی اور ایک ایسا فریضہ جسے وہ عبادت کے خلوص اور عشق کی وارفتگی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ یہ لمحۂ مفارقت کس قدر کربناک اور اذیت انگیز ہے، اس کا صحیح اندازہ لفظوں سے ممکن نہیں۔ کاش اس درد کو زبان دی جا سکتی۔ کاش یہ کلمات سلیقۂ اظہار جانتے تو شاید شدت احساس سے خود لفظوں کے یہ پیکر ٹوٹ کر بکھر جاتے۔ آج یہ آنکھیں کیوں نہ برسیں کہ ان میں علم و دانش کا سرمہ اسی معلمِ مہرباں کا کھینچا ہوا ہے۔ یہ دل کیوں نہ غم سے لبریز ہو کہ اس 'سینۂ بے نور' میں اسی ارسطوئے زماں نے شوقِ علم کا چراغ روشن کیا تھا۔ یہ ذہن کیوں نہ مضطرب ہو کہ اسی نے اس 'پیالۂ بے فیض' کو سلیقۂ فکر عطا کیا اور اسے معنی کی جستجو اور حقیقت کی پہچان کا ذوق بخشا۔

آج مولانا ارشاد حسین معروفی کی رحلت سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا بسیط کائنات سے نور کی ایک اہم شعاع کم ہو گئی ہو۔ الفاظ جاں بہ لب ہیں، احساسات بے نور سے ہیں، اور دل ایک ایسی خاموش چیخ میں مبتلا ہے جسے سننے والا کوئی نہیں۔ مگر جانے والا بھی گیا تو ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ..... گویا اسے یقین تھا کہ اب

اس کی ملاقات علمِ کل کے مالک، عقلِ کل کے منبع اور شرفِ کل کے مظہر سے ہونے والی ہے، اور وہ اس سفر کو ایک کامیاب معلم کی طرح سرخرو ہو کر طے کر رہا ہے۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ قافلۂ علم و عمل جس نے ہماری تربیت کی ذمہ داری اٹھائی تھی، کس تیزی سے گزر رہا ہے۔ ایک ایک کر کے وہ چراغ بجھتے جا رہے ہیں جن کی روشنی دل کو ڈھارس دیتی تھی۔ ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے کہ کاروانِ خلوص اپنی پوری تابانیوں، نورافشانیوں اور فیض رسانیوں کے ساتھ ہمارے درمیان موجود تھا، لیکن آج وہی کارواں بکھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ان مخلص اساتذہ کی فہرست جو کبھی طویل تھی، اب مختصر سے مختصر تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک ایک کر کے وہ ہستیاں رخصت ہوتی گئیں جن کے دم سے علم کی محفلیں آباد تھیں اور فکر کی شمعیں روشن تھیں، اور اب اس قافلۂ علم و عمل کا وہ امین بھی ہم سے جدا ہو گیا جو صدق و صفا کا پیکر تھا، مروت و محبت کا استعارہ تھا اور علمی فیاضی کا ایک درخشاں باب تھا۔ یہ سینہ داغدار ماتم کیوں نہ ہو؟ یہ آنکھیں اشکبار کیوں نہ ہوں؟ آخر خشک رہنے کا جواز ہی کیا ہے؟ ان اشکوں کی جھلملاہٹ میں کچھ یادوں کے دیپک روشن ہیں، جو ماضی کے امین ہیں اور انہی اشکوں کے سائے میں کچھ جگنو ہیں جو کبھی مدھم اور کبھی تیز چمک کر ہمیں ان لمحوں کی طرف لے جاتے ہیں جہاں زندگی میں روشنی تھی، سمت تھی، اور ایک مہربان رہنما کی موجودگی تھی۔

یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ہر یاد ایک تصویر اور ہر تصویر میں ایک جہاں آباد ہے۔ انہی تصویروں میں ایک تصویر وہ بھی ہے جب پہلی بار مولانا ارشاد معروفی کو دیکھا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ باب العلم، مبارک پور کی روانگی کا وہ لمحہ آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ دسمبر ۲۰۰۲ء کی ایک سرد شام تھی مگر دل میں امنگوں کی حرارت اور جذبوں کی روشنی تھی۔ اپنا مختصر سا اثاثہ لیے خال محترم مولانا مہدی حسینی کے ہمراہ باب العلم کے لیے روانہ ہوا۔ ایک ایسی درس گاہ کی طرف جو اپنی روایت کی امین اور اپنے وقار کی نگہبان تھی۔ جہاں ہزاروں طلبۂ علم کے اس منہلِ زلال سے سیراب ہو کر نکلے تھے، جس علمی سرپرستی کا سرا اظفر الملت جیسے نابغہ روزگار شخصیت سے متصل ہوتا ہے۔ میں ابھی نو واردگان میں شامل تھا۔ داخلے کے بعد شناسائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم عمروں سے بھی اور اساتذہ سے بھی، لیکن وہ لمحہ آج بھی اپنی پوری تازگی کے ساتھ یاد ہے جب پہلی بار ان کی زیارت ہوئی۔ سنیچر کی شام تھی۔ تعقیبات کے بعد سردی کی شدت کے باعث طلبہ اپنے کمروں میں مطالعہ میں مشغول تھے۔ مجھے کاتب والے کمرے میں قیام ملا تھا۔ اسی اثنا میں وہ نہایت سادہ انداز میں چہل قدمی کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ہاتھ میں ایک ریڈیو، لباس نہایت عام، مگر چہرے پر ایک غیر معمولی سکون اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ۔ ایسی مسکراہٹ جو کسی سے مخاطب ہونے پر اور گہری ہو جاتی تھی۔

کسی نے آہستہ سے کہا: ''سلام کرو، یہ مولانا ارشاد ہیں.....'' اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ''یہ سوال

کرتے ہیں، اور سوال میں ہی جواب بھی ہوتا ہے۔'' اس وقت میں اس جملے کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا مگر وقت کے ساتھ یہ راز کھلا کہ یہ محض ایک اندازِ گفتگو نہیں بلکہ ایک مکمل تدریسی فلسفہ تھا۔ ایسا اسلوب جس میں طالب علم کو سوچنے، سمجھنے اور خود دریافت کرنے کی راہ دکھائی جاتی ہے۔ ایک منظر اور یاد آتا ہے۔ نماز کے بعد تمام طلبہ اپنی کتابیں لیے امام بارگاہ کے ہال میں بیٹھے مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ حسبِ معمول ٹہلتے ہوئے آئے۔ ایک بچے کے ہاتھ میں 'ہندی پستک' دیکھ کر رک گئے۔ قریب آئے، مسکرائے اور نہایت سادہ انداز میں سوال کیا: ''کیا پڑھ رہے ہو؟'' پھر پوچھا: ''پرتھم کا کیا مطلب ہے؟'' بچہ خاموش رہا۔ مولانا نے مسکرا کر خود ہی کہا: ''پہلے سوال کا ہی جواب نہیں معلوم'' اور پھر شفقت سے جواب دیا کہ لفظوں سے دوستی کرو معانی خود بخود روشن ہوتے رہیں گے۔ ان کو اپنا بنالو یہ تمہیں اپنا بنالیں گے۔

غور کیجیے! یہ محض ایک سوال نہ تھا یہ ایک مکمل تربیتی نظام تھا، سادگی میں گہرائی، شفقت میں اصلاح اور مسکراہٹ میں حکمت۔ وہ واقعی سدا بہار شخصیت کے مالک تھے۔ لفظوں کی تہ داریوں سے آشنا اور ان کی نزاکتوں کے ادا شناس۔ جب بولتے تو لفظوں کے باہمی تناسب کا ایسا خیال رکھتے کہ جملہ محض جملہ نہ رہتا بلکہ ایک فکری پیکر بن جاتا۔ لفظوں کے اشتقاق، ہیئتی زیر و بم اور ساختاری حسن سے ایسی نکتہ آفرینی کرتے کہ سننے والا ان کی باتوں میں ایک خاص لذت محسوس کرتا۔

اخلاقی وقار، ادبی تعمق اور علمی تبحر اس درجہ تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ بھی ان کے سامنے شرفِ تلمذ حاصل کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ان کی علمی فیاضی ایسی تھی کہ جو بھی ان کے حلقۂ درس میں آیا، خالی ہاتھ نہ لوٹا۔ ان کے لیے علم کوئی محدود متاع نہ تھی، بلکہ ایک ایسا خزانہ تھا جسے وہ کشادہ دلی کے ساتھ بانٹتے تھے۔ مبارک پور میں دیگر مسالک کے علما کو بھی ہم نے ان سے علمی مشورے اور رہنمائی حاصل کرتے ہوئے دیکھا۔

مدرسہ بورڈ کے امتحانات کے دنوں میں ان کی محنت دیدنی ہوتی۔ ایک مہینہ قبل ہی طلبہ کی تیاری شروع کرا دیتے۔ کبھی کلاس میں کبھی کلاس کے بعد۔ جب امتحانات شروع ہوتے تو گویا وہ خود ایک امتحان میں مبتلا ہو جاتے۔ صبح سے شام تک طلبہ کے ساتھ اور رات کے ابتدائی حصے میں ان اساتذہ کے ساتھ جو ایران سے فارغ التحصیل ہو کر امتحان دینے آتے تھے۔ وہ تھکتے تھے اور نہ اکتاتے تھے کیوں کہ تعلیم و تدریس ہی ان کی روحانی غذا تھی۔ جب بھی دیکھیے درس و تدریس سے اشتغال۔ اگر خالی ہیں تو کتابوں کا مطالعہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان کے حلقۂ درس کی خاصیت انشراحِ صدر تھی۔ کوئی بھی مشکل سے مشکل مسئلہ پیش کر دیجیے، وہ نہایت دلجمعی، انہماک اور وارفتگی کے ساتھ اسے اس طرح حل کرتے کہ پیچیدگی خود سادگی میں بدل جاتی اور مشکل و مغلق مقامات آسان سے معلوم ہونے لگتے تھے۔

آج کے دور میں جہاں قدیم علوم سے رغبت کم ہوتی جارہی ہے اور جہاں فلسفہ، ہیئت اور افلاک جیسے علوم کو نظر انداز کیا جارہا ہے وہاں مولانا کی شخصیت ایک مکمل عہد کی نمائندہ تھی۔ وہ ہر فن مولا تھے، منطق وفلسفہ کے ادق مسائل میں ان کا تبحر ایسا تھا جو اب خال خال ہی نظر آتا ہے۔ وہ واقعی اس سلسلۂ ذہب سے تعلق رکھتے تھے جس کے علما بیک وقت کئی علوم پر عبور رکھتے اور صاحبِ نظر بھی ہوتے تھے۔

ان کی علمی خدمات کا دائرہ صرف درس وتدریس تک محدود نہ تھا۔ وہ رقعہ نویسی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ اگر ان کے لکھے ہوئے رقعات کو جمع کر کے کتابی صورت دے دی جائے تو وہ بلا مبالغہ ایک ادبی شاہکار ثابت ہوں گے۔ ان کی تحریر میں ژرف نگاہی، دقتِ نظر، متانت، سلاست اور ایک خاص طرح کا جمالیاتی توازن پایا جاتا تھا۔ وہ لفظوں کو اس طرح برتتے جیسے کوئی ماہر مرصع ساز قیمتی جواہرات کو ترتیب دیتا ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ مکمل، ہر جملہ مربوط اور ہر مفہوم بالکل واضح۔

میں خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی کے ہر اہم موڑ پر ان کی رہنمائی شامل رہی۔ مبارک پور کے بعد لکھنؤ کا سفر، اور اس سے متعلق اہم فیصلے۔ یہ سب ان کے مشورے سے طے پائے۔ آج جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ان کی دوراندیشی اور اخلاص وللّٰہیت کا اعتراف، دل کی گہرائیوں سے کرتا ہوں۔

میرے لکھنؤ آنے اور قیام پذیر ہونے کے بعد بھی کبھی ان کا سلسلہ فیضان نہیں رکا۔ مبارک پور میں عربی ادب ان کی نگرانی اور تشویق میں پڑھا تھا اور پھر جب لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تو چوں کہ ایک مضمون فارسی ادب بھی تھا، لہٰذا یہ نصاب بھی ان سے پڑھتا رہا۔ وہ جب بھی لکھنؤ آتے تو اپنی مادرِ علمی میں ضرور حاضری دیتے۔ طلبہ ان اوقات میں ان سے خوب علمی فیض حاصل کرتے تھے۔ وہ محض ایک استاد نہ تھے بلکہ ایک روحانی مربی تھے۔ ان کی صحبت میں گزرا ہر لمحہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ہم ایک ایسے انسان کے زیرِ سایہ تعلیم پا رہے تھے جو اپنے عمل میں للّٰہیت اپنی فکر میں گہرائی اور اپنی شخصیت میں ایک خاص نورانیت رکھتا تھا۔ آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک عہد اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ ایک ایسا عہد جس میں علم صرف کتابوں میں نہیں بلکہ کردار میں بھی جھلکتا تھا اور استاد صرف معلم نہیں بلکہ رہنما بھی ہوتا تھا۔ اور اب..... یہی یادیں ہیں، یہی چراغ ہیں اور یہی روشنی ہے۔ انہی کے سہارے ہم اپنے باطن کی تاریکیوں سے لڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن دل کے کسی گوشے میں یہ حسرت ہمیشہ زندہ رہے گی ایک ایسی کسک جو وقت کے ساتھ مدھم تو ہوسکتی ہے مگر ختم نہیں ہوسکتی کہ: ع۔

''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔''

☆☆☆

ابن ارشاد
پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، رابطہ نمبر: 7388886628

وقارِ باطن کا مجسم پیکر

مولانا ارشاد حسین کی شخصیت پہلی نظر میں ہی دل ونگاہ کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھی۔ قد میانہ، جسم متوازن اور حرکات وسکنات میں ایسا فطری وقار جھلکتا تھا جو بے اختیار احترام کی فضا قائم کر دیتا تھا۔ وہ نہ قامت کے اعتبار سے غیر معمولی تھے اور نہ ظاہری ہیئت میں کسی امتیاز کے محتاج، مگر جب کسی محفل میں وارد ہوتے تو اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتے۔ نگاہیں بے ساختہ ان پر ٹھہر جاتیں، گویا اس سراپے میں کشش باطن کی کوئی خاموش تاثیر کارفرما ہو۔

یہ وقار نہ کسی تصنع آمیز رکھ رکھاؤ کا نتیجہ تھا اور نہ کسی ظاہری اہتمام کی پیداوار، بلکہ ان کے باطن کی سنجیدگی، کردار کی استقامت اور سیرت کی پختگی سے پھوٹنے والی وہ کیفیت تھی جو بغیر کسی اعلان کے اپنی پہچان خود قائم کر لیتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ان کی شخصیت زبان سے زیادہ اپنے وجود کے ذریعے بولتی ہے اور خاموشی ہی میں اپنی معنویت کا اظہار کر دیتی ہے۔

سر پر ہمیشہ دو پلی ٹوپی ہوتی، جو ان کے رکھ رکھاؤ اور تہذیبی شعور کی علامت تھی۔ آنکھیں عرفان سے لبریز، جیسے مطالعے، تجربے اور فکر کی کئی دنیاؤں کا عکس اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوں۔ ان نگاہوں میں ٹھہراؤ بھی تھا اور اپنائیت بھی۔ جسم پر اکثر شیروانی ہوتی، سادہ مگر باوقار، جو ان کی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ دکھائی دیتی۔ لباس کبھی ان کی ذات پر حاوی نہیں ہوتا بلکہ ان کی شخصیت ہی لباس کو وقار بخشتی تھی۔ یوں مولانا کا سراپا دیکھنے والے کے ذہن میں ایک ایسے سنجیدہ، باوقار اور صاحبِ عرفان انسان کی مکمل تصویر کھینچ دیتا، جو خاموشی سے بھی اپنی شناخت قائم کر لیتا ہے۔

ان کا چہرہ سراسر کتابی تھا، ایسا چہرہ جو پہلی ہی نظر میں علم، مطالعہ اور تفکر وتخیل کی دنیا سے وابستگی کا اعلان کر دیتا۔ پیشانی کشادہ تھی، جیسے اس پر غور وفکر کی لکیریں خاموشی سے اپنی داستانیں رقم کر رہی ہوں۔ چہرے پر تکلف وتصنع کا شائبہ تک نہ تھا، سادگی تھی، ایسی سادگی جو دل تک اتر جائے۔ آنکھوں میں ایک

خاص قسم کا ٹھہراؤ موجود تھا، ایسا ٹھہراؤ جو عجلت اور سطحیت سے کوسوں دور نظر آتا۔ ان نگاہوں میں عجلت نہیں تھی، بلکہ تجربے کی پختگی اور مشاہدے کی وسعت تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان آنکھوں نے صرف افراد کو نہیں بلکہ وقت کے بدلتے ہوئے دھارے اور رنگ روپ کو بھی بغور دیکھا ہے۔ زمانے کی ناہمواریوں، انسانی رویوں اور حالات کی کروٹوں نے ان کی نگاہوں میں خاموش بصیرت بھر دی تھی۔

وہ کم گو تھے۔ ان کی خاموشی میں بھی ایک باوقار گفتگو پوشیدہ تھی۔ جب کسی کی طرف دیکھتے تو ایسا لگتا جیسے الفاظ کے بغیر ہی بہت کچھ سمجھا رہے ہوں۔ ان کی نگاہیں سوال بھی کرتی تھیں اور جواب بھی خود ہی دے دیتی تھیں۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کی خاموش نظریں طویل تقریر پر بھاری ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے سامنے بیٹھنے والا خود کو لاشعوری طور پر سنبھال لیتا، گویا وہ آنکھیں نہیں بلکہ آئینہ ہوں جو سامنے والے کو اس کی اصل صورت دکھا دیتی ہوں۔

ان کی ناک ستواں تھی اور چہرے کے خدوخال قدرتی تناسب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ نہ کوئی تصنع نمایاں تھا اور نہ کسی قسم کی مصنوعی خوب صورتی، بلکہ ایک ٹھہری ہوئی دل کشی تھی جو دیر تک اثر انداز ہوتی۔ داڑھی سادہ اور قرینے سے رکھتے۔ لباس میں سادگی تھی، مگر یہ سادگی بے رنگ نہ تھی۔ اس میں شائستگی، نفاست اور تہذیب کی خوش بو رچی بسی ہوتی۔ ان کی نظر اپنے ظاہر سے زیادہ باطن پر مرکوز رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے کپڑے کبھی توجہ کا مرکز نہیں بنتے تھے، بلکہ شخصیت توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا کہ لباس انھیں نہیں پہچان دیتا بلکہ وہ اپنے اخلاق و کردار سے لباس کو شناخت عطا کر رہے ہوں۔

وہ خوش باش اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ البتہ ان کی خوش مزاجی سطحی یا شور پسند نہ تھی بلکہ سنجیدگی میں گھلی ہوتی۔ نہ بے موقع ہنستے اور نہ بے محل خاموش رہتے تھے۔ سنجیدہ گفتگو کے دوران بھی ان کے چہرے پر ہلکی پھلکی، باوقار مسکراہٹ قائم رہتی، جو سامنے والے کے دل سے اجنبیت، جھجک اور خوف کو آہستہ آہستہ زائل کر دیتی۔ ان سے بات کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے علم کسی بوجھ کی صورت میں نہیں بلکہ سہل، نرم اور دل نشیں انداز میں منتقل ہو رہا ہو۔ گفتگو میں وہ تناسباتِ لفظی، جملوں کی ساخت اور مفہوم کی مناسبت کا خاص خیال رکھتے۔ لفظ ان کی زبان سے نکلتے تو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر معنی کو نکھار دیتے۔ یہی تناسباتِ لفظی ان کی گفتگو کو نہ صرف خوب صورت بناتے تھے بلکہ دیرپا اثر بھی عطا کرتے تھے۔

موقع و محل کی مناسبت سے اشعار کا استعمال ان کی گفتگو کا خاص وطیرہ تھا۔ وہ اشعار بات کی گرہ کھولنے، مفہوم کو واضح کرنے اور اثر کو دوچند کرنے کے لیے استعمال کرتے۔ کبھی فارسی و عربی کا کوئی شعر، کبھی اردو کی کوئی بلیغ سطر، اور کبھی کسی بزرگ کا مقولہ، سب کچھ اس طرح برمحل آتا کہ گفتگو میں روانی اور وقار

دونوں برقرار رہتے۔ وہ بوجھل عالم نہ تھے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا مرعوب یا خوف زدہ ہو جائے۔ ان کی مجلس میں نہ تصنع کی سختی تھی اور نہ علم کی ہیبت۔ بلکہ وہاں ایسا ذہنی سکون میسر آتا جو کم کم نصیب ہوتا ہے۔ ان کی خوش مزاجی ان کی فطرت کا حصہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی محفل سے اٹھتے ہوئے انسان خود کو ہلکا، مطمئن اور تازہ دم محسوس کرتا تھا۔

ظرافت مولانا کی گفتگو کا رنگ ہی نہیں، بلکہ ان کی شخصیت کا ایک متوازن اور مہذب وصف بھی تھا۔ ان کی شوخی میں شائستگی کی چمک اور مزاح میں وقار کی متانت موجود ہوتی۔ وہ ہنسی کو شور و غوغا میں تبدیل کرنے کے قائل نہ تھے اور نہ سنجیدہ بات کو بے جا قہقہوں کی نذر کرتے، بلکہ ان کے یہاں ظرافت معنی کی ترسیل کا ذریعہ، مقصد کی معاون اور فکر کی ہم سفر تھی۔

ان کا لطیفہ کبھی کسی کی دل آزاری کا موجب نہیں بنتا تھا۔ طنز کی دھار کو وہ اس قدر معتدل رکھتے کہ اصلاح کا اشارہ بنے، جراحت کا سبب نہ ہو، اور مزاح کی لطافت کو یوں برتتے کہ اس میں تمسخر کی تلخی یا تحقیر کی آمیزش نہ آنے پائے۔ ان کی ہلکی سی ظرافت مجلس کی فضا کو سبک، دلوں کو قریب اور بات کو قابلِ قبول بنا دیتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ظرافت کو تہذیب کلام اور تسہیل ابلاغ کا اسلوب سمجھتے تھے، جہاں مسکراہٹ فکر کی راہ ہموار کرتی اور شگفتگی سنجیدگی کی رفیق بن جاتی۔

وہ دشوار اور کڑوی سے کڑوی بات بھی اس لطیف پیرایۂ اظہار میں ادا کرتے کہ سننے والے کے ماتھے پر ناگواری کی لکیر تک نہ ابھرتی، بلکہ وہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے قابل قبول بنا لیتا۔ ان کے الفاظ میں خشونت کے بجائے حکمت کی روشنی ہوتی، اور لہجے میں تلخی کی آمیزش کے بجائے فہم و فراست کی شائستہ چمک نمایاں رہتی۔ وہ کلام کے آداب اور تاثیر کے رموز سے آگاہ تھے۔ انھیں بخوبی اندازہ تھا کہ کہاں توقف کرنا ہے، کس حد تک کہنا ہے، اور کس اسلوب میں کہنا ہے کہ معنی بھی محفوظ رہے اور مخاطب کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو۔ یہی اعتدالِ فکر، توازنِ بیان اور برمحل ظرافت ان کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی روشن دلیل تھی۔

علم کے ساتھ مولانا کا رشتہ رسمی یا پیشہ ورانہ نہ تھا بلکہ قلبی، دیرینہ اور جذباتی تھا۔ کتاب ان کے لیے رفیقِ تنہائی اور ہم رازِ فکر تھی۔ ان کی دوستی کتاب سے کسی خاص زمانے یا ضرورت کی پیداوار نہیں تھی، بلکہ عمر بھر کے ذوق اور مسلسل ریاضت کا نتیجہ تھی۔ گفتگو کے دوران جب وہ کسی موضوع پر بات کرتے تو حوالہ، مثال اور استدلال اس طرح بے ساختہ آتے کہ بات میں روانی بھی رہتی اور وقار بھی۔

وہ علمی گفتگو میں اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے خواہش مند نہ تھے۔ نہ القاب و خطابات کی طلب تھی اور نہ عالم کہلانے کی حرص۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت اپنی ذات کو منوانے کی نہیں، بلکہ بات کو سمجھانے

اور منوانے کی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کی گفتگو میں دعویٰ کم اور دلیل زیادہ ہوتی، اور ان کا اسلوب کسی بھی طرح علمی رعب یا نمائش کا احساس پیدا نہیں کرتا تھا۔

منطق اور فلسفہ جیسے دقیق، باریک اور بظاہر خشک سمجھے جانے والے موضوعات بھی اس قدر سہل، مربوط اور جاذب انداز میں پیش کرتے کہ ان کی پیچیدگی رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر فہم و ادراک کی سطح پر اتر آتی تھی۔ ان کا طریقۂ تدریس اصطلاحات کی توضیح یا تعریفوں کی تکرار تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ مسئلے کی جڑ تک پہنچتے، اس کے پس منظر کو واضح کرتے اور پھر اسے مرحلہ وار اس انداز سے کھولتے کہ طالب علم خود کو فکری سفر میں شریک محسوس کرتا۔

وہ مشکل ترین منطقی قضایا اور فلسفیانہ مباحث کو روزمرہ مثالوں، سادہ تمثیلات اور مانوس تجربات سے اس طرح جوڑ دیتے کہ اجنبی تصورات بھی مانوس ہو جاتے۔ ان کے درس میں ابہام کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جہاں کسی طالب علم کے ذہن میں سوال ابھرتا، وہ اس کو محسوس کر لیتے اور اس کا جواب اس سے پہلے دے دیتے کہ تشنگی اضطراب میں بدل جائے۔ ان کی گفتگو میں تسلسل بھی ہوتا تھا اور ترتیب بھی، ہر نکتہ اپنے مقام پر آتا اور ہر نتیجہ اپنی دلیل کے ساتھ ختم ہوتا۔

ان کے نزدیک منطق خشک قوانین کا مجموعہ نہ تھی اور نہ فلسفہ مجرد خیالات کی دنیا، بلکہ دونوں علوم انسانی فکر کی تربیت، ذہنی بالیدگی اور حقیقت تک رسائی کے وسائل تھے۔ اسی لیے وہ طلبہ کو غور و فکر پر آمادہ کرتے اور انھیں یہ احساس دلاتے تھے کہ مسئلہ حل کرنے سے زیادہ اہم مسئلہ کو سمجھنا ہے۔ ان کی تدریس کا کمال یہ تھا کہ طالب علم مشکل مباحث سے خوف زدہ ہونے کے بجائے ان سے انس محسوس کرنے لگتا، اور فلسفے کی گرہیں ذہن پر بوجھ بننے کے بجائے آہستہ آہستہ کھلتی چلی جاتی تھیں۔

علمِ صرف و نحو میں بھی انھیں غیر معمولی، بلکہ بجا طور پر کہا جائے تو غضب کی مہارت حاصل تھی۔ کافیہ، فصولِ اکبری، شافیہ اور شرحِ جامی جیسے دقیق اور طلبہ کے لیے ہیبت ناک سمجھے جانے والے متون کے مسائل اس قدر سلیقے، ترتیب اور وضاحت کے ساتھ سمجھاتے کہ مشکل سے مشکل قاعدہ بھی سہل اور قابلِ فہم ہو جاتا۔ ان کا طریقۂ تدریس عبارت خوانی یا تشریح لفظی تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ قاعدے کی روح تک پہنچتے، اس کے پس منظر کو واضح کرتے اور پھر مثالوں کے ذریعے اسے ذہن نشین کرا دیتے۔

وہ صرف یہ نہیں بتاتے تھے کہ قاعدہ کیا ہے، بلکہ یہ بھی واضح کرتے تھے کہ وہ کیوں ہے اور کہاں کہاں کارآمد ہے۔ اسی لیے ان کے پڑھائے ہوئے اسباق دیر تک یاد رہتے اور طلبہ کے ذہن میں نقش کالحجر ہو جاتے۔ اس سلسلے میں میرا ذاتی تجربہ بھی اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے، کیوں کہ میں خود ان کے

دروس میں براہ راست پانچ سال شریک رہا ہوں، بلکہ اس کے بعد بھی ہر مسئلے میں انھیں سے پوری زندگی مشورہ کرتا رہا۔ ان کے سامنے بیٹھ کر یہ احساس شدت سے ہوتا تھا کہ علمِ صرف ونحو قواعد کا انبار نہیں، بلکہ منظم اصول وضوابط ہیں، جو صحیح رہنمائی میں نہایت دلچسپ اور دل نشیں بن جاتے ہیں۔

ایک بار کتاب 'میزانُ المنطق' لائبریری میں دستیاب نہ تھی اور اس کا اسٹاک بالکل ختم ہو گیا۔ ایسے میں انھوں نے اس کمی کو ایک انتظامی مسئلہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا، بلکہ علم دوستی اور طلبہ نوازی کی ایک درخشاں مثال قائم کر دی۔ انھوں نے پوری کتاب کو خود اپنے ہاتھوں سے صرف تین دن میں نہایت خوش خط، مرتب اور واضح انداز میں لکھا، تاکہ طلبہ کو مطالعے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔ یہ نقل نویسی نہ تھی، بلکہ ایک استاد کی وہ خاموش خدمت تھی جس میں اخلاص، ذمہ داری اور علم سے والہانہ وابستگی پوری طرح جھلکتی تھی۔

بعد ازاں پورے درجے کے طالب علموں نے اسی تحریر کی فوٹو اسٹیٹ کرائی اور اسے بطورِ نصابی متن استعمال کیا۔ اس طرح ایک کتاب کی عدم دستیابی نے ان کے ہاتھوں علم کی اشاعت اور استفادے کی نئی صورت پیدا کر دی۔ یہ واقعہ نہ صرف ان کی علمی غیرت اور تعلیمی ذمہ داری کا ثبوت ہے بلکہ اس حقیقت کی بھی روشن دلیل ہے کہ ان کے نزدیک کتاب ایک شے نہیں بلکہ علمی امانت ہے، جسے طلبہ تک پہنچانا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے۔

وہ بچوں کے لیے دل وجان سے فکر مند رہتے اور ان کی فلاح وبہبود کے لیے بے دریغ خود کو صرف کرتے تھے۔ طلبہ کے معاملے میں وہ کسی مصلحت یا مداہنت کے قائل نہ تھے۔ اگر کبھی کسی طالب علم کے ساتھ ناانصافی ہوتی یا اس کا حق دبایا جاتا تو وہ بلا تردد مدرسے کی انتظامیہ کے سامنے روبرو ہو جاتے اور پوری جرأت، سنجیدگی اور دلیل کے ساتھ اس کا حق دلانے کی کوشش کرتے۔ ان کی یہ جدوجہد نہ جذباتی شور پر مبنی ہوتی اور نہ تلخ کلامی پر، بلکہ حکمت، وقار اور اخلاقی استدلال کے ساتھ ہوتی تھی۔

مولانا کی شخصیت میں ایک خاموش مگر عمیق کشش ودیعت تھی۔ ایسی دل آویز جاذبیت جو بے ساختہ قدیم بزرگ اساتذہ کی یاد تازہ کر دیتی۔ جو شخص بھی کسی نسبت، تعلق یا نیاز کے رشتے سے ان کے قریب آیا، وہ ان کے اخلاقِ کریمانہ، شفقتِ پدرانہ اور خلوصِ بے شائبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کی صحبت تربیتی تجربہ گاہ تھی، گویا ان کے مزاج کی ملائم حرارت سرد اور پژمردہ دلوں میں بھی تازگی اور تاثیر کی رمق پیدا کر دیتی۔ وہ خطابت کے زور سے نہیں بلکہ کردار کی روشنی سے اثر انداز ہوتے تھے۔ ان کا نرم لہجہ، شفیقانہ انداز اور انسانیت سے بھرپور رویّہ دلوں پر وہ نقش ثبت کر دیتا جو الفاظ کی گونج سے کہیں زیادہ دیرپا اور معنی خیز ہوتا۔

وہ دوسروں کی قدر کرنا خوب جانتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، اجنبی ہو یا شناسا، ہر ایک کے ساتھ ان کا برتاؤ یکساں احترام پر قائم رہتا۔ وہ معمولی سے معمولی تعلق کو بھی بوجھ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسے امانت خیال کرتے۔ ان کی طبیعت میں احسان فراموشی کا شائبہ تک نہ تھا۔ کسی کی معمولی توجہ بھی ان کے نزدیک قابلِ قدر ہوتی، اور وہ اسے نبھانے میں کوتاہی گوارا نہ کرتے تھے۔

سیاسی اور سماجی معاملات میں مولانا کا تدبر واقعی قابلِ رشک تھا۔ وہ حالات کو سطحی نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کے پس منظر، نتائج اور اثرات کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔ فیصلہ کرتے وقت جذبات کے بجائے عقل و حکمت سے کام لیتے، مگر اس عقل میں سختی نہیں نرمی اور انسان دوستی شامل رہتی تھی۔ اگر کبھی کوئی سخت فیصلہ کرنا ناگزیر ہو جاتا تو وہ اس طرح انجام دیتے کہ دل شکنی کم سے کم ہو۔

ناگوار اور دل شکن مواقع پر بھی وہ سلیقہ، شائستگی اور حسنِ تدبیر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بات کہنے کا انداز ہی اکثر بات کے اثر کو بدل دیتا ہے۔ اسی لیے وہ تلخ حقیقت کو بھی اس پیرائے میں پیش کرتے کہ سامنے والا مخالفت کے باوجود بددعا کے بجائے دعا دینے پر مجبور ہو جاتا۔ ان کے فیصلوں میں ذاتی عناد نہ ہوتا اور نہ کسی قسم کی انانیت کی آمیزش۔ یہی غیر جانب داری، یہی انسان شناسی اور یہی توازن ان کی معاملہ فہمی کا اصل کمال تھا، جس نے انھیں سیاسی اور سماجی زندگی میں اعتبار عطا کیا۔

مولانا کی انتظامی صلاحیتیں ان کی شخصیت کا ضمنی پہلو نہیں تھیں بلکہ ان کے مزاج و کردار کا فطری اظہار تھیں۔ وہ ذمہ داری کو کسی صورت بوجھ نہیں سمجھتے، بلکہ اسے امانت خیال کرتے تھے جس کی ادائیگی میں کوتاہی ان کے نزدیک گناہ کے مترادف تھی۔ جو کام ان کے سپرد کیا جاتا، وہ رسمی فریضہ سمجھ کر نمٹا دینے کے قائل نہ تھے، بلکہ پوری دل جمعی، یکسوئی اور توجہ کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ نوکری ہو یا کوئی سماجی ذمہ داری، وہ ہر کام میں نظم، ترتیب اور توازن کو ملحوظ رکھتے۔ ان کے فیصلوں میں جلد بازی نہیں ہوتی تھی بلکہ غور و خوض، مشاورت اور نتائج پر گہری نظر شامل رہتی تھی۔

ان کے نزدیک عہدہ اخلاقی ذمہ داری تھا جس کی پاس داری لازم تھی۔ وہ منصب کو اپنی ذات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بناتے تھے بلکہ اسے خدمت اور دیانت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے طرزِ عمل میں خود نمائی کے بجائے فرض شناسی نمایاں تھی۔ جو لوگ ان کے ساتھ کام کرتے تھے، وہ نہ صرف ان کی انتظامی گرفت کے قائل تھے بلکہ ان کی راست گوئی، انصاف پسندی اور تحمل سے بھی متاثر ہوتے تھے۔

بالجملہ مولانا کی شخصیت ایک ہم آہنگ اور مربوط انسانی توازن کی مجسم تعبیر تھی۔ ان کے وجود میں سنجیدگی، اخلاق، ظرافت اور متانت اس درجہ باہم پیوست تھیں کہ ہر صفت دوسری صفت کی تکمیل

کرتی اور ایک جامع کلیت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ان کے یہاں علم کردار میں ڈھلا ہوا شعور تھا اور اخلاق تہذیبِ نفس کا پرتو۔ خودنمائی سے گریز اور اخفائے کمال ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ ان کی زندگی خاموش عمل کی زندہ مثال تھی۔ وہ شور کے بغیر جیتے اور دعوے کے بغیر اثر چھوڑ جاتے تھے۔

ان کی شخصیت کا اثر آہستہ آہستہ دل میں اترنے والی روشنی کی مانند تھا۔ وہ محفل میں موجود ہوں تو ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو جاتا اور جب وہ رخصت ہو جاتے تو یہ احساس شدت سے ابھرتا کہ کوئی معتبر، شفیق اور باوقار ہستی اٹھ کر چلی گئی۔ ان کے جانے کے بعد محفل باقی تو رہتی، مگر اس کی روح میں خلا سا محسوس ہونے لگتا۔

یادوں کی دنیا میں مولانا کی شبیہ ہمیشہ وقار، سادگی اور شائستگی کے روشن اور شفاف رنگوں میں جلوہ گر رہتی ہے۔ ان کی نرم گفتاری، متوازن مزاج، معنی خیز زیرلب مسکراہٹ اور شفقت سے لبریز نگاہیں آج بھی ذہن میں اسی طرح گردش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جیسے وہ ابھی کسی گوشۂ محفل میں وقار کے ساتھ موجود ہوں۔ وہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے، مگر اپنے کردار کی استقامت، اخلاق کی رفعت اور انسانی رویوں کی پاکیزگی کے ذریعے دلوں میں اپنی موجودگی کا احساس چھوڑ گئے۔ ایسا احساس جو وقت گزرنے کے ساتھ مدھم نہیں ہوگا۔

آج ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ملک کے مختلف گوشوں میں اور سرحدوں سے پرے بھی، دین و دنیا کی خدمت، علم کی اشاعت اور عوامی فلاح کے کاموں میں مصروف ہے۔ یہ سب دراصل اسی تربیت، خلوص اور علمی امانت کا ثمر ہے جو مولانا نے خاموشی کے ساتھ نسل در نسل منتقل کیا۔ وہ خود تو رخصت ہو گئے، مگر علم کا وہ چراغ چھوڑ گئے جس کی روشنی قیامت تک پھیلتی رہے گی۔ ان کا نام یادوں میں نہیں، بلکہ ان کے شاگردوں کے کردار، خدمت اور عمل میں زندہ رہے گا، اور یہی اصل حیات ہے اور حقیقی کامیابی، کہ انسان دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی علم و عمل کے سفر میں مسلسل موجود رہے۔ حافظ شیرازی نے سچ کہا ہے ؎

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد ز عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

☆☆☆

مولانا نفیس الحسن
حوزۂ علمیہ مدرسہ امام خمینی، قم (ایران)، رابطہ نمبر: 00989392151268

حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ

(کمال و جمال کے آئینہ میں)

تمام تعریفیں اس وحدہ لاشریک کے لیے ہیں جس نے اپنی معرفت اور شناخت کے لیے اس جہان بے مثال کو خلق کیا اور اس کائنات ہست و بود میں مختلف قسموں کی مخلوق کی تخلیق کی۔ انھیں مخلوقات میں سے کچھ لوگوں کو دوسری مخلوقات کی ہدایت کے لیے انتخاب کیا کہ جو انبیا اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام جیسی پاک و پاکیزہ ذوات مقدسہ تھیں۔ ظاہری طور پر جب ان ہادیان الٰہی کا سلسلہ ختم ہو گیا تو بندوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت رہتی دنیا تک پڑتی۔ لہٰذا اتمامِ حجت کے لیے: العلماء ورثۃ الانبیاء۔ علمائے کرام کو ہادیان الٰہی کا وارث بنا دیا۔ لہٰذا حقیقی عالم وہی ہے جو پوری امانت داری کے ساتھ اس وراثت کو لوگوں تک منتقل کرے۔ جب تک ایک انسان عالم باعمل نہیں ہوگا صحیح معنوں میں وہ انبیائے کرام علیہم السلام اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے علم کا وارث کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔ انھیں عالم باعمل ہستیوں میں ایک ہستی استاد محترم حجۃ الاسلام والمسلمین عالیجناب مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ کی تھی۔

آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ کمال و جمال کے اعتبار سے اپنے آپ میں ایک منفرد شخصیت تھے۔ ویسے تو اس کائنات میں ہر انسان کمال کا خواہاں ہے اور وہ کمال حاصل بھی کر لیتا ہے، تو کیا ہر حاصل کی ہوئی چیز کو کمال کہا جاتا ہے؟ نہیں۔ جس چیز میں خودنمائی ہو اگرچہ ظاہراً کمال دکھ رہی ہو لیکن حقیقی معنی میں وہ کمال نہیں ہے۔ جو کام خالصتاً للہ انجام دیا گیا ہو درحقیقت وہ کمال ہے اور وہی پھر جمال میں بدل جاتا ہے۔ چاہے وہ انسان کے لیے سخت ترین وقت رہا ہو کیوں کہ وہ اپنے ہر کام کو رضائے الٰہی میں دیکھتا ہے۔

مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ نے اپنی پوری زندگی خواہ وہ سماجی و معاشرتی ہو یا خانوادگی ہو، مرضی خدا کے مطابق اور خداوند متعال کو حاضر و ناظر سمجھ کر گزاری۔ اسی لیے ان کی زندگی کا ہر لمحہ ان کے کمال و

جمال کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کا ہر ایک عمل چاہے تدریسی رہا ہو یا تقریر کے میدان میں رہا ہو یا کسی کی تیمارداری یا صلہ رحمی یا تشییع جنازہ میں شرکت یا لوگوں کے قومی و دینی مسائل رہے ہوں، ہر ایک کو پورے خلوص اور اپنی پوری ذمہ داری اور دینی فریضہ سمجھتے ہوئے انجام دیا۔ انھیں چیزوں نے لوگوں کے درمیان آپ کو مقبول اور قابل احترام بنا دیا۔ ع:

عالم تو فقیری میں بھی کرلیتا ہے شاہی

مولانا مرحوم کثیر العیال تھے۔ قبل از سرکاری ملازمت آپ کی زندگی کا گزر بسر بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ تمام بچوں کی تعلیم کا خرچ اٹھانا اور گھر کا خرچ سب انھیں کے ذمے تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود آپ کی ایک خصوصیت خندہ پیشانی تھی، ہر حال میں ہنسنا اور مسکرانا اور دوسروں کو ہنسنا ہنسانا آپ کا شیوہ رہا تھا، اور ان کی یہ خندہ پیشانی کبھی بھی اپنی اندرونی تنگدستی و پریشانی کو دوسروں پر ظاہر ہونے نہیں دیتی تھی۔ انھوں نے لوگوں کو اپنی زندگی سے یہ پیغام دیا ہے کہ اگر اللہ پر ایمان و توکل ہے تو ان مع العسر یسرا، کہ ہر پریشانی کے بعد آسانی ہے اور اس کا نمونہ بھی انھوں نے پیش کیا ہے کہ بحمد اللہ تینوں فرزند، حجۃ الاسلام والمسلمین عالیجناب مولانا ڈاکٹر ذیشان حیدر، مولوی ڈاکٹر فیضان حیدر اور جناب سلمان حیدر سبھی برسر روزگار ہیں۔

مولانا مرحوم اخلاق و کردار کے اعتبار سے کمال کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ ہر ایک سے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، پڑھا لکھا ہو یا جاہل، مہربانی و مہر و محبت سے پیش آتے تھے اور یہی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ امتحان کے وقت اپنی شفقت اور مسکراہٹ بھری نگاہوں سے آدھا ٹینشن اور خوف طالب علموں کے ذہنوں سے منٹوں میں دور کر دیتے تھے۔ آپ ایک باکمال استاد تھے اس معنی میں کہ انھوں نے ہر طالب علم کو چاہے وہ ان کے مدرسہ کا ہو یا کسی اور مدرسہ کا، یا ان کا پڑھا یا ہوا ہو یا نہ ہو، برابر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

طالب علموں کے تئیں بہت دلسوز و مہربان اور ایثار گرانہ وفدا کارانہ سلوک کرتے تھے اور یہ صرف دعویٰ نہیں ہے بلکہ دلیل بھی ہے۔ آج کے پچیس سال پہلے تقریباً ۲۰۰۰ء میں جب ہم لوگ جامعہ حیدریہ، خیرآباد مئو میں پڑھتے تھے، اس وقت مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ مدرسہ باب العلم مبارک پور میں پڑھاتے تھے۔ اس وقت ایران سے جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ کے کچھ نمائندہ ہندوستان کے مدارس میں پڑھنے والے طالب علموں کا امتحان (ٹسٹ) لینے آئے تھے۔ اس حوالے سے سبھی مدرسوں میں اطلاع دی جا چکی تھی کہ جو بھی اپنے مدرسہ کے بچوں کو امتحان دلانا چاہتا ہے، وہ جامعہ جوادیہ شہر بنارس میں حاضر ہو جائے، اور یہ زمانہ غالباً محرم و صفر کے مہینوں میں سے تھا کہ ہمارے مدرسہ کے زیادہ تر اساتذہ عشرہ ثانی کے حوالے سے شہر گجرات گئے ہوئے تھے یا کچھ لوگ جمعرات و جمعہ کی چھٹی پر گھر جانے کو اہمیت دیتے

تھے، ادھر تقریباً دس گیارہ طالب علم بے چین تھے کہ کاش کوئی ہوتا جو ہم لوگوں کو لے کر چلتا اسی بہانے ٹہل پھر بھی لیتے۔ اتنے میں مدرسہ باب العلم سے شفیق، دلسوز وفدا کار استاد کا فون آیا کہ ہمارے مدرسہ باب العلم میں اس وقت کوئی بڑی جماعت میں طالب علم ہی نہیں ہے۔ سب چھوٹے چھوٹے ہیں لہٰذا یہاں سے تو کوئی جانے والا نہیں ہے تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے۔ ہم لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ تو آمادہ ہیں لیکن کوئی لے کر جانے والا نہیں ہے۔ جواب میں انھوں نے فوراً کہا کہ تم سب تیار ہو جاؤ میں آتا ہوں۔ اس طرح وہ پورے راستے ہم لوگوں کو پڑھے ہوئے دروس کی یاد دہانی کراتے رہے حتیٰ کہ کچھ طالب علموں کے پاس اتفاق سے جیب خرچ کم تھا تو انھوں نے کرایہ میں بھی کمک کی۔

جب ایسے صاحب کردار، با اخلاق و با کمال اور عالم باعمل استاد پیدا ہوتے ہیں تو رہتی دنیا تک اپنا نقش پا چھوڑ جاتے ہیں، جن کو زمانہ پڑھتا اور یاد کرتا رہتا ہے اور ان کی زندگی صاحبان عقل کے لیے باعث عبرت بن جاتی ہے جو کبھی بھلائے بھی نہیں بھولتی ہے۔ کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن گفتگو کے طولانی ہونے کے خوف سے ان دو مصرعوں کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
ایک قطرہ ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

☆☆☆

ڈاکٹر اصغر اعجاز قائمی
صدر شعبۂ دینیاتِ شیعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، رابطہ نمبر: 9440945645

منظوم خراج عقیدت

وا استاذاہ!

(حجۃ الاسلام والمسلمین استاذی، استاذ الاساتذہ، سماحۃ العلامۃ آقائے مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ کی وفات حسرت آیات کی مناسبت سے)

اے مدبر جوہر تدبیرِ علم — اے مصور روکش تصویرِ علم
اے گل گلدستۂ ذیشانِ علم — اے امین جوہر فیضانِ علم
اے قسیم خوش بوئے گلزارِ علم — اے نسیم صبح جلوہ بارِ علم
اے شمیم آہوئے تاتارِ علم — اے حریم حرمت اقدارِ علم
اے شعاع مہر عالمتابِ علم — اے متاع امتنان بابِ علم
اے نگین خاتم جویانِ علم — اے جبین روشن خاصانِ علم
اے قرار قلب سربازانِ علم — اے وقار سورۂ قرآنِ علم
اے مسلسل بارش نیسانِ علم — اے مکمل تابش عرفانِ علم
اے کمال سدرۂ معراجِ علم — اے جمال چہرۂ سرتاجِ علم
اے مدبر! اے معلم! اے خطیب! — اے مصور! اے مدرس! اے نقیب!
حضرت ارشاد حسین اے شان علم — اے موید رونق بستانِ علم

آپ کے غم میں بصد آہ و فغاں — مضطرب ہے علم و فن کا کارواں
خون کے آنسو بہاتا ہے چمن — مضطرب ہر پھول ہے ہر گلبدن
شرح جامی[۱] کی ہیں آنکھیں اشکبار — اور متنبی[۲] کا دل ہے سوگوار
ہوگئی بے نور چشمِ کافیہ[۳] — اجڑا اجڑا ہے ریاضِ شافیہ[۴]
فلسفہ کا پیچ سلجھائے گا کون — منطق و میزان[۵] سمجھائے گا کون

سوگ میں ہیں اس لیے فقہ و اصول اٹھ گیا ہے حامل علم رسول
کائنات علم میں ذیشان تھے آپ ہر مدرَس کی روح و جان تھے
روز دہراتا رہے گا گلستاں آپ کا فن داستاں در داستاں
میں حضورِ باعث ارض و سما کررہا ہوں تعزیت ان کی ادا
صبر کر اے اصغر اعجازؔ تو چشم خامہ سے بھی بہتا ہے لہو

☆☆☆

حواشی:

۱۔شرحِ جامی نحو کی ایک مشہور و مستند کتاب ہے جو اہم تصنیف کافیہ (ابنِ حاجب) کی شرح ہے۔اس کے مصنف نورالدین عبدالرحمٰن جامی ہیں۔جامی نے اس شرح میں عربی نحو کے دقیق مسائل کو نہایت سادہ اور بلیغ انداز میں واضح کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ درسِ نظامی میں ایک اہم کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔مراد دیوانِ ابوالطیب متنبی: یہ عربی شاعری کا عظیم شاہکار ہے، اس کے قصائد زندگی کے گہرے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔اس میں زبان کی فصاحت، معنی کی بلندی اور اسلوب کی قوت نمایاں ہے۔

۳۔کافیہ عربی نحو کی ایک نہایت اہم اور معروف کتاب جس کے مصنف ابنِ حاجب ہیں۔اس میں عربی نحو کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس کی عبارت نہایت دقیق اور فنی ہے، اسی لیے اس پر متعدد شروح لکھی گئیں، جن میں شرحِ جامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

۴۔شافیہ عربی صرف کی ایک اہم اور مستند کتاب ہے، جس کے مصنف ابن حاجب ہیں۔اس میں الفاظ کی ساخت، صیغوں کی تبدیلی اور قواعد صرف کو نہایت مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اس کی عبارت فنی اور دقیق ہے، اسی لیے اس پر بھی متعدد شروح لکھی گئی ہیں۔مدارسِ اسلامیہ میں شافیہ کو علم صرف کی اعلیٰ کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

۵۔میزان الصرف عربی علمِ صرف کی ایک ابتدائی درسی کتاب ہے، جس میں الفاظ کی ساخت، اوزان اور صیغوں کی بنیادی تبدیلیوں کو سادہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔یا اس سے مراد میزان المنطق منطق کی ایک ابتدائی اور معروف درسی کتاب ہے۔اس کتاب میں تصورات، تصدیقات، قیاس اور استدلال کے بنیادی اصول نہایت سادہ اور منظم انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔[مدیر]

☆☆☆

پروفیسر مقبول احمد مقبولؔ
چٹگوپہ، ضلع بیدر (کرناٹک)، رابطہ نمبر: 9028598414

رباعیات بیادِ مولانا ارشاد حسین

علامۂ دوراں تھے ارشاد حسین
خود ایک دبستاں تھے ارشاد حسین
کرتا تھا کسبِ نور جن سے ہر شخص
وہ شمعِ فروزاں تھے ارشاد حسین

معمارِ زمانہ تھے ارشاد حسین
یکتا و یگانہ تھے ارشاد حسین
جس میں تھے جمع علم و فن کے گوہر
اک ایسا خزانہ تھے ارشاد حسین

فیاض و منعّم تھے ارشاد حسین
اور علم کے خادم تھے ارشاد حسین
تعلیم و تعلّم سے تھی فطری رغبت
ممتاز معلم تھے ارشاد حسین

ہر ایک برائی سے نفرت ان کو
نیکی سے، نیکوں سے محبت ان کو
تھے سادگی و عجز کے پیکر ایسے
چھو کر بھی نہ گزری تھی نخوت ان کو

☆☆☆

کلیم حیدر کلیمؔ معروفی
حسین آباد، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، رابطہ نمبر: 9935727632

تعزیتی نظم بیاد مولانا ارشاد حسین معروفی (مرحوم)

واہ کیا عالم دیں دار تھے ارشاد حسین
گردنِ جہل پہ تلوار تھے ارشاد حسین
کاذبوں میں بھی یہ سچ بول کے دم لیتے تھے
پیروِ میثمِ تمار تھے ارشاد حسین
ذہن میں ڈال دیا کرتے تھے مفہوم سبق
وہ مدرس تھے، وہ فن کار تھے ارشاد حسین
موت کے بعد بھی لہراتا ہے پرچم جن کا
علم دیں کے وہ علم دار تھے ارشاد حسین
روشنی علم کی لیتے تھے ہزاروں طلبہ
مثل سورج کے ضیابار تھے ارشاد حسین
آج بھی آپ کا اخلاق صدا دیتا ہے
قسمت خوبیٔ کردار تھے ارشاد حسین
آپ تنقیدی مضامین سے رکھتے تھے شغف
ایک تخلیقی قلم کار تھے ارشاد حسین
درد سینے میں غمِ عابد بیمار کا تھا
کون کہتا ہے کہ بیمار تھے ارشاد حسین
ڈال کر زیست پہ اک صبر و قناعت کی ردا
تنگدستی میں بھی خوددار تھے ارشاد حسین
آپ کے علم کا شہرہ تھا زمانے میں کلیمؔ
ہر طرف روشن و ضوبار سے ارشاد حسین

☆☆☆

ڈاکٹر علی اصغر الحید ری
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، رابطہ نمبر: 9968616032

چراغِ داغ!

(بہ یاد وفات حسرت آیات استاذ نا العلّام، زبدۃ العلماء الاعلام وممتاز الافاضل الکرام مولانا ارشاد حسین معروفی رحمۃ اللہ علیہ)

کجاست آن کہ پر از علم وفن و عرفان بود — کجاست آن کہ بہ فنِ خطابہ، سحبان بود
کجاست سورۂ مہر و کجاست آیۂ عشق — کجاست آن کہ مفسر برای قرآن بود
کجاست آن کہ کند نور در دلم روشن — کجاست آن کہ تجلایِ طورِ رحمان بود
کجاست آن کہ تفلسف کند و دریابد — ز آسمان برمید آن کہ مہر تابان بود
چہ عاشقانہ بہ تدریس صرف وقت گذاشت — چہ عارفانہ بہ نحو مسیر رضوان بود
دمی ہدایت حکمت گہی حماسۂ نور — گہی علوم ادب ہم وظیفۂ جان بود
چو بوعلی و چو حلّی، چو باقرِ داماد — گرہ گشای فنون دقیق عرفان بود
شموس بازغۂ فکر، صید معنی کرد — بہ مرز و بوم معانی، بدیل خاقان بود
نشستہ بود بہ پیشانی‌اش وقار و صفا — ز فیض باری او رنگ در گلستان بود
ہنوز چہرۂ عرفانی‌اش بہ دل دارم — لبش قرار گہ انگبین فرزان بود
بیا کہ چشم دلم بی‌تو غرق باران است — قسم بہ نور! وجود تو عشق رخشان بود
بہ عشق حضرت مولا از این جہان چوگذشت — برای دیدن مولا چقدر شادان بود

☆☆☆

عزادار حسین ساجدؔ جلال پوری
جلال پور، امبیڈکر نگر، رابطہ نمبر: 7571867185

تعزیتی نظم

[بیادِ عالی جناب مولانا ارشاد حسین معروفی طاب ثراہ]

ایک عالم، نیک دل انسان تھے — مسجد و محراب کی وہ شان تھے
تھا تمسک ان کا 'باب العلم' سے — اس لیے وہ علم پر قربان تھے
ان کا شاگردوں پہ تھا لطف و کرم — ہر گھڑی حاضر یہ جسم و جان تھے
لکھنے پڑھنے میں سدا مصروف تھے — کام سے ان کے سبھی حیران تھے
دین کی نشر و اشاعت میں کروں — دل میں ان کے بس یہی ارمان تھے
زندگی بھر علم سے رشتہ رہا — در حقیقت واقفِ قرآن تھے
عشق اہلِ بیت و قرآں دل میں تھا — آخرت کے خاص یہ سامان تھے
علم کا بیٹوں پہ بھی فیضان تھا — جب تلک زندہ رہے، ذیشان تھے
مغفرت ہو مولوی ارشاد کی — وہ نہایت معتبر انسان
بات کیا یہ کم ہے بخشش کے لیے — مرتے دم تک صاحب ایمان تھے

☆☆☆

ڈاکٹر فیضان حیدر
استاد شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ایم کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 7388886628

فی رثاءِ والدی مولانا ارشادحسین (طاب ثراہ)

یا شمسَ علمٍ غابتِ الیومَ في السَّحَرِ
فاهتزَّ قلبُ الوری وانهدَّ في الحُجرِ
یا منبعَ الفضلِ، یا بحرَ العُلومِ، و یا
نورًا تسامی علی الآفاقِ کالقَمَرِ
أخدمْتَ طُلّابَكَ الأبرارَ مُجتهدًا
کالأبِ الحاني علی الأبناءِ في السَّفَرِ
ما زلتَ تزرعُ في الأرواحِ مکرُمةً
و تسکبُ النورَ في الأسماعِ و البَصَرِ
في ''فلسفةِ التوحیدِ'' سرٌّ کشفتَ به
عن روعةِ الحقِّ في إشراقِ مُعتَبَرِ
و في ''الصلاةِ'' بیانٌ قد نشرتَ به
سرَّ العروجِ إلی الرَّحمنِ في الفِکَرِ
و الصومُ عندكَ بحرٌ من معارفِنا
علَّمتَنا الصبرَ فیه خیرَ مُدَّکرِ
فسَّرتَ سورًا صِغارًا في دلالتِها
فصارَ کلُّ حَرفٍ مشرقًا کالدُّرَرِ
و''غرایب القرآنِ'' أظهرتَ حکمتَها
حتی تکلَّمَ إعجازٌ بلا خَبَرِ

و''علومُ القرآنِ'' سفرٌ قد نظمتَ به
صرحًا من الفهمِ كالبُنيانِ في الحَجَرِ
سِفرٌ عظيمٌ يُضاهي الطودَ هيبتُه
كأنَّه البحرُ في أمواجِه الزُّخَرِ
كم من قصيدٍ و كم غزلٍ رتَّبتَ به
عقدًا من الحُسنِ في ألفاظِكَ العِطرِ
مدحتَ آلَ النبيِّ الطاهرينَ، فكم
ذابَتْ قلوبُ الورى في فيضِكَ المنهمرِ
و كنتَ تُكرمُ أهلَ الفضلِ مُبتسمًا
تخطُّ تقريظَ إحسانٍ على السُّوَرِ
ما أروعَ الخُلقِ في أخلاقِ سيِّدِنا
ما أصدقَ الحُبِّ في الأفعالِ و السِّيَرِ
لم يَثنِكَ السُّقمُ عن درسٍ و عن قَلَمٍ
بل كنتَ صبراً على البأساءِ والضَّجَرِ
يا والدًا في عطاءِ العلمِ قد رُزِقَت
بكَ البُيوتُ هُدًى في واضحِ الأثَرِ
صرنا يتامى و إن كنّا على ثِقَةٍ
أنَّ الدعاءَ لكَ الجاري مدى الدَّهَرِ
نسألُ الرحمنَ أن يُعلي منازلَهُ
في جَنَّةِ الخُلدِ في ظلٍّ من الشَّجَرِ
و أن يُجاورَ أهلَ البيتِ مُبتسمًا
في روضةِ الطُّهرِ في نورٍ من الزُّهَرِ
يا ربِّ فاغفرْ لعبدٍ كان مُجتهدًا
في خدمةِ الدِّينِ في السرِّ و الجَهَرِ
و اجعل كتاباتِهِ نورًا يُضيءُ لنا

دربَ النجاةِ إلى الإحسانِ و الظَّفَرِ
فيضانُ تلميذُهُ يرجو شفاعتَهُ
و يمسحُ الدمعَ في خُدَّيهِ كالمطَرِ

رحمَ اللهُ والدنا الجليلَ، و جعلَ علمَهُ صدقةً جاريةً إلى يومِ القِيامة.

☆☆☆

ای فروغِ صبح ایمانی، ز ما رفتی چرا؟

ای فروغِ صبحِ ایمانی، ز ما رفتی چرا؟ شمعِ دل، خورشیدِ عرفانی، لِقا رفتی چرا؟
رُخ ز خاکِ فقر و تسلیم و رضا برداشتی در دلِ شب، آیتی بودی، خفا رفتی چرا؟
ای زبانت آشنا با نطق قرآن و حدیث چون صدای نایِ رحمانی، قضا رفتی چرا؟
ہر سخن‌ہای تو خضری بود در شب‌ہای ما ای صفای مجلسِ روحی، بقا رفتی چرا؟
در مساجد، در مدارس، در دلِ احباب خویش چون نسیمِ صبحِ ربانی، جدا رفتی چرا؟
چشم گریان، دل پریشان، سینہ پُر از آہ و درد ای عزیزِ قومِ ایمانی، چرا رفتی چرا؟
ما یقین داریم کز درگاہِ حق یابی مقام چون ز مردانِ خُدا بودی، رضا رفتی چرا؟
روح تو آرام گیرد در جنانِ پاک و خوش در حضورِ خلوتِ ربی، صفا رفتی چرا؟
تو بُدی آموزگارِ منطق و حکمت، اصول اہلِ دانش را تو بودی اتقا، رفتی چرا؟
ہر عبارت از تو روشن بود در تفسیرِ حق رازِ حکمت را تو دادی راستا، رفتی چرا؟
در کلام و فقہ بودی مرجعِ اصحابِ علم بودہ‌ای سرمایہ‌ای، آبِ بقا رفتی چرا؟
ہر کلامت بر دلِ طالب چو رحمت می‌رسید دُر زِ دریایِ گہر بودی قضا رفتی چرا؟
از صفای سیرت و زہدت ہمہ حیران بُدند ای چراغِ راہ ما از ما جدا رفتی، چرا؟
یادگارِ مکتبِ تقویٰ، امامِ خامشی درمیانِ ما چو صبح با ضیا، رفتی چرا؟
سوخت از داغت دلِ فیضانؔ از درد و الم بی‌سبب با این ہمہ لطف و عطا رفتی چرا؟

☆☆☆

تعزیتی نظم

(بیادِ والدِ محترم مولانا ارشاد حسین)

کیسا سکوت، شہرِ سخن پر اتر گیا
اک آفتابِ علم، افق سے گزر گیا
وہ شخص جس کی بات تھی تاثیرِ دلنواز
ہم میں زُلالِ علم وہ خوشبو سا بھر گیا
مسجد کی صف میں نور تھا جس کے وجود سے
تھا جس کے دم سے مدرسہ مثلِ سحر، گیا
تحقیق کا وقار وہ تدریس کا جمال
اب بانٹ کر علوم وہ خود ہی بکھر گیا
وہ نرم خو، وہ حلم کا پیکر، وہ سادگی
جو سنگ دل کو موم بنادے، گہر گیا
وہ باوقار طرزِ تکلم، وہ شفقتیں
وہ مثلِ اشک آج دلوں میں اتر گیا
کربل کی یاد جس کے لہو میں بسی رہی
حق گوئیوں کا سلسلۂ معتبر گیا
خاموش ہو گئے ہیں وہ لب جن سے تھا سکوں
دل کا جہاں اداس فضاؤں سے بھر گیا
شاگرد کی دعاؤں، کتابوں کی سطر میں
اخلاق کی مثال تھا جو جلوہ گر، گیا
محفل میں آج بھی ہے وہی خوش بوئے سخن
فیضانؔ اُن کے ذکر سے دل غم سے بھر گیا

☆☆☆

تعزیتی قطعات

زندگی میں جو کہ وابستہ تھا باب العلم سے
مندمل کردے گی اس کے غم کو بھی یادِ حسین
اُس کے شاگردوں میں ماتم کا سماں ہے ہر طرف
نشر جو کرتا رہا تا عمر ارشادِ حسینؑ

نتیجہ فکر: ڈاکٹر اظہر قائمی، جلال پور، امبیڈکر نگر

☆☆☆

سوگ میں ڈوبی کلی ہے گلستاں صدمے میں ہے
آج ہر چھوٹا بڑا، پیر و جواں صدمے میں ہے
یاد آئیں گے ہمیشہ آپ استاد عظیم
آپ کا شاگرد جو بھی ہے جہاں صدمے میں ہے

نتیجہ فکر: مولوی محمد حیدر زینبی، بڑا گاؤں گھوسی، مئو

☆☆☆

ہر سو غم و الم کی زمانے میں صوت ہے
بے مثل، بے نظیر معلم کی فوت ہے
جانے سے ان کے کیوں نہ خسارہ ہو قوم کا
عالِم کی موت اصل میں عالَم کی موت ہے

نتیجہ فکر: طاہر مبارک پوری، جامعہ ناظمیہ، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : نگارشات (مجموعۂ مضامین)
مصنف : ڈاکٹر سفیان احمد انصاری
صفحات : ۲۰۸ قیمت : ۴۰۰/روپے
سال اشاعت : ۲۰۲۵ء مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
تبصرہ نگار : فیضان حیدر (معروفی)

.....

اردو ادب کی تنقیدی و تحقیقی روایت میں ایسے مجموعہ ہائے مضامین کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے جو مختلف ادبی، تاریخی اور تہذیبی موضوعات کو ایک مربوط فکری زاویے کے تحت پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سفیان احمد انصاری کی تصنیف 'نگارشات' اسی نوعیت کی ایک اہم اور قابلِ قدر کوشش ہے۔ یہ کتاب مختلف ادبی شخصیات، اصنافِ ادب، صحافت، تاریخ اور سماجی مسائل سے متعلق مضامین کا ایسا مجموعہ ہے جس میں مصنف نے اپنی وسیع المطالعہ شخصیت، تحقیقی بصیرت اور ادبی شعور کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کلاسیکی و جدید ادب، شخصیات کے تذکرے، ادبی اصناف کی توضیح اور تاریخی موضوعات سب کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب اردو ادب کی متنوع جہات کا ایک جامع آئینہ بن گئی ہے۔

کتاب کے آغاز میں شامل 'پیش لفظ' میں مصنف نے قلم کی اہمیت اور اس کی معنوی و فکری طاقت پر مدلل انداز میں گفتگو کی ہے۔ مصنف کے نزدیک قلم محض اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بلکہ فکر و شعور کی بیداری، علم و آگہی کی اشاعت اور تہذیبی اقدار کے تحفظ کا ایک موثر وسیلہ ہے۔ انسانی تاریخ میں قلم ہی وہ طاقت رہا ہے جس نے افکار کو دوام بخشا، علمی سرمایہ کو محفوظ کیا اور معاشرے میں فکری و اخلاقی تبدیلیوں کی راہیں ہموار کیں۔ اسی احساسِ ذمہ داری کے تحت انھوں نے اس مجموعے کے مضامین قلم بند کیے ہیں تاکہ ادب و تاریخ کے مختلف گوشوں کو روشنی میں لایا جا سکے اور قارئین کو علمی و ادبی بصیرت سے آراستہ کیا جا سکے۔

کتاب کا پہلا مضمون 'پروفیسر ملک زادہ منظور احمد: شخصیت و شاعری' ہے۔ ملک زادہ منظور احمد اردو کے معروف شاعر، نقاد اور محقق تھے۔ مصنف نے اس مضمون میں ان کی علمی و ادبی خدمات، ان کی شاعری

کے اسلوب اور فکری جہات کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔ ملک زادہ کی شاعری میں جو فکری گہرائی، تہذیبی شعور اور زبان و بیان کی شائستگی ملتی ہے، اسے مصنف نے نہایت سلیقے سے واضح کیا ہے۔

اس کے بعد 'حق گوئی و بے باکی کا نقیب: راحت اندوری' کے عنوان سے مضمون شامل ہے۔ راحت اندوری جدید اردو شاعری کے مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سفیان احمد انصاری نے اس مضمون میں راحت اندوری کی شاعری کی عوامی مقبولیت، ان کے بے باک اظہار اور سیاسی و سماجی شعور کو نمایاں کیا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں جو احتجاجی آہنگ اور عوامی درد جھلکتا ہے، مصنف نے اس کو خاص طور پر موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس کے آخر میں ان کی نعتیہ شاعری پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

'اشک ریز کا شاعر: مظہر سعید' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون ایک حساس شاعر کی تخلیقی شخصیت کا تعارف پیش کرتا ہے۔ اشک ریز شاعر کا شعری مجموعہ ہے۔ مصنف نے مظہر سعید کی شاعری کے جذباتی اور درد انگیز پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شاعری میں پائی جانے والی داخلی کیفیات کو اجاگر کیا ہے۔ اسی سلسلے میں 'ڈاکٹر عبرت بہرائچی: حیات و شاعری' ایک ایسا مضمون ہے جس میں ایک علاقائی مگر باصلاحیت شاعر کی شخصیت اور فن کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں شاعر کی زندگی کے اہم پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے فنی و فکری محاسن پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

ادبی تاریخ کے حوالے سے 'لکھنؤ میں اردو ڈراما نگاری' ایک اہم مضمون ہے۔ لکھنؤ اردو تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے اور یہاں ڈراما نگاری کی بھی ایک نمایاں روایت موجود ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں ڈراما نگاری کا آغاز و ارتقا، لکھنؤ میں ڈراما نگاری کے آغاز، اس کے ارتقا اور اس سے وابستہ ادیبوں کا ذکر کرتے ہوئے اس صنف کی تاریخی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

اسی طرح 'عبدالماجد دریابادی: بلند پایہ صحافی و ادیب' میں ایک ایسی شخصیت کا تعارف پیش کیا گیا ہے جو اردو صحافت اور ادب دونوں میدانوں میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مصنف نے عبدالماجد دریابادی کی صحافتی جرأت، علمی بصیرت اور ادبی خدمات کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔

'رتن ناتھ سرشار اور اودھ اخبار' اردو صحافت کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ رتن ناتھ سرشار اردو کے معروف ناول نگار تھے اور ان کا تعلق اودھ اخبار سے رہا۔ مصنف نے اس مضمون میں سرشار کی صحافتی سرگرمیوں اور اردو صحافت کے فروغ میں ان کے کردار کو واضح کیا ہے۔ اسی تسلسل میں 'افق لکھنوی اور ان کا اخبار 'نظم'' ایک اہم صحافتی شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ مصنف نے افق لکھنوی کی ادبی و صحافتی خدمات کا جامع تعارف پیش کیا ہے۔

'فن غزل گوئی میں فراق کی انفرادیت' اردو تنقید کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ فراق گورکھپوری اردو غزل کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون مختصر ہے لیکن مصنف نے اس مضمون میں فراق کی شاعری کے فنی محاسن، ان کے مخصوص لہجے اور انفرادیت کا نہایت بصیرت افروز جائزہ لیا ہے۔

کتاب میں 'ایک نادر شخصیت' کے عنوان سے شامل مضمون پروفیسر نادر علی خاں کی صحافتی خدمات پر مشتمل ہے جن کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح کے مضامین ادبی تاریخ کے گم نام گوشوں کو روشن کرنے کا کام کرتے ہیں۔ تاریخی اور قومی موضوعات میں 'تحریک آزادی میں علما اور مسلمانوں کا کردار' ایک نہایت اہم مضمون ہے۔ اس میں مصنف نے آزادی کی جدوجہد میں علما اور مسلمانوں کی قربانیوں اور خدمات کو اجاگر کیا ہے۔

افسانوی ادب کے حوالے سے 'حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں معاشی مسائل کی عکاسی' ایک قابلِ ذکر تنقیدی مطالعہ ہے۔ مصنف نے حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں پیش کیے گئے سماجی و معاشی مسائل کو نہایت باریک بینی سے پرکھا ہے۔ اسی طرح 'مرزا غالب کا سفر کلکتہ اور اس کے محرکات: ایک جائزہ' تاریخی اور ادبی تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس مضمون میں غالب کے کلکتہ کے سفر کے اسباب اور اس کے اثرات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مضمون نہایت دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے اور اس میں مصنف نے بڑی مدلل گفتگو کی ہے۔

کتاب میں شامل مضمون 'انور جلال پوری: ایک ہمہ جہت شخصیت' ایک ایسی ادبی شخصیت کا تعارف پیش کرتا ہے جس نے اردو ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انور جلال پوری نہ صرف ایک صاحبِ طرز شاعر تھے بلکہ ترجمہ نگاری اور ادبی سرگرمیوں میں بھی ان کی شرکت قابلِ ذکر رہی ہے۔ بالخصوص مشاعروں کی نظامت میں انھیں غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ ان کا اندازِ نظامت نہایت شائستہ، بامعنی اور دل نشیں ہوتا تھا جس میں ادبی لطافت، برجستگی اور حاضر جوابی کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ وہ مشاعرے کے ماحول کو خوش گوار بنانے اور شعرا و سامعین کے درمیان ایک بامقصد ربط قائم رکھنے کا ہنر بخوبی جانتے تھے۔ مصنف نے اس مضمون میں انور جلال پوری کی اسی ہمہ جہتی کو اجاگر کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نہایت احترام کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اسی طرح 'اطہر رحمانی: ایک گوشہ نشین شاعر' کے عنوان سے شامل مضمون میں مصنف نے ایک ایسے شاعر کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے جس نے شہرت و نمود سے دور رہ کر خاموشی کے ساتھ ادب کی خدمت انجام دی۔ اطہر رحمانی ان شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتیں اگرچہ عوامی سطح پر زیادہ نمایاں

نہ ہوسکیں، لیکن ان کی شاعری میں فکری گہرائی، سادگی اور اخلاص کی جھلک نمایاں طور پر ملتی ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں ان کے مزاج کی درویشی، ان کی گوشہ نشینی اور ان کی شاعری کے فکری و فنی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ادبی دنیا میں ایسے خاموش طبع اور مخلص تخلیق کار بھی ہیں جو بغیر کسی شور و شہرت کے اپنی تخلیقی ذمہ داری ادا کرتے رہتے ہیں۔

'رباعی کا فن' کے عنوان سے شامل مضمون اردو شاعری کی ایک اہم اور قدیم صنفِ سخن کے فنی و جمالیاتی پہلوؤں کا بامعنی جائزہ پیش کرتا ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں رباعی کی ہیئت، اس کے مخصوص اوزان اور فنی تقاضوں کو واضح کرتے ہوئے اس صنف کی انفرادیت کو روشن کیا ہے۔ رباعی اگرچہ چار مصرعوں پر مشتمل ایک مختصر صنف ہے، لیکن اس کی معنوی وسعت اور فکری گہرائی اسے نہایت مشکل اور نازک فن بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر سفیان احمد انصاری نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ رباعی میں کم سے کم الفاظ میں گہری اور موثر بات کہنے کا ہنر درکار ہوتا ہے۔ اسی لیے بڑے شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اسے فلسفیانہ اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس مضمون میں رباعی کی فنی ساخت، اس کے تاریخی پس منظر اور اردو شاعری میں اس کے مقام کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے، جس سے قاری کو اس صنف کی ادبی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

'محمد عالم ندوی کی خاکہ نگاری' کے عنوان سے شامل مضمون اردو ادب کی اہم نثری صنف یعنی خاکہ نگاری کے تناظر میں ایک ادبی شخصیت کے اسلوبِ تحریر کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے محمد عالم ندوی کی خاکہ نگاری کی خصوصیات، ان کے اندازِ بیان اور مشاہدے کی گہرائی کو اجاگر کیا ہے۔ محمد عالم ندوی کے خاکوں میں شخصیت نگاری کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان کا اسلوب نہایت سادہ، دل نشیں اور حقیقت پسندانہ ہے جس میں مبالغہ آرائی کے بجائے اعتدال اور صداقت کو اہمیت دی گئی ہے۔ مصنف نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ محمد عالم ندوی اپنے خاکوں میں کردار کی نفسیاتی اور اخلاقی جہات کو نہایت باریک بینی سے پیش کرتے ہیں، جس کے باعث ان کی تحریریں محض تعارفی نوٹ نہیں رہتیں بلکہ ایک مکمل ادبی تصویر بن کر سامنے آتی ہیں۔

'اردو ناول کا آغاز و ارتقا: مختصر جائزہ' اردو ناول کی تاریخ کا ایک اجمالی مطالعہ پیش کرتا ہے جس میں ابتدائی ناولوں سے لے کر جدید دور تک کے ارتقائی مراحل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح 'اردو شاعری میں عید کا ذکر' ایک دلچسپ موضوع ہے جس میں اردو شاعری میں عید کے تہذیبی و جذباتی مظاہر کو پیش کیا گیا ہے۔ 'مظہر سعید کی شاعری 'آنسوؤں کی زبان' کے آئینے میں' ایک تنقیدی مطالعہ ہے جس میں مظہر سعید کی

شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

'اودھ میں اردو شاعری کا ارتقا' کے عنوان سے شامل مضمون اردو ادب کی علاقائی تاریخ کے ایک نہایت اہم باب کو سامنے لاتا ہے۔ اس میں مصنف نے اودھ کی ادبی فضا، وہاں کی تہذیبی روایت اور شعری ماحول کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ اودھ برصغیر کے ان خطوں میں شمار ہوتا ہے جہاں اردو زبان و ادب کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اور متعدد ممتاز شعرا نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اردو شاعری کو نئی جہات عطا کیں۔ مضمون نگار نے اس تحریر میں اودھ کے نمایاں شعرا، ان کے شعری رجحانات اور ان کے ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اس خطے نے اردو شاعری کی ترقی اور اس کے تہذیبی وقار کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کتاب میں شامل ایک اہم مضمون 'منفرد لب و لہجے کا نعت گو شاعر: اثر بہرائچی' ہے۔ اس میں ان کی نعتیہ شاعری کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

'اردو خطوط نگاری' کے عنوان سے شامل مضمون اردو نثر کی ایک اہم اور قدیم صنف کے تاریخی و فنی پہلوؤں کا جامع جائزہ پیش کرتا ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں خطوط نگاری کی ادبی حیثیت، اس کی ارتقائی منزلوں اور اس کے اسلوبیاتی تقاضوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو ادب میں مختلف ادبا و شعرا کے خطوط نہ صرف ان کی شخصی زندگی اور فکری رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ اپنے عہد کی تہذیبی اور سماجی فضا کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ مصنف نے اس مضمون میں یہ واضح کیا ہے کہ اردو خطوط نگاری میں سادگی، برجستگی اور بے ساختگی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اور یہی خصوصیات اسے اردو نثر کی دل کش اور موثر صنف بناتی ہیں۔

کتاب کے آخر میں شامل 'نذیر صاحب' کے عنوان سے مضمون بھی ایک اہم ادبی شخصیت کے تعارف اور ان کی علمی و ادبی خدمات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے نذیر صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کی علمی و ادبی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ بالخصوص ان کے تاریخی اور ادبی مضامین کو خاص اہمیت دی ہے جن کے ذریعے انھوں نے ادب اور تاریخ کے متعدد گوشوں کو روشن کرنے کی کوشش کی۔ مصنف کے مطابق نذیر صاحب کی تحریروں میں تحقیق و جستجو کا عنصر نمایاں ہے اور وہ اپنے مضامین میں سنجیدہ علمی طرزِ فکر کو پیش کرتے ہیں۔ اس طرح یہ مضمون نہ صرف ایک صاحبِ قلم شخصیت کے تعارف کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ادب و تاریخ کے میدان میں ایسے محققین اور قلم کاروں کی خدمات ہمیشہ قدر و منزلت کی مستحق رہتی ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو 'نگارشات' ایک ایسا مجموعۂ مضامین ہے جس میں ادبی تاریخ، تنقید، شخصیات کے تذکرے اور تحقیقی مباحث سب یکجا ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر سفیان احمد انصاری نے مختلف ادبی

اور تاریخی موضوعات کو سادہ مگر موثر اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں میں علمی سنجیدگی، مطالعے کی وسعت اور ادب سے گہری وابستگی کا احساس نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ مصنف کا اندازِ بیان رواں اور قابلِ فہم ہے جس کی وجہ سے قارئین کو مضامین کے موضوعات تک رسائی حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔

البتہ تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بعض مقامات پر تذکیر و تانیث کی چند اغلاط اور زبان و بیان کی معمولی ناہمواری بھی محسوس ہوتی ہے جو ایک سنجیدہ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہے۔ اگر آئندہ ایڈیشن میں ان لسانی خامیوں کی اصلاح کر دی جائے تو کتاب کی افادیت اور اسلوبی حسن میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ مجموعہ اپنے موضوعات کے تنوع اور علمی اہمیت کے باعث اردو ادب کے سنجیدہ قارئین اور طلبہ کے لیے ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : پریم چند کی مضمون نگاری
مصنف : ڈاکٹر خالد انجم
صفحات : ۱۰۹ قیمت : ۱۹۰/روپے
سال اشاعت : ۲۰۱۲ء مطبع : ایچ۔ایس آفسیٹ پریس، دہلی
ناشر : ادبستان پبلی کیشنز، دہلی
تبصرہ نگار : فیضان حیدر (معروفی)

.....

اردو میں مضمون نگاری ایک نہایت اہم اور موثر صنف کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ صنف نہ صرف ادبی افکار و نظریات کی ترجمانی کرتی ہے بلکہ معاشرتی، تہذیبی اور فکری ارتقا کی آئینہ دار بھی ہے۔ اردو میں اس صنف کو فروغ دینے والے متعدد اہلِ قلم ہوئے ہیں، جن میں پریم چند کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ عام طور پر پریم چند کو افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت حاصل ہے، لیکن ان کی مضمون نگاری بھی فکری گہرائی، سماجی شعور اور ادبی بصیرت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر خالد انجم کی تصنیف 'پریم چند کی مضمون نگاری' اسی پہلو کو علمی و تحقیقی انداز میں سامنے لانے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔

ڈاکٹر خالد انجم اردو کی نئی پود کے باصلاحیت محقق و ناقد ہیں۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے

ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور ادبی دنیا میں اپنی تحقیقی کاوشوں کے ذریعے معتبر مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کے تقریباً دو درجن سے زائد مضامین ملک اور بیرونِ ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں، جو ان کی علمی و تحقیقی سنجیدگی کا ثبوت ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں ابھی زیرِ طبع ہیں جن میں 'افکارِ انجم' کو اردو ڈائرکٹوریٹ، پٹنہ سے مالی تعاون حاصل ہو چکا ہے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ مصنف ایک سنجیدہ ادبی مزاج اور تحقیقی شعور کے حامل قلم کار ہیں۔ زیرِ نظر کتاب دراصل ایم فل کا تحقیقی مقالہ ہے جسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

کتاب کی ساخت منظم اور سلیقہ مند ہے۔ اسے 'پیش لفظ' کے علاوہ چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، جب کہ آخر میں سوانحی خاکہ، کتابیات اور اشاریہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس ترتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے موضوع کو ایک باقاعدہ تحقیقی خاکے کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کا پہلا باب 'مضمون: تعریف، تاریخ اور ارتقا' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مصنف نے مضمون کی صنفی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے اس کی تعریف، تاریخی پس منظر اور ارتقائی مراحل پر مفصل گفتگو کی ہے۔ مضمون نگاری کی ابتدا مغربی ادب میں کس طرح ہوئی اور پھر یہ صنف اردو ادب میں کیسے متعارف ہوئی، اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ مصنف نے مضمون کی مختلف تعریفوں کو پیش کر کے ان کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ مضمون محض خیالات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک فکری و ادبی اسلوب کا نام ہے۔ اسی باب میں مضمون نگاری کے ابتدائی نقوش، اس کے ارتقائی مراحل اور اہم مضمون نگاروں کا مختصر ذکر بھی ملتا ہے، جو قارئین کو اس صنف کی تاریخی معنویت سے آگاہ کرتا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب 'اردو مضمون نگاری: فن اور روایت' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مصنف نے اردو مضمون نگاری کی فنی خصوصیات اور اس کی روایات کا جائزہ لیا ہے۔ اردو ادب میں مضمون نگاری کی روایت کو سمجھنے کے لیے انھوں نے اہم مضمون نگاروں اور ان کے اسالیب کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اردو مضمون نگاری صرف معلوماتی یا تفریحی صنف نہیں بلکہ اس میں فکری گہرائی اور ادبی جمالیات بھی موجود ہیں۔ مصنف نے مضمون نگاری کے فنی لوازمات جیسے اسلوب، طرزِ بیان، موضوعات کے تنوع اور فکری جہات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے قارئین کو یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اردو میں مضمون نگاری کس طرح ایک سنجیدہ ادبی صنف کے طور پر ترقی کرتی رہی ہے۔

کتاب کا تیسرا باب اس تصنیف کا مرکزی اور سب سے اہم باب ہے جس کا عنوان 'پریم چند:

مضامین اور تنقیدی تجزیہ' ہے۔ اس باب میں مصنف نے پریم چند کے مضامین کا موضوعاتی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے مضامین کو چار مختلف زمروں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ سوانحی مضامین

۲۔ ادبی و تنقیدی مضامین

۳۔ بین العلومی مضامین

۴۔ متفرق مضامین

یہ تقسیم نہایت مناسب اور مفید ہے کیوں کہ اس کے ذریعے پریم چند کی مضمون نگاری کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ انداز میں سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ سوانحی مضامین کے تحت پریم چند کی ان تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں انھوں نے مختلف شخصیات کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین میں پریم چند کا اسلوب نہایت سادہ مگر موثر ہے اور وہ شخصیت نگاری کے فن سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔

ادبی و تنقیدی مضامین کے ذیل میں پریم چند کی وہ تحریریں شامل کی گئی ہیں جن میں انھوں نے ادب، فن اور معاشرے کے باہمی تعلق پر گفتگو کی ہے۔ ان مضامین میں پریم چند کا تنقیدی شعور نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ ادب کو محض جمالیاتی سرگرمی نہیں بلکہ سماجی اصلاح اور انسانی بیداری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد انجم نے ان مضامین کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ پریم چند کے ادبی نظریات ان کی تخلیقی تحریروں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

بین العلومی مضامین کے تحت پریم چند کی وہ تحریریں زیرِ بحث آئی ہیں جن میں سماجیات، تعلیم، سیاست اور معاشرتی مسائل جیسے موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس حصے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند ایک ہمہ جہت مفکر تھے اور ان کی تحریریں صرف ادبی حدود تک محدود نہیں تھیں بلکہ وہ سماجی شعور کی بیداری میں بھی اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ متفرق مضامین کے تحت ان تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے جو کسی مخصوص زمرے میں شامل نہیں کی جا سکتیں، لیکن ان میں بھی پریم چند کی فکری بصیرت اور سماجی حساسیت نمایاں ہے۔

کتاب کا چوتھا باب 'سوانحی خاکہ' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں پریم چند کی زندگی، تعلیم، ادبی خدمات اور ان کے فکری و ادبی رجحانات کا مختصر مگر جامع خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں پریم چند کی تخلیقات کا اشاریہ بھی شامل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی کون سی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی۔ اس حصے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے قارئین کو پریم چند کی شخصیت اور ان کے ادبی پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کسی بھی ادیب کی تحریروں کو سمجھنے کے لیے اس کی زندگی اور حالات سے آگاہی ضروری

ہوتی ہے اور یہ باب اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات اور شخصیات کے اشاریے شامل کیے گئے ہیں جو کسی بھی تحقیقی تصنیف کی اہم ضرورت ہوتے ہیں۔ کتابیات میں ان تمام مآخذ کا ذکر ہے جن سے مصنف نے استفادہ کیا ہے، جب کہ اشاریہ کی مدد سے قاری مختلف شخصیات کو آسانی سے تلاش کر سکتا ہے۔ یہ دونوں عناصر کتاب کی تحقیقی اہمیت کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی اس کی مدلل اور منظم پیش کش ہے۔ مصنف نے اپنے موضوع کو سادہ مگر علمی انداز میں بیان کیا ہے۔ زبان و بیان صاف اور شستہ ہے جس کی وجہ سے قارئین کو متن سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ کہیں کہیں عبارت میں معمولی ناہمواری کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ خامیاں اس قدر معمولی ہیں کہ مجموعی طور پر کتاب کی افادیت و اہمیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

اگر تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بعض مقامات پر موضوع کی مزید وسعت کی گنجائش محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند کے بعض اہم مضامین کا زیادہ تفصیلی تجزیہ کیا جا سکتا تھا، جس سے کتاب کی علمی قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اردو مضمون نگاری کی روایت کے ضمن میں دیگر اہم مضمون نگاروں کے ساتھ تقابلی مطالعہ بھی شامل کیا جاتا تو یہ بحث مزید جامع ہو سکتی تھی۔ تاہم یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ کتاب دراصل ایم فل کا مقالہ ہے، اس لیے اس کی حدود بھی اسی نوعیت کی ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو 'پریم چند کی مضمون نگاری' ایک مفید اور قابلِ قدر تحقیقی کاوش ہے۔ یہ کتاب نہ صرف پریم چند کی مضمون نگاری کے مطالعے میں مددگار ثابت ہوتی ہے بلکہ اردو مضمون نگاری کی روایت کو سمجھنے کے لیے بھی حوالہ فراہم کرتی ہے۔ خاص طور پر طلبہ کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر خالد انجم نے اس کتاب کے ذریعے پریم چند کے ایک نسبتاً کم زیرِ بحث پہلو کو علمی اور تحقیقی انداز میں سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگرچہ کتاب حجم کے اعتبار سے ضخیم نہیں ہے، لیکن موضوع کے اعتبار سے جامع اور مدلل ہے۔ اس میں پیش کیے گئے مباحث نہ صرف قارئین کے علم میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ انھیں پریم چند کی ادبی شخصیت کو نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔

☆☆☆

انتخابِ کلام مولانا ارشاد حسین

حمد باری تعالیٰ

(۱)

کلیمِ طور کے جلوے کا تار ختم نہ ہو
یہ نورِ ارض و سما کا وقار ختم نہ ہو
وجودِ واجبِ ذاتی[۱] کی ذات کے صدقے
وجوبِ غیر[۲] کا بھی اضطرار ختم نہ ہو
کہاں ہو معرفتِ حق دلیلِ لمّی[۳] سے
تحیّرِ بصرِ نور بار ختم نہ ہو
شناخت اس کی ہے ممکن دلیلِ اِنّی[۴] سے
اثر کے ساتھ موثر کا پیار ختم نہ ہو
جہانِ زیست کو بخشی ہے اس نے شادابی
خزاں کے ڈر سے چمن کی بہار ختم نہ ہو
صفات اس کی ہماری طرح تعالیٰ اللہ!
وہ عینِ ذات[۵] ہے یہ اعتبار ختم نہ ہو
بس ایک ذرّہ ہے ارشادؔ اس کی خلقت کا
یہ مہر و ماہ کا سب کاروبار ختم نہ ہو

(۲)

بوئے گل کو نذرِ شامِ گلستاں کس نے کیا
عندلیبِ خوش گلو کو نغمہ خواں کس نے کیا
خلقت ارض و سما اور روز و شب کا اختلاف

عاقلوں کو محوِ فکرِ جاوداں کس نے کیا
کس کی قدرت سے ہواؤں کو ملا آبِ حیات
خاک و آتش کو بھی ان کا ہم زباں کس نے کیا
کردیا کس نے عناصر کو حریف نورِ حق
وجہ تخلیق زمین و آسماں کس نے کیا
کل زمیں پر چلتا تھا جو سر اٹھا کر فخر سے
سر جھکا تو اب اڑاکر آسماں کس نے کیا
کتنے طوفاں ہم سے ٹکراتے رہے ہر عہد میں
ہم کو آخر عزم کا کوہ گراں کس نے کیا
دل کی ہیئت در حقیقت پان کی مانند ہے
سرخ ہونٹوں کو مثالِ خونچکاں کس نے کیا
درد ہے تو درد کا درماں بھی اس کے پاس ہے
دہر میں رنج و خوشی کو جوڑواں کس نے کیا
کس نے نعتِ مصطفیٰ کا بھی شرف بخشا مجھے
مجھ کو ارشادِ نبی کا نکتہ داں کس نے کیا

☆☆☆

مناجات

ستم کو صبر سے مسکاں بنادے
بہت دشوار ہے آساں بنادے
جہاں پر ظلم کا دریا ہو جاری
خدایا! تو ہمیں طوفاں بنادے
ہوں ہندو اور مسلماں بھائی بھائی
ہر اک شیطان کو انساں بنادے
کوئی رہزن نہ لوٹے آشتی کو
ہمالہ سا کوئی نگراں بنادے
چمن میں ہر طرف پھیلی ہو خوش بو
ہمیں ایسا گل و ریحاں بنادے
دہکتے ہوں جو انگارے جنوں کے
اسے تو عقل کا گلداں بنادے
زمانے بھر میں امن و آشتی ہو
محبت کا یہ ہندُستاں بنادے
اگر آتنک کا ہو جسم زندہ
اسے کمزور اور بے جاں بنادے
ہمارا ملک تھا سونے کی چڑیا
اسے ہیرے کی اب اک کاں بنادے
کہیں پر کھو گئی گمنام منزل
اسے معروف کا استھاں بنادے

☆☆☆

نعت

(۱)

میں تری خاکِ نقشِ پا ہوتا
تیرا خادم جو مصطفیٰ ہوتا
خاک ہوتا میں تیرے آنگن کی
تیرے قدموں کو چومتا ہوتا
بن کے خاکِ شفا زمانے میں
سارے دردوں کی اک دوا ہوتا
سانس لیتا تو تازگی ملتی
تیرے گلشن کی میں ہوا ہوتا
رہ گزر ہوتا تیری منزل کی
راہ تیری میں دیکھتا ہوتا
جس کو ملتا قبولیت کا شرف
تیرے لب کی میں وہ دعا ہوتا
ابر ہوتا جو سر پہ سایہ فگن
تیرے ہمراہ گھومتا ہوتا
ہوتا نعلین تیرے پیروں کی
عرش تلووں کو چومتا ہوتا
لفظ ہوتا میں آیت رب کا
جو لبوں سے ترے ادا ہوتا
تیرے اسوہ کی اک جھلک ملتی

جو مرے دل کا مدعا ہوتا
دل کی دھڑکن کا حال کیا ہوتا
جب بھی ارشادِ مصطفیٰ ہوتا

(۲)

کرتا ہوں تذکرہ میں صداقت کے پھول کا
کس کو بھلا پسند ہے کانٹا ببول کا
چہرے پہ خاک اڑتی ہے، حالت خراب ہے
کیوں ذکر ہورہا ہے ابھی خم کی دُھول کا
نور خدا بھی، مطلعِ انوار بھی یہی
دنیا میں ہر طرف ہے اجالا رسول کا
ذکر نبی سے ہم کو بھی معراج مل گئی
شہرت میں کچھ گزر نہیں ہرگز خمول کا
تعظیم کو جو اٹھتے تھے سردارِ انبیا
کتنا عظیم تر ہے یہ رتبہ بتول کا
جب خود وصی ہے مظہرِ اوصافِ انبیا
کیا جانے کوئی مرتبہ اس کے رسول کا
ارشادِ رب کہ رحمۃٌ للعالمین ہے
مرکز ہے جس کا قلب شفا کے نزول کا
ارشادِ جس کے فضل پہ حاتم بھی ہے نثار
مرکز ہے ہل **اتیٰ**[٦] کی وہ شان نزول کا

(۳)

عشق خیرالبشر اگر لکھنا
ان کی معراج کا سفر لکھنا

قاب قوسین ہو کہ اَو ادنیٰ
اُدنُ منّی کے باب پر لکھنا
ہے کہاں آدمی کے امکاں میں
نعتِ سرکارِ بحر و بر لکھنا
آپ تو نور ہیں حقیقت میں
اور پیکر میں ہیں بشر لکھنا
نور سے کل جہاں منور ہے
ان کی آمد کا ہے اثر لکھنا
جس سے عاجز جہاں ہے اس کی ثنا
چاہتا ہے یہ بے خبر لکھنا
نعت ہے یہ کوئی غزل تو نہیں
ہے یہ خنجر کی دھار پر لکھنا
کلمہ پڑھتے ہیں ہاتھ پر کنکر
جھکتے قدموں میں ہیں شجر لکھنا
ایک انگشت کے اشارے سے
ہوتا دو نیم ہے قمر لکھنا
آدمی کیا ہے تابعِ فرماں
ہیں قدم بوس جانور لکھنا
در پہ ارشادؔ ان کے شاہ و گدا
سب جھکاتے ہیں آکے سر لکھنا

(۴)

عرش سے فرش پہ دیوانے چلے آتے ہیں
شمع جلتی ہے تو پروانے چلے آتے ہیں

آ گیا آمنہ کی گود میں اک پارۂ نور
عرش والے بھی ضیا پانے چلے آتے ہیں
ہے زلیخائے جہاں چہرۂ انور پہ نثار
فخرِ یوسف ترے دیوانے چلے آتے ہیں
میکدہ ہوگیا روشن ترے مے خواروں سے
خود بخود ہاتھوں میں پیمانے چلے آتے ہیں
نور سے گل ہوا آتش کدۂ فارس بھی
دیکھنے جلوے کو انجانے چلے آتے ہیں
آب رخ دیکھ کے کیوں خشک ہے بحر ساوہ
کفر بے آب ہے بتلانے چلے آتے ہیں
کون کیا جانے گا لولاک کی منزل ارشادؔ
بزمِ افلاک سے فرزانے چلے آتے ہیں

(۵)

جو نعتِ پاک کا دنیا میں کام کرتے ہیں
وہ پُر شرابِ محبت سے جام کرتے ہیں
ہے کائنات میں خُلقِ عظیم کا حامل
یہ وصفِ خاص محمدؐ کے نام کرتے ہیں
زمیں پہ آپ کا سایہ نہیں تو پھر حیدر
نبی کے واسطے سایہ کا کام کرتے ہیں
فقط ہے فاصلہ قوسین کا کہ ادنیٰ کا
کہاں پہ مرسلِ اعظمؐ قیام کرتے ہیں
گناہگار فضاؤں کے گھپ اندھیرے میں
وہ نور اسوۂ حسنہ کو عام کرتے ہیں

مباہلے میں نصاریٰ یہ چیخ کر بولے
خموش چہرے تکلّم کا کام کرتے ہیں
کسی چمن کی طرف سے اگر گزر ہوجائے
درخت آپ کو جھک کر سلام کرتے ہیں
ہے کلمہ گویوں میں شامل جماد بھی ارشادؔ
نبیؐ کے ہاتھ پہ پتھر کلام کرتے ہیں

(۶)

جو حسنِ حق ہے کہاں اس کی کبریائی نہیں
ازل سے تا ابد کیا عشق کی خدائی نہیں
فرازِ عشق کی منزل کو کوئی کیا جانے
جہاں پہ عقل کی پرواز کی رسائی نہیں
میں حسن و قبح کے کل فلسفے سے واقف ہوں
یہ کیسا حسن ہے جس میں کوئی برائی نہیں
ہے گرد منھ پہ جمی دھو رہے ہیں آئینہ
یہ بے خودی کبھی ہوش و خرد نے پائی نہیں
زنانِ مصر سے پوچھے کوئی کرشمۂ حسن
کٹی ہیں انگلیاں، احساسِ نارسائی نہیں
سنا زلیخا نے یوسف سے حسن ختم رُسُل
جوان ہوگئی، تنویر دیکھ پائی نہیں
کسے شہود کا حاصل ہو مرتبہ ارشادؔ
اِسے نہ پائے گا کوئی جو مصطفائی نہیں

(۷)

وہ روح تزکیہ و پیکرِ صدق و صفا آئے

پئے کردار سازی دہر میں خیر الوریٰ آئے
دُرِ یکتا کی مدحت میں مرے اشعار موتی ہیں
کہ ہے قرطاس پر اک کہکشاں، بدرالدجیٰ آئے
یہ نعتِ مصطفیٰ ہے ذات کی منزل خدا جانے
یہ نازک مرحلہ طے ہوگا جب معجز نما آئے
زمیں کیا عرش پر بھی جشن برپا ہے پئے مدحت
''دو عالم میں مسرت ہے حبیبِ کبریا آئے''
کلیم طور ہی جانیں ترے نعلین کی منزل
خدا نے ان سے فاخلع کہہ دیا تو پیادہ پا آئے
کلامِ رب ہوا محبوب سے اک خاص لہجے میں
خدا ہی جانے وہ منزل جہاں پر مصطفیٰ آئے
مریضِ عشقِ احمد ہوں فقیری ہے مری دولت
مسیحا بن کے رہزن پاس میرے بارہا آئے
اگر ارشادِ حق سمجھا نہیں قولِ پیغمبر کو
کہاں ایمان کی منزل پہ تیرے نقشِ پا آئے

(۸)

فضیلتوں کے فلک پر یہ صرف تنہا ہے
جہاں میں کوئی کہاں مصطفیٰ کے جیسا ہے
وہ کائنات میں خُلقِ عظیم کا در ہے
جہاں سے کفر مسلمان بن کے جاتا ہے
ترقیات سے سمجھو مسافتِ معراج
وہ ایک پل میں فلک سے زمیں پہ آتا ہے
نبی سے بات کی حق نے علی کے لہجے میں

حبیب کو یہی لہجہ پسند آتا ہے
کیے ہیں ایک اشارے میں چاند کے ٹکڑے
کلام پاک میں یہ صاف صاف لکھا ہے
لعاب ڈال دیا جب کنویں میں آقا نے
یہ معجزہ ہے کہ شفاف آب نکلا ہے
خدا کا حکم نہ جب تک ملے اِسے ارشادؔ
مرا رسول کہاں کچھ کلام کرتا ہے

(۹)

محبوبِ خدا کی الفت میں جب نعت سنائی جاتی ہے
کوثر بھی لبوں کو چومتا ہے جنت بھی دکھائی جاتی ہے
اک نور اتارا ہے حق نے کافور ہوئی سب تاریکی
تخلیق کے سازِ فطرت پر اک ضرب لگائی جاتی ہے
شاہوں کو گدائی سکھلانے کونین کا مالک آپہنچا
انوارِ نبی کی دولت سے ہر چیز سجائی جاتی ہے
ساوہ کا بھی دریا خشک ہوا، کسریٰ کے گرے ہیں کنگورے
آتشکدۂ فارس ہے بجھا، وہ شمع جلائی جاتی ہے
واللیل تری زلفیں ہیں مگر والشّمس یہ تیرا چہرہ ہے
والنجم ہیں آنکھیں دیکھ کے یہ تصویر بنائی جاتی ہے
حیران ہے حسنِ یوسف بھی، چشمانِ زلیخا خیرہ ہیں
تصویر جمالِ مصطفوی کیا خوب دکھائی جاتی ہے
اللہ بھی ایک پیمبر بھی، قرآں بھی ایک ہے قبلہ بھی
پھر کس لیے قومِ مسلم میں تفریق یہ پائی جاتی ہے
پیغمبر اکرم آئے ہیں مظلوموں کا دل جھوم اٹھا

اب ظلم و تشدد کی دنیا بنیاد سے ڈھائی جاتی ہے
آسان نہیں توصیف رقم کرنا مرے آقا کی ارشادؔ
جب خونِ جگر کو صرف کرو تب نعت بنائی جاتی ہے

(۱۰)

ہر سمت مسرت ہے زمانے میں خوشی ہے
جس نور کی آمد ہے وہ نبیوں کا نبی ہے
آئی ہے بہار آمنہ کی گود بھری ہے
کیا کیف و مسرت کی ہوا چلنے لگی ہے
آیا ہے نبی آج تو صادق سا ولی بھی
دونوں کا مزاج ایک ہے سچ بات یہی ہے
کسریٰ کے گرے کنگرے، آتش کدہ گل ہے
زندہ ہوا دیں، کفر کی گردن پہ چھری ہے
چھٹنے لگا جب جھوٹ کی لعنت کا اندھیرا
محسوس ہوا شمع صداقت کی جلی ہے
سر خم کرو تعظیم سے، اکڑو نہ یہاں پر
یہ سوچ کے آؤ کہ پیمبر کی گلی ہے
ارشادِ خدا ہے کہ کرو بات ادب سے
اونچی نہ ہو آواز یہ دربارِ نبی ہے

☆☆☆

حواشی:

۱۔ واجبِ ذاتی وہ ہستی ہے جس کا وجود اپنی ذات سے لازم اور اٹل ہو، یعنی وہ اپنے وجود میں کسی اور کا محتاج نہ ہو اور اس کے نہ ہونے کا تصور بھی محال ہو۔ فلسفہ و کلام میں یہ اصطلاح عموماً اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، کیوں کہ وہی ایسی ذات ہے جو ازلی و ابدی، بے نیاز اور قائم بالذات ہے۔ واجبِ ذاتی نہ کسی سبب کا نتیجہ ہے اور نہ کسی علت کا محتاج، بلکہ تمام کائنات اسی کے وجود پر موقوف ہے، یعنی دیگر تمام

موجودات ممکن الوجود ہیں۔

۲۔ وجوبِ غیر سے مراد ایسا وجود ہے جو اپنی ذات سے واجب نہیں ہوتا بلکہ کسی دوسرے کے سبب واجب قرار پاتا ہے۔ یعنی وہ چیز بذاتِ خود ممکن ہوتی ہے، مگر کسی علت یا سبب کے پیدا کرنے سے اس کا وجود ضروری ہو جاتا ہے۔ فلسفہ و علمِ کلام میں اسے 'واجب بالغیر' بھی کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کائنات کی اشیا اپنی ذات میں ممکن الوجود ہیں، لیکن خالق کے ارادہ و تخلیق کے بعد ان کا وجود لازم ہو جاتا ہے۔ اس طرح وجوبِ غیر دراصل ایک عارضی اور تابعی وجوب ہے جس کی بنیاد کسی دوسرے پر قائم ہوتی ہے۔

۳۔ دلیلِ لمّی وہ استدلال ہے جس میں کسی نتیجے کو اس کی علتِ حقیقیہ (سببِ اصلی) کے ذریعے ثابت کیا جاتا ہے۔ یعنی ہم علت سے معلول کی طرف آتے ہیں، اس لیے اسے زیادہ مضبوط اور یقینی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً آگ کے وجود سے حرارت کا ثابت ہونا دلیلِ لمّی کی مثال ہے، کیوں کہ آگ حرارت کی حقیقی علت ہے۔ منطق اور فلسفہ میں یہ طریقۂ استدلال اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب علت معلوم اور واضح ہو، اور اسی کے ذریعے معلول کی حقیقت کو سمجھا جائے۔ یہ دلیل علمِ یقینی تک پہنچنے میں نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔

۴۔ دلیلِ اِنّی وہ استدلال ہے جس میں معلول (اثر) سے علت (سبب) کا اثبات کیا جاتا ہے۔ یعنی ہم کسی نتیجے یا اثر کو دیکھ کر اس کے پیچھے موجود سبب کا اندازہ لگاتے ہیں۔ مثلاً دھواں دیکھ کر آگ کے وجود کا یقین کرنا دلیلِ اِنّی کی مثال ہے۔ منطق میں یہ طریقہ اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب علت براہِ راست معلوم نہ ہو، بلکہ اس کے آثار سے اس کا سراغ لگایا جائے۔ اگرچہ یہ دلیل، دلیلِ لمّی کے مقابلے میں کم یقینی سمجھی جاتی ہے، مگر عملی زندگی اور سائنسی تحقیق میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

۵۔ عینِ ذات سے مراد وہ صفت یا حقیقت ہے جو کسی شے کی ذات سے جدا نہ ہو بلکہ بعینہٖ اسی کی ذات ہو۔ یعنی اس میں صفت اور موصوف کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔ فلسفہ و علمِ کلام میں یہ اصطلاح خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان میں آتی ہے، جہاں کہا جاتا ہے کہ اس کی صفات (جیسے علم، قدرت، حیات) عینِ ذات ہیں، نہ کہ اس سے الگ کوئی مستقل وجود رکھتی ہیں۔ اس طرح عینِ ذات کا تصور ذات اور صفات کے درمیان کامل وحدت اور غیر منفک تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

۶۔ 'مرکز ہے ھل اَتیٰ' ایک شعری و صوفیانہ تعبیر ہے جس میں 'ہل اَتیٰ' سے مراد سورۂ دہر ہے، جو قرآنِ مجید کا ایک اہم سورہ ہے۔ اس سورہ میں اہلِ بیتِ اطہار کے ایثار، صبر اور اخلاص کی شان بیان کی گئی ہے، خاص طور پر وہ واقعہ جس میں انھوں نے اپنی ضرورت کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلایا۔

☆☆☆

غزلیات

(۱)

وہ بتوں کی کبھی تکریم نہیں کرسکتا
سنّت رب میں جو ترمیم نہیں کرسکتا

ہے یہی خارقِ عادت ترے مجنوں کا مزاج
پتھروں سے کوئی تقدیم نہیں کرسکتا

صورِ جسم سے ممکن نہیں مفرد کی شناخت
ایسی صورت کوئی تقسیم نہیں کرسکتا

صورتِ نوع[۱] سے گر تم کو سہارا نہ ملے
پھر ہیولیٰ[۲] کی بھی تفہیم نہیں کرسکتا

لامکاں کے لیے حیّز[۳] بھی نہیں ہے ارشادؔ
پھر بھی اک گھر ہے جو تقسیم نہیں کرسکتا

(۲)

یہ عکس ہے کہ کوئی آئینہ ہے حیرت کا
دکھا رہا ہے تماشا وہ کیسی عبرت کا

یہ کس کے شوق کی وادی میں رکھ دیا ہے قدم
مہک رہا ہے ہر اک سو گلاب الفت کا

جو ظلم ڈھاتی ہیں مخمور نیم باز آنکھیں
ہے کس میں زورِ بیاں اس اثر کی کلفت کا

وہ زلف رخ سے ہٹالے تو صبح پھوٹ پڑے
بکھیر دے تو تصور ہو شام ظلمت کا

نہیں کی تیغ سے کاٹی ہے شہ رگِ باطل
خلاصہ ہے یہی حق کی زباں کی رفعت کا
سکوت موت کا چھایا ہے اُس جگہ ارشادؔ
جہاں تھا شور حکومت کی شان و شوکت کا

(۳)

نہ کر اب تذکرہ خندہ لبی کا
بھروسہ کیا کسی کی زندگی کا
دلوں کی دھڑکنوں سے جو ہے واقف
اُسے آتا ہے فن شیشہ گری کا
گلی میں اُن کی موت آئی تو بولے
پتہ تھا اس کو میری بے بسی کا
جنوں کی سیر کرتا رہ گیا وہ
جسے کچھ حوصلہ تھا آگہی کا
جنوں کی راہ پر کیوں چل پڑا ہے
کہیں پتھر نہ لگ جائے کسی کا
ستم کے قافلے نکلے ہیں ارشادؔ
اشارہ ہے یہ طوفانِ خفی کا

(۴)

ارادہ ہے اگر فتنہ گری کا
تماشا کیوں ہے پھر بازی گری کا
میں بیٹھا تھا ابھی گم ہوگیا ہوں
کرشمہ ہے تری جادوگری کا
یہ داغِ ماہ ہے یا نقصِ فن ہے

ہنر ہے یا کوئی صنعت گری کا
شکستہ دل کا ناممکن ہے جڑنا
بہت نازک ہے فن شیشہ گری کا
یہ پیکر نور کا اور وہ ہے ناری
تقابل حور سے کیا ہو پری کا
اگر ارشادؔ کو مل جائے طاقت
صفایا ہو ضلال و گمرہی کا

(۵)

اظہارِ کرم کرنا آسان نہیں ہوتا
پھر اس کا نبھا پانا آسان نہیں ہوتا
اک وقت بھی آتا ہے جب راہِ محبت میں
مرمر کے جیے جانا آسان نہیں ہوتا
زلفوں کی کوئی ناگن جب ڈس لے جھروکے سے
انسان کا پھر بچنا آسان نہیں ہوتا
کچھ درد محبت کا، کچھ خوف زمانے کا
اوسان بجا رکھنا آسان نہیں ہوتا
جب آگئی قسمت میں ناکامی و محرومی
تو اس کو بھلادینا آسان نہیں ہوتا
کانٹوں کا سفر ہم نے طے کر تو لیا لیکن
زخموں کا مگر بھرنا آسان نہیں ہوتا
نرگس پہ پڑی شبنم قطرہ نہیں دریا ہے
جس کا کبھی رک جانا آسان نہیں ہوتا
دل کھول کے رونے سے تسکین تو ہوتی ہے

پھر اس کا سنبھل پانا آسان نہیں ہوتا
ارشادؔ نے جھیلی ہیں کچھ ایسی گزرگاہیں
جن راہوں پہ چل پڑنا آسان نہیں ہوتا

(۶)

ٹوٹ کر بکھرا ہوا گوہر جو تھا
مثلِ شیشہ پارۂ جوہر جو تھا
جرأتوں کے قافلے آگے بڑھے
میں رکا تھا، میل کا پتھر جو تھا
کیوں بھلا ڈستیں مجھے تنہائیاں
ساتھ تیری یاد کا لشکر جو تھا
ظلمتیں کافور ہوکر رہ گئیں
پاس میرے نور کا پیکر جو تھا
اُٹھ گیا اس کا جنازہ دھوم سے
یہ ہزاروں طالبوں کا سر جو تھا
آتے تھے طلاب پڑھنے کے لیے
سبک دوشی پر وہ اپنے گھر جو تھا
کاش ان سے سیکھ لیتے فلسفہ
علم معقولات کا دفتر جو تھا
رک گئی ارشادؔ کی نبض حیات
سوگیا، طلاب کا مصدر جو تھا

(۷)

غصہ کو پیوں گا اور غم کو ترے کھاؤں گا
ایک پل کے لیے تم کو بھی نہیں بھاؤں گا

عکس تیرا جو نظر آتا ہے آئینے میں
مضطرب ہوکے میں سیماب کو تڑپاؤں گا
تو اگر چاہتا ہے مجھ سے بنائے دوری
تیری خاطر میں ترے پاس نہیں آؤں گا
قیس کو دشت میں مرنا تھا مگر مر نہ سکا
اُس کا کہنا ہے کہ در پر ترے مر پاؤں گا
نکہتِ گل کی طرح چاک گریباں ہوکر
گلشنِ زیست سے میں دور نکل جاؤں گا
برق پر آہ کی سوزش سے گرے گی بجلی
حادثہ جو نہ ہوا وہ تجھے دکھلاؤں گا
لب جو ہلتے ہیں تو ہر درد کا ہوتا ہے علاج
کیسے ارشادؔ مسیحا کا وہ دم پاؤں گا

(۸)

کوئی نہیں جو تجھے درد کی دوا دے گا
اگر خلوص سے مانگو تو بس خدا دے گا
سکون چاہو تو گندی فضا سے دور رہو
وفا کے نام پہ ورنہ کوئی دغا دے گا
جو بیٹھو گے کبھی اک بار اس کی محفل میں
سلیقہ ہجر کا تم کو وہی سکھا دے گا
تمہارے غیر کو فرصت کہاں ستانے کی
جو زخم دے گا تجھے تیرا آشنا دے گا
بڑی مشقتوں سے بستیاں بسائی تھیں
خبر نہ تھی کوئی ظالم انھیں جلادے گا

عزیز ہے جو ترے دل کو زندگی ارشادؔ
تو حق پہ مرنے کا جذبہ اسے سکھادے گا

(۹)

جہاں پر علم کا چرچا رہے گا
ہمیشہ جہل کو صدمہ رہے گا
خموشی کو بھی گویائی بنادے
ترا احساس گر زندہ رہے گا
امیرِ شہر کو کیا اس کا غم ہے
اگر مفلس کوئی بھوکا رہے گا
اسے ہر چیز مل جائے گی جس کو
طلب کا حوصلہ پختہ رہے گا
جو خود استاد کو ہلکا سمجھ لے
وہ علم و فن سے بےگانہ رہے گا
اسے ہے عقل کی دولت میسر
جو صدقِ دل سے دیوانہ رہے گا
اگر ارشادؔ ہے شیشہ کے گھر میں
تو پتھر کا اسے خطرہ رہے گا

(۱۰)

جیسے ہی حکم ہجر ملا مان تو گیا
دیوانگی کے درد و الم جان تو گیا
مجنوں نے میرا حال جو دیکھا تڑپ اٹھا
کہنے لگا کہ آج یہ انسان تو گیا
حرفِ جلی میں نام محبت وہ لکھ گیا

آنکھوں کے اک اشارے کو پہچان تو گیا
کہتے ہیں عشق ہجر کی لذت کا نام ہے
گر وصل ہاتھ آگیا ارمان تو گیا
کیوں آگئی ہے فکر میں سنجیدگی بہت
دریا میں اب سکوت ہے طوفان تو گیا
سوچا تھا ایک ساتھ چلے عمر کا سفر
الفاظ رہ گئے مگر عنوان تو گیا
ارشادؔ گر عمل میں ریا کا ہے شائبہ
شرکِ خفی سے آپ کا ایمان تو گیا

(۱۱)

ہجر کے درد نے پیہم ہمیں ناشاد کیا
وصل کی آرزو نے زیست کو برباد کیا
مار دیتا جو ہمیں زیر قفس اچھا تھا
بال و پر توڑ کے صیاد نے آزاد کیا
تھی کبھی بے خبری اور کبھی کوہ کنی
اس نے ہم کو کبھی مجنوں کبھی فرہاد کیا
جب بھی حق کے لیے آواز اٹھائی ہم نے
اس نے ہر بار انوکھا ستم ایجاد کیا
دل دہلنے لگے بے دردوں کے آخر ارشادؔ
دردمندوں نے عجب درد سے فریاد کیا

(۱۲)

دل نے بھی آج ضبط کا دعویٰ نہیں کیا
غم کو مگر کسی پہ بھی افشا نہیں کیا

کل تک تو حرف حرف میں تھی روشنی بسی
ہم نے ہی اپنے شوق کو دریا نہیں کیا
کیا کم تھا یہ کہ آنکھ میں غم کی لکیر تھی؟
اظہارِ درد اور بھی گہرا نہیں کیا
وہ عہد جو تھا عمر میں زیادہ عزیز تر
ہم نے اسے زمانے سے سودا نہیں کیا
تقدیر نے سپردِ مشیت کیا جسے
چھن جانے کا اسے کبھی شکوہ نہیں کیا
ہم بھی مریدِ کربِ وفا تھے مثالِ میرؔ
دل کو مگر اسیرِ تمنا نہیں کیا
تاریخ پوچھتی رہی کردار کا جواز
ہم نے قلم سے جھوٹ کا سودا نہیں کیا
دشواریوں نے جب بھی کبھی آزما لیا
ہم نے کسی کو حال سے آگہ نہیں کیا
آخر میں یہ کہا کہ قضا بھی ہے رازدار
ہم نے اجل سے کوئی تقاضا نہیں کیا
ارشادؔ دل نے صبر کی حد بھی عبور کی
لیکن کسی کے سامنے سجدہ نہیں کیا

(۱۳)

ان کے ہونٹوں کو سنانا آ گیا
نغمۂ دل گنگنانا آ گیا
زخم کے کھلنے کی ہیئت دیکھ کر
پتھروں کو مسکرانا آ گیا

دیکھیے اب دوستوں کے بھیس میں
دشمنوں کو آزمانا آ گیا
عشق کی راہیں ہوئی ہیں پر فتن
حسن کو جب سے ستانا آ گیا
جب رقیبوں نے رکاوٹ ڈال دی
ان کو دوری کا بہانا آ گیا
تم نے اے ارشادؔ سوچا تھا کبھی
خواب یہ کیسا سہانا آ گیا

(۱۴)

تیغِ ابرو کا اشارہ ہوگیا
نام تیرا، کام میرا ہوگیا
زلف جو اس کی پریشاں ہوگئی
اور بھی بادل گھنیرا ہوگیا
آسماں پر چھا گئیں تاریکیاں
اور چڑیوں کا بسیرا ہوگیا
رات بھر آنکھیں بچھی تھیں راہ میں
وہ نہ آیا اور سویرا ہوگیا
چل پڑی اس راہ پر محفل کی بات
آج جو ارشادؔ تیرا ہوگیا

(۱۵)

جب سے دیکھا ہے تمھیں عشق میں خوابوں کی طرح
بے گناہی مری لگتی ہے گناہوں کی طرح
چند لمحے جو کبھی جوشِ جنوں میں گزرے

گوشۂ قلب میں ہیں نقش وہ یادوں کی طرح
جرم کرنا بھی وہ چاہے تو نہیں کرسکتا
جس کو اللہ بچائے رکھے پاکوں کی طرح
حسرتِ دید ہے مدت سے پس منظر شوق
کاش وہ آکے گزر جائیں خیالوں کی طرح
میری تہذیب ہے الفت کو ترقی دینا
آئے گوشہ نہ تعصب کا نصابوں کی طرح
گردشِ دہر میں کیسا ہے تمھارا چہرہ
گھومتا رہتا ہے آنکھوں میں نظاروں کی طرح
ہم نے اس طرح سے دی مات خزاں کو ارشادؔ
دشت میں ذکر ہمارا ہے بہاروں کی طرح

(۱۶)

جب نسیمِ سحر چلے گل پر
زیب دیتا ہے راگ بلبل پر
بے ثباتی کو دیکھ کر اس کی
رونا آتا ہے خندۂ گل پر
سانپ جب لوٹتا ہے سینے پر
ذہن جاتا ہے تیرے کاکل پر
ہائے اب جاں بہ لب ہوا عاشق
رحم آتا ہے اس تحمّل پر
اب کے ارشادؔ کے مطابق میں
جی رہا ہوں بس اک توکل پر

(۱۷)

ذرّے ذرّے کو اگر پیکرِ عرفاں کردوں

کیوں نہ ویرانے کو میں رشکِ گلستاں کردوں
گر تجھے روبروئے یوسفِ کنعاں کردوں
حسن سے تیرے میں آئینے کو حیراں کردوں
کیا عجب ناخنِ تقدیر کے ہاتھوں اے دوست
میں ترے گیسوئے پیچاں کو پریشاں کردوں
آتشِ عشق کی سوزش کا تقاضا ہے یہی
سینۂ سوختہ کو اور بھی بریاں کردوں
لذتِ ہجر نے وہ کیف دیا ہے مجھ کو
دردِ دنیا کو بھی نذرِ غمِ جاناں کردوں
نقش بر آب، ہوائے نفس و نارِ غرور
ایک ٹھوکر میں انھیں خاک بداماں کردوں
اشک چغلی جو کیا کرتے ہیں پیہم ارشادؔ
کیسے ممکن ہے کہ اس درد کو پنہاں کردوں

(۱۸)

سنبل کو زلف پھول کو رخسار کیوں کہوں
حاصل نہیں ہے آپ کا دیدار کیوں کہوں
میں کھینچتا رہا کوئی تصویر رات بھر
لیلیٰ کی سرخ آنکھوں کو خونبار کیوں کہوں
جمتے نہیں ہیں گر قدم اس کے زمین پر
ہوگا کوئی نشہ، اسے میخوار کیوں کہوں
آنکھوں کی پتلیاں رہیں محروم دید سے
چہرے کے تل کو خالِ ستم گار کیوں کہوں
ارشادِؔ حق ہے دل سے محبت کی راہ میں

اس کے سوا کسی کو مددگار کیوں کہوں

(۱۹)

مثلِ رنگِ بہار آنکھوں میں
آ گیا ہے خمار آنکھوں میں
خونِ دل کی طرح نمایاں ہے
سرخ ڈوروں کا تار آنکھوں میں
بڑھ گئی انتظار کی شدّت
کیسے آئے قرار آنکھوں میں
قطرۂ اشک تھا جو پلکوں پر
چبھ گیا مثلِ خار آنکھوں میں
صرف مژگاں کے اک اشارے پر
ہوگیا دل شکار آنکھوں میں
بزم سے کھینچ کر ہزاروں دل
لے گیا گلعذار آنکھوں میں
کوئی ارشادؔ سے ذرا پوچھے
کیا ہوا خون بار آنکھوں میں

(۲۰)

کیوں تکلف ہو بھلا اپنے کو اپنانے میں
جب ترحم کی نظر دیکھ لی بیگانے میں
جانے کیوں آج ہیں بدلے ہوئے تیور ان کے
کیا خطا ہوگئی مجھ سے کوئی انجانے میں
سوزشِ عشق سے جب شمع کو روتے دیکھا
آرزو جلنے کی پیدا ہوئی پروانے میں

پی کے دو گھونٹ قسم توڑ دی ساقی میں نے
دیکھ لی آپ کی تصویر جو پیمانے میں
ان کی آنکھوں کا کرشمہ ہے کہ لب کی حرکت
کیوں خودی کی جگہ ہے بے خودی دیوانے میں
جس کو پینے کا سلیقہ نہیں آتا ارشادؔ
وہ پلانے کے لیے بیٹھے ہیں میخانے میں

(۲۱)

عقل والے ہمیں دیوانہ کہا کرتے ہیں
ہوش والوں کو بھی مستانہ کہا کرتے ہیں
جو رہِ عشق میں مجنوں کو بھی پیچھے کردے
ایسے دیوانے کو فرزانہ کہا کرتے ہیں
چاہنے والے ترے ہوتے ہیں دانا لیکن
جو ہیں ناداں انھیں دیوانہ کہا کرتے ہیں
کیا اُترتا ہے کبھی ادھ کھلی آنکھوں کا نشہ
چشمِ میگوں کو بھی میخانہ کہا کرتے ہیں
سر جھکاتے نہیں ہم ظلم کے آگے ارشادؔ
بات انصاف کی روزانہ کہا کرتے ہیں

(۲۲)

ہم نے کتنی سخت دیں قربانیاں
پھر بھی باقی ہیں تو ہیں حیرانیاں
لاکھ اٹھتی ہیں جہاں میں آندھیاں
حوصلہ ہے شمع کا پھر بھی جواں
فیصلہ تم نے لیا وہ سخت تھا

تھیں مگر حالات کی مجبوریاں
جانے کب تک ہم نے جھیلیں سختیاں
تلخیاں، مجبوریاں، ویرانیاں
لکھ دیا ہے کاتبِ تقدیر نے
میرے دل کے سامنے ناکامیاں
جب سے تم آنکھوں سے اوجھل ہوگئے
زندگی میں رہ گئیں تنہائیاں
کیسا ہے حالات کا ظلم و ستم
مصلحت میں کھو گئیں نزدیکیاں
لاکھوں مجنوں مرگئے ہیں راہ میں
میں ابھی کرتا ہوں طے سب دوریاں
ہوگیا بوڑھا مگر اے فرط شوق
تونے رکھا ہے مجھے اب بھی جواں
خود ہی پروانے لپٹ کر مرگئے
رات بھر شمعیں ہیں کیوں گریہ کناں
دل ہے تیرے ابروؤں کا آئینہ
چاند ترچھا ہے تو چبھتا ہے یہاں
جب سے دیکھا ہے تری آنکھوں کا سحر
بھٹکی بھٹکی ہیں نگاہیں یاں وہاں
ایک عرصہ ہوگیا چبھتے ہوئے
اب بھی ہے خارِ الم دل میں نہاں
الٹے سیدھے خواب کی تعبیر سے
جائیں گھبرا کر تو ہم جائیں کہاں

آنسوؤں کا ضبط کرنا شرط ہے
راز الفت کا نہ ہوجائے عیاں
سامنے ارشادؔ کے جب تم ہوئے
گنگ کیسے ہوگئی اس کی زباں

(۲۳)

شدت غم سے ہے دل برقِ تپاں
خوف ہے جل جائے اپنا آشیاں
خود ہی پروانے لپٹ کر مرگئے
رات بھر شمعیں ہیں کیوں گریہ کناں
جب سے دیکھا ہے تری آنکھوں کا سحر
بھٹکی بھٹکی ہیں نگاہیں یاں وہاں
ایک عرصہ ہوگیا چبھتے ہوئے
اب بھی ہے خار الم دل میں نہاں
الٹے سیدھے خواب کی تعبیر سے
جائیں گھبراکر تو ہم جائیں کہاں

(۲۴)

مجھ سے وہ بےخبر ہے مرا چارہ گر کہاں
جانے یہ درد روک دے دل کا سفر کہاں
جب خود مسیح درد کا درماں نہ بن سکا
پھر داروئے طبیب میں ہوگا اثر کہاں
زلفوں کے پیچ و خم کا زمانہ گزر گیا
پیچیدہ مسئلوں پہ ہے تیری نظر کہاں
پھولوں کی آرزو کو ذہن سے نکال دو

کانٹوں کا سامنا ہے تو زخموں کا ڈر کہاں
رہتے ہیں صبح و شام گناہوں کی فکر میں
پھر بھی ہے یہ گلہ کہ دعا میں اثر کہاں
تاریکیوں میں کیسے کٹے رات کا سفر
پر نور تیری یاد سے ہے رہ گزر کہاں
بربادیوں کی سازشیں افلاک پر ہوئیں
ارشادؔ بھی ہے اس مگر بے خبر کہاں

(۲۵)

دل لگا ہے کہ دل لگی ہے یہاں
کیا ہوا کیسی بیکلی ہے یہاں
آشیانے جلا رہا ہے مگر
جوں نہ کانوں پہ رینگتی ہے یہاں
میرے لب اور ان کے عارض سے
آگ نکلی تو تشنگی ہے یہاں
اُن کی یادوں کے جل رہے ہیں چراغ
اب اندھیروں میں روشنی ہے یہاں
کیا کسی کربلا کی حاجت ہے
خون دینے میں کچھ کمی ہے یہاں
نفرتیں بِک رہی ہیں دنیا میں
اب کہاں مہر و دوستی ہے یہاں
راہِ حق سے بھٹک رہا ہے بشر
کیسی ارشادؔ رہبری ہے یہاں

(۲۶)

دل سے تمھاری یاد نہ جائے تو کیا کروں

اک لمحہ بھی قرار نہ آئے تو کیا کروں
رنگِ بہار دیکھ کے صحرا کی راہ لوں
گر دشت میں بھی چین نہ آئے تو کیا کروں
سوچا کہ جان دے دوں محبت کے نام پر
مرکر بھی گر سکون نہ آئے تو کیا کروں
تیرا خیال دل پہ مسلط ہے اس طرح
کوشش کے بعد نیند نہ آئے تو کیا کروں
اسلام میں شراب کا پینا حرام ہے
تیری جو سرخ آنکھ پلائے تو کیا کروں
تنکوں کو چن کے ایک نشیمن بنایا تھا
اس کو بھی کوئی برق جلائے تو کیا کروں
اک آرزو تھی پھول کی لیکن جو راہ میں
کانٹے اگر رقیب بچھائے تو کیا کروں
ارشادؔ سارے درد جہاں کے سمیٹ کر
قدرت جو تیرا دل ہی بنائے تو کیا کروں

(۲۷)

تاباں صفت نگینوں کا جوہر ہم ہی تو ہیں
ظلمت میں روشنی کا مقدر ہم ہی تو ہیں
دنیا حقیر لاکھ سمجھتی رہے ہمیں
معلوم ہے کروڑوں سے بہتر ہم ہی تو ہیں
ہر راہ رو نشانِ قدم دیکھ کر چلے
منزل کا جو پتہ دے وہ رہبر ہم ہی تو ہیں
فرشِ زمیں پہ چاند ستارے اتاردیں

اوجِ فلک پہ مہرِ منور ہم ہی تو ہیں
ظلم و ستم کی دہر میں چلتی ہیں آندھیاں
جلتی رہے جو شمع برابر ہم ہی تو ہیں
کرتی ہیں جب برائیاں گندہ ضمیر کو
عفت کی روح خلق کا پیکر ہم ہی تو ہیں
سر جھک سکے کسی کا نہ باطل کے سامنے
ارشادؔ سر کٹادے جو حق پر ہم ہی تو ہیں

(۲۸)

جس قدر ان کو بھلاتے ہیں وہ یاد آتے ہیں
صبح کو، شام کو راتوں کو وہ یاد آتے ہیں
مہربانی تو نہیں ان کی ادا میں شامل
ناز و عشوہ کے لیے خرم و شاد آتے ہیں
شاخ گل کو جو لچکتے ہوئے دیکھا ہم نے
بانکپن کے بھی حوالے سے وہ یاد آتے ہیں
وہی ملزم، وہی منصف، یہ عجب ہے بیداد
ہوکے مجبور مگر طالب داد آتے ہیں
مانگتا رہ گیا وہ ایک نوشتہ کے لیے
لے کے کب لوگ قلم اور مداد آتے ہیں
جس کو اصلاح کی حاجت ہو وہ لے کر ارشادؔ
تیرے پاس اپنے بیاض اور سواد آتے ہیں

(۲۹)

ہم ان کی خیالوں میں تصویر بناتے ہیں
کچھ نقش بناتے ہیں کچھ نقش مٹاتے ہیں

کاغذ پہ نہ بن پائی جب صورت جانانہ
تب ذہن کے گوشے میں اک بُت کو سجاتے ہیں
بے خوف و خطر ملتے ہیں چاہنے والے جب
کچھ اُن کی بھی سنتے ہیں کچھ اپنی سناتے ہیں
یہ بھی کوئی ملنا ہے بس شکل دکھا دینا
کچھ بات نہیں ہوتی واپس چلے جاتے ہیں
جب مشکلیں پڑتی ہیں مایوس نہیں ہوتے
شب بھر تری یادوں کے ہم دیپ جلاتے ہیں
لرزش میں ہے لو، ہم تو شمعِ شبِ آخر ہیں
بجھتے ہیں تو عالم کو پُرنور بناتے ہیں
ارشادؔ نے جو چھوڑے ہیں نقش زمانے میں
ہر طالبِ منزل کو وہ راہ دکھاتے ہیں

(۳۰)

کبھی آنکھوں کو یہ پیمانہ بنا دیتے ہیں
آشنا کو کبھی بےگانہ بنا دیتے ہیں
گلعذاروں کی ہے نظروں میں خزاں کی تاثیر
مرغزاروں کو بھی ویرانہ بنا دیتے ہیں
سرخ آنکھوں سے پلا دیتے ہیں جامِ رنگیں
محفلِ عیش کو میخانہ بنادیتے ہیں
عشق کا راز جو کھل جائے تو اربابِ ہوس
عاشقِ زار کو دیوانہ بنادیتے ہیں
شمع کی طرح چمکتے ہیں گلابی چہرے
جو نظر والوں کو پروانہ بنادیتے ہیں

چاندنی رات میں بکھرے ہوئے جلوے ان کے
چشمِ ارشادؔ کو مستانہ بنادیتے ہیں

(۳۱)

عشق کے زخم کیسے بھرتے ہیں
ہجر کے دن کہاں گزرتے ہیں
یار کا جب خیال آتا ہے
آئینے میں وہ کیوں سنورتے ہیں
ہوش میں کیا نہیں ہیں اہلِ خرد
بات اب وہ جنوں کی کرتے ہیں
موج دریا ہے زندگی اپنی
پل میں ہم ڈوبتے ابھرتے ہیں
موسم گل میں نغمۂ بلبل
سن کے عشاق رشک کرتے ہیں
دردِ دل بڑھ گیا تو بڑھنے دو
موت سے کب حبیب ڈرتے ہیں
ساتھ دینے کی کھائی تھی قسمیں
کیا ہوا مرکے پھر وہ مرتے ہیں
ہم نے کیا کہہ دیا جنوں میں انھیں
اپنے وعدے سے کیوں مکرتے ہیں
جو بھی عادی ہیں جھوٹ کے ارشادؔ
سچ کی تلخی سے کب سدھرتے ہیں

(۳۲)

لوگ جب تیرا نام لیتے ہیں

دل کو ہم اپنے تھام لیتے ہیں
کون ہے میرے خوں کا ذمہ دار
ہم رقیبوں کے نام لیتے ہیں
بے وفائی پہ اس ستمگر کی
صبر سے کیسے کام لیتے ہیں
جب کبھی مہربان ہو ہم پر
ان کی آنکھوں کے جام لیتے ہیں
ہو غضبناک جب، خدا کی پناہ
اشک خوں کی مدام لیتے ہیں
چھایا بادل تو بدلی نیت بھی
میکدہ آکے جام لیتے ہیں
ابتدا سے ہے انتہائے خلوص
نام اپنا عوام لیتے ہیں
کوئے جاناں میں جاکے اے ارشادؔ
خود سے ہم انتقام لیتے ہیں

(۳۳)

جن کے لب سوزش ناسور میں ہنس لیتے ہیں
اپنی آنکھوں سے وہی خون برس لیتے ہیں
زندگی لگتی ہے فرعون کا دربار جہاں
اب تو رسی سے بنے سانپ بھی ڈس لیتے ہیں
درد کی گرد ہو گر عشق کے آئینے پر
کیا قیامت ہے کہ وہ رو کے بھی ہنس لیتے ہیں
کردیئے جاتے ہیں کیوں سارے غذا سے محروم

سانپ ڈس لے جسے کیا دودھ ہی بس لیتے ہیں
جب بھڑکتی ہے کبھی قلب میں احساس کی آگ
سرد کرنے کے لیے صبر کا رس لیتے ہیں
کوئی صیاد ہمیں قید نہیں کرسکتا
سانس آزادی کا ہم زیر قفس لیتے ہیں
عشق کی آگ کے شعلے تو بھڑکتے ہیں مگر
بعض وہ لوگ ہیں جو خود کو جھلس لیتے ہیں
ظلم جب حد سے گزر جائے تو بڑھ کر ارشادؔ
حوصلے والے کمر آج بھی کس لیتے ہیں

(۳۴)

جب فضائیں مہرباں کچھ بھی نہیں
دور تک یہ آسماں کچھ بھی نہیں
احسنُ الخلوق جب کوئی نہ ہو
پھر تو یہ سارا جہاں کچھ بھی نہیں
مادّہ ہی جب ہو اصل کائنات
خلقتِ کون و مکاں کچھ بھی نہیں
لاکھ رخ بدلو مظالم کے یہاں
سوچ لو رب سے نہاں کچھ بھی نہیں
چاہے وہ نمرود ہو شداد ہو
اب کہیں ان کا نشاں کچھ بھی نہیں
حق پرستی کربلا سے سیکھ لو
سامنے تیر و سناں کچھ بھی نہیں
سنگریزوں، پتھروں کے شہر میں

شیشہ و شیشہ گراں کچھ بھی نہیں
رہ روان راہ الفت کے سوا
زندگی کا کارواں کچھ بھی نہیں
مثل قطرہ ہے تو پھر ارشادؔ کو
علم بحر بے کراں کچھ بھی نہیں

(۳۵)

پہلے تم حسن کو تلاش کرو
بعد میں عشق کو تلاش کرو
گر تمنائے دید ہے تم کو
اپنی ہستی میں خود تلاش کرو
تاب نظّارہ گر نہیں ممکن
ذات موسیٰ میں تم تلاش کرو
لن ترانی ہے کیا اسے دیکھو
پھر حقیقت کو تم تلاش کرو
ایک پانی کا بلبلہ ہو تم
اک سمندر کی تم تلاش کرو
ہر حسیں میں ہے حسن کا جلوہ
کاش ارشا تم تلاش کرو

(۳۶)

ملا ہے عشق میں وہ مرتبہ شہادت کو
زمانہ بھول نہ پائے گا اس حکایت کو
کہیں کٹا ہوا سر بولتا ہے نیزے پر
کمالِ عشق نے طاقت ہے دی محبت کو

کوئی رقیب نگاہِ ہوس کا مجرم تھا
مگر سزا ملی پاکیزگیٔ الفت کو
نگاہ کیا ملی طوفان اٹھ گیا دل میں
چھپائے کس طرح تیر نظر قیامت کو
حیات اس کی ہے بد تر ممات سے ارشادؔ
جو حل نہ کرسکے محتاج کی ضرورت کو

(۳۷)

دل کی اجڑی ہوئی بستی کو بسا کر دیکھو
گریہ کرتے ہوئے انساں کو ہنسا کر دیکھو
درد دینے کا ہنر تم کو بہت آتا ہے
کیا علاجِ دلِ بے تاب ہے آکر دیکھو
کتنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ تبسم آجائے
راہِ حق میں ذرا دولت کو لٹا کر دیکھو
خوب مضبوط بنائے ہیں نشیمن ہم نے
تم کو ہمت ہے اگر برق جلا کر دیکھو
ظلم سے مختصر ہوجاتی ہے عمر انساں
راز سربستہ سے پردے کو اٹھا کر دیکھو
کیسے رہبر ہیں کہ منزل کا انھیں علم نہیں
کارواں بھٹکا ہے ارشادؔ کو لا کر دیکھو

(۳۸)

نہیں خاموش استقرارِ گریہ
پگھلتا ہے ابھی کہسارِ گریہ
تری سیدھی نظر ہے تیر لیکن

جو ترچھی ہو تو ہے تلوارِ گریہ
خموشی میں اگرچہ مضطرب ہے
مگر ہے تیزرو رہوارِ گریہ
ہیں تیرے قہقہے نمناک شاید
ترے اشعار ہیں دیوارِ گریہ
ترے قطرات جو آنکھوں سے ٹپکے
جواہر ہیں کہ ہیں شہکارِ گریہ
جب آنکھیں ڈبڈبا اٹھی ہیں ارشادؔ
سمندر ہیں کہ گوہر بارِ گریہ

(۳۹)

ہے خموشی خود بیاں کا آئنہ
بے زبانی ہے زباں کا آئنہ
سوز ہے برقِ تپاں کا آئنہ
جل نہ جائے اک جہاں کا آئنہ
ظلم سے گھٹ جاتی ہے عمر عزیز
موسمِ گل ہے خزاں کا آئنہ
کربلا کی ہے ضرورت آج بھی
موت ہے حفظان جاں کا آئنہ
ساری دنیا کی ہدایت کے لیے
لامکاں خود ہے مکاں کا آئنہ
پوشش اسود رہے گی حشر تک
کعبۂ دل کے نشاں کا آئنہ
سنگ اسود چومنا بدعت نہیں

یہ وطیرہ ہے جناں کا آئنہ
کتنے مہر و ماہ اس میں دفن ہیں
یہ زمیں ہے آسماں کا آئنہ
حسنِ ذاتی ہے ہدف ارشادؔ کا
ہے جو عشقِ جاوداں کا آئنہ

(۴۰)

نوجوانی کتاب میں گزری
شکرِ رب ہے ثواب میں گزری
درس سے عشق تھا زمانے میں
کچھ نہ کلفت شباب میں گزری
وقت ایسا بھی آگیا مجھ پر
زندگی تھی عذاب میں گزری
چھوٹے بچوں سے جب ملی فرصت
تب وہ اونچے نصاب میں گزری
کتنے نکتوں میں درس کی ساعت
بس سوال و جواب میں گزری
جب بھی اٹّھا مطالعے کے لیے
تیری صورت کتاب میں گزری
لمحہ لمحہ تلاشِ آب میں تھا
عمر ساری سراب میں گزری
زندگی تھی کہ اک کہانی تھی
محفل شیخ و شاب میں گزری
اب جو بیدار ہوں تو کیا حاصل

زندگی جب کہ خواب میں گزری
کربلا سے تھی مستعار حیات
ظالموں سے حساب میں گزری
یاد چھوڑی جو نسل نو کے لیے
وہ قیامت کے باب میں گزری
عمرِ آخر بھی تیری اے ارشادؔ
خوب درسِ کتاب میں گزری

(۴۱)

تری پلکیں کماں تیروں کے ڈھب کی
ہیں تیری نرگسی آنکھیں غضب کی
ترے ابرو ہلال عید جیسے
ترے رخسار پر نظریں ہیں سب کی
تمہارے ہونٹ پنکھڑیاں ہیں نازک
بجھے گی پیاس کیا اب تشنہ لب کی
ترا قد ہے قیامت کا نمونہ
قسم کھاکر کہا جاتا ہے رب کی
سوا تیرے کسے معلوم ہوگا
تمھاری ذات فتنہ گر ہے کب کی
تری زلفیں ہیں یا کالی گھٹائیں
کہیں بارش نہ ہوجائے غضب کی
کبھی محبوب کو کہتے ہیں ارشادؔ
غزل کی روح ہے، جاں ہے ادب کی

(۴۲)

خود کو بھلارہا تھا تری یاد آگئی

دل کو منارہا تھا، تری یاد آگئی
کہنے لگے صنم تجھے دنیائے حسن میں
لاحول پڑھ رہا تھا، تری یاد آگئی
کل رات چھت پہ چاندنی میں میر کی غزل
میں گنگنا رہا تھا، تری یاد آگئی
باد نسیم خوب چلی تھی کہ اک گلاب
خوشبو لٹا رہا تھا، تری یاد آگئی
اب تک شرابِ عشق سے مدہوش تھا مگر
کچھ ہوش آرہا تھا، تری یاد آگئی
سارے غموں کو بھول کے ارشادؔ روز عید
جب مسکرا رہا تھا، تری یاد آگئی

(۴۳)

کسی کی زلفِ معنبر سجارہا ہے کوئی
مشامِ جاں کو معطر بنارہا ہے کوئی
خزاں کا دور گیا آگئی چمن میں بہار
شعور و فکر کی خوشبو لٹارہا ہے کوئی
یقیں ہے جہل کی ظلمت کا خاتمہ ہوگا
جہاں میں علم کا سورج اگارہا ہے کوئی
یہ کیوں ہے پھول کی ڈالی پہ نغمہ زن بلبل
حضورِ یار میں اک گیت گارہا ہے کوئی
ہوا سے کہہ دو کہ اوقات میں رہے اپنی
ابھی چراغِ محبت جلارہا ہے کوئی
کسی کے لب پہ مسلسل دعا ہے بخشش کی

گلے پہ ظلم کے خنجر چلا رہا ہے کوئی
یہ حادثوں کی صدی ہے تو مان لو ارشادؔ
تمہارے پاس دبے پاؤں آ رہا ہے کوئی

(۴۴)

چھپ کے تنہائی میں رولیں کیسے
موتیاں اشک کی رولیں کیسے
درد فرقت میں کچھ قرار نہیں
داغِ دل اشکوں سے دھولیں کیسے
بات دل کی بتائیں ہم کس سے
چپ رہیں کیسے یا بولیں کیسے
یہ تغافل ہے ترا اک پیغام
راز کی بات ہے کھولیں کیسے
تم سے شکوہ نہیں ہے کچھ مجھ کو
آسماں سے مگر بولیں کیسے
پاس میرے نہیں کوئی میزان
تیرے الفاظ کو تولیں کیسے
ہے یہ تقدیر کا چکر ارشادؔ
نیند آتی نہیں سولیں کیسے

(۴۵)

وہ سبز باغ دکھاتا رہا زمانے سے
بچایا عزم نے مجھ کو فریب کھانے سے
زمانہ لاکھ ستائے مجھے بہانے سے
میں مسکراتا رہوں گا ہنسی اڑانے سے

مرا چراغ ہواؤں سے بجھ نہیں سکتا
تمام آندھیاں ہیں تھک گئی بجھانے سے
ہے بحرِ حق کی یہ مرضی کہ ایک قطرے کو
نہ روک پائے گا کوئی دوام پانے سے
یہ آشیانہ مری زندگی کا حاصل تھا
اسے جلایا گیا روشنی بجھانے سے
ہزار بار چلے ہیں ہوس کے تیر ارشادؔ
مگر تو خود کو بچاتا رہا نشانے سے

(۴۶)

موسم بہار کا جسے فصلِ خزاں لگے
تم ہی بتاؤ اس کا بھلا دل کہاں لگے
آنکھیں دھڑک رہی ہیں ترے انتظار میں
جو نقشِ پا ہے راہ میں تیرا نشاں لگے
آزاد ہم سمجھتے ہیں اب خود کو قید میں
خطرہ ہے اس طرح کا کہ ہم کو اماں لگے
ظلم و ستم کی چلتی ہیں اس طرح آندھیاں
ہر سمت ہم کو ریت کا بکھرا مکاں لگے
گلزار بس زمیں نہیں انساں کے خون سے
اوپر نظر اٹھاؤ تو سرخ آسماں لگے
ارشادؔ جب بھی سنتا ہے پُر درد واقعہ
کیوں اس کو اپنے درد کی ہی داستاں لگے

(۴۷)

اس نے اظہارِ محبت کیا پہلے پہلے

آشنا درد سے دل ہوگیا پہلے پہلے
زندگی تھی مری دریائے سکوں میں خاموش
سامنا ہوگیا طوفان کا پہلے پہلے
ایسی دیوانگی، خود کو نہ خبر تھی اپنی
اس کا بھی حال کچھ ایسا ہی تھا پہلے پہلے
کل تو دن رات جلا کرتے تھے یادوں کے چراغ
روز بھی مثلِ شبِ تار تھا پہلے پہلے
تیز آندھی کی طرح آکے گزرجاتا تھا وہ
میں چراغوں کو سنبھالے رہا پہلے پہلے
چند لمحوں کے لیے ہوتی ملاقات اگر
میں سمجھتا کہ سکوں مل گیا پہلے پہلے
وصل کیا چیز ہے معلوم نہیں ہو پایا
ہجر کا درد و الم دے دیا پہلے پہلے
آج کے وقت ہے کیوں گنگ زبانِ ارشادؔ
کل اگر بول نہیں پایا تھا پہلے پہلے

(۴۸)

گیسوئے پیچاں کے سارے خم گئے
زلف کے چھپتے ہی بادل تھم گئے
اُن کے تیرِ ظلم سے زخمِ جگر
اشکِ خوں بن کر مژہ پر جم گئے
تیرِ مژگاں کے نشانے سے کوئی
ہوگیا زخمی مگر مر، ہم گئے
جو رگِ گردن سے ہے زیادہ قریب

عشق ہو ایسا تو سارے غم گئے
آپ کے ارشادؔ پر سر جھک گیا
دل کے سب طوفان آخر تھم گئے

(۴۹)

ہزاروں عذر ہیں دنیا میں آدمی کے لیے
مگر نہیں ہے کوئی عذر کاہلی کے لیے
سمجھ رہا ہے وہ پانی کو بھی سرابِ نظر
ہمیشہ ٹھوکریں کھائی ہیں زندگی کے لیے
کسی کی رات اجالوں میں اب گزرتی ہے
تڑپ رہا ہے کوئی دن میں روشنی کے لیے
کسی کو نفس کی عزت کا ہے خیال اگر
بہانہ ڈھونڈتا ہے بھوک میں ہنسی کے لیے
زمانہ آئینہ دکھلا رہا ہے اس کو مگر
رگوں میں جوش نہ آیا کبھی کسی کے لیے
وہ ایک تنکا جو ٹکرا رہا ہے طوفاں سے
ابھارتا ہے وہ ارشادؔ کو خودی کے لیے

(۵۰)

اس کے رخ پر خال دکھائی دیتا ہے
وہ جی کا جنجال دکھائی دیتا ہے
رنگوں کی تبدیلی ایک معمہ ہے
زخم ہرا ہے لال دکھائی دیتا ہے
جکڑا ہو جو غربت کی زنجیروں میں
بچہ، کہنہ سال دکھائی دیتا ہے

محنت ہو تو ماضی کے آئینے میں
کتنا اچھا حال دکھائی دیتا ہے
جس نے ہم کو کی تھی پھنسانے کی کوشش
اس کے آگے جال دکھائی دیتا ہے
جو ہو شکاری مچھلی کا پیہم ارشادؔ
اس کو نرجا تال[۴] دکھائی دیتا ہے

(۵۱)

یہ کیسا سازشی دن آگیا ہے
کہ پردے میں بہت کچھ ہورہا ہے
ہماری غفلتوں کا ہے نتیجہ
کہ قاتل رو کے ہنستا جارہا ہے
جسے ناکامیوں کا خود یقیں تھا
وہ کیسے کامیابی پارہا ہے
ابھی تک جانور بکتے تھے لیکن
یہاں انسان بکتا جارہا ہے
ترے لب کے تبسم کا ہے صدقہ
کلی کو مسکرانا آگیا ہے
ترے رخسار کی خوشبو کے دم سے
گلوں کو اب مہکنا آگیا ہے
ضیائے کربلا کی ہے ضرورت
اندھیرا ظلم کا اب چھارہا ہے
کسی کو اپنی غفلت پر ہے افسوس
کوئی سازش کے نغمے گارہا ہے

کسی کی زلف بکھری ہوگی ارشادؔ
فضا میں کیوں اندھیرا چھا رہا ہے

(۵۲)

عشق کا اعتبار باقی ہے
کوئی جانِ بہار باقی ہے
بے خودی کی مری یہ حالت ہے
اپنا خود انتظار باقی ہے
ہجر کی دوریاں خدا کی پناہ
وصل کا انتظار باقی ہے
نہیں میری دوا مسیح کے پاس
ان کو بھی انتظار باقی ہے
غیب میں رہ کے کررہا ہے نظر
دین کا افتخار باقی ہے
لینا ہے انتقام خونِ حسین
عدل کا شاہکار باقی ہے
کیوں نہ قائم ہوں آج ارض و سما
چودھواں تاجدار باقی ہے
درد فرقت سہا نہیں جاتا
اب قیامت کا بار باقی ہے
کیسے دیدار ہو تجھے ارشادؔ
ساعت احتضار باقی ہے

☆☆☆

حواشی:

۱۔نوع منطق کی اصطلاح میں ایک کلی مفہوم ہے جو اپنے افرادِ کثیرہ پر یکساں طور پر صادق آتا ہے اور اپنی ماہیت میں ایک مشترک حقیقت رکھتا ہے۔یعنی یہ ایسی حقیقت ہے جس کے تحت آنے والی مختلف اشیا اپنی اصل میں ایک جیسی ہوتی ہیں، اگرچہ ان میں جزوی اختلافات پائے جائیں۔مثلاً 'انسان' ایک نوع ہے، کیوں کہ اس کے تمام افراد (زید، بکر وغیرہ) ایک ہی حقیقت یعنی انسانیت میں شریک ہیں۔نوع، جنس کے مقابلے میں زیادہ خاص ہوتی ہے اور فصل کے ذریعے اپنے سے اوپر والی جنس سے ممتاز کی جاتی ہے۔

۲۔ہیولیٰ فلسفہ کی اصطلاح میں اس اصل مادّہ کو کہا جاتا ہے جو بذاتِ خود بے صورت (بلا شکل) ہوتا ہے مگر مختلف صورتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ارسطو کے فلسفے میں اسے 'مادۂ اولیٰ' کہا جاتا ہے، جو ہر جسم کی بنیادی حقیقت ہے لیکن خود کسی خاص شکل یا صفت کے ساتھ متعین نہیں ہوتا۔

ہیولیٰ ہمیشہ 'صورت' کے ساتھ مل کر موجود ہوتا ہے، کیوں کہ محض ہیولیٰ کا خارج میں وجود ممکن نہیں۔ یعنی کسی بھی شے کی حقیقت مادہ (ہیولیٰ) اور صورت کے امتزاج سے بنتی ہے۔اس طرح ہیولیٰ امکان اور استعداد کی علامت ہے، جو مختلف صورتوں کے ذریعے فعلیت اختیار کرتا ہے۔

۳۔حیّز فلسفہ کی اصطلاح میں اُس جگہ یا مقام کو کہتے ہیں جس میں کوئی جسم موجود ہو یا قرار پکڑے۔یہ دراصل وہ ظرف یا اسپیس ہے جو کسی شے کو اپنے اندر سموئے رکھتا ہے۔متکلمین کے نزدیک حیّز وہ جگہ ہے جہاں جسم واقع ہوتا ہے، جب کہ بعض فلاسفہ اسے جسم کے ابعاد (طول، عرض، عمق) سے متعلق سمجھتے ہیں۔حیز کا تصور وجودِ جسمانی کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ ہر مادی شے کسی نہ کسی حیز میں ہی موجود ہوتی ہے۔

۴۔فتح پور نرجا تال، اتر پردیش کے ضلع مئو میں واقع ایک اہم مقام ہے جو پورہ معروف سے تقریباً ۶ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔یہ علاقہ گھوسی تحصیل اور کوپا گنج بلاک کے تحت آتا ہے اور پورواںچل کے جغرافیائی دائرے میں شامل ہے۔یہاں ایک مشہور تالاب نرجا تال کے نام سے ہے جس کے بارے میں مقامی روایت ہے کہ اس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا، اسی وجہ سے یہ مقام خاص اہمیت رکھتا ہے۔گاؤں میں بنیادی سہولیات موجود ہیں۔یہ بستی اپنی سادہ دیہی ساخت اور مقامی تاریخی روایت کے باعث پہچانی جاتی ہے۔

☆☆☆

رباعیات

[۱]

دل تھا جو کبھی مہر و وفا کا گھر تھا
ہر شخص یہاں آئینۂ منظر تھا
اب خود ہی حوادث میں گھرا بیٹھا ہے
یہ شہر کبھی امن کا اِک پیکر تھا

[۲]

اے مومنو! وہ بارگہِ کرب و بلا
ہر وقت جہاں گونجتی ہے حق کی صدا
باطل کے اندھیرے میں اجالا بن کر
تھے صبر کے پیکر وہ امام شہدا

[۳]

دن رات ہمیں طعنۂ دنیا بھی ملا
ہر موڑ پہ الزام کا دریا بھی ملا
ہم نے مگر آئینۂ حق تھاما تھا
کانٹوں میں سہی، راہ کا سایہ بھی ملا

[۴]

جو ٹوٹ کے بکھرا وہی تعمیر ہوا
ہر زخم مرے واسطے تنویر ہوا
اک لمحۂ ادراک سے عقدہ یہ کھلا
پردہ جو تھا ہستی کا وہ تعبیر ہوا

[۵]

فن جس میں نہ سوزِ دلِ بیدار رہا
وہ حرف فقط دفترِ اغیار رہا
تخلیق خلوص سے جو عاری ٹھہری
بےسود ہوئی اور نہ معیار رہا

[۶]

ٹھکرا کے زمانے نے جنھیں چھوڑ دیا
حالات کی آندھی نے جنھیں موڑ دیا
وہ لوگ الٹ دیتے ہیں تختِ شاہی
جن ہاتھوں کو کل وقت نے تھا توڑ دیا

[۷]

رہتی دل مومن میں ہے اس طرح وفا
جیسے چمنستان میں ہو بادِ صبا
قرآں ہے جہاں نقطۂ با کے اندر
یوں اشک کے قطرے میں ہے محفوظ دعا

[۸]

سڑکوں پہ ہے لوگوں کی قطارِ غربت
ہر سمت ہے موجود شعارِ غربت
بہرے جو ہیں مسند نشیں ایوانوں میں
سن سکتے نہیں حالِ زارِ غربت

[۹]

مت دو اسے اتنی بھی فراوانی دوست
بڑھ جائے نہ سر پر کہیں نادانی دوست

دولت کی ہوا جب بھی چلی ہے سر پر
اُڑ جاتا ہے پھر عقل کا بھی پانی دوست

[۱۰]

اب اہلِ نظر کم ہیں زمانے میں بہت
ہر سو ہے ہنر، پر نہیں معنی کی جہت
وہ شعر ہی زندہ ہے قیامت تک جو
انسان کو دے فکر و عمل کی قوت

[۱۱]

چہرے پہ تھکن، آنکھ میں اندوہ بہت
سینے میں مگر حوصلۂ کوہ بہت
مفلس کی دعاؤں کو نہ سمجھو کم تر
ان ہاتھوں میں پوشیدہ ہے شکوہ بہت

[۱۲]

بستی میں دھواں آنکھ میں پانی کی طرح
پھیلاؤ ہے غربت کا کہانی کی طرح
چپ رہ کے گزر جاؤں یہ ممکن تو نہیں
جلتا ہوں میں خود شمع فغانی کی طرح

[۱۳]

اے اہلِ وفا، بنتِ نبیؐ کا دلدار
میدانِ بلا میں ہے سراپا ایثار
کل ریگِ تپاں پر کر کے سجدہ ادا
سر دے کے بچائے گا وہ دینِ سرکارؐ

[۱۴]

اے قومِ محمدؐ یہ گھڑی ہے دشوار
ہر سمت سے شبیر پہ باطل کا ہے وار
پانی بھی میسر نہیں ان کو لوگوں
دریا بھی کھڑا دیکھ رہا ہے بےزار

[۱۵]

شبیر ہے میزانِ وفا کا معیار
ہر دور میں زندہ ہے اسی کا کردار
کٹ جائے گا سر، جھک نہیں سکتا ہرگز
باطل کے مقابل ہے وہ مثلِ کہسار

[۱۶]

طوفان سے آنکھیں نہ چرا بیٹھیں ہم
سچائی کی مشعل نہ بجھا بیٹھیں ہم
زنجیر اگر پاؤں میں آ بھی جائے
پرواز کا جذبہ نہ مٹا بیٹھیں ہم

[۱۷]

ہر شخص نہیں درد کا ہمراز یہاں
کم آئے نظر ہمدم و دمساز یہاں
کچھ لوگ تو آنکھوں میں چھپا رکھتے ہیں
احساس کی صورت میں ہر راز یہاں

[۱۸]

وہ شعر کہو جس میں صداقت ہو نہاں
ہر مصرع میں ہو فکر کی تاثیر رواں
الفاظ نہ ہوں صرف ہنر کی تشہیر

خود روحِ معانی سے مزین ہو بیاں

[۱۹]

دیوار کے سائے کو گماں کہتے ہیں
ہم قید میں رہ کے بھی اذاں کہتے ہیں
جو لوگ صداقت پہ مٹادیں خود کو
انسان انھیں اہلِ زباں کہتے ہیں

[۲۰]

بے خوف و خطر حق کا بیاں دیتے ہیں
ہم دار پہ بھی سچ کی اذاں دیتے ہیں
جو ظلم کے ایوان ہلانے نکلیں
وہ تیغ کو بھی حق کی زباں دیتے ہیں

[۲۱]

جو وقت ملا اُس کو غنیمت سمجھو
ہر سانس کو سرمایۂ رحمت سمجھو
دنیا کی یہ رونق ہے فقط اک لمحہ
کل خاک میں ملنا ہے، حقیقت سمجھو

[۲۲]

خطرہ ہو تو ہو، عزم جواں رہنے دو
ہر زخم کو سینے میں نہاں رہنے دو
یہ روشنی آخر کو عیاں ہوگی کبھی
کچھ دیر ابھی پردۂ جاں رہنے دو

[۲۳]

مقتل کی صداؤں کو دباتے کیوں ہو

پیغامِ شہادت کو بھلاتے کیوں ہو
اک قطرۂ خوں جس نے بدل دی تقدیر
اس راز کو لوگوں سے چھپاتے کیوں ہو

[۲۴]

ہر ذرّہ میں ہے رازِ نہاں پوشیدہ
ہر رنگ میں صد نقشِ گماں پوشیدہ
یہ دہر بظاہر تو ہے خاموش مگر
ہر سنگ میں ہے شورِ رواں پوشیدہ

[۲۵]

ہر دور میں اک کربلا باقی ہے ابھی
ہر دل میں کوئی نینوا باقی ہے ابھی
باطل کے محل لاکھ سجا لو تم لوگ
اہلِ حق کا حوصلہ باقی ہے ابھی

[۲۶]

شمشیر کے سائے میں اذاں بولی تھی
ریتوں پہ بھی تکبیرِ جواں بولی تھی
سوچو تو ذرا دشتِ بلا کی مٹی
انسان کے لہجے میں کہاں بولی تھی

[۲۷]

الفت کے چراغوں کو ہوا کس نے دی
نفرت کی صداؤں کو ہوا کس نے دی
وہ بستی جو روشن تھی کبھی خوابوں سے
آج اس کو شرربار فضا کس نے دی

[۲۸]

رہتی نہیں طاقت نہ جوانی باقی
تا عمر نہ شوخی نہ روانی باقی
سب رنگ اتر جاتے ہیں وقت آنے پر
رہتی ہے فقط نیک نشانی باقی

[۲۹]

دشمن کے لیے برقِ گراں بار علی
مومن کے لیے سایۂ دیوار علی
علم و عمل و حلم کا پیکر ایسا
ہر دور میں ہے حق کا علمدار علی

[۳۰]

توحید کی تفسیر کا عنوان علی
ایمان کی تکمیل کا سامان علی
کعبہ بھی جھکا جس کے ولادت پہ کبھی
اسلام کی تقدیر کا ارمان علی

[۳۱]

مشکل میں پکارو تو سہارا ہے علی
ڈوبی ہوئی کشتی کا کنارا ہے علی
عدل اس کا ہے دستورِ حیاتِ عالم
انصاف کی دنیا کا ستارا ہے علی

[۳۲]

ہر ضرب میں اخلاص کی خوشبو ہے علی
ہر صبر میں تسلیم کا جادو ہے علی

محراب میں سجدہ ہو کہ میدانِ جہاد
ہر روپ میں بس حق کا ترازو ہے علی

[۳۳]

کر یوں نہ تکبّر کہ بکھرنا ہے تجھے
جانا ہے سبھی چھوڑ کے مرنا ہے تجھے
یہ رُتبہ و منصب سب امانت ہیں فقط
اک روز سبھی چھوڑ کے جانا ہے تجھے

[۳۴]

پیاسا تھا مگر سر نہ جھکایا اس نے
حق بول کے باطل کو ابھارا اس نے
اک سجدہ جو تاریخ میں زندہ ٹھہرا
اس سجدے سے انساں کو سنوارا اس نے؟

[۳۵]

چہرے پہ شرافت کا نقاب اچھا ہے
باطن میں ہو گر صدق کا خواب اچھا ہے
الفاظ سے کردار نہیں بنتے ہیں
کردار ہو روشن تو خطاب اچھا ہے

[۳۶]

شبیر کے خیموں میں سکوتِ غم ہے
ہر آنکھ میں اشکوں کا رواں زمزم ہے
کل خون سے سینچے گا وہی دشتِ بلا
اسلام کی خاطر یہ عجب عالم ہے

[۳۷]

ویرانۂ دل میں ہے تجلّی کا سماں
ہر ذرّہ مرے ظرف کا اک بحرِ رواں
میں خاک سہی، خاک میں پوشیدہ ہوں گر
ہے رازِ فنا اصل میں آئینۂ جاں

[۳۸]

ہر سمت عجب شورِ قیامت کیوں ہے
انصاف بھی اب قیدِ سیاست کیوں ہے
کل تک جو چراغوں کی حفاظت میں تھی
اب آج ہوا میں یہ شرارت کیوں ہے

[۳۹]

محنت کی کمائی بھی لٹی جاتی ہے
امید کی بھی شمع بجھی جاتی ہے
یہ کیسا نظامِ زر و زور و تزویر
انسان کی قیمت بھی گھٹی جاتی ہے

[۴۰]

عباس کی آنکھوں میں وفا بولی ہے
زینب کی زباں سے بھی حیا بولی ہے
کربل کی زمیں آج بھی کہتی ہے یہی
ہر عہد میں حق کی ہی صدا بولی ہے

☆☆☆

مناقب

درمنقبت حضرت علی (ع)

(۱)

اگر حالات زیادہ پر خطر ہیں
تو پھر خطبے علی کے پر اثر ہیں
شب ہجرت نبی کی جاں بچائی
ابوطالب کے یہ نورِ نظر ہیں
کوئی غزوہ ہو یا کوئی سریّہ
علی ہر حال میں دیں کی سپر ہیں
جو حکمت چاہیے تو در پہ آؤ
علی در ہیں نبی حکمت کا گھر ہیں
علی اس طرح ہیں دوشِ نبی پر
کہ جیسے پاؤں ان کے عرش پر ہیں
غدیر خم کا منظر دیکھ لیجے
علی کیسے نبی کے ہاتھ پر ہیں
کوئی بھولے نہ ارشادِ پیمبر
میں شہر علم، حیدر میرا در ہیں

(۲)

جو بابِ علم سے کچھ انتساب رکھتے ہیں
وہ سوئے دار بھی جانے کا خواب رکھتے ہیں
جو عشقِ نامِ علی کی کتاب رکھتے ہیں

وہ زندگی کا مکمل نصاب رکھتے ہیں
کسے پتہ نہیں ہر مسئلے کا حل ہیں علی
زباں پہ بارہا ''لولا'' جناب رکھتے ہیں
لبوں کو دے کے جو مدحِ علی کی سوغاتیں
ہم اپنے لہجے کو معراج یاب رکھتے ہیں
نشہ ہے حبّ علی کا بہک نہیں سکتے
ہم اپنے جام میں پختہ شراب رکھتے ہیں
زبان کٹ کے بھی جاری رہے ثنائے علی
فرازِ دار سے اک انقلاب رکھتے ہیں
اسی کے نام کا سکہ رواں ہے دنیا میں
نبی کا ایسا وصی لاجواب رکھتے ہیں
غدیر خم کا وہ منبر صدائے ''من کنت''
خلافتوں کا علی آفتاب رکھتے ہیں
وہ ذوالعشیرہ ہو، جنگ تبوک یا ہجرت
ہر اک جگہ سے علی انتخاب رکھتے ہیں
ہماری ماں کی ہے آغوشِ تربیت کا اثر
دلوں میں حب علی بے حساب رکھتے ہیں
علی سے بغض ہے کفر و نفاق اے ارشادؔ
یہ خود سے پوچھیے کیا دل میں آپ رکھتے ہیں

(۳)

حرم میں جب بتوں کو توڑنے سرکارؐ آئے ہیں
علی بھی زیبِ دوشِ احمد مختار آئے ہیں
قضیہ حل نہ ہو تو خود ہلاکت سے بچانے کو

علی کے پاس دوڑے صاحبِ دستار آئے ہیں
کبھی خطرہ ہوا اسلام کو دیں کی سپر بن کر
علی ہی شہسوارِ مرکبِ کردار آئے ہیں
جو چادر تان کر سوئے ہیں تلواروں کے سائے میں
پیمبر کی حفاظت کے ضمانت دار آئے ہیں
مبارز جب طلب کرتا تھا کلِّ کفر خندق میں
مقابل کلِّ ایماں بر سرِ پیکار آئے ہیں
پرانا در مقفل ہے ولادت طے ہے کعبے میں
نئے در سے حرم میں حیدرِ کرار آئے ہیں
اگر ارشادؔ تجھ کو حوصلہ ہے دار کا کہہ دو
محبّانِ علی میں میثمِ تمّار آئے ہیں

(۴)

محفل میں جام حب علی ہے رواں ابھی
جاری رہے گا دور شراب زباں ابھی
عمروبن عبدوُد کو مبارز کی ہے تلاش
کتنے جری ہیں فوج میں پیر و جواں ابھی
کہتے ہیں بار بار نبی کون جائے گا
اسلام ہے زباں پہ تو کچھ ہے نہاں ابھی
اسلام مررہا تھا بچائی ہے کس نے جاں
کیوں قابل بیاں نہیں، اس کا بیاں ابھی
مخفی نہیں کسی سے کہ خیبر میں کیا ہوا
رہتی ہے اس کے ذکر سے کیوں چپ زباں ابھی
آغازِ ذوالعشیرہ سے اکمالِ دین تک

دیکھو کہ کیا چلے ہیں قلم اور زباں ابھی
جس نے بھی مدح کا کوئی گوشہ چھپا لیا
نارِ سقر میں بن گیا اس کا مکاں ابھی
عرصہ ہوا حرم میں ولادت کو آپ کی
باقی ہے کیوں جدار میں در کا نشاں ابھی
بغضِ علی تو کفر بھی ہے اور نفاق بھی
ارشادؔ ہے رسول کا سب پر عیاں ابھی

(۵)

اہلِ ایمان کے دل میں ہے محبت ان کی
جو منافق ہیں وہ رکھتے ہیں عداوت ان کی
گر علی نہ ہوں تو اقرار ہلاکت ہے انھیں
کس قدر عدل پہ مبنی ہے قضاوت ان کی
جن کے مولا ہیں نبی ان کے علی ہیں مولا
خم کے میدان سے ثابت ہے خلافت ان کی
جنگ خیبر ہو کہ خندق ہو کہ ہوں بدر و احد
دیکھ لی دیکھنے والوں نے شجاعت ان کی
ایک ہی در سے جو سائل کو کرے مستغنی
سچ ہے حاتم سے بھی بڑھ کر ہے سخاوت ان کی
بن گیا بنت اسد کے لیے دیوار میں در
رب کو منظور ہے کعبے میں ولادت ان کی
گر ہوں اشجار قلم اور سیاہی دریا
پھر بھی تحریر سے باہر ہے فضیلت ان کی

کیوں نہ ہو مدحِ علی شغل ترا اے ارشادؔ
جب کی قرآن کے سوروں میں ہے مدحت ان کی

☆☆☆

درمنقبت حضرت فاطمہ زہرا (ع)

(۱)

تری ثنا ہو ادا یہ محال ہے زہرا
کرے جو دعویٰ یہ کس کی مجال ہے زہرا
عظیم مرتبہ تیرا حقیر فکر مری
میں کیسے مدح کروں یہ سوال ہے زہرا
نبی کی ذات ہے سارے جہان کی رحمت
نبی کی آپ ہیں رحمت کمال ہے زہرا
لقب جو ام ابیہا کا مل گیا تم کو
ترے کرم سے رسالت بحال ہے زہرا
تری فضیلتوں کی حد و انتہا نہ رہی
کہاں زمانے میں تیری مثال ہے زہرا
کھڑے جو ہوتے تھے تعظیم کو رسولِ کریم
عمل یہ جزوِ رسالت پہ دال ہے زہرا
ترے فدک کا یہ صدقہ ہے بعد پیغمبر
عرب کے پاس جو مال و منال ہے زہرا
ہو دور ضعفِ رسالت کسائے یمنی سے
تمھاری ایک ردا کا یہ حال ہے زہرا
رسول اس کی شفاعت میں کیا کریں ارشادؔ
نہ جس سے آپ ہوں راضی، محال ہے زہرا

(۲)

کوئی کیا جانے درجہ فاطمہ کا
ہے قرآں میں قصیدہ فاطمہ کا
اسے ہیں عرش سے لائے پیمبر
بہت اونچا ہے رتبہ فاطمہ کا
نبی کی ذات رحمت کل جہاں کی
ہے رحمت ان کی جلوہ فاطمہ کا
پے تعظیم اٹھ جاتے ہیں مرسل
اگر ہوتا ہے دورہ فاطمہ کا
نبی کی نسل پھیلی ہے اسی سے
یہ کوثر ہے کہ سورہ فاطمہ کا
ہیں مریم شعبۂ نسواں میں افضل
مگر اعلیٰ ہے رتبہ فاطمہ کا
لقب امّ ابیہا کا ملا ہے
پدر سے کیا ہے رشتہ فاطمہ کا
سرِ دربار مانگا ہے فدک کو
ذرا دیکھو تو دیدہ فاطمہ کا
ہٹائے گی اگر دنیا یہ دعویٰ
ہٹے گا کیسے خطبہ فاطمہ کا
گرانے والے گرجائیں گے ارشادؔ
بنے گا خوب روضہ فاطمہ کا

(۳)

دیکھ کر جنت کے اوپر اختیارِ فاطمہ

کل خواتینِ بہشتی ہیں نثارِ فاطمہ
گھر پہ رضوانِ جناں خیاط بن کر آ گیا
صدق کی تصدیق ہے یا اقتدارِ فاطمہ
نذر مانی تین روزوں کی خدا کے واسطے
دہر کا سورہ ہوا نازل بکارِ فاطمہ
مرسلِ اعظم کھڑے ہوجاتے ہیں تعظیم کو
منصبِ جزوِ رسالت ہے وقارِ فاطمہ
راہبوں کی ہار تھی پر نور چہروں کے سبب
صورتِ ''ابنائنا'' ہیں شاہکارِ فاطمہ
حشر میں کیا منھ دکھائے گا رسولِ پاک کو
وہ سقی جس نے کیا در سے فشارِ فاطمہ
در حقیقت طعنۂ ابتر کا ہے بن کر جواب
آئی گلزارِ خدیجہ میں بہارِ فاطمہ
پنجتن جب آتے ہیں ارشادؔ چادر کے تلے
آیتِ تطہیر بنتی ہے حصارِ فاطمہ

☆☆☆

در مدحِ امام حسن (ع)

(۱)

درِ حسن پہ جو سائل سوال کرتا ہے
وہ فیضِ علم سے محکم جواب پاتا ہے
حسن کا خلق ہے خلقِ نبی کا آئینہ
عدو جو آئے فداکار بن کے جاتا ہے
فضائیں کیوں نہ معطر ہوں مشک و عنبر سے

چمن میں فاطمہ کے آج پھول کھلتا ہے
حَسَن ہے حسن میں جب ہم شبیہِ پیغمبر
تو حسنِ خُلق میں لاریب ان کے جیسا ہے
زمانہ ہوگیا، صدیاں گزرگئیں لیکن
جہاں میں آج بھی خلقِ حسن کا چرچا ہے
یہ ایک صلح ہے بیعت نہیں ہے حاکم کی
حسن کے سارے شرائط کو اس نے مانا ہے
جناں میں سید و سردار ہے جوانوں کا
رسولِ حق کا یہ ارشاد کتنا سچا ہے

(۲)

ساقی مئے ولائے حسن کا یہ جام ہے
پی لے جو خام طبع تو وہ پختہ کام ہے
خُلقِ رسول کا ہے مکمل یہ آئینہ
جاری جو اس کے نام کا سکہ مدام ہے
صلحِ حدیبیہ کو ہے صلح حسن پہ ناز
یہ صلح ہے کہ امن جہاں کا پیام ہے
تاریخ کررہا ہے رقم وقت کا امام
دنیا سمجھ رہی ہے حسن بے حسام ہے
صفین کہہ چکی ہے شجاعت کو مرحبا
حیدر کا لال شیرِ خدائے انام ہے
ہے دین و اہلِ دیں کی حفاظت کا مرحلہ
اے شام! دیکھ ورنہ سحر بے نیام ہے
ظلمت کو خوف تھا کہ کہیں نور چل پڑے

ظاہر میں شرط حق کا کیا احترام ہے
دنیا ہے تیرا قصد امامت مرا ہدف
بتلا کہ کس کے ہاتھ میں دیں کی لگام ہے
ارشادؔ اس پہ سارے جہاں کا ہے اتفاق
شاہی سے میکدہ تو خلافت کا جام ہے

☆☆☆

منقبت امام حسین (ع)

(۱)

معطر ہے فضا خوشبو سے موسم کی جوانی ہے
بہاریں جھوم اٹھی ہیں چمن میں شادمانی ہے
فرشتے آسماں سے آتے ہیں جشنِ مسرت میں
زمیں پر آج سردارِ جناں کی مدح خوانی ہے
نبی کے بعد نفس مطمئنہ کا لقب پایا
خدا کے حکم سے یہ ذکر ہاتف کی زبانی ہے
ملے فطرس کو بال و پر جو گہوارے سے مس ہوکر
اڑا کہہ کر، حسین ابنِ علی کی مہربانی ہے
نہیں کی ایک ٹھوکر سے گرایا قصر باطل کو
یہی انکارِ بیعت کی حقیقی ترجمانی ہے
کبھی روکے نہ رک سکتا ہے ذکر سبط پیغمبر
زمانہ جانتا ہے ذکر سرور جاودانی ہے
حسین ابن علی مجھ سے ہے اس سے ہوں میں بے شبہہ
یہ ارشادِ پیمبر اصل میں بحر معانی ہے

(۲)

کوئی کیا جانے کہ کس شان کا انساں ہے حسین
آسمانِ تقویٰ، کعبۂ ایماں ہے حسین
جن کے صدقے میں ہوئی سارے جہاں کی تخلیق
پانچوں انوار میں اک نورِ درخشاں ہے حسین
ہیں نبی سجدے میں اور پشت پہ سجدے کا وقار
زیرِ خنجر جو کرے سجدۂ سبحاں ہے حسین
حر کو جنّت دی، عطا کردیا پَر فطرس کو
جس کو جو چاہیے ویسا ترا احساں ہے حسین
جب ضرورت ہوئی اسلام کو خوں دینے کی
یہ بہتر نہیں، سو جان سے قرباں ہیں حسین
خون سے جس نے کیا گلشن دیں کو سیراب
تشنہ لب دے دیا سر ایسا نگہباں ہے حسین
نوک نیزہ پہ تلاوت ہے کلام رب کی
سچ ہے ارشادؔ یہ خود بولتا قرآں ہے حسین

☆☆☆

منقبت جناب علی اکبر (ع)

حضر ہو یا سفر وہ دین کا عنوان رکھے گا
مدینے کا مسافر کربلا کی آن رکھے گا
اگر اکبر اذاں نہ دیں سوالِ فجر اٹھ جائے
بلا کے دشت میں کچھ تو عجب ذیشان رکھے گا
فدا ہو گر زلیخائے جہاں اس پر تو حیرت کیا
یہ شکلِ افتخارِ یوسفِ کنعان رکھے گا

اسے خود حق کی جانب کھینچ لے گی صبحِ عاشورہ
سپاہِ شام میں کوئی اگر ایمان رکھے گا
عطش ایسی کہ خود پانی بھرے نہر فرات آ کر
سمندر پیاس کا خشکی میں اک مہمان رکھے گا
ستم کی فوج میں اک آنسوؤں کا سیل اُمڈے گا
پدر جب طفلِ تشنہ کو سرِ میدان رکھے گا
بلا کے دشت میں دے کر اذانِ صبحِ عاشورہ
''علی اکبر زبانِ مصطفیٰ کی جان رکھے گا''
حبش کے اک موذن نے مدینے کو شرف بخشا
مدینے کا موذّن کربلا کی شان رکھے گا
اگر ارشادؔ تجھ میں شاعری کی کچھ بھی شدبد ہے
غزل کو چھوڑ کر تو منقبت پہچان رکھے گا

☆☆☆

درمنقبت امام زین العابدین (ع)

(۱)

ترا صحیفہ ہے اک مخزنِ دعا سجاد
جو بارگاہِ خدا میں ہے التجا سجاد
غرور تھا بہت شیطان کو عبادت پر
ترے سجود کو دیکھا تو کی ثنا سجاد
جلا رہے تھے تو خیموں کو آگ کے شعلے
مگر جلی ہوئی بیعت کی تھی چتا سجاد
اذاں دلائی تھی خطبے کو روکنے کے لیے
مگر وہی بنی تبلیغ کی بنا سجاد

سنارہی تھی جہاں کو سکوتِ زنداں میں
پیامِ حریت زنجیر کی صدا سجاد
خوشی کی بزم میں شرکت نہیں کریں گے امام
شریک ہوں گے جو ہو مجلسِ عزا سجاد
میں اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں گا ارشادؔ
ملے نصیب سے جو تیری گردِ پا سجاد

(۲)

شام کے دربار میں خطبہ دیا سجاد نے
پتھروں کے دل کو بھی پگھلا دیا سجاد نے
کربلا میں لاش بیعت کی سلگتی رہ گئی
شام میں قصرِ یزیدی ڈھادیا سجاد نے
رب نے **زینُ** العابدیں کا دے دیا ان کو لقب
دیں کو جب اخلاص کا سجدہ دیا سجاد نے
سجدے میں ابلیس انگوٹھا چباتا رہ گیا
حس کو محویت کا ہے تحفہ دیا سجاد نے
معجزہ ہے ان کے ہونٹوں کا کہ گویا ہوگیا
سنگِ اسود کو جو اک بوسہ دیا سجاد نے
اشکِ غم جب ہوگئے گوہر تو کچھ حیرت نہیں
ہاتھ کے دھوون کو تو ہیرا دیا سجاد نے
حشر تک قائم امامت کا رہے گا سلسلہ
صورتِ باقر نمائندہ دیا سجاد نے
مدح میں ان کی ہے اب رطبُ اللساں ارشادؔ بھی
شاعری کا جب اسے دیدہ دیا سجاد نے

☆☆☆

منقبت امام باقر (ع)

(۱)

جو قسمت سے تمہارے در کو پالے حضرت باقر
اسے مل جائیں حکمت کے اجالے حضرت باقر
پیمبر نے سلامِ ناز کہلایا تھا جابر سے
صحابی ہے گلے اس کو لگالے حضرت باقر
یہ میرا پانچواں نائب ہے، نام اس کا محمد ہے
نہ کیوں علموں کی یہ بنیاد ڈالے حضرت باقر
ہلوں سے بیل جیسے چیڑتا ہے سخت کھیتوں کو
یہ پیچیدہ مسائل کو نکالے حضرت باقر
کبھی نہ نعمت دنیا کی خواہش کی زمانے میں
جو جی چاہے وہ جنت سے منگالے حضرت باقر
مسلمانوں کو گر درپیش پیچیدہ مسائل ہوں
تو پھر وہ دین کی عزت بچالے حضرت باقر
محمد نام ہے تیرا یہ ارشادِ پیمبر ہے
عنانِ دین ہے تیرے حوالے حضرت باقر

(۲)

رحمتِ رب کی زمانے میں فراوانی ہے
گلشنِ دہر میں خوشبو کہ یہ طغیانی ہے
آج ہے فاطمہ کے گھر میں گل تر آیا
پوتا شبیر کا سجاد کا وہ جانی ہے
یہ محمد ہے خدا نے اسے سب علم دیا
علم کی حد تو کسی نے نہ کبھی جانی ہے

جو بھی ہوں علم سے محروم وہ سب مردہ ہیں
دولتِ علم عطا ہو جسے لافانی ہے
پڑھ کے اس سے ہوئے ہیں کتنے امامانِ جہاں
مدرسہ آپ کا تعلیم میں لافانی ہے
اس گھرانے کے سبھی لوگ محمد ہیں مگر
آج کے جشن میں باقر کی ثناخوانی ہے
ہے فضیلت کے بیاں کرنے سے عاجز ارشادؔ
کیوں کہ ہر قول و عمل آپ کا قرآنی ہے

☆☆☆

امام جعفر صادق (ع)

(۱)

حصول علم کی گر ہو ضرورت حضرت صادق
تمھارے در کی ہے محتاج خلقت حضرت صادق
تمھارے جامعہ میں آتے تھے اطرافِ عالم سے
ہزاروں طالبانِ علم و حکمت حضرت صادق
ادارہ ہے یہ صفّہ کی ترقی یافتہ صورت
خدا کا فضل ہے، تیری عنایت حضرت صادق
حدیث و فقہ ہوں تفسیر ہو کہ علمِ عقلی ہو
سبھی حاصل ہوئے تیری بدولت حضرت صادق
نبی کی طرح ان کے صدق کا سکہ ہوا جاری
یقیناً ہیں شہنشاہِ صداقت حضرت صادق
ہمارے فقہ کو کہتی ہے فقہ جعفری دنیا
عدیم المثل تھی تیری فقاہت حضرت صادق

ترا ارشادؔ ہے جو روئے شاہِ دیں کی مجلس میں
بلاشبہہ وہ ہے حقدارِ جنّت حضرت صادق

(۲)

مل جائے زندگی جو ہو ایما مرے لیے
ٹھوکر ہے آپ کی دمِ عیسیٰ مرے لیے
ہے عین حسن ملت بیضا کی رہبری
آساں نہیں ہے عشق کا سودا مرے لیے
قرآن جب ہے جعفر صادق کی زندگی
ہے پیروی نجات کا زینہ مرے لیے
مرکز ہے جامعہ ترا جملہ علوم کا
جس کا وجود نازشِ صفّہ مرے لیے
کتنے امام آپ کے شاگرد ہوگئے
کچھ روئے التفات ہو مولا مرے لیے
سچ ہے جو تیرے فقہ کو حبلُ المتیں کہوں
یہ علم ہے جناں کا وسیلہ مرے لیے
سر کے عروج کے لیے ہادی ہے راہ میں
تیرے قدم کی خاک کا ذرہ مرے لیے
تیرے سبب جو صدق کو معراج مل گئی
تیرا مقام عرشِ معلیٰ مرے لیے
قرآن و اہلِ بیت ہمیشہ ہیں ساتھ ساتھ
ہے حکمِ رب مودت قربیٰ مرے لیے
الفت کا بیج ہے مرے دل کی زمین میں
ہیں اہل بیت سدرۂ طوبیٰ مرے لیے

تنویر ہے امام و نبی کے مزاج میں
کافی ہے صادقین کا جلوہ مرے لیے
پیکر مرا خطاؤں سے ملبوس ہے خدا
اے کاش اب لباس ہو تقویٰ مرے لیے
ارشادؔ کتنے صاحبِ دیواں ہیں راہ میں
منزل رساں ہے ایک قصیدہ مرے لیے

☆☆☆

امام موسیٰ کاظم (ع)

(۱)

فلک نے تم پہ کتنے ظلم ڈھائے حضرت کاظم
مگر نہ حرفِ شکوہ لب پہ لائے حضرت کاظم
مسلسل ''کاظمین الغیظ'' ہے وردِ زباں ان کے
غموں کی دھوپ میں بھی مسکرائے حضرت کاظم
نسب تیرا ہے اعلیٰ کس قدر کردار ہے روشن
زمانے بھر پہ چھائے تیرے سائے حضرت کاظم
خدا جانے کہ کب تک قید خانے کی مشقت سے
اندھیرے میں چراغ دل جلائے حضرت کاظم
جو عورت آپ کے بہکانے کو زنداں میں آئی تھی
اسے بھی راہ حق پر کھینچ لائے حضرت کاظم
ترے کردار کی عظمت کا صدقہ ہے مرے مولا
کہ اب اشراف بھی زنداں میں آئے حضرت کاظم
ہے ارشادِ نبی لاریب کہ ہم سب محمد ہیں
کہاں ناچیز سے ہوگی ثنائے حضرت کاظم

(۲)

آج کیوں دہر میں رحمت کی گھٹا چھائی ہے
بول اے بادِ صبا کوئی خبر لائی ہے
کیسی مےخانے میں یہ دھوم مچی ہے ساقی
مست کیا ہیں، نظرِ رند بھی للچائی ہے
خانۂ جعفر صادق میں ہے موسیٰ کا ورود
کہہ دو فرعونِ زمانہ سے قضا آئی ہے
ظلم کی قید سے ہوجائے بغاوت نہ کہیں
جلد کردے رہا اس میں تری اچھائی ہے
اک یہودیہ ہے بھیجی گئی بہکانے کو
دیکھ لے اب وہی اسلام کی شیدائی ہے
نام موسیٰ کا ملا اور لقب ہے کاظم
ساتھ ہیبت کے وہ مصداقِ شکیبائی ہے
آتے ہیں بن کے گدا در پہ سلاطین جہاں
ابنِ مریم کی بھی اس در پہ مسیحائی ہے
یہ بلندی کی ملک کرتے ہیں روضے کا طواف
رفعتِ مدح تو ارشادؔ نے بھی پائی ہے

☆☆☆

امام رضا (ع)

(۱)

ہزاروں مسلمان روضے پہ آکے
طوافِ عقیدت کریں سر جھکاکے
ہے بچپن میں بھی علم کا رعب اتنا

حکومت چلی در پہ شاہِ ہدا کے
کوئی دعوئے علم جتنا بھی کرلے
برابر نہیں نقشِ پائے رضا کے
جو نکلا ہے گھر سے ضمانت میں تیری
مسافر وہ ہے امن میں اب خدا کے
ہوا شیرِ قالین زندہ حقیقت
اشارے ملے تھے جو حکمِ رضا کے
ضرورت پڑی گر ولایت کی دیں کو
حکومت بھی کی دینِ حق کو بچاکے
فضائل سمندر ہیں ارشادؔ قطرہ
کھڑا ہے وہ ساحل پہ تیری ثنا کے

(۲)

پسپا پہ آج ظلم، ولایت رضا کی ہے
سکہ رواں ہے عدل کا شوکت رضا کی ہے
عنواں بدل گیا ہے کتابِ حیات کا
سرخی ہے کائنات کی، حکمت رضا کی ہے
پروانہ وار آپ پہ دنیا نثار ہے
جو شمع جل رہی ہے، امامت رضا کی ہے
مامون خود ہے حسنِ تدبر کا معترف
اس کا ہے نام اور سیاست رضا کی ہے
روضے کی شان، چاہنے والوں کا ازدحام
انسانیت کے دل پہ حکومت رضا کی ہے
صدقے کے بعد کوئی بھی گھر سے سفر کرے

ہے امن میں خدا کے، ضمانت رضا کی ہے
گوہر نثار کرتا ہوں لفظوں کی شکل میں
ارشادؔ کے ہیں شعر، عنایت رضا کی ہے

☆☆☆

امام محمد تقی (ع)

(۱)

ہوا گلوں سے معطر ہوئی تقیِ جواد
بہار جھوم کے آتی رہی تقیِ جواد
بہت ہی مختصر چوبیس سال کی تھی حیات
مگر یہ صدیوں پہ بھاری رہی تقیِ جواد
تری سخا سے ہے حیران حاتم طائی
سمندروں کو ہے شرمندگی تقیِ جواد
تمہارے سر پہ جو تقویٰ کا تاج روشن ہے
ہے تاجِ شاہ میں کیا روشنی تقیِ جواد
جہاں میں علم کے دریا بہادیے تونے
پیاس تشنہ دلوں کی بجھی تقیِ جواد
نصیب والے جو پہنچے تمھارے روضے پر
مراد اُن کی برآور ہوئی تقیِ جواد
تری ثنا اگر مقبول ہوگئی ارشادؔ
سمجھ لو حشر میں کام آگئی تقیِ جواد

(۲)

کس کی آمد سے ہے تقویٰ کی فضیلت روشن
جس کی حاتم سے بھی بڑھ کر ہے سخاوت روشن

پانی پانی ہے سمندر ترے دل کے آگے
کس قدر جود و سخا کی ہے کرامت روشن
در سے تیرے نہیں پلٹا کوئی خالی دامن
اے جواد و سخی! ہے تیری عنایت روشن
ہوگیا فیضِ تقی سے رواں دریائے علوم
ہر طرف ہوگئی مولا کی امامت روشن
چاند سورج ہی نہیں کسبِ ضیا سے مخصوص
نور سے ان کے ہے تنویر کی خلقت روشن
آپ کے علم سے مامون کو حیرانی ہے
ہار سے ہوگئی یحییٰ کی خجالت روشن
مرتبہ دیکھ کے داماد بنایا اپنا
اپنی بیٹی کی بھی جب دیکھ لی نیت روشن
روضۂ بابِ حوائج پہ کہاں سے آئی
مشکلوں سے ہے یہ مشکل کی شکایت روشن
آپ کی چاہیے ارشادؔ پہ تھوڑی سی نظر
اس کے اشعار میں ہے گوشۂ مدحت روشن

☆☆☆

امام علی نقی (ع)

(۱)

آئی بہار دہر میں گلشن نبی کا ہے
اک پھول جو کھلا ہے چمن میں علی کا ہے
آتے ہیں آستاں پہ گدائی کو شاہِ وقت
فقر و غنیٰ کے تاج پہ قبضہ اسی کا ہے

پہلے علی کے مثل ہے چوتھے علی کی شان
خطبہ علی نقی کا ہے لہجہ علی کا ہے
اللہ جانے اس کے فضائل کی انتہا
ہے کائنات اس کی زمانہ اسی کا ہے
پاکیزگیٔ نفس کا علم نہ پوچھیے
محفل میں آج ذکر نقاوت نقی کا ہے
مل جائے نقش پائے امام نقی اگر
کیا اس سے بڑھ کے آنکھ کا سرمہ کسی کا ہے
پھیلی ہے تیری مدح کے مہتاب کی ضیا
ارشادؔ خواستار اسی روشنی کا ہے

(۲)

جلاتے جاؤ جہالت میں آگہی کا چراغ
زمانہ بھول نہ پائے گا روشنی کا چراغ
کوئی جلائے محبت میں دشمنی کا چراغ
جلاؤ ہاتھ سے خود اپنے دوستی کا چراغ
اجالا پھیل گیا ہر طرف زمانے میں
تقی کے گھر میں جو روشن ہوا نقی کا چراغ
فساد و دہشت و ظلم و عناد ختم ہوئے
جلایا آپ نے جب امن و آشتی کا چراغ
غروب ہوگیا عباسیوں کا سورج بھی
مگر ہے آج بھی روشن علی نقی کا چراغ
انھیں کے ذکر سے زینت دو اپنی محفل کو
سدا جلاتے رہو مدحت علی کا چراغ

وہی تو حشر میں دے گا تمھیں ضیا ارشادؔ
جو منقبت میں جلاؤ گے شاعری کا چراغ

امام حسن عسکری (ع)

(۱)

ہے مظہرِ جلال و سخا شانِ عسکری
کتنا عظیم تر ہے یہ ایوانِ عسکری
بن جائے گا وہ صاحبِ کردار باخدا
ہوجائے تھوڑا سا جسے عرفانِ عسکری
باقی ہے دہر جس کی بقا کے طفیل میں
وہ ہے گلِ بہارِ گلستانِ عسکری
تازہ ہے ایک پھول زمانے میں آج بھی
قائم رہے گا جس سے یہ بستانِ عسکری
مشہور ہے جہان میں تفسیر آپ کی
جاری رہے گا حشر تک فیضانِ عسکری
ممکن نہیں ہے ان کے فضائل کی انتہا
لکھتے رہیں کتاب بعنوان عسکری
جب کائنات مدح میں رطبُ اللسان ہے
ارشادؔ بھی ہے ایک ثنا خوانِ عسکری

(۲)

کرتے رہیں صدا فکر و آگہی کی بات
ہوتی رہے گی ذکرِ نبی و علی کی بات
اسلام کے وقار کا جب آئے مسئلہ
سب پر بلند رہتی ہے حق کے ولی کی بات

ہوگا جہاں بھی شوکت و سطوت کا تذکرہ
ہوگی وہاں ضرور حسن عسکری کی بات
دنیا میں یادگار ہے تفسیر آپ کی
قرآن بولتا ہے نبی کی، وصی کی بات
عباسیوں کی سلطنت صدیوں کی بات ہے
ہر لب پہ چل رہی ہے ابھی عسکری کی بات
سلطان معتمد ہے، یہ ہے وقت کا امام
جب بھی چلے گی بات تو ہوگی اسی کی بات
ارشادؔ کو کبھی نہیں دیوان کی تلاش
ممدوح کو پسند ہے دردِ ولی کی بات

امام مہدی (ع)

(۱)

حُسن وہ جو عسکری کے لال کی صورت میں ہے
پھر کہاں وہ یوسفِ کنعان کی قسمت میں ہے
روشنی دیتا ہے جیسے ابر میں بھی آفتاب
غیب میں رہ کر ہدایت آپ کی عادت میں ہے
اے امامِ منتظَر! عرصے سے ہم ہیں منتظِر
آپ کب آئیں گے دنیا دید کی حسرت میں ہے
پھر فراعینِ زمانہ کررہے ہیں ظلم و جور
اس کا حل اب موسیٰ عمران کی ہیبت میں ہے
ظلم سے مملو یہ دنیا عدل سے بھر جائے گی
ذوالفقاری کاٹ، شانِ حیدری حجت میں ہے
ذوالفقارِ حیدری چلتی تھی نسلیں دیکھ کر

درحقیقت یہ صفت بھی آپ کی سیرت میں ہے
لے گا جب وہ انتقامِ خونِ فرزندِ رسول
تب یزید وقت سمجھے گا اثر لعنت میں
چرخ سے آئیں گے عیسیٰ ہوں گے ماموم امام
کاش عیسائی سمجھ لیتے کہ حق حجت میں ہے
مدح کا ارشادؔ لفظوں میں بیاں ممکن نہیں
دل سمجھتا ہے مزہ جو آپ کی مدحت میں ہے

(۲)

درد و بےقراری کا اس قدر اثر جائے
کاش مدّتِ غیبت آپ کی ٹھہر جائے
آپ آئیں گے کب تک خوف ہے مجھے مولا
انتظار میں شاید زندگی گزر جائے
لکھ کے اک عریضہ بھی چھوڑ دوں سمندر میں
حالِ دل کی مولا کو کس طرح خبر جائے
عدل سے بھرے دنیا آپ کی قیادت میں
خون جو بہے اس میں ظالموں کے سر جائے
جو وجودِ مہدی کا دہر میں نہیں قائل
بزمِ مدحِ حجّت سے ایسا بد گہر جائے
ہے یہ غیبت کبریٰ خود ظہور کی حجت
ہم اگر نہ مل پائیں اک دعا مگر جائے
ناصروں میں مولا کے نام ہو ترا ارشادؔ
جب ظہور ہو منکر آپ کا کدھر جائے

☆☆☆

حضرت عباس (ع)

(۱)

رعب اتنا کہ کوئی دیکھ لے چہرہ ان کا
پھر بھلا کیسے نظارہ ہو دوبارہ ان کا
ہیبت و شوکت و جرأت ہے وراثت میں ملی
حیدری شان کا مظہر ہے جو حلیہ ان کا
حسن ایسا کہ لقب ہے بنی ہاشم کا قمر
منتشر مہر امامت سے ہے جلوہ ان کا
ترکِ اولیٰ کا بھی دھبہ نہیں دامن پہ کوئی
کیسا معصوم صفت ہے یہ طریقہ ان کا
ہوئی تخلیق تو شبیر کی نصرت کے لیے
کی وفا ایسی کہ جاری ہوا سکّہ ان کا
آنکھ کھولی تو تھی شبیر کے چہرے پہ نظر
بند کی آنکھ تو تھا سامنے چہرہ ان کا
مشکلیں دور تو ہوجائیں گی فوراً ارشادؔ
جب بھی ہوجائے گا ہلکا سا اشارہ ان کا

(۲)

نازشِ ہمہمۂ حمزہ و جعفر آیا
گود میں شیر دلاور کے غضنفر آیا
حامل پرچم اسلام کا دلبر آیا
صف شکن باپ کی آغوش میں صفدر آیا
حسن کردار کا ایثار کا پیکر آیا
جو بنادے گا وفاؤں کا مقدر آیا

درِ شہوارِ رسالت کا فدائی بن کر
بحرِ عرفانِ امامت کا شناور آیا
رخِ خورشید ولایت کی خلافت لے کر
مرحبا ام بنیں کا مہ انور آیا
روکے نظروں پہ جو طاغوت کے طوفانوں کو
نصرت کشتیٔ ایماں کا وہ لنگر آیا
زینب و شبر و شبیر فدا ہیں جس پر
نسل زہرا کے لیے آج وہ محور آیا
لے کے عباس کو آغوش میں کہتے ہیں علی
''گھر میں حیدر کے کوئی ثانیٔ حیدر آیا''
سنتے ہی آمد غازی کی خبر ہیبت سے
شرک کا گھٹ گیا دم، کفر کو چکر آیا
باندھنے جوشِ شجاعت پہ وفا کا پہرہ
نفسِ پیغمبرِ اسلام کا جوہر آیا
ہو سراپا قد و قامت کہ جلال اور جمال
لے کے ہر وصف علی بیٹا سراسر آیا
جس کے بازو میں ہے اسلام کی قوت ارشادؔ
دہر میں آج وفاؤں کا وہ پیکر آیا
اور بڑھ جاتا ہے الفت کا نشہ فرقت سے
عشق مرتا نہیں محبوب کے مرجانے سے
کون تسلیم کرے گا ترے سچ کو ارشادؔ
ملنا سو بار کا خالی رہا مل پانے سے

☆☆☆

حضرت زینب (ع)

تمھارے خطبے نے وہ کام کردیا زینب
کہ شام و کوفہ کا دربار ہل گیا زینب
ترا خطاب تھا یا تھی وہ ذوالفقار کی کاٹ
زبان و لہجہ تھا سب حیدری ترا زینب
جہاد کے لیے دربارِ شام و کوفہ میں
حسین بن کے گئی بعدِ کربلا زینب
دیارِ شام میں مجلس کی رکھ کے تونے بنا
غمِ حسین کو دی دائمی بقا زینب
علی ہیں زینتِ منبر تو باپ کی زینت
ترے خطاب سے کہرام مچ گیا زینب
کچھ اس طرح سے بنی تو شریکِ کارِ حسین
کہ نشر ہوگیا پیغامِ کربلا زینب
تمھاری مدح نے ذرّے کو آفتاب کیا
وگرنہ شاعری ارشادؔ کی ہے کیا زینب

☆☆☆

سلام

(۱)

تو شہادت گاہِ اولاد نبی ہے کربلا
دین حق کو تونے بخشی زندگی ہے کربلا
تو ہے اک روضہ ریاضِ جنتُ الفردوس کا
آ گیا جو بھی یہاں پر جنتی ہے کربلا
دین پر دی ہے یہیں تونے متاعِ جاں حسین
کوئی کیا جانے کہ کتنی قیمتی ہے کربلا
جامۂ تخئیل اس کو کیسے پہنائے کوئی
فکر چھوٹی ہے ہماری اور بڑی ہے کربلا
کہہ سکوں شایانِ شاں تیری تو کچھ بن جائے بات
ورنہ سب بے سود میری شاعری ہے کربلا
کفر اور الحاد کے رخ سے پلٹ دی ہے نقاب
شام کے ظلمت کدے میں روشنی ہے کربلا
دشمنِ حق کوئی تیرے پاس آسکتا نہیں
تو زیارت گاہِ شیعانِ علی ہے کربلا
اے خدا نورِ بصیرت کر عطا ارشادؔ کو
اس کو چشمِ معرفت سے دیکھنی ہے کربلا

(۲)

بزدلوں نے گھاٹ پر پہرا کیا
شیر دل نے دفعتہً حملہ کیا

اس طرح بھاگے ستمگر نہر سے
جیسے بڑھ کر موت نے پیچھا کیا
سر کٹانے کی جو باری آگئی
حق سے کچھ شبیر نے وعدہ کیا
صاف باطل کی حقیقت ہوگئی
حر نے حق کے سامنے سجدہ کیا
ایک ہی تیر تبسم کے طفیل
سنگدل لشکر نے کیوں گریہ کیا
بے کفن بھائی کا لاشہ دیکھ کر
زینب و کلثوم نے نوحہ کیا
چھن گئی زینب کے سر سے جب ردا
چادرِ تطہیر نے پردہ کیا
دیکھ کر ارشادؔ کے اشعار کو
خلد کا رضوان نے در وا کیا

(۳)

جب ہوئی ہیں دین میں بے دینیاں
دیں علی کے لال نے قربانیاں
تشنہ لب فرزندِ ساقی ہوگیا
ختم پانی کی ہوئیں سب شوخیاں
کربلا میں خون پانی ہوگیا
اور پانی کی ہوئی قیمت گراں
پانی پانی ہوگئی نہرِ فرات
ہائے پیاسی ہیں پیمبر زادیاں

سر پٹکتا تھا جو پانی گھاٹ پر
مضطرب تھا شرم سے بے ایں و آں
نہر سے سیراب ہے ہر کلب و خوک
خشک ہوتا ہے نبی کا گلستاں
خون کے آنسوں ہے روتی علقمہ
جب سناتی ہے بلا کی داستاں
مدحتِ ساقی جو کی ارشادؔ نے
دیکھ کے کوثر نے لی انگڑائیاں

(۴)

دیکھ لو کیا ولائے حیدر ہے
روح کیسی ہے کیسا پیکر ہے
موت آئی ہے حبِّ ساقی میں
اس کے ہاتھوں میں جامِ کوثر ہے
دستِ حسنین میں ہے زلفِ رسول
آج خوشبو میں وہ سوا تر ہے
سنگِ اسود کو چوم کر جنت
وہ نہیں پائے گا جو پتھر ہے
درِ شبیر پر جو آیا فقیر
واپسی میں وہ اک تونگر ہے
اشک نکلے جو تیرے غم میں حسین
قطرہ ہر ایک مثل گوہر ہے
کیوں نہ دیکھیں حسین جی بھر کر
لال ہم صورت پیمبر ہے

یہ دعائے امام کا ہے اثر
چہرۂ جَون ماہِ انور ہے
کربلا میں ہے سر کھلے زینب
رات ہی آج اس کی چادر ہے
حشر میں لے کے جائے گا ارشادؔ
ہاتھ میں مدح کا جو دفتر ہے

(۵)

آنکھیں تلاش کرتی ہیں سرور کہاں گئے
زینب پکارتی ہیں برادر کہاں گئے
قبر رسول، ماں کی لحد، بھائی کا مزار
سب چھوڑ کر وہ دین کے رہبر کہاں گئے
ساحل پہ کرکے خیر سے دینِ رسول کو
دریائے خوں میں ڈوب کے سرور کہاں گئے
زینب سے پوچھتی ہے تڑپ کر یہی رباب
آغوش میں پدر کے تھے اصغر کہاں گئے
کوفہ کی سمت بھاگ چلی فوجِ اشقیا
ہلچل مچی کہ وارثِ حیدر کہاں گئے
کیسی یہ کربلا میں ہوائے خزاں چلی
ارشادؔ سوچتا ہے بَہتّر کہاں گئے

(۶)

حوصلہ ٹوٹا نہیں کرتا کسی بھی وار سے
عزم کا سر کٹ نہیں سکتا کبھی تلوار سے
کہہ رہا ہے نوکِ نیزہ پر سرِ باطل شکن

لو چراغوں کی نہیں کٹتی چھری کی دھار سے
کس قدر دھوکا تھا باطل کی حکومت کا غرور
توڑ ڈالا شہ نے بیعت کا صنم انکار سے
کیسے ممکن ہے کہ حق پر ظالم و مظلوم ہوں
حق وہ ہے جس کو ہو نسبت احمد مختار سے
فاسق و فاجر کے آگے نام لوں شبیر کا
کیا تقابل ایک کنکر کا درِ شہوار سے
صلح کی کوشش بہت کی تھی نبی کے لال نے
باز نہ آئی یہ فوجِ اشقیا پیکار سے
ہیبتِ عباس کی فوج عدو کو تاب کیا
جو سنبھل پائی نہ اصغر کی ہنسی کے وار سے
جس کا دل ہو حسنِ دائم سے منوّر تا ابد
وہ کبھی محروم رہتا ہی نہیں دیدار سے
ہے دعا اے میرے مالک خلد ہو اس کا مقام
بیتِ جنت ہو عطا ارشادؔ کو اشعار سے

(۷)

کیسے لکھّوں حالِ دل اس مادرِ دلگیر کا
جس کا بچہ بن گیا رن میں نشانہ تیر کا
جیسا تھا مرنے کا جذبہ ہر جوان و پیر کا
اس سے کچھ کم تھا نہ ہرگز ولولہ بے شیر کا
حشر تک جس سے ہو سوزش حرملہ کے قلب میں
چبھ گیا تیرِ تبسم اس طرح بے شیر کا
فوج بھاگی مثلِ روباہوں کے کوفہ کی طرف

کربلا میں یوں تھا اندازِ وغا شبیر کا
اک صحابی سن کے بولے کیا قیامت آ گئی
باپ کے لہجے میں خطبہ زینب دلگیر کا
عابد مضطر نے خطبہ دے کے ثابت کردیا
درسِ حرّیت ہے حلقہ پاؤں کی زنجیر کا
مرحبا کہنے لگی تھی ذوالفقار حیدری
کام خطبوں سے لیا سجاد نے شمشیر کا
مدحتِ آلِ پیمبر میں اٹھا تا ہے قلم
باغِ جنت ہے صلہ ارشادؔ کی تحریر کا

☆☆☆

نظمیں

اک روز تو ایسا آئے گا

اک روز تو ایسا آئے گا جب ظلم کا سر چکرائے گا
باطل کی ہوا اُڑ جائے گی اور پرچمِ حق لہرائے گا
آئے گی بہارِ روح فزا اور دورِ خزاں مٹ جائے گا
خوشبو سے معطر ہوگا چمن اور بلبل نغمہ گائے گا
ظالم ہم کو تڑپائیں گے کب تک آخر، آخر کب تک
رکھیں گے کب تک اہلِ ستم، اس ظلمت شب کا نام سحر
کب تک یہ کہیں گے اہلِ نظر چمکیلے پتھر کو گوہر
پیتل کی تجارت کب تک ہوگی سونے کی دوکانوں پر
کب تک یہ بہائیں گے الٹی گنگا ان خشک زمینوں پر
نابینا نقش بنائیں گے کب تک آخر، آخر کب تک
زہرا کو رلانے والے یہ نجدی خود اشک بہائیں گے
روضے کو گرا کر خوش ہولیں، جنت میں نہ جانے پائیں گے
خاتونِ جناں کا پھر روضہ یہ اہلِ جہاں بنوائیں گے
کہتے ہیں جسے ''صنم اکبر'' وہ روضہ کیسے گرائیں گے
بدعت کے فتوے لائیں گے کب تک آخر، آخر کب تک
جب تیر و کماں سب ٹوٹیں گے، خنجر کا جگر پھٹ جائے گا
طاقت کا نشہ سب اترے گا، تلوار کا سر کٹ جائے گا

آئے گی سیاست کی آندھی، وہ گرد سے تب پٹ جائے گا
تک امریکا کے چہرے سے نقلی پردہ ہٹ جائے گا
شیطان ہمیں بہکائیں گے کب تک آخر۔ آخر کب تک

ایٹم کا دم گھٹ جائے گا، ہر بم کا مقدر پھوٹے گا
جب بے پر ہوں گے طیارے، ہتھیاروں کا بل ٹوٹے گا
جب ہاتھ ہی شل ہوجائیں گے، میزائل کیسے چھوٹے گا
مہدی کی ہدایت کا لشکر، سامانِ ضلالت لوٹے گا
ملحد تب شور مچائیں گے، کب تک آخر، آخر کب تک

پانی پہ مصلیٰ بچھ جائے، بھرنے لگیں پانی اہل ستم
ہوں پانی پانی اہل جہاں اور عیسیٰ آجائیں اس دم
ماموم بنیں تب روح اللہ رہ جائے امراللہ کا بھرم
انصاف کا سکہ ہوگا رواں اور چھا جائیں گے اہلِ کرم
ہم عدل کا خون بہائیں گے کب تک آخر، آخر کب تک

مٹ جائے گی سب تاریکی جب نورِ خدا آجائے گا
گونجے گی صدائے جاءالحق ہر کان جسے سن پائے گا
پتھر کا کلیجہ شق ہوگا، آہن کا جگر برمائے گا
ارشادِ خدا کا ابرِ کرم دنیا میں گہر برسائے گا
مشرک پتھر برسائیں گے کب تک آخر، آخر کب تک

☆☆☆

آزادیٔ وطن

جب سمومِ ظلم سے جھلسا چمن زارِ وطن
تب لہو سے ہم نے سینچا ہے یہ گلزارِ وطن
اس کے جسم نازنیں میں جب دِکھا چبھتے ہوئے

اپنی پلکوں سے نکالا ہم نے ہر خارِ وطن
ظلم کی تاریکیوں میں ڈوب جائے گر چمن
داغِ دل سے ہر طرف پھیلادو انوارِ وطن
ظالموں نے جنگ آزادی کا رکھا نام غدر
اٹھ گئے سب سر کٹانے کو وفادارِ وطن
سرد جب ہونے لگا احساس کا سودا کبھی
کردیا ہم نے لہو سے گرم بازارِ وطن
پھر بھی نوّے سال تک چلتا رہا یہ سلسلہ
تب شہیدوں کے لہو سے بن سکا کارِ وطن
اپنے بھارت سے ہوا فرعونیت کا خاتمہ
بعد عرصے کے ہوا سب دور آزارِ وطن
مادرِ گیتی کا حق ہے اس کی ہم سیوا کریں
بیچ دے جو ماں کی چادر وہ ہے غدارِ وطن
خون کا نذرانہ جو دے ماتر بھومی کے لیے
ایسے انساں کو کہا جائے فداکارِ وطن
جب چمن سے دور ہوجائیں عنادل ہم نفس
مضطرب ہوتا ہے دل کیسے ہو دیدارِ وطن
اس نے تم کو پال کر بخشی ہیں سب رعنائیاں
زندگی کی ہے عطا، کیا کم ہے ایثارِ وطن
ملک کے دشمن کبھی آنکھیں دکھا سکتے نہیں
کی ہے یوں مضبوط سربازوں نے دیوارِ وطن
ہم نے سانسیں لی ہیں اس آزاد ہندوستان میں
باپ دادا تھے ہمارے کل کے سالارِ وطن

اپنے پرکھوں نے بلی دی خون کی اس کے لیے
سچ جو پوچھو تو وہی تھے بس رضاکارِ وطن
جب سمجھ پائیں گے اے ارشادؔ آزادی ہے کیا
تب کریں گے حرّیت کی قدر احرارِ وطن

☆☆☆

عیدِ مباہلہ

کیا فصلِ گل میں آئی ہے عید مباہلہ
کیف و سرور لائی ہے عید مباہلہ
قرآن پنجتن کو ہی کہتا ہے صادقین
سچوں کو خوب بھائی ہے عید مباہلہ
ہیں عورتوں میں فاطمہ نفسوں میں ہیں علی
بیٹوں کا نور لائی ہے عید مباہلہ
سچوں کو حق ہے پئیں مئے حبِ اہل بیت
چھلکا کے جام لائی ہے عید مباہلہ
جزیہ کا وعدہ کرکے جو میداں سے ہٹ گئے
ان کو تو غم کی کھائی ہے عید مباہلہ
لعنت سے قبل مان لی باطل نے اپنی ہار
جلوے جو حق کے لائی ہے عید مباہلہ
عیسیٰ نہیں ہیں ابنِ خدا وہ رسول ہیں
ارشادؔ حق پہ لائی ہے عید مباہلہ

☆☆☆

عیدِ غدیر

بلّغ کی شان دیکھیے آکر غدیر میں

صحرا کی دھوپ، حشر کا منظر غدیر میں
حجاج سب پسینے میں ڈوبے ہیں اس طرح
جیسے کہ بہہ رہا ہو سمندر غدیر میں
اس واقعے کو بھول نہ پائے کبھی کوئی
ایسا ہے اہتمامِ پیمبر غدیر میں
النّاس سے بچانے کا وعدہ جو ہوچکا
تب بن گیا کجاووں کا منبر غدیر میں
خطبہ رسول نے جو دیا لاجواب تھا
اولیٰ بکم پہ، ہاں کا تھا منظر غدیر میں
قم یا علی کی گونج مچی تھی جو بزم میں
دستِ نبی پہ ایک تھا پیکر غدیر میں
دن میں تھا مہر و ماہ کا اس وقت اجتماع
جب چھپ گیا تھا مہرِ منور غدیر میں
من کنتُ کی صدا سے ولایت کا ہے ثبوت
مولا نبی کی طرح ہیں حیدر غدیر میں
نعمت تمام ہوگئی اکمالِ دیں ہوا
اسلام کو رضا ملی آکر غدیر میں
چھلکاتا ہے کوئی مئے حبِّ علی کے جام
جیسے ہو کوئی ساقیٔ کوثر غدیر میں
نخؔ کہا تھا دل سے کہ وہ بے دلی کے ساتھ
یا چل گیا تھا سینے پہ خنجر غدیر میں
ارشادؔ آج روز ہے عید عظیم کا
ہے جشنِ تاج پوشیٔ حیدر غدیر میں

☆☆☆

نظم قصص قرآنی

ہیں عبرتوں کے خزینے کتاب کے قصے
نصیحتوں کے دفینے کتاب کے قصے
ہدایتوں کے سفینے کتاب کے قصے
ہیں بحرِ دیں کے نگینے کتاب کے قصے
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں

یہ معجزات کا ملجا ہے اور ماویٰ ہے
نہ مثل لائے گا کوئی یہ اس کا دعویٰ ہے
کلام پاک کی عظمت کو کس نے جانا ہے
یہ نثر ہے کہ جہاں نظم لفظ و معنی ہے
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں

کہیں پہ امر و نہی ہیں کہیں پہ خوف و رجا
کہیں قصص ہیں تو امثال ہیں، ادب ہے دعا
کہیں دفاع کی باتیں بطرزِ حسنِ ادا
کہیں پہ اجر رسالت بشکل مہر و وفا
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں

کتاب حق نے سنواری ہے زندگی میری
رہِ ہدیٰ پہ گزری ہے زندگی میری

اسی طریق پہ جاری ہے زندگی میری
یہ بس عطیۂ باری ہے زندگی میری
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں
فسانے کیسے حقیقت بنیں گے اے لوگو!
کبھی مصیبت و کلفت بنیں گے اے لوگو!
سرور، وجہِ اذیت بنیں گے اے لوگو!
ضیاعِ وقت کی صورت بنیں گے اے لوگو!
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں
جہانِ کفر سے ان کو اذیتیں پہنچیں
کسی نبی کو نہ اتنی مصیبتیں پہنچیں
ہو مکہ یا کہ ہو طائف، ہیں کلفتیں پہنچیں
ہیں پاؤں خون میں تر کتنی نکبتیں پہنچیں
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں
نبوتوں کی کہانی کا نام قرآں ہے
رسالتوں کی جوانی کا نام قرآں ہے
ہدایتوں کی روانی کا نام قرآں ہے
یہ بے نشاں کی نشانی کا نام قرآں ہے
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں
جہانِ ظلم و ستم کے غرور ٹوٹ گئے

رعونتوں کے صنم کے قصور ٹوٹ گئے
نمودِ بغض و حسد کے شعور ٹوٹ گئے
حباب کفر کے، حق کے حضور ٹوٹ گئے
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں

وہ سوز عشق کی راہوں سے کس طرح گزرا
قدم قدم پہ شراروں سے کس طرح گزرا
مصیبتوں کے پہاڑوں سے کس طرح گزرا
گلوں کے ساتھ یہ خاروں سے کس طرح گزرا
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں

ہے اس میں آدم و حوا کا باربار بیاں
جگہ جگہ پہ ہے موسیٰ کا باربار بیاں
جناب مریم و عیسیٰ کا باربار بیاں
ہمارے آقا و مولیٰ کا باربار بیاں
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں

تمام خلقت آدم کا تذکرہ اس میں
جناب نوح کی عظمت کا تذکرہ اس میں
نہ بس براہیم و یوسف کا تذکرہ اس میں
ہے لامکاں کے مکاں کا بھی تذکرہ اس میں
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں

ہے اہل بیت پہ افتاد دین کی خاطر
کتاب حق کی ہے فریاد دین کی خاطر
اگر ہو زندگی برباد دین کی خاطر
نہ حق کو چھوڑے گا ارشادؔ دین کی خاطر
یہ الف لیلہ و لیلہ کی داستان نہیں
حقیقتوں کے مظاہر ہیں چیستان نہیں

۱۳؍رمضان المبارک ۱۴۴۳ھ

☆☆☆

ہم کیا ہیں؟

تاباں صفت نگینوں کا جوہر ہمیں تو ہیں
ظلمت میں روشنی کا مقدر ہمیں تو ہیں
دنیا حقیر لاکھ سمجھتی رہے ہمیں
معلوم ہے کروڑوں سے بہتر ہمیں تو ہیں
ہر راہ رو نشانِ قدم دیکھ کر چلے
منزل کا جو پتہ دے وہ رہبر ہمیں تو ہیں
فرشِ زمیں پہ چاند ستارے اتار دیں
اوجِ فلک پہ مہر منور ہمیں تو ہیں
ظلم و ستم کی دہر میں چلتی ہیں آندھیاں
جلتی رہی جو شمع برابر ہمیں تو ہیں
کرتی ہیں جب برائیاں گندہ ضمیر کو
عفت کی روح، خلق کا پیکر ہمیں تو ہیں
سر جھک سکے کسی کا نہ باطل کے سامنے
ارشادؔ سر کٹا دے جو حق پر ہمیں تو ہیں

☆☆☆

کرونا کے حوالے سے

فقر میں زندگی گزاری ہے
اس لیے عیش سے یہ عاری ہے
کیوں نہ انسانیت تڑپ اٹھے
یہ کرونا عذابِ باری ہے
آنے والے دنوں میں کیا ہوگا
آج جب خوف اتنا طاری ہے
سچ جو پوچھو تو ساری دنیا میں
اس کرونا کا قہر جاری ہے
لاک ڈاؤن میں گھر سے مت نکلو
تم کو گر جان اپنی پیاری ہے
سب حکومت کا ساتھ دو مل کر
ہم سبھی کی یہ ذمہ داری ہے
کیا دوا ہوگئی کوئی ایجاد
یا ابھی کھوج اس کی جاری ہے
ہے فضاؤں پہ آپ کا قبضہ
ایک کیڑے سے جنگ جاری ہے
اب تو مانو کہ ہے کوئی اللہ
جو حکومت میں سب پہ بھاری ہے
حق اسی کو ہے کبریائی کا
اس کے در کا ہر اک بھکاری ہے
یہ کرونا مقامِ عبرت ہے
ظلم کے سر پہ ضربِ کاری ہے

جلد ہو دور یہ بلا معبود
گڑگڑا کر دعا ہماری ہے
اپنے بندوں پہ رحم کر اللہ
تیری رحمت غضب پہ بھاری ہے
کیوں نہ ارشادؔ کو نجات ملے
اچھے لوگوں سے اس کی یاری ہے

☆☆☆

روحِ حقیقت

ستمگروں کو جو مانا ہے بےگناہوں میں
وقار اس سے گھٹا خلق کی نگاہوں میں
جو اقتدار کا نشّہ ہے کچھ دماغوں میں
اتر ہی جائے گا اک روز چند سالوں میں
اساتذہ ہوں کہ طلاب سب معزز ہیں
ہیں صرف دین کے خادم رہے خیالوں میں
جو عہدیدار ہیں وہ خادمانِ ملت ہیں
وہ بابِ علم کے گر ہوگئے غلاموں میں
وہ بدگمانیاں جو وجہِ انقلاب بنیں
نہیں تھا ان کا کہیں ذکر بھی فسانوں میں
جو راہِ حق میں دے قربانیاں زمانے میں
اسی کا نام ہے میدان کے جیالوں میں
کہیں پہ روحِ حقیقت ہے نقشِ یکرنگی
دو رنگیاں ہیں کہیں لوحِ دل کے خانوں میں
ہو جلوہ طور کا گر مقتضیِ شعلۂ طور

تو آگ کیوں نہ لگے دل کے آشیانوں میں
بہت کٹھن ہے یہ پر خار وادیوں کا سفر
شمار کیسے ہو ارشا پاکبازوں میں

☆☆☆

تعزیتی نظمیں

نظم تعزیت بسلسلۂ رحلت پروفیسر مظفر حنفی

جہانِ علم و ادب کا وقار ٹوٹ گیا
شعور و فکر کے پھولوں کا ہار ٹوٹ گیا
زمانہ کیوں نہ ہو بے نور ان کی رحلت سے
جہانِ دید کی آنکھوں کا تار ٹوٹ گیا
خزاں سے لگتی ہے ہر شے شکستگی کا شکار
چمن میں تھا کوئی جانِ بہار، ٹوٹ گیا
وہ کامیاب و مظفر تھا اپنی دنیا میں
سخن کے شہر کا محکم حصار ٹوٹ گیا
اسی کے دم سے غزل کا تھا مے کدہ روشن
یہ کیا ہوا کہ وہ جامِ شرار ٹوٹ گیا
کدھر گیا جسے نظریں تلاش کرتی ہیں
ادب کا سلسلۂ مشکبار ٹوٹ گیا
تھی کس کی وجہ سے محفل کی نغمگی قائم

فضا یہ کہتی ہے کوئی ستار ٹوٹ گیا
فلک سے اُس کی نہ دیکھی گئی حسین ادا
کہ سوزِ برق سے سازِ ہزار ٹوٹ گیا
کبھی جو دیتا تھا فن کی بلندیوں سے صدا
وہ نقدِ شعر کا روشن منار ٹوٹ گیا
فسانے جس کے تھے تعمیر فکر و فن کا عمود
سخنوری کا تھا جس پر مدار، ٹوٹ گیا
وہ کام کرگیا نازاں ہیں جس پہ اہل خرد
جنوں کی طرح ہیں ان پر نثار، ٹوٹ گیا
خزانہ دے گیا اردو کو اپنی کاوش سے
وہ دن بھی آیا قلم کا فشار، ٹوٹ گیا
ڈرامے ان کے تھے پیغام دل کا آئینہ
شکستہ عکس ہے، رخ کا سنگھار ٹوٹ گیا
یہ غمزدہ ہے زمانہ تو وجہ ہے ارشادؔ
تھا جس سے وجہِ ادب کا نکھار، ٹوٹ گیا

☆☆☆

تعزیتی نظم

بروفات حسرت آیات مولا سید ابن حیدر طاب ثراہ

علم میں مہر ضیابار تھے ابن حیدر
دہر میں تابشِ کردار تھے ابن حیدر
خطبہ دیتے تھے وہ بے خوف و خطر منبر سے
مدح میں میثم تمار تھے ابن حیدر
علم و فن ان کے قدم کے تھے رہینِ منّت

مسند درس کے شہکار تھے ابن حیدر
کیوں نہ ہو عرش علا فکر رسا پر نازاں
فرش پر سوکے بھی بیدار تھے ابن حیدر
خامشی میں بھی جہاں شان تکلم تھی عیاں
رہ کے چپ صاحبِ گفتار تھے ابن حیدر
بلبلِ ہند خطابت میں لقب تھا ان کا
مثل نونہروی فن کار تھے ابن حیدر
ان کو حیدر کی غلامی کا شرف حاصل تھا
عشق میں بوذر و عمار تھے ابن حیدر
درد و رقت سے شہ دیں کے مصائب پڑھتے
ابن حیدر کے فداکار تھے ابن حیدر
مسکراتے تھے کبھی پھول کی مانند جناب
گریہ کرتے تھے، عزادار تھے ابن حیدر
مرگِ عالِم سے کبھی پُر نہیں ہوتا رخنہ
حصنِ مضبوط کی دیوار تھے ابن حیدر
سوگ میں مادر علمی ہے جہاں رحلت سے
غمزہ قوم ہے سردار تھے ابن حیدر
لکھنؤ کے چمنستان میں آئی ہے خزاں
ایک نادر گل گلزار تھے ابن حیدر
ان کے مرنے سے فضا ہوگئی سونی سونی
دل ہے ویران کہ دلدار تھے ابن حیدر
ان کے شاگرد ہیں ارشادؔ ہزاروں علما

قلعۂ دین کے معمار تھے ابن حیدر
(۸/اگست ۲۰۲۰/۱۷/ذی الحجہ ۱۴۴۱ھ)

☆☆☆

تعزیتی نظم

بسلسلۂ وفات مولانا سلیمان عباس ابن الحاج غضنفر حسین مرحوم، مجلس مورخہ ۱۴/ستمبر ۲۰۱۹ء

مرکزِ علم و فضیلت تھے سلیمان عباس
دہر میں عینِ شرافت تھے سلیمان عباس
موت عالم کی تو ہوجاتی ہے موت عالَم کی
قحط علما میں غنیمت تھے سلیمان عباس
علم ادیان کے ساتھ علم تھا ابدان کا بھی
ماہر فن طبابت تھے سلیمان عباس
ان کے مرنے سے جہاں سوگ میں کیوں ڈوبا ہے
پیکرِ خلق و مروت تھے سلیمان عباس
چھوڑ کر اپنا وطن کرلیا گجرات آباد
راہ تبلیغ میں نعمت تھے سلیمان عباس
آپ کے سوگ میں کیوں بیٹھے نہ بلقیس جہاں
مالک ملکِ سیاست تھے سلیمان عباس
دن کو وہ وعظ میں مصروف رہا کرتے تھے
شب میں مشغول عبادت تھے سلیمان عباس
زندگی میں وہ پڑھا کرتے تھے ارشادِ خدا
حاملِ زورِ خطابت تھے سلیمان عباس

☆☆☆

تعزیتی نظم

بروفات حسرت آیات حکیم امت، مولانا ڈاکٹر سید کلب صادق مرحوم ۲۶ رنومبر ۲۰۲۰ء

ملت کی روح قوم کا سردار اٹھ گیا
علم و عمل کا کوہِ گراں بار اٹھ گیا
افسوس ہم نے رہبر صادق کا کھودیا
کرکے جو خفتہ قوم کا بیدار اٹھ گیا
اخلاق کا مجسمہ، پیکر خلوص کا
کلب حسین کا تھا وفادار اٹھ گیا
دیکھا تھا ایک خواب جو غفراں مآب نے
تعبیر بن کے وہ درِ شہوار اٹھ گیا
قائم کی جس نے انجمن توحید مسلمیں
طلاب غمزدہ کا وہ غم خوار اٹھ گیا
بنوا کے اک اِرَا میڈیکل یونیورسٹی
ملت کا ایک منفرد معمار اٹھ گیا
مفلس کوئی علاج سے محروم کیوں رہے
سب انتظام کرکے وہ بیمار اٹھ گیا
جو تیرگیٔ جہل سے بیزار تھا بہت
وہ علم و فن کا مہر ضیابار اٹھ گیا
اک انقلاب لایا زمانے میں علم کا
تحریکِ علم دے کے علمدار اٹھ گیا
آگے بڑھے گا ان کا مشن یونٹی کے ساتھ
رستہ دکھا کے صاحب کردار اٹھ گیا

توحید و اتحاد کا مرکز تھی اس کی ذات
وہ لکھنؤ کا صاحبِ دستار اٹھ گیا
اس کے عمل پہ سرسید کو بھی فخر ہے
جو گرم کرکے علم کا بازار اٹھ گیا
حاسد تڑپ کے رہ گیا بوجھل عمل کے ساتھ
کار گراں وہ کرکے سبکسار اٹھ گیا
ارشادؔ کیا شمار کرے ان کی خوبیاں
اک لشکرِ علوم کا سالار اٹھ گیا
۲۶؍نومبر ۲۰۲۰ء؍۱۰؍ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ

☆☆☆

وقت رحلت مولانا محمد مجتبیٰ حسین جامعہ ناظمیہ لکھنؤ

خاموش طبع تھا جو سخنور نہیں رہا
دنیائے فقر کا وہ سکندر نہیں رہا
سیراب جس سے ہوتے تھے طلاب علم دیں
تشنہ لبوں کا اب وہ سمندر نہیں رہا
تدریس کے فلک کو عطا کرکے روشنی
وہ علم و فن کا مہر منور نہیں رہا
باریکیاں اصول کی اسرار فقہ کے
دے کر ریاض کا وہ گل تر نہیں رہا
تھا منفردِ درس قوانین و فرائد
تدریس کے صدف کا وہ گوہر نہیں رہا
کیا تبصرہ کرے کوئی ہیئت پہ آپ کی
تصریح کے فلک کا وہ محور نہیں رہا

اس نے سکھائے کتنے معالم اصول کے
لمعہ کو جس پہ ناز تھا وہ سر نہیں رہا
کیا صرف علم نحو ہوئی اس کی زندگی
جامی کا وہ معلم خوشتر نہیں رہا
تدریس شافیہ میں نرالی تھی اس کی شان
لفظوں کے اشتیاق کا مصدر نہیں رہا
علم عروض میں تھا دوائر کا وہ محیط
اور نقد شعر جس کا تھا جوہر نہیں رہا
علم کلام کرتا ہے اب خود سے گفتگو
احقاق حق کا آج وہ منظر نہیں رہا
تھی جامع جمیع کمالات اس کی ذات
روح علوم کا تھا جو پیکر نہیں رہا
افسوس جس کے دم سے مشارع میں آب تھی
وہ شوکت شرائع کا دفتر نہیں رہا
ارشادؔ کو بھی درد ہے اس کے فراق پر
صد حیف فکر و فن کا مقدر نہیں رہا

☆☆☆

تعزیتی نظم

بروفات محمد اعجاز کربلائی ابن غضنفر حسین مرحوم ۱۸؍جولائی ۲۰۲۰ء

گوشۂ عرش کے اختر تھے محمد اعجاز
باخدا بندۂ داور تھے محمد اعجاز
چھوٹے بھائی نے رکھی جامعہ کی تھی بنیاد
حسن تعمیر کا مصدر تھے محمد اعجاز

قوم و ملت کو ابھی ان کی ضرورت تھی بہت
علم نسواں کے جو رہبر تھے محمد اعجاز
جیسے ہی آپ کی رحلت کی خبر عام ہوئی
لوگ اندوہ کا پیکر تھے محمد اعجاز
وادیٔ موت میں جب حشر کا ہنگامہ تھا
پر سکوں بر سر محشر تھے محمد اعجاز
اک امانت تھی جو اللہ نے واپس لے لی
انا للہ کا مظہر تھے محمد اعجاز
جوہری خوب سمجھتا ہے کہ کیا تھے مرحوم
بالیقیں قیمتی گوہر تھے محمد اعجاز
زائر روضۂ شبیر کا حاصل تھا شرف
کربلا! عاشقِ سرور تھے محمد اعجاز
خانوادے کے لیے مرکزی نقطہ بن کر
حسن پرکار کا محور تھے محمد اعجاز
جیسے امت میں نبی ہوتا ہے یوں اہل میں شیخ
حسب ارشادِ پیمبر تھے محمد اعجاز

☆☆☆

تعارفی نظم

برائے حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا تفضّل مہدی مرحوم طاب ثراہ

سیرت نواز خلق کا پیکر نہیں رہا
وہ علم و فن کا مہر منور نہیں رہا
پر نور جس کی وجہ سے مسند تھی درس کی

تدریس کے فلک کا وہ اختر نہیں رہا
حق بولتا تھا خواہ وہ کتنا ہی تلخ ہو
باطل کے سامنے اسے کچھ ڈر نہیں رہا
اس کی وفات سے نہ ہوئی صبر کی ''سبیل''
''دیں کا ستون'' رہ گیا وہ در نہیں رہا
دنیائے علم و فن جسے کرتی ہے اب تلاش
تحقیق و جستجو کا وہ محور نہیں رہا
جو ناخن شعور سے حل کردے گتھیاں
پیچیدہ مسئلوں کا وہ خوگر نہیں رہا
''ہارون'' کا گلاب وہ ''خیرالنسا'' کا پھول
جو نازش چمن تھا گل تر نہیں رہا
اک خانوادہ تھا جو ''ضمانت'' میں شیخ کی
مثل نبی وہ اہل کا رہبر نہیں رہا
اللہ نے اٹھالی ''امانت'' خطاب کی
جو دہر میں تھا زینت منبر نہیں رہا
چھیڑے جو ساز صبر پہ نغمہ حیات کا
اب وہ ''غلام صابر'' سرور نہیں رہا
فضل خدا ''تفضّل مہدی'' کا سلسلہ
غیبت کے باوجود کہاں پر نہیں رہا
جو تھا ''ظہور مہدی'' دوراں کا منتظر
سودائے دید جس میں تھا وہ سر نہیں رہا
''فیضان'' علم اور دم ''عیسیٰ'' کی شکل میں
چھوڑی ہے جس نے روح وہ پیکر نہیں رہا

ہر آدمی تھا اس کی بشاشت کا معترف
جو زندہ دل تھا حیف وہ دلبر نہیں رہا
ارشادؔ کچھ جریدوں کی کرکے ادارتیں
پرواز دے جو فکر کو وہ پر نہیں رہا

☆☆☆

تعزیتی نظم

بروفات جناب مولوی اقبال مہدی عزمیؔ معروفی

عزم کے فضل و شرافت کے تھے مظہر اقبال
زہد کے ورع کے تقویٰ کے تھے پیکر اقبال
منتظم ایسے کہ تنظیم کو تھا ناز ان پر
متفکر بھی تھے تدریس کو لے کر اقبال
زندگی ان کی شب قدر سے طولانی تھی
لحن داؤد میں قرآن تھا لب پر اقبال
مرثیہ خوانی کا انداز جداگانہ تھا
کھینچ سکتا ہے بھلا کون وہ منظر اقبال
الفت آل پیمبر میں جو موت آئی ہے
زندگی پائی شہادت کی ہے مر کر اقبال
فیض پہنچایا ہے ہر قوم کو فن سے اپنے
بالیقیں آپ کا احسان ہے گھر گھر اقبال
آپ کے غم میں عزا ہوگئی سونی سونی
نوحہ ماتم میں ہے مصروف برابر اقبال
خانوادہ ہی نہیں سوگ میں تیرے گریاں

غمزدہ قوم ہے اے عاشق سرور اقبال
آپ کے غم میں جو ارشادؔ کو غم پہنچا ہے
کچھ تدارک تو کریں خواب میں آکر اقبال

☆☆☆

تعارفی نظم

فخرِ قوم حکیم شیخ تفضّل حسین طاب ثراہ

فضل و کرم کی جان تفضّل حسین تھے
علم و عمل کی شان تفضّل حسین تھے
تھی ذات ان کی جرأت و ہمت میں بے مثال
پیری میں بھی جوان تفضّل حسین تھے
جب مسئلہ عزائے حسینی کا آگیا
تو عزم کی چٹان تفضّل حسین تھے
چٹکی میں حل کیا جو لاینحل تھا مسئلہ
جو حق کی تھی زبان تفضّل حسین تھے
اک رعب و داب ذہنوں پہ طاری تھا آپ کا
جس کی تھی آن بان تفضّل حسین تھے
قدرت نے ان کو حسن تکلم عطا کیا
کیا خوب پر بیان تفضّل حسین تھے
پڑھتے تھے جب مصائب بیمار کربلا
اٹھتی تھی اک فغان تفضّل حسین تھے
ثانی نہیں تھا کوئی طبابت میں آپ کا
حکمت کی روح و جان تفضّل حسین تھے

ماہر تھے نفسیات کے علم بدن کے ساتھ
باریک نکتہ دان تفضّل حسین تھے
کتنے تھے ان کے حسن تدبر کے واقعات
ہاتھوں میں تھی کمان تفضّل حسین تھے
خود مشورے کو آتے تھے حکام ان کے پاس
وہ قوم کا نشان تفضّل حسین تھے
تا عمر وقفِ کیفِ مودت تھے اس لیے
مصروفِ امتحان تفضّل حسین تھے
ہو عام یا کہ خاص جو گرداب میں پھنسا
اس کے لیے امان تفضّل حسین تھے
سرخی تھی ان کی ذات مشاہیر وقت کی
شہرت کے ترجمان تفضّل حسین تھے
ارشادؔ کیا بیان کرے ان کی خوبیاں
ممدوح بے گمان تفضّل حسین تھے

☆☆☆

قطعات

(۱)

صلح حدیبیہ اگر فتح مبین ہے
ہے تیرا کام دین مبیں کے وقار کا
فرزند مصطفیٰ تری جرأت کے میں نثار
نوکِ قلم سے کام لیا ذوالفقار کا

(۲)

جب علی کو پکارا گیا
کوئی مرحب سا مارا گیا
جو بھی کرتا تھا گستاخیاں
اس کا پانی اتارا گیا

(۳)

ساقی کوثر کی جاں ہے تشنہ لب
ہے یہ ابنِ کلِّ ایماں تشنہ لب
منتظر تھی کب سے بلقیسِ فرات
آج آیا ہے سلیماں تشنہ لب

(۴)

دنیا والے جو ہنسا کرتے ہیں کچھ فکر نہیں
رونا یہ ہے کہ ہنسا کرتے ہو تم بھی مجھ پر
توڑ کر عہد وفا خود ہی یہ کیسا الزام

بے وفائی کا دیا کرتے ہو تم بھی مجھ پر

(۴)

اصغر بے شیر کی تشنہ لبی کو دیکھ کر
پانی پانی ہوگیا لشکر جفاکاری کے ساتھ
ابن کاہل نے چلایا تیر سہ شعبہ مگر
چھِد گئی بیعت کی گردن اس کی مکاری کے ساتھ

(۵)

یہ زمانے کا ستم پست ہے جو قطرے سے
وہ یہ کہتا ہے کہ دریا سے بڑا ہوں اب تک
اور دنیا جسے کہتی ہے سمندر ارشادؔ
اس کا یہ قول ہے ''ساحل پہ کھڑا ہوں اب تک''

(۶)

عیسیٰ ہیں اللہ کے بندے اولواالعزم رسولوں میں
ابن اللہ جو مانیں ان کو آخر ہیں وہ کیسے لوگ
دیکھ کے نورانی چہرے عیسائی ہیں سب خوف زدہ
جھوٹوں پر کرنی ہے لعنت آئے ہیں کچھ سچے لوگ

(۷)

سر کٹا سکتے ہیں راہِ الفتِ شبیر میں
جو کبھی باطل کے آگے سر جھکا سکتے نہیں
حُر کی سیرت سے زمانے کو یہ ملتا ہے سبق
حق پہ جو آجائیں وہ مر کر بھی مر سکتے نہیں

(۸)

شہ رگِ قربِ خدا کو کاٹتا کوئی نہیں

ورنہ نیزے پر کٹا سر بولتا کوئی نہیں
قتل کرکے سینکڑوں کو اس نے مردہ کردیا
زندگی یہ پوچھتی ہے کیوں مرا کوئی نہیں
کاٹنا ممکن نہیں ہے شہ رگِ قرب خدا
ورنہ نیزے پر یقیناً بولتا کوئی نہیں
قتل کرکے ظلم نے پامال کرڈالا مگر
یہ حقیقت ہے کہ ان میں پھر مرا کوئی نہیں
لوحِ دل پر نقشِ جاں اب دوسرا کوئی نہیں
شہ رگِ جاں کہہ رہی ہے فاصلہ کوئی نہیں

(۹)

طوفانِ بلا میں ہے یہ اک موجِ تبسم
اصغر نے اڑائی ہے ہنسی فوجِ ستم کی
قاسم کا ہے حملہ کہ ہے ہنگامۂ محشر
تصویر یہ کھینچی گئی حیدر کے حشم کی

(۱۰)

فلک نے طے کیے ہیں تیری بربادی کے منصوبے
یہ مہلت چند روزہ ہے تمھیں دفع مضرت کو
دعا کے اسلحے کو آسماں کے پار پہنچا دو
ہٹادو آفت ارضی، سماوی کی حقیقت کو

(۱۱)

کبر کی آگ میں جلتے جاؤ
تا ابد راکھ ہی بنتے جاؤ
اگر اوجِ ثریا کے ہو طالب

کتابِ انکساری پڑھتے جاؤ

(۱۲)

سارے عالم کے لیے رحمت ہیں ختم المرسلیں
اور ختم المرسلیں کی جان رحمت فاطمہ
نور خدا ہیں سرور کونین سربسر
نور نگاہ ختم رسالت ہے فاطمہ

(۱۳)

مرتا ہے اور مرنے پہ کیا حال ہو وہاں
تجھ کو خبر مری ہے نہ مجھ کو خبر تری
آسودہ ہو لحد میں کہ کچھ بےقرار ہو
میں قیدِ زندگی ہوں مجھے کیا خبر تری

(۱۴)

حوصلہ ٹوٹا نہیں کرتا کسی بھی وار سے
عزم کا سر کٹ نہیں سکتا کبھی تلوار سے
کہہ رہا ہے نوکِ نیزہ پر سرِ باطل شکن
لَو چراغوں کی نہیں کٹتی چھری کی دھار سے

(۱۵)

جو کہتے ہیں کہ تعظیم محمد شرک و بدعت ہے
ابو جہل و لہب کا ساتھ دینا ان کی عادت ہے
نبی کا حکم تھا ہرگز نہ ہٹنا اپنی منزل سے
مگر مال غنیمت کی طلب تو ان کی فطرت ہے

(۱۶)

کہتے ہیں ہم بہار تو آجاتی ہے خزاں

صدمات غم دعا کو یہ تاثیر دے گئے
رویا میں ہم نے دیکھا تھا روئے حبیب کو
الٹی وہ میرے خواب کی تعبیر دے گئے

(۱۷)

ہے آج تاج پوشیٔ مولا غدیر میں
سب کاروبار چھوڑ کے ہم اور تم چلے
ساغر چلے ہیں، جام چلے اور قدَح چلے
یہ میکدہ غدیر کا ہے خُم کے خم چکے

(۱۸)

ہر ایک ذرے کو اک گلستاں بنانا ہے
زمین ہند کو رشک جناں بنانا ہے
سکون امن ہو سکھ شانتی ہو ہر جانب
ہمیں تو ایسا ہی ہندوستاں بنانا ہے

☆☆☆

مرثیہ امام زین العابدین (ع) بہ شکل مسدس

سجاد تیرے خطبے سے اٹھی ہیں آندھیاں
چہروں پہ ہے نفاق کی اڑتی ہوائیاں
ڈالی ہے تو نے کفر کی پیروں میں بیڑیاں
زینب نے موڑ دی ہے ستم کی کلائیاں
مظلومیت کا اٹھ گیا طوفان ہر طرف
بہتے ہیں تخت و تاج کے ارمان ہر طرف

خطبے کا لفظ لفظ ہے اک ضرب ذوالفقار
طوفانِ انقلاب نظر آیا ایک بار
دیکھا کہ پائے تخت تزلزل کا ہے شکار
مجمع کی چیخ سے ہوا ماحول سوگوار
بہر نماز روز ہی دی جاتی ہے اذاں
خطبے کو روکنے کے لیے دی گئی اذاں

کھینچے گا کوئی کیسے وہ منظر جو تھا وہاں
درباریوں کا حال تھا ناقابلِ بیاں
غصے سے خود یزید چباتا تھا انگلیاں
جب دوسرے علی نے تھا حق کو کیا عیاں
سجاد کے خطاب سے محشر بپا ہوا
درباریوں پہ ملک کا حاکم خفا ہوا

سجاد ہی نے دیں کی بچائی ہے آبرو
حق کو بلند کردیا باطل کے روبرو

لفظوں کو نطق دے دیا معنی کو جستجو
بخشی ہے تاجِ فکر کو وہ منزل علو
دنیا کو درسِ حرّیت دیتا رہا وہی
قید ستم کو خاک چٹاتا رہا وہی
سجاد تیرے سجدوں نے وہ کام کردیا
شیطان کو زمانے میں ناکام کردیا
دنیائے کفر و فسق کو بد نام کردیا
مفہومِ زینِ عابدیں کو عام کردیا
دنیا میں بندگی کا سلیقہ سکھا دیا
اسلام میں مقامِ عبادت بتادیا
داخل ہوئے جو بیتِ خدا میں ترے قدم
تکبیر کی صداؤں سے گونج اٹھا تھا حرم
جس دم حشامِ وقت نے دیکھا تری حشم
انجان میں کے پوچھا کہ ہے کون ذی کرم
شاعر نے چیخ کر کہا ایسا ہے ذی کرم
کلمے میں لا نہ ہوتی تو لا اس کی تھی نعم
سجاد تیرے دم سے دعا کو ملی حیات
تیرے سبب ہے قربِ الٰہی خلوصِ ذات
ارشادؔ کو دکھا دیا تونے رہِ نجات
یہ توشۂ حیات بھی ہے توشۂ ممات
مومن کا ہے سلاح صحیفہ یہ کاملہ
مجموعۂ دعا ہے صحیفہ یہ کاملہ

☆☆☆

فردیات

حق سے باطل کو شکست فاش دی ہے کربلا
صبر سے ظلم و ستم کو مات دی ہے کربلا

کسی فسانے میں جب تیرا نام ذکر ہوا
تو ہم نے اس کو حقیقت سمجھ کے چوم لیا

نرگس پہ پڑی شبنم قطرہ نہیں دریا ہے
جس کا کبھی رک جانا آسان نہیں ہوتا

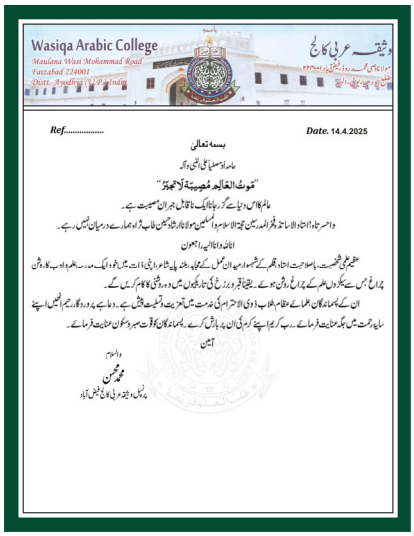
خود ہی پروانے لپٹ کر مرگئے
رات بھر شمعیں ہیں کیوں گریہ کناں

لمحہ لمحہ تلاش آب میں تھا
عمر ساری سراب میں گزری

آنسوؤں کو ضبط کرنا شرط ہے
راز الفت کا نہ ہوجائے عیاں

☆☆☆

تعزیت نامے



وثیقہ عربی کالج
Wasiqa Arabic College
Maulana Wasi Mohammad Road
Faizabad 224001
Distt. Ayodhya (U.P.) India

Ref..... Date. 14.4.2025

بسمہ تعالیٰ

عالمہ اُمِ صہیبہ الحق دامت برکاتہا

"موتُ العالِمِ مُصیبۃٌ لا تُجبَرُ"

عالمِ اِمکان دنیا کے گزر جانا بیک ناقابلِ جبران مصیبت ہے۔

واصر جناہ انا للہ وانا الیہ راجعون

انا للہ وانا الیہ راجعون

علیمی شخصیت، باصلاحیت استاذ، فقہ کے شہسوار، مہ الان عمل کے پیکر، جامعۃ الہدیٰ کے بانی، جامعۃ الہدیٰ ذات میں خود ایک مدرسہ، علوم وادب کا روشن چراغ جس سے سیکڑوں علماء کے چراغ روشن ہوئے۔ جنتیں قبر و برزخ کی تاریکیوں میں دور و نیکی کا علم کرتی رہیں گے۔

ان کے پسماندگان علماء طلاب نظام الدین ذوی الاحترام کی خدمت میں تعزیت و تسلیت پیش ہے۔ دعا ہے پروردگار عالم انھیں اپنے سایہ رحمت میں جگہ مناسبت فرمائے۔ رب کریم اپنے کریمی ان پر بارش کرے۔ پسماندگان کو قوت صبر و سکون مناسبت فرمائے۔

آمین

والسلام

محمد محسن

پرنسپل وچیف ایڈیٹر فیض آباد



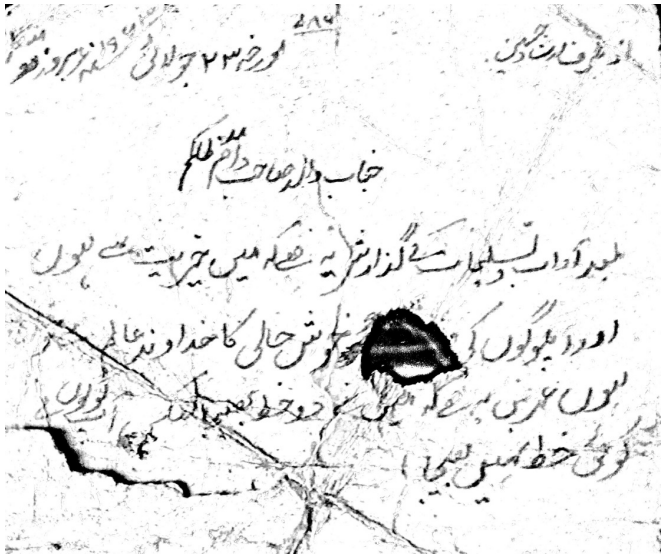
جامعہ حیدریہ مدینۃ العلوم
فیض آباد، ضلع مئو
ناظمہ: داعیہ حیدریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
العلماء باقون ما بقی الدھر

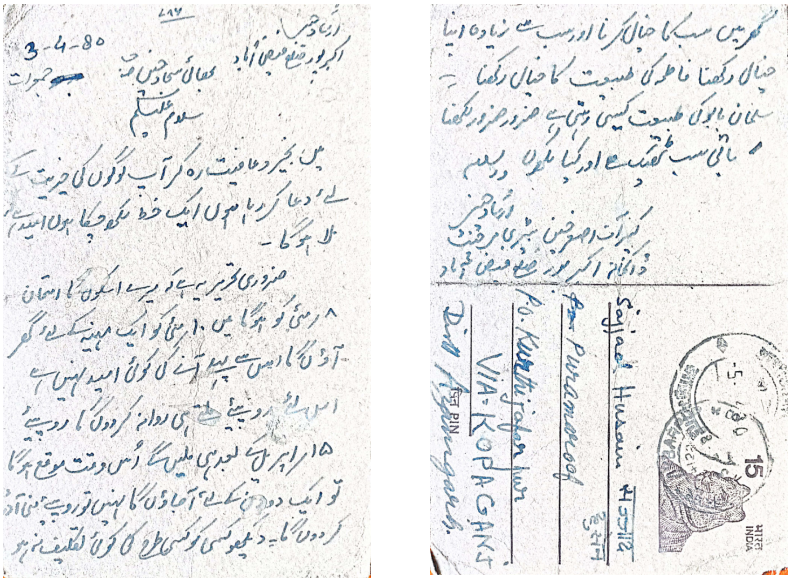
Ref: ..... Date: 17/04/2025

مرض یرقان، استاذ الاساتذہ، ادیب اریب، محقق، مفکر، بالغ نظر مفسر قرآن، سنت، فقیہ اسلام، مدافع اسلام، مسلمین، مولانا ارشاد حسین معروفی صاحب قبلہ قدس سرہ۔ آہ! استاذ محترم کی ناگہانی رحلت، محقق، مفکر، مدبر، مفسر، محدث، فقیہ، عظیم، علامہ، فہامہ، مولانا ارشاد حسین معروفی صاحب قبلہ قدس سرہ۔ ایک تبصرہ، ایک تحقیق، ایک مقالہ، ایک مضمون، ایک کتاب، ایک خطاب، ایک درس، ایک تدریس، ایک تقریر، ایک تحریر، ایک خطاب کے ذہن میں نمودار ہوگا کہ **اعیانهم مفقودة وامثالهم فی القلوب موجودة**۔

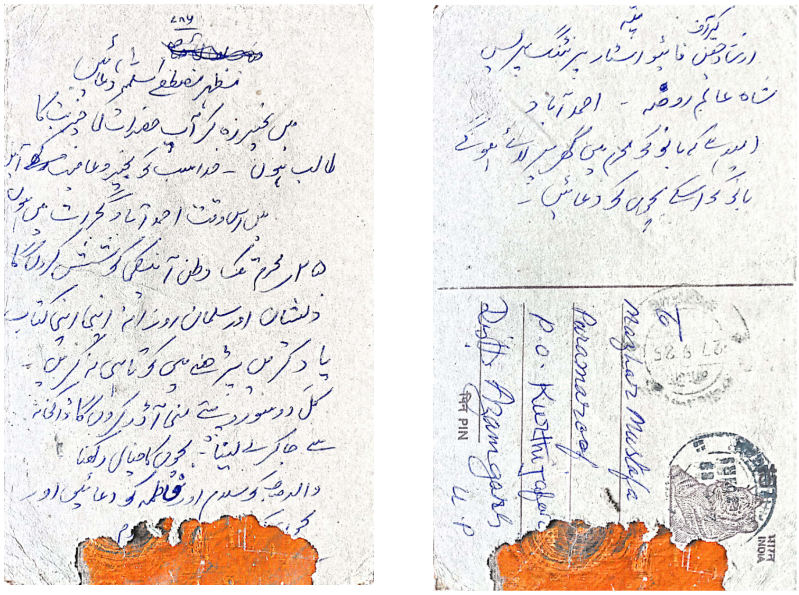
دنیا مرنے والوں کی پرواہ نہیں کرتی، دنیا ان کی پرواہ نہیں کرتی جو دنیا کی پرواہ نہیں کرتے، دنیا ان کی پرواہ کرتی ہے



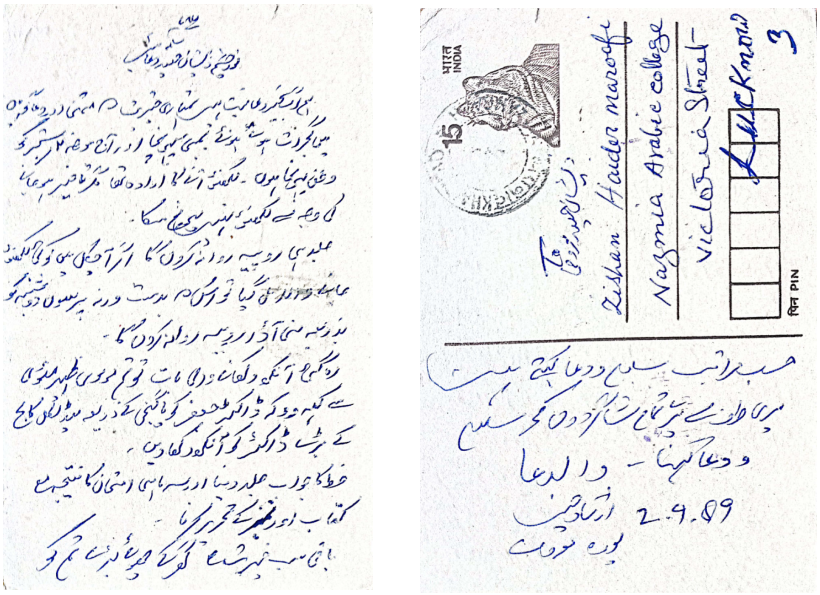
نمونۂ تحریر مولانا ارشاد حسین مرحوم [مورخہ ۲۳؍جولائی ۱۹۶۳ء]



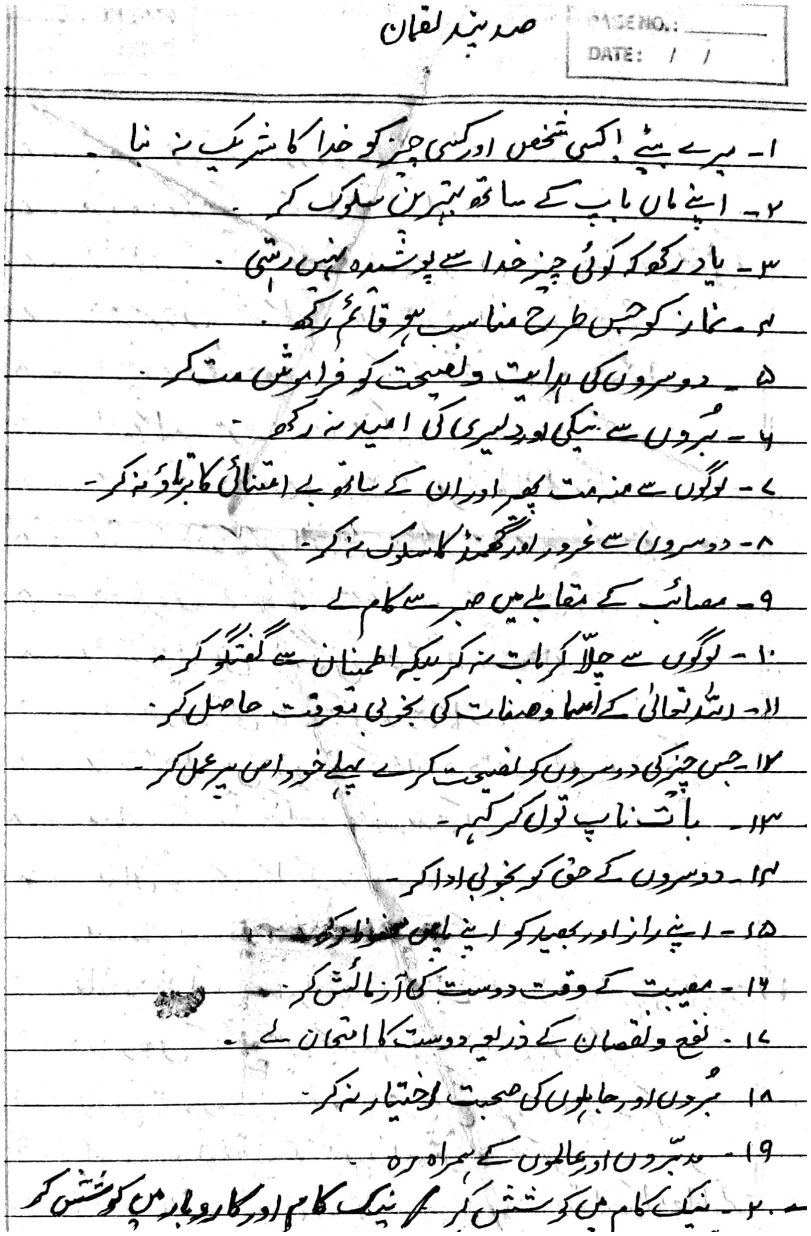
بڑے بھائی سجاد حسین مرحوم کو لکھے گئے ایک خط کا نمونہ [مورخہ ۰۳؍اپریل ۱۹۸۰ء]



مولانا کے برادر خرد مظہر مصطفیٰ مرحوم کو لکھے گئے ایک خط کا نمونہ [مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۸۵ء]



بڑے بیٹے ڈاکٹر ذیشان حیدر کو لکھے گئے ایک خط کا نمونہ [مورخہ ۰۲ ستمبر ۱۹۸۹ء]



صد پند لقمان

PAGE NO.:
DATE: / /

۱۔ میرے بیٹے! کسی شخص اور کسی چیز کو خدا کا شریک نہ بنا۔
۲۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہترین سلوک کر۔
۳۔ یاد رکھ کہ کوئی چیز خدا سے پوشیدہ نہیں رہتی۔
۴۔ نماز کو جس طرح مناسب ہو قائم رکھ۔
۵۔ دوسروں کی ہدایت و نصیحت کو فراموش مت کر۔
۶۔ بُروں سے نیکی اور دلیری کی امید نہ رکھ۔
۷۔ لوگوں سے منہ مت پھیر اور ان کے ساتھ بے اعتنائی کا برتاؤ نہ کر۔
۸۔ دوسروں سے غرور اور گھمنڈ کا سلوک نہ کر۔
۹۔ مصائب کے مقابلے میں صبر سے کام لے۔
۱۰۔ لوگوں سے چلّا کر بات نہ کر بلکہ اطمینان سے گفتگو کر۔
۱۱۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی بخوبی معرفت حاصل کر۔
۱۲۔ جس چیز کی دوسروں کو نصیحت کرے پہلے خود اس پر عمل کر۔
۱۳۔ بات ناپ تول کر کہہ۔
۱۴۔ دوسروں کے حق کو بخوبی ادا کر۔
۱۵۔ اپنے راز اور بھید کو اپنے پاس محفوظ رکھ۔
۱۶۔ مصیبت کے وقت دوست کی آزمائش کر۔
۱۷۔ نفع و نقصان کے ذریعہ دوست کا امتحان لے۔
۱۸۔ بُروں اور جاہلوں کی صحبت اختیار نہ کر۔
۱۹۔ مدبّروں اور عالموں کے ہمراہ رہ۔
۲۰۔ نیک کام میں کوشش کر نیک کام اور کاروبار میں کوشش کر

ترجمہ صد پند لقمان کے خطی نسخے کا نمونہ [۲۰۱۹ء]

نظم تعزیت

وقت رحلت مولانا محمد مجتبیٰ حسین مرحوم جامعہ ناظمیہ لکھنؤ

(۱) خاموش طبع تھا جو سخنور نہیں رہا — دنیائے فقر کا وہ سکندر نہیں رہا
(۲) سیراب جس سے ہوتے تھے طلاب علم دیں — تشنہ لبوں کا اب وہ سمندر نہیں رہا
(۳) تدریس کے فلک کو عطا کر کے روشنی — وہ علم و فن کا مہر منور نہیں رہا
(۴) باریکیاں اصول کی، اسرار فقہ کے — دے کر ریاض کا وہ گل تر نہیں رہا
(۵) مشہور قوانین تھا فرائد میں منفرد — تدریس کے صدف کا وہ گوہر نہیں رہا
(۶) کیا تبصرہ کرے کوئی ہیئت پہ آپ کی — تصریح کے فلک کا وہ محور نہیں رہا
(۷) اس نے دکھائے کتنے معالم اصول کے — لمعہ کو جس پہ ناز تھا وہ سر نہیں رہا
(۸) کیا صرف علم بخشا ہے اس کی زندگی — جامی کا وہ معلم خوش تر نہیں رہا
(۹) تدریس شافیہ سے ہے اک بات یہ عیاں — لفظوں کے اشتقاق کا مصدر نہیں رہا
(۱۰) علم عروض میں تھا دوائر کا وہ محیط — اور نقد شعر جس کا تھا جوہر نہیں رہا
(۱۱) علم کلام کرتا ہے اب خود سے گفتگو — احقاق حق کا آج وہ منظر نہیں رہا
(۱۲) تھی جامع جمیع کمالات اس کی ذات — روح علوم کا تھا جو پیکر نہیں رہا
(۱۳) افسوس جس کے دم سے مشارع میں آب تھی — وہ شرکت شرائع کا دفتر نہیں رہا
(۱۴) ارشاد کو بھی درد ہے اس کے فراق پر — صد حیف! فکر و فن کا مقدر نہیں رہا

ارشاد حسین المعروف
پورہ یوسف کریم جعفر پور
ضلع سدھارتھ نگر 8896740346
مجتبیٰ حسین 8604416168

جامعہ اور کتابوں کے نام

۱۔ ریاض المسائل
۲۔ قوانین الاصول
۳۔ فرائد الاصول
۴۔ تبصرۃ المتعلمین
۵۔ تصریح
۶۔ معالم الاصول
۷۔ لمعہ، شرح لمعہ
۸۔ جامی شرح کافیہ
۹۔ شافیہ
۱۰۔ محیط الدائرہ
۱۱۔ نقد الشعر
۱۲۔ احقاق الحق
۱۳۔ مشارع الشرائع (جامعہ ناظمیہ)





پہلی تصویر ۱۹۷۱ء کی ہے جب کہ دوسری تصویر نوّے کی دہائی کی ہے۔



تصویر میں دائیں سے: ماسٹر سلمان حیدر، مولانا ارشاد حسین مرحوم، ڈاکٹر ذیشان حیدر، محمد تابش [مولانا کے پوتے]، مظہر مصطفیٰ مرحوم، فیضان حیدر اور سامنے مولانا کی پوتی اور پوتے زینب فاطمہ، محمد علی اور علی نازش



مولانا ارشاد حسین طاب ثراہ کی ایک نادر تصویر جو ان کی علمی عظمت اور روحانی وجاہت کی خاموش داستان سناتی ہے۔



آخری آرام گاہ، آبائی قبرستان مٹھیا، پورہ معروف (بازار)، کرتھی جعفر پور، مئو

تصویر: مورخہ ۱۷؍جون ۲۰۲۵ء

Quarterly *FAIZAN-E-ADAB*

An International Peer Reviewed Refereed Research Journal with

Impact Factor: 7.0 (IIFS)

Vol. XI, Issue: II & III, April to September 2026

RNI: UPURD/2018/74924 —— ISSN: 2456-4001

Website: www.faizaneadab.in & faizaneadab.blogspot.com

In Memory of

Late Maulana Irshad Husain (Tabasarah)

EDITOR

Dr. Faizan Haider, Cell: +917388886628, E-Mail: **faizanhaider40@gmail.com**

ADVISORY BOARD

Prof. Nasim Ahmad, Ex-Head, Dept. of Urdu, Faculty of Arts, Banaras Hindu University, Varanasi– 221005, U.P. India, Cell: +919450547158

Prof. S. Hasan Abbas, Head, Dept. of Persian, Faculty of Arts, Banaras Hindu University, Varanasi– 221005, U.P. India, Cell: +919839337979

Prof. Syed Mohammad Asghar, Ex- Head, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh – 202002, India, Cell: +919412396990

Prof. S. Vazeer Hasan, Ex-Head Dept. of Arabic, Faculty of Arts, Banaras Hindu University, Varanasi – 221005, U.P. India, Cell: +919919062351

Prof. Umar Kamaluddin, Ex- Head, Dept. of Persian, University of Lucknow, Lucknow Pin Code – 226007, India, Cell: +919838543323,

Prof. S. M. Jawed Hayat, Ex- Head, Dept. of Urdu, Patna University, Patna – 800005, India, Cell: +919430002712

Dr. Mahmood Ahmad Kaawish, Ex-Principal, Quaid-e-Azam Academy for Educational Development, Narowal, Pakistan, Cell: +923007764252

Dr. Mohsin Raza Rizvi, Head, Dept. of Urdu, Oriental College, Patna City, Patna – 800008, India, Cell: +919431443778

Dr. Zishan Haider, Assistant Professor in Persian, MANUU Lucknow Campus, 504/122 Tagore Marg, Lucknow, U.P. – 226020, India, Cell: +919336027795

EDITORIAL BORAD

Prof. Abid Husain Haidari, Head, Department of Urdu, M.G.M. Post Graduate College, Sambhal – 244302 (U.P.) India, Cell: +919411097150

Dr. Shakeel Ahmad, Doman Pura, Maunath Bhanjan, Mau, U.P.– 275101, India, Cell: +919236722570

Dr. S. Naqi Abbas, Head, Department of Persian, L.S. College, Muzaffarpur – 842001, India, Cell: +918860793679

Dr. Zaheer Hasan Zaheer, Department of Urdu, Smt. Indira Gandhi P.G. College, Dumri Maryad Pur, Mau – 221602, India, Cell: +917607445476

Dr. S. Ulfat Husain, Assistant Professor (Urdu), Arvind Mahila College, Patna – 800004, India, Cell: +916201788749

Dr. Faizan Jafar Ali, Husainabad, Pura Maroof, Kurthi Jafarpur, Dist. Mau, U.P– 275305, Cell: +918874669937

Dr. Mahnaz Anjum, Islamabad, Pakistan – 44790, Cell: +923315982145

Dr. Md. Khalid Anjum Usmani, Head, Department of Urdu and Persian, C.M. College, Darbhanga, Bihar – Cell: 7033822281

Dr. Shamim Ahmad, Department of Urdu, H.A. Rab Girls P.G. College, Jahangirabad, Mau – 275101, India, Cell: +918090121488

Address: Urdu And Persian Research Organization, Purana Pura, Kurthi Jafarpur, Mau, U.P. – 275305, Cell: 7388886628, E-Mail: faizaneadab@gmail.com